فتاویٰ دیداریہ

جلد اوّل

از

سید الفقہا مولانا سیّد محمد دیدار علی شاہ مُحدّث الوری قدس سرّہٗ

بانی مرکزی انجمن حزب الاحناف لاہور

مکتبہ العصر

کریالہ (منزل رضوان الصّادق)
جی ٹی روڈ، گجرات

فتاویٰ دیداریہ

جلد اوّل

از

سید الفقہا مولانا سیّد محمد دیدار علی شاہ محدّث الوری قدس سرہٗ

بانی مرکزی انجمن حزب الاحناف، لاہور۔

ترتیب و تخریج و ترجمہ

علامہ مفتی محمد علیم الدّین نقشبندی مُجدّدی

محمد اکرم مجددی

۲۹ ذوالقعدہ ۱۴۲۸ھ

مکتبۃ العصر
کریالہ (منزل رضوان الصادق)
جی ٹی روڈ، گجرات

نام کتاب......	فتاویٰ دیداریہ جلد اول
مصنف......	سید الفقہاء مولانا سید محمد دیدار علی شاہ محدث الوری قدس سرہ
	بانی مرکزی انجمن حزب الاحناف لاہور
ترتیب وتخریج وترجمہ......	علامہ مفتی محمد علیم الدین نقشبندی مجددی
کمپوزنگ......	محمد یوسف مجددی
صفحات......	۹۱۸
تعداد......	۱۱۰۰
اشاعتِ اول......	۱۴۲۸
پرنٹر......	داور پیکجز 6- نسبت روڈ لاہور

ملنے کے پتے......

مکتبہ اعلیٰ حضرت:......	دربار مارکیٹ لاہور
مکتبہ قادریہ:......	دربار مارکیٹ لاہور
مکتبہ مجددیہ سلطانیہ:......	ملک پلازہ دینہ جہلم

مظہرِ علم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فہرست

تاریخ وسوانح

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

حالات

حضرت مولانا ابو محمد سید محمد دیدار علی شاہ محدث الوری رحمۃ اللہ علیہ

از

حضرت صاحبزادہ مولانا عبدالسلام صدیقی مجددی دامت برکاتہم العالیہ

خانقاہ سلطانیہ نزد کالا دیو (جہلم)

آپ کے اسلاف مشہد (ایران) سے ہند تشریف لائے، سید خلیل شاہ رحمۃ اللہ علیہ (آپ کے پردادا) پہلے شخص ہیں جن کا نام تاریخ کے صفحات پر جلوہ گر ہوا، آپ ہی مشہد سے بلگرام اور وہاں سے فرخ آباد آئے، کچھ عرصہ کے بعد فرخ آباد کو خیر باد کر کے ریاست الور میں قیام پذیر ہوئے آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام موسیٰ رضا رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، جس کی وجہ سے آپ حسنی حسینی رضوی سید ہیں۔

مولانا سید محمد دیدار علی شاہ مشہدی رضوی نقشبندی قادری محدث الوری قدس سرہ ۱۲۷۳ھ بمطابق 1856ء پیر کے دن ریاست الور میں اپنے عم بزرگوار سید ''نثار علی'' شاہ کی دعا سے پیدا ہوئے، حضرت نے آپ کی والدہ محترمہ کو پہلے ہی بشارت دی تھی کہ تیرے گھر ایک بیٹا پیدا ہوگا جو دین اسلام کا چراغ ہوگا، اس کا نام ''دیدار علی'' رکھنا۔

حضرت سید صاحب نے ابتدائی تعلیم الور میں حاصل کی پھر دہلی کا رخ کیا اور مولانا کرامت اللہ خان صاحب سے درسِ نظامی کا کچھ حصہ پڑھا۔ مولانا عبدالعلی رامپوری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا ارشاد حسین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی زانوئے تلمذ طے کیا، اس زمانہ میں سہارن پور میں مولانا احمد علی محدث سہارن پوری

تدریس حدیث میں یگانہ روزگار مانے جاتے تھے'ان کے پاس آپ نے دورہ حدیث پڑھا'ان دنوں آپ کے ہم سبق مولانا وصی احمد محدث سورتی اور حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی تھے' یہ وہ لوگ ہیں جو آسمان علم وشہرت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے' دورہ حدیث سے فارغ ہو کر معقولات کا بڑا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے۔

حضرت مولانا احمد علی سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ آپ کو درج ذیل مشائخ طریقت اور شیوخِ حدیث سے سلاسلِ طریقت اور فقہ وحدیث وتفسیر میں اجازت حاصل تھی۔

1۔ حضرت سائیں توکل شاہ انبالوی رحمۃ اللہ علیہ' حضرت محدثِ الوری رحمۃ اللہ علیہ دو سال تک ان کی تربیت میں رہے اور ان سے سلاسلِ طریقت کی اجازت اور خلعتِ خلافت حاصل ہوئی۔

2۔ حضرت مولانا فضل الرحمان گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ' حضرت توکل شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے فرمان کے مطابق آپ ان کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ سلسلہ عالیہ قادریہ نقشبندیہ میں آپ سے بیعت ہوئے اور سندِ حدیث حاصل فرمائی جو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تک صرف ایک واسطہ سے پہنچتی ہے۔ آپ کو حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے صاحب زادے مولانا شمس الدین احمد میاں کے درس حدیث میں ساتھی ہونے کا شرف بھی حاصل رہا۔ ان سے بھی تمام اعمال واذ کارِ سلاسلِ اولیاء میں اجازت اور خلافت حاصل کی۔

3۔ حضرت مولانا عبدالغنی بہاری مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ کو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے چالیس اکابر علمائے کرام سے فقہ وحدیث میں اجازت حاصل تھی ان سے بھی سند حاصل کی۔

4۔ امام فن قراءت حضرت قاری عبدالرحمٰن پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ۔ ان سے بھی قرآن مجید' حدیث اور فقہ کی اجازت سے مشرف ہوئے۔

5۔ اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنت امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ آپ نے بھی حضرت محدث الوری رحمۃ اللہ علیہ کو تمام سلاسل اولیائے کرام کے اعمال واذ کار اور جملہ مرویاتِ فقہ وحدیث کی اجازت اور خلافت عطا فرمائی۔

6۔ حضرت سید اولادِ رسول محمد میاں قادری برکاتی مارہروی رحمۃ اللہ علیہ' آپ امام احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ کے پیر خانہ مارہرہ شریف کے سجادہ نشین تھے۔ حضرت محدث الوری رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے بھی طریقت

کے سلاسل کی خلافت اور حدیث وعلومِ دینیہ کی سند حاصل کی۔

7۔ حضرت سید نثار علی رضوی مشہدی رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ سلسلہ چشتیہ کے عظیم روحانی پیشوا اور رشتہ میں حضرت محدث الوری رحمۃ اللہ علیہ عم محترم تھے۔ تکمیلِ علوم کے بعد آپ نے ایک عرصہ ان کی خدمت میں گذارا اور ان کی صحبتوں سے مستفیض رہے۔ انہوں نے بھی آپ کو اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا۔

8۔ حضرت شاہ ابو احمد محمد علی حسین اشرفی کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت محدث الوری رحمۃ اللہ علیہ ان سے بھی سندِ حدیث اور سلاسلِ طریقت میں خلافت سے سرفراز ہوئے۔

سید صاحب جب علم سے فارغ ہوئے تو آپ اپنے استاد مولانا ارشاد حسین رامپوری رحمۃ اللہ علیہ کے حکم کے مطابق ''ارشاد العلوم رام پور'' میں مدرس اول مقرر ہوئے چند برس کے بعد 1906ء میں بمبئی روانہ ہوئے وہاں ایک سال پورا کام کرنے کے بعد 1907ء میں وطن مالوف ''الور'' میں تشریف لائے اور مسجد ''دائرہ'' میں ''قوت الاسلام'' کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا یہ مدرسہ آپ کی علمی زندگی کا سنگِ اولین قرار دیا جاتا ہے جو آپ نے دینی علوم وفنون کی اشاعت کے لیے قائم کیا۔ ''مسجد دائرہ'' میں درسِ قرآن کا آغاز فرمایا' درس کی خصوصیت یہ تھی کہ سننے والے پابندِ شریعت ہو گئے' سینکڑوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی' حتی کہ ہندو بھی آپ کے درس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے' مسجد کے باہر کھڑے ہو کر درسِ قرآن سنتے تھے' الور کا ہندو راجہ بڑا متعصب تھا اس نے حضرت کا درس بند کرانے کے لیے مختلف حربے استعمال کرنا شروع کیے' مگر آپ استقامت کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے۔

حضرت قبلہ سید صاحب ۱۳۳۰ھ بمطابق ۱۹۱۲ء میں لاہور تشریف لائے' اس دور میں پنجاب کی شہرہ آفاق واحد دینی درس گاہ ''دار العلوم نعمانیہ'' میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے' مدرسہ میں درس حدیث شریف دیتے اور لاہور اور اس کے مضافات میں تبلیغی جلسوں میں خطاب فرماتے تھے' آپ کا وعظ بہت مقبول اور مؤثر تھا جس اجتماع میں آپ کا اعلان ہوتا خلقِ خدا کثیر تعداد میں آپ کی زیارت اور وعظ سننے کے لیے جمع ہو جاتی۔

1916ء میں لاہور سے آگرہ تشریف لے گئے' اور رمضان ۱۳۳۴ھ بمطابق ۱۹۱۶ء جامع مسجد اکبر آباد آگرہ کے مفتی وخطیب مقرر ہوئے' اور ۱۹۱۹ تک آگرہ میں آپ کا قیام رہا۔

۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۲۰ میں آپ حج بیت اللہ شریف اور زیارت روضۂ رسول ﷺ کے لیے روانہ ہوئے اور حج سے واپسی پر ۱۹۲۰ء میں آپ مستقل سکونت کے ارادہ سے لاہور تشریف لائے اور جامع مسجد وزیرخان کے خطیب مقرر ہوئے' خطابت کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ بھی شروع فرمایا۔

۱۳۴۲ھ بمطابق ۱۹۲۴ء میں آپ نے مرکزی انجمن حزب الأحناف ہند قائم کی اور دارالعلوم حزب الاحناف کی بنیاد رکھی' جہاں سینکڑوں علماء وفضلاء اور مدرسین پیدا ہوئے' آج شاید ہی پاکستان کا کوئی شہر یا قصبہ ایسا ہوگا جہاں حزب الاحناف کے فارغ التحصیل علماء دینی خدمات سرانجام نہ دے رہے ہوں۔

حضرت کی ذات ستودہ صفات محتاجِ تعارف نہیں' بے باکی اور حق گوئی آپ کی طبیعت ثانیہ تھی' مخالفین کے طوفان آپ کے پائے ثبات کو جنبش نہ دے سکے' دنیا کی کوئی طاقت آپ کو مرغوب نہ کر سکی' علم وفضل کے تو گویا سمندر تھے' کسی مسئلہ پر گفتگو شروع کرتے تو گھنٹوں بیان جاری رہتا' سورہ فاتحہ شریف کا درس شروع کیا تو ایک سال تک صرف سورۂ فاتحہ شریف کا درس جاری رہا۔ آپ کے خلوص' ایثار' زہد وتقویٰ' سادگی اور اخلاقِ عالیہ کے مخالف وموافق سب معترف تھے' عوام وخواص سے انکساری سے ملتے' علمائے مشائخ اہل سنت کی عزت وتکریم کرتے دینی طلباء پر شفقت فرماتے' بحث سے اجتناب کرتے' مناظروں کی حوصلہ شکنی کرتے' گالیوں کے جواب میں خاموش رہتے' اپنی ضروریات کی اشیاء خود بازار سے خرید لاتے' جہاں خلافِ شرع بات دیکھتے نرمی سے نصیحت کرتے' دوکانداروں کو مسائل شریعت سے آگاہ فرماتے' ۔لباس سادہ' کپڑے کی ٹوپی' تکمے والا کرتا' ٹخنوں سے اونچا پاجامہ' دیسی ساخت کا جوتا' استعمال کرتے تھے۔

حضرت علامہ سید صاحب کے تین صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تھیں جن میں سے ایک صاحبزادی اور دو صاحبزادوں نے بڑی عمر پائی ہے۔ ﴿۱﴾ سید احمد ابوالبرکات قادری رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم حزب الاحناف کا انتظام وانصرام آپ کے ذمہ ہی تھا جسے آپ نے بڑی خوبصورت انداز سے نبھایا

﴿۲﴾ علامہ ابوالحسنات سید محمد قادری رحمۃ اللہ علیہ جامع مسجد وزیر خان کے خطیب اور جمعیت علمائے پاکستان کے صدر تھے، آپ تحریک پاکستان، جہاد کشمیر اور ختم نبوت کی مہم کے سچے جانباز سپہ سالار تھے۔

۲۲ رجب المرجب ۱۳۵۴ھ بمطابق 20 اکتوبر 1935ء کو آپ نے وصال فرمایا جب کہ آپ نماز عصر کے لیے نیت باندھ چکے تھے، اندرون دہلی دروازہ دارالعلوم حزب الاحناف میں آپ کی آخری آرامگاہ ہے۔

ہندو پاک میں آپ کی انتھک تدریسی کاوشوں کی بدولت بے شمار تلامذہ نے آپ سے علوم دینیہ کی تعلیم پائی، آپ کے صاحبزدگان کے علاوہ چند تلامذہ کے نام یہ ہیں۔

1۔ مولانا ارشاد علی الوری　　2۔ مولانا محمد رمضان بلوچستانی
3۔ مولانا رکن الدین نقشبندی　　4۔ مولانا غلام محی الدین کاغانی
5۔ مولانا محمد اسلم جلال آبادی　　6۔ مولانا محمد رمضان لسبیلہ، سندھ
7۔ مولانا عبدالحق ولایتی　　8۔ مولانا شفیق الرحمان پشاور۔
9۔ مولانا سید فضل شاہ　　10۔ مولانا محمد مہر الدین
11۔ مولانا ابوالخیر نور اللہ نعیمی　　12۔ مولانا عبدالعزیز۔ بورے والا۔
13۔ مولانا عبدالقیوم ہزاروی۔

آپ نے محققانہ تصانیف کا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے بعض تصانیف کے نام یہ ہیں۔

(۱) تفسیر میزان الادیان (مقدمہ و تفسیر سورۃ فاتحہ شریف)
(2) علامات وہابیہ　　(3) ہدایۃ الغوی بارشاد علی درردِ روافض۔
(4) اصول الکلام　　(5) تحقیق المسائل
(6) ہدایۃ الطریق　　(7) سلوک قادریہ
(8) فضائل رمضان　　(9) فضائل شعبان
(10) الاستغاثۃ من اولیاء اللہ عین الاستغاثۃ من اللہ
(11) دیوان دیدار علی۔ فارسی۔ اردو

تقریظ جلیل

از

محقق اہل سنت علامہ مولانا محمد جلال الدین قادری زید مجدہ

کھاریاں ضلع گجرات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

استفتاء اور فتویٰ کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی پرانی تاریخ اسلام کی ہے۔ قرآنِ مجید فرقانِ حمید کے نزول کے دوران صحابہ کرام علیہم الرحمۃ والرضوان نے بعض امور سے متعلق حضور پرنور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرعی حکم دریافت فرمایا تو اسی وقت بعض اوقات اللہ تعالیٰ جل وعلا نے قرآن مجید میں اس کا جواب نازل فرمایا اور اکثر اوقات خود شارع اسلام علیہ التحیۃ والسلام نے حکمِ شرعی واضح فرمایا۔ قرآنِ مجید کی متعدد آیات اور احادیثِ کثیرہ میں یہ صورتِ حال ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

نبیِ اکرم رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصالِ پُر ملال کے بعد صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے دور میں شرعی امور میں استفتاء طلب کیے جاتے رہے اور مقتدر صحابہ کرام اور جلیل القدر ائمہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ان کو جواب عطا فرماتے رہے۔ یہی جواب فتاویٰ کہلائے۔ یہ سلسلہ سوال اور جواب کا وہیں نہیں رکا بلکہ اب تک جاری ہے اور انشاء اللہ قربِ قیامت تک جاری رہے گا۔

استفتاء کرنے والے کبھی اپنی ذات سے متعلق پیش آمدہ صورت حال سے سوال کرتے اور کبھی معاشرہ کو پیش آمدہ اجتماعی صورتِ حال سے سوال کرتے۔ مفتی انہیں حسب حال شرعی اصول وقواعد کی روشنی میں جواب عطا فرمادیتا۔ اس طرح بعض فتاویٰ کا تعلق ایک شخص سے ہوتا ہے اور بعض کا تعلق اجتماعی طور پر معاشرے

سے۔ فتاویٰ کی اہمیت اور قدر و قیمت دونوں صورتوں میں یکساں ہوتی ہے مگر اثر و نفوز کے اعتبار سے ثانی الذکر فتاویٰ ہمہ گیر اثر رکھتے ہیں۔ ایسے فتاویٰ بعض اوقات معاشرے سے کسی برائی کو ختم کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات ان کا اثر و نفوذ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اس سے مقتدرِ اعلیٰ کے اقتدار پر زد پڑتی ہے اور یہ بھی دیکھا گیا کہ فتاویٰ سے بعض اوقات حکمرانی تبدیل ہوگئی۔ یہ مقامِ اختصار ہے ورنہ اس کی کثیر مثالیں تاریخ میں موجود ہیں جن کو یہاں درج کیا جاسکتا ہے۔

فتاویٰ کی ایک حیثیت زبانی اور ایک تحریری ہے۔ مستفتی نے سوال اگر زبانی کیا تو مفتی نے اس کا جواب زبانی دے دیا اور اگر مُستفتی نے تحریری سوال کیا تو اس کا جواب مفتی نے تحریری دے دیا۔ زبانی سوال وجواب کا انضباط بہت دشوار امر ہے۔ البتہ تحریری فتاویٰ کی جمع و تالیف اور ترتیب قدرے آسان ہے۔

درج بالا حقیقت کے پیشِ نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی تاریخ میں کتب فتاویٰ لاتعداد و بیشمار مرتب وموجود ہوں مگر شاید ایسا نہیں۔ اس کی وجہ وہی ہے جو اسلامی کتب تفاسیر' احادیث' فقہ' تاریخ' شروح کے ساتھ حادثہ ہوا یعنی وہ قلمی مسودات کا ایک متعد بہا حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ بعض حصہ اسلام دشمن حکمرانوں کے حملوں کی نذر ہو چکا ہے۔ یہ بات تو بطور ضرب المثل کہی جاتی ہے کہ تاتاریوں کے حملوں سے عروس البلاد بغداد مقدس کا نایاب اور کثیر علمی ذخیرہ دریائے دجلہ کی نذر ہوا جس سے قلمی مسودات کی روشنائی سے دریائے دجلہ کا پانی سیاہ ہو گیا تھا۔ ایسے بیسیوں حادثات اسلامی کتب کے ساتھ ہو چکے ہیں۔ تاہم بحمدہٖ تعالیٰ اسلامی کتب کا ایک معتد بہا قیمتی ذخیرہ کسی نہ کسی طرح محفوظ رہ سکا ہے۔ چنانچہ دیگر کتب اسلامیہ کے ساتھ ساتھ کتب فتاویٰ کی ایک کثیر مقدار قلمی یا مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔

فتویٰ کیا ہے اور اس کی مذہبی' دینی اور معاشرتی حیثیت کیا ہے؟ یہاں ان امور کے بیان کا موقع نہیں۔ مختصراً یوں جان لیجئے ایک شخص یا معاشرہ کو درپیش صورتِ حال میں اسلامی حکم جاننے کی کوشش استفتاء ہے اور اس صورتِ حال میں کتاب وسنت اور اقوالِ ائمہ وفقہاء کی روشنی میں کسی عالمِ دین کا شرعی جواب فتویٰ کہلاتا ہے۔ گویا فتویٰ کو ایک شخص یا ایک معاشرہ کی دینی' معاشرتی' معاشی اور سماجی زندگی میں بنیادی اہمیت

حاصل ہے۔

زیرنظر فتاویٰ کی کتاب مسمّٰی بہ ''فتاوی دیداریہ'' تین مفتیان کرام کے فتاوی کا مجموعہ ہے۔

1۔ مولانا مفتی محمد رمضان صاحب۔

2۔ مولانا مفتی سید محمد اعظم شاہ صاحب

3۔ مولانا مفتی سید ابو محمد محمد دیدار علی شاہ صاحب۔

تینوں مفتیانِ کرام جامع مسجد اکبر آباد (آگرہ) کے خطیب اور مفتی ہیں۔ جو یکے بعد دیگرے مذکور مسجد میں افتاء اور خطابت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ جس رجسٹر میں تینوں مفتیان کرام کے فتاویٰ درج ہیں اس کا دورانیہ جنگِ عظیمِ اول کا زمانہ (1914ء تا 1919ء) ہے۔

اول الذکر دو مفتیان کرام کے حالات فقیر غفرلہ القدیر (راقم السطور) کو معلوم نہیں۔ البتہ تیسرے مفتی نبراس المحدثین استاذ العلماء والمدرسین مولانا سید ابو محمد محمد دیدار علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کتبِ تذکرہ میں موجود ہیں۔ یہ وہی ہیں جنہیں امام احمد رضا محدث بریلوی قدس سرہ العزیز سے خلافت واجازت حاصل تھی۔ ہاں یہ وہی ہیں جو بعد میں مرکزی دار العلوم حزب الاحناف لاہور ہند (اور اب پاکستان) کے بانی ہیں۔

تینوں مفتیانِ کرام کے فتاویٰ کی کیفیت وکمیت بھی مختلف ہے۔

اول الذکر مفتی مولانا محمد رمضان صاحب کے فتاویٰ بہت قلیل ہیں۔ جو انگلیوں پر گِنے جاسکتے ہیں۔ ان کے فتاویٰ تحریر کرنے کا انداز بھی مختصر ہے۔ وہ مختصر عبارت میں (اور اکثر اوقات) بغیر حوالہ کتبِ فقہ وغیرہ کے فتویٰ تحریر کردیتے ہیں۔

ثانی الذکر مفتی مولانا سید محمد اعظم شاہ صاحب کے فتاوی اول الذکر مفتی کے فتاوی سے ذرا زیادہ ہیں۔ مجموعی طور پر وہ بھی قلیل ہیں۔ مگر ان کا انداز تحریر قدرے مفصل ہے وہ کتبِ حوالہ جات سے اپنی تحریر کو مزین کرتے ہیں۔

ثالث الذکر مفتی مولانا سید ابومحمد محمد دیدار علی شاہ صاحب کے اکثر فتاویٰ طویل ہیں۔ وہ قرآن مجید کی آیاتِ کریمہ' احادیثِ طیبہ اور اقوالِ ائمہ اور کتبِ فقہاء اور شروح محدثین کے کثیر در کثیر حوالہ جات سے اپنے موقف کو مستفتی کے لیے واضح کرتے چلے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ائمہ کرام اور فقہائے عظام کے اختلاف کو بڑی شرح وبسط سے بیان کر دیتے ہیں اور ان اختلافات کی روشنی میں جواب فتویٰ کے مختلف پہلو واضح کر دیتے ہیں۔ (اگرچہ یہ امر علماء کی عظمت کا نشان ہے مگر بعض اوقات قاری اس سے الجھن محسوس کرتا ہے)

''فتاویٰ دیداریہ'' کے چند فتاویٰ سے اتفاق مشکل ہے۔ مگر یہ امر باعثِ قدح نہیں۔ مفتی اگر اخلاص، للّٰہیت اور ممکنہ تحقیق کے بعد جواب دے اور وہ جواب دیگر جمہور فقہائے امت اور مفتیانِ ملت کے خلاف واقع ہو تو اس کو خطائے اجتہادی کے مانند محمول کرنا چاہئے۔ مفتی مذکور باوجود خطا کے ماجور و مثاب ہوگا۔ انشاء اللہ العزیز۔

''فتاوی دیداریہ'' میں بعض وہ فتاویٰ ہیں جن کی بنا پر مروجہ کچہریوں میں فیصلے ہوئے جس کا صریح مفہوم یہ ہے کہ مولانا سید ابومحمد محمد دیدار علی شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کے فتاوی کو عوام و خواص کے علاوہ مروجہ کچہریوں میں قابلِ حجت تسلیم کیا جاتا ہے۔

بعض فتاویٰ وہ ہیں جن کا بالواسطہ تعلق مروجہ کچہریوں سے تھا۔ وہ یوں کہ اوقاف' مساجد' مدارس وغیرہ کے مقدمات کے مصارف پورے کرنے سے متعلق فتویٰ دیا۔ بعض فتاویٰ کا تعلق مسلمانوں کے اجتماعی معاملات سے متعلق تھا۔ مثلاً عیدگاہ یا جامع مسجد میں سائلین کے سوال کرنے اور ان کی امداد کرنے والوں سے متعلق شرعی احکام کا واضح کرنا ہے۔

غرضیکہ ''فتاویٰ دیداریہ'' کتب فتاویٰ میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ لیکن اس کی موجودہ افادیت کی صورت گری کا سہرا برادرم محترم علامہ مولانا مفتی محمد علیم الدین نقشبندی مجددی مدظلہ العالی کی گراں قدر' مشکل اور مسلسل مساعی جمیلہ کا مرہونِ منت ہے۔

مفتی محمد علیم الدین مجددی مدظلہ العالی نے فتاویٰ کے رجسٹر کو بنظرِ عمیق پڑھا۔ شکستہ خط اور بوسیدہ ہونے

کے باعث پڑھنے میں جو مشکل پیش آئی وہ صرف وہی جانتے ہیں دوسرا اس مشکل کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ ہاں وہ حضرات جو اس نوعیت کے مخطوطے مرتب کرتے ہیں وہ اس سے واقف ہیں۔

رجسٹر فتاویٰ پڑھ لینے کے بعد جو مراحل مفتی مراتب نے طے کیے ان کا مختصر تعارف (جو فقیر غفرلہ راقم السطور کی سمجھ میں آیا) یوں ہے۔

1۔ رجسٹر فتاویٰ اسی ترتیب سے ہے جس ترتیب زمانی سے مستفتی نے سوال کیا ظاہر ہے کوئی عبادات سے متعلق سوال کرتا ہے کوئی معاملات سے متعلق، کوئی مناکحات سے متعلق سوال کرتا ہے کوئی میراث کے بارے میں فتویٰ پوچھتا ہے۔ جس ترتیب زمانی سے جس نے جو سوال پوچھا اسی ترتیب سے جواب رجسٹر میں نقل کر دیا۔ یہ مجموعہ فقہی ابواب سے یکسر مختلف تھا۔ قاری کے لیے اس سے استفادہ بہت دشوار تھا۔ مرتب مفتی صاحب نے تمام فتاویٰ کو فقہی ابواب پر مرتب کر دیا ہے۔ اب اس سے قاری کے لیے استفادہ نہایت آسان ہے۔ وہ اپنی پسند کا باب کھول کر پڑھ سکتا ہے۔

2۔ مفتیانِ کرام نے فتویٰ کے دوران جن کتب کا حوالہ دیا ہے ان میں اکثر اوقات کتاب کا باب اور صفحہ درج نہیں اور نہ یہ درج ہے کہ متعلقہ کتاب کس مطبع کی ہے۔ مرتب موصوف نے حوالہ جات کی تخریج بڑی عرق ریزی سے کر دی ہے۔

3۔ عربی یا فارسی عبارات مندرجہ فتاویٰ، جن کا ترجمہ مفتیان کرام نے نہیں کیا مرتب موصوف نے ان کا سلیس اردو ترجمہ کر دیا ہے تاکہ قاری کے لیے آسانی پیدا ہو جائے۔

4۔ بعض مقامات پر عربی یا فارسی عبارت کا ترجمہ مفتیان کرام نے کیا ہے مگر وہ درست نہیں۔ مرتب موصوف نے اس ترجمہ کی تصحیح حاشیہ میں کر دی ہے۔

5۔ بعض مقامات پر مفتیانِ کرام نے جس کتاب کا حوالہ درج کیا ہے اصل کتاب میں وہ حوالہ ان الفاظ سے نہیں۔ مرتب موصوف نے حاشیہ میں کتاب متعلقہ کے اصل الفاظ نقل کر دیے ہیں۔

6۔ بعض اوقات مفتیانِ کرام نے جو عبارت کسی کتاب سے بطور حوالہ نقل کی وہ عبارت اس کتاب کی نہیں

بلکہ کسی اور کتاب کی ہے۔ مرتب موصوف نے اصل کتاب کی نشان وہی فرمادی ہے۔

7۔ مرتب موصوف، جو بذاتِ خود مفتی ہیں، نے جہاں کہیں فتویٰ جمہور فقہائے امت کے خلاف ملاحظہ کیا اس کی تصحیح حاشیہ میں کر دی ہے۔

اس نوعیت کی کثیر مساعی ہیں جن کا حوالہ اصل مرتبہ "فتاویٰ دیداریہ" ہیں جا بجا ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

8۔ اصل مجموعہ فتاویٰ میں بوجہ بوسیدگی یا شکستگی جو کلمات پڑھے نہ جاسکے مرتب موصوف نے انہیں اندازہ سے درج کیا ہے مگر حاشیہ میں صاف وضاحت کر دی ہے کہ یہ کلمہ اندازاً سیاق وسباق کے پیش نظر لکھا گیا ہے۔

9۔ مفتیانِ کرام نے بعض اوقات کسی عبارت کے لیے ایک حوالہ درج کیا ہے۔ مرتب موصوف نے وہی عبارت دیگر کتب میں موجود ہونے کی نشان دہی کر دی ہے۔

10۔ ایک اہم کام مجموعہ فتاویٰ کی تفصیلی فہرست درکار تھی جو مرتب موصوف نے نہایت عرق ریزی سے فقہی ابواب پر مرتب فرمادی ہے۔ فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ فلاں مسئلہ یا فتویٰ کہاں اور کس صفحہ پر ہے۔

یہ تمام کوششیں قاری کی سہولت کے لیے کی گئی ہیں اور ساتھ یہ بھی مقصد ہے کہ مفتیانِ کرام کا وہ مجموعہ از سرِ نو زندہ ہوسکے۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء آخر میں یہ فقیر ناتواں مرتب موصوف مولانا مفتی محمد علیم الدین نقشبندی مجددی کی بے مثال کوششوں کو بنظر تحسین دیکھتے ہوئے انہیں اس فتاویٰ کی ترتیب پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔ مولیٰ تعالیٰ اپنے حبیب کریم ﷺ کے طفیل ان کی مساعی مقبول فرمائے اور یہ فتاویٰ امتِ مسلمہ کے لیے مفید فرمائے۔ آمین بجاہ طٰہٰ و یٰس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وصحبہ وبارک وسلم وکرم وشرف۔

فقیر قادری محمد جلال الدین عفی عنہ

۸/ ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ

17/ مئی 2005ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظِ جلیل

از

استاذ الاساتذہ حضرت علّامہ محمد عبدالحکیم شرف قادری مدظلہ العالی

محدثِ الوری حضرت مولانا ابو محمد سید محمد دیدار علی شاہ رحمہ اللہ تعالیٰ ابن سید نجف علی ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۶ء الور (انڈیا) میں پیدا ہوئے' ابتدائی تعلیم الور ہی میں حاصل کی' مزید تعلیم کے لیے دہلی جا کر مولانا کرامت اللہ خان سے درسِ نظامی کی اکثر و بیشتر کتابیں پڑھیں' اس کے بعد سہارنپور جا کر بخاری شریف کے محشی مولانا احمد علی سہارنپوری سے حدیث شریف پڑھی شیخ المحدثین مولانا وصی احمد محدث سورتی اور مقتدائے علماء واصفیاء پیر مہر علی شاہ گولڑوی آپ کے رفقاء میں سے تھے۔ فراغت کے بعد معقولات کی مزید تعلیم کے لیے رامپور جا کر مولانا ارشاد حسین رامپوری اور مولانا عبدالعلی رامپوری سے استفادہ کیا۔

دو سال تک حضرت سائیں توکل شاہ انبالوی قدس سرہ کی خدمت میں رہ کر ان کی خلافت سے مستفید ہوئے پھر ان کے ارشاد کے مطابق حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی شاگرد حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے دستِ اقدس پر سلسلہ نقشبندیہ اور قادریہ میں بیعت ہوئے اور حضرت کے صاحبزادے مولانا شمس الدین احمد میاں رحمہ اللہ تعالیٰ کی معیت میں کچھ حصہ بخاری شریف' مؤطا امام مالک اور کچھ شرح وقایہ سنا کر اجازت حاصل کی۔

اس کے علاوہ انہیں امام احمد رضا بریلوی سے بھی اجازت وخلافت حاصل تھی' جس کا کچھ حصہ راقم کو حضرت مفتیٔ اعظم پاکستان علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری سے حاصل ہوا تھا جسے راقم نے اپنی تصنیف ''تذکرہ اکابرِ اہلِ سنت'' میں شائع کر دیا تھا' وہاں سے لے کر اس مضمون کے آخر میں اس کا عکس شائع کیا جا رہا ہے۔

فراغت کے بعد کچھ عرصہ 1901ء سے 1905ء تک مدرسہ ''ارشاد العلوم'' رامپور میں فرائضِ تدریس انجام دیتے رہے' اس کے بعد دو سال بمبئی چلے گئے' پھر اپنے وطن الور تشریف لائے اور وہاں ''قوت الاسلام'' کے نام سے ایک دار العلوم قائم کیا۔ کچھ عرصہ بعد لاہور تشریف لاکر جامعہ نعمانیہ میں فرائض تدریس انجام دیتے رہے ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء میں مولانا ارشاد حسین رامپوری کے ایماء پر اکبر آباد (آگرہ) تشریف لے گئے اور شاہی مسجد کے خطیب اور مفتی کی حیثیت سے دینی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے' سید محمد اعظم شاہ کے بعد آپ وہاں کے مفتی مقرر ہوئے۔ سید محمد اعظم شاہ صاحب کے آخری فتویٰ پر یکم جولائی ۱۹۱۶ء/ ۳۰ شعبان ۱۳۳۴ھ درج ہے اور حضرت سید صاحب کے پہلے فتویٰ پر ۳ رمضان ۱۳۳۴ھ اس کے بعد کے کسی فتویٰ پر سید محمد اعظم شاہ کے دستخط نہیں ہیں۔ ادھر لاہور کے اہلِ علم و درد آپ کو لاہور بلانے کے لیے مسلسل کوشاں تھے' چنانچہ 1922ء میں آپ دوبارہ لاہور تشریف لے آئے اور جامع مسجد وزیر خاں میں خطابت' درس و تدریس اور افتاء کے فرائض انجام دیتے رہے۔

۱۹۲۴ء ''مرکزی انجمن حزب الاحناف'' قائم کی اسی انجمن کے تحت بعد میں دار العلوم قائم کیا جہاں سے بڑی تعداد میں علماء' خطباء اور مدرسین تیار ہوئے۔ بعد میں دار العلوم حزب الاحناف گنج بخش روڈ پر منتقل ہو گیا' آج کل آپ کے پر پوتے سید نثار اشرف صاحب دہلی دروازہ کے اندر چنگڑ محلہ میں واقع قدیم حزب الاحناف کو دوبارہ آباد کیے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ کی مزید توفیق و ہمت عطا فرمائے۔

غازی کشمیر مولانا علامہ ابوالحسنات سید محمد قادری اور مفتیٔ اعظم پاکستان علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری رحمہما اللہ تعالیٰ آپ کے دونوں صاحبزادوں کے اہل سنت و جماعت پر بڑے احسانات ہیں' شارحِ بخاری علامہ سید محمود احمد رضوی آپ کے پوتے اکابر علماء اہل سنت و جماعت میں سے ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کے صاحبزادے مولانا سید مصطفیٰ اشرف رضوی ان کے جانشین ہیں۔

4 جولائی 1986ء کو مرکزی مجلس رضا لاہور کے بانی اور صدر حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ ایک دفعہ حکیم عبدالمجید عتیقی صدر خلافت کمیٹی لاہور نے بیان کیا کہ ترکی کی مشہور ادیبہ خالدہ ادیب

خانم لاہور آئی تو طے ہوا کہ جمعہ کے بعد مسجد وزیر خاں میں جلسہ کیا جائے' جمعہ سے پہلے مولانا سید دیدار علی شاہ نے تقریر کی' ان کی تقریر میں ترکی کا نام سن کر خالدہ ادیب خانم نے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ اسے بتایا کہ تمہاری اور مصطفیٰ کمال پاشا کی پارٹی پر تنقید کر رہے ہیں' جمعہ کے بعد اس نے فارسی میں تقریر کی' اس کے بعد مولانا نے ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کی' واپسی پر خالدہ نے کہا:

''یہ بہت بڑا عالم ہے''

حضرت مفتیِ اعظم پاکستان علامہ ابو البرکات سید احمد قادری نے تحریک خلافت اور تحریک ترکِ موالات کے دور کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا کہ ایک دفعہ مولانا محمد علی جوہر' مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر کچلو وغیرہ نے مسجد وزیر خان میں جلسہ منعقد کرنے کا پروگرام بنایا' حضرت ابا جی (مولانا سید محمد دیدار علی شاہ رحمہ اللہ تعالیٰ) نے مجھے فرمایا کہ اخباری تراشوں والا فائل اٹھا کر لائیں' وہ لے کر آیا تو آپ نے زوردار خطاب کیا اور اس میں مولانا محمد علی جوہر اور دوسرے لیڈروں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ نے فلاں موقع پر یہ کہا کہ فلاں موقع پر یہ کہا' یہ اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے' آپ کے خطاب کے بعد مولانا محمد علی جوہر کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: اللہ کا شکر ہے کہ ایسے علمائے ربانی موجود ہیں جو ہماری غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہیں' یہ کہا اور اپنا خطاب ختم کر دیا۔

یہ بھی حضرت مفتیِ اعظم پاکستان ابو البرکات سید احمد قادری نے بیان کیا کہ ایک دفعہ علامہ اقبال الیکشن میں کھڑے ہوئے' اور حضرت ابا جی (مولانا محمد دیدار علی شاہ) سے ملاقات کے لیے آئے' علامہ حضرت کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھے ہوئے تھے' یوں تو یاد نہیں کہ حضرت ''ابا جی'' کس مسئلے پر گفتگو فرما رہے تھے' لیکن اتنا یاد ہے کہ وہ الٰہیات کے کسی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے اور علامہ کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا۔

مخالفین حضرت محدثِ الوری کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہوئے اس بات کو بہت اچھالتے ہیں کہ انہوں نے علامہ اقبال کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا تھا' جب کہ حقیقت اس سے مختلف تھی' اقبالیات کے ماہر جناب سید نور محمد قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ حضرت محدث الوری کی خدمت میں علامہ کے کچھ اشعار علامہ کا

نام لیے بغیر پیش کیے گئے جن میں آفتاب کو مخاطب کرتے ہوئے اس کے لیے صفاتِ الوہیت ثابت کی گئی تھیں ظاہر کو دیکھتے ہوئے حضرت محدث الوری نے فرمایا کہ یہ کفر ہے جب کہ واقعہ یہ تھا کہ علامہ نے اللہ تعالیٰ کو آفتاب کہہ کر مخاطب کیا تھا اس صورت میں یہ مسئلہ اگرچہ غور طلب ہوگا کہ اللہ کو آفتاب کہنا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نام توقیفی ہیں اس ذات اقدس کے لیے وہی نام استعمال کیے جائیں گے جو قرآن وحدیث میں آئے ہیں تاہم ان اشعار کی بنا پر حکمِ کفر عائد نہیں ہوگا۔

فتاویٰ دیداریہ آگرہ

کچھ عرصہ پہلے دار العلوم حزب الاحناف کے مفتی مولانا مفتی غلام حسن قادری امام وخطیب جامع مسجد مولانا روجی اندرون بھاٹی دروازہ لاہور کے پاس مجھے ایک رجسٹر ملا جس میں مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت علامہ ابو البرکات سید احمد قادری امام المحدثین مولانا سید محمد دیدار علی شاہ نقشبندی قادری محدث الوری مولانا مفتی محمد رمضان اور مولانا مفتی سید محمد اعظم شاہ (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے قلمی فتاویٰ تھے رجسٹر کے کاغذات بوسیدہ اور سیاہ ہو چکے تھے۔ ان میں سے مفتی اعظم پاکستان علامہ ابو البرکات سید احمد قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کے فتاویٰ تو دورِ حاضر کے ولی کامل منقطع عن العلائق بے نیاز از خلائق اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت واطاعت میں منہمک شیخ المشائخ حضرت خواجہ قاضی محمد صادق نقشبندی مجددی دامت برکاتہم العالیہ کے پوتے جناب صاحبزادہ محمد عبد السلام حفظہ القدوس السلام نے مرتب کر کے مکتبہ "منار الہدیٰ" کی طرف سے 363 صفحات میں شائع کر دیئے جزاہ اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔

آج سے چند دن پہلے صاحبزادہ صاحب کے استاذ حضرت مولانا محمد جلال الدین قادری مدظلہ العالی (کھاریاں) کے برادرِ اصغر اور شاگردِ خاص مولانا مفتی محمد علیم الدین نقشبندی مجددی مدظلہ العالی مدرس دار العلوم سلطانیہ نزد کالا دیو جہلم نے 642 صفحات پر مشتمل مسودہ بھجوایا جو کمپوز شدہ فتاویٰ کی فوٹو سٹیٹ کاپی کی صورت میں تھا۔

اس مسودے کو دیکھ کر خوشی کے ساتھ ہی حیرت بھی ہوئی مفتی صاحب نے تھوڑے سے عرصے میں نہ

صرف بوسیدہ اور سیاہ اوراق سے ان فتاویٰ کو پڑھا' نقل کیا' بلکہ حاشیہ میں حوالوں کی تخریج بھی کی' یہ نتیجہ ہے اس خلوص کا جوان کے سینے میں دین اور علوم دینیہ کے لیے موج زن ہے' بعض مقامات پر انہوں نے اختلافی نوٹ بھی لکھے ہیں اور یہ اہلِ علم کا حق ہے' بعد میں دیکھنے والے علماء فیصلہ کریں گے کہ ان میں سے درست کیا ہے؟

اس مجموعے میں زیادہ حضرت امام المحدثین سید محمد دیدار علی شاہ محدث الوری کے فتاویٰ ہیں یاد رہے کہ بقول مولانا محمد علیم الدین صاحب یہ ان کے تین سال ایک ماہ اور چند روز کے فتاویٰ ہیں' اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ساٹھ سال کے عرصے میں کتنے فتوے دیئے ہوں گے۔ کچھ فتاویٰ مولانا مفتی محمد رمضان اور حضرت مولانا سید محمد اعظم شاہ (رحمہما اللہ تعالیٰ) کے بھی ہیں افسوس کہ ان کے بارے میں تا حال راقم کو سوائے ان کے نام کے کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔

کچھ مرتب اور محقق کے بارے میں

گزشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت علامہ مولانا مفتی محمد علیم الدین نقشبندی مجددی مدظلہ العالی اپنے بڑے بھائی اور کتب کثیرہ کے مصنف حضرت مولانا علامہ محمد جلال الدین قادری مدظلہ العالی (کھاریاں) کے شاگردِ خاص ہیں' وہ طویل عرصے سے دارالعلوم سلطانیہ' نزد کالا دیو' جہلم میں فرائض تدریس انجام دے رہے ہیں' بلا شبہ یادگار اسلاف ہیں۔

تدریس' تحقیق اور تصنیف سے انہیں شغف ہے' سنا ہے کہ چپکے چپکے امام علامہ یوسف صالحی شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی سیرت طیبہ کے موضوع پر شہرۂ آفاق تصنیف ''سبل الھدیٰ والرشاد'' کا اردو ترجمہ کر رہے ہیں' ان کی منظر عام پر آنے والی چند تصانیف کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) سیرت سید الانبیاء علیہ وسلم۔

یہ حضرت مولانا علامہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی نہایت اہم تصنیف ''بذل القوۃ فی حوادث سنی النبوۃ'' کا ترجمہ ہے اور اس کے صفحات 610 ہیں۔

(۲) احکامِ طہارت۔ 230 صفحات پر مشتمل یہ کتاب طہارت (وضو' غسل اور تیمم) کے ضروری احکام پر

مشتمل ہے۔

(۳) دلیل زائر حرمین شریفین

498 صفحات پر مشتمل یہ کتاب حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ''المسلک المتقسط فی المنسک المتوسط'' سے ماخوذ اور حج وعمرہ کے مسائل کے ساتھ مدینہ طیبہ کی حاضری کے آداب پر بھی مشتمل ہے۔

(۴) النبی الأطہر

(۵) تذکرہ قاضی فتح اللہ قادری شطاری رحمۃ اللہ علیہ

(۶) تعلیم وتعلّم

(۷) شرح مسلّم الثبوت

(۸) ترجمہ خزائن فتحیۃ الاسرار

(۹) شرح سبع معلقات

(۱۰) ترجمہ قرآن کریم

اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے حضرت علامہ کو صحت وتندرسی کے ساتھ عمر دراز عطا فرمائے اور ان کا علمی وروحانی فیض دور دراز تک پہنچائے۔

۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ
28 جون 2005ء

محمد عبدالحکیم شرف قادری
بانی مکتبہ قادریہ لاہور

بسم الله الرحمن الرحیم

لمھد الیك آسناد الحمد و نهایة سلاسل الثناء صل علی حبلك الموصول المتصل الغیر
مع مرسلك المرفوع بوصلك فوق کل مرتفع وعلی اله وصحبه خیر ال وصحب روٰاة
وحملة بنه طرق الوصول الی ساحته الرحب وبعد فسلام علیکما ورحمة الله وبرکاته
سید الفاضل والجید الفاصل ذا الفخر السمی والقدر العلی مولینا المولوی
ابا محمد دیدار علی العلوی الحیدری الرضوی الالوری مفتی اکبر اباد
مل الفساد وایده بالسداد والرشاد ونجله الاسعد الارشد الامجد الاحمد

الف وثلثمائة وسبع وثلثین من هجرة سید الانام علیه وعلی اله وصحبه وابنه وحزبه افضل الصلاة والسلام
قاله بفمه ورقمه بقلمه عبد المصطفی احمد رضا المحمدی السنی الحنفی القادری
البرکاتی غفر الله لہ ما مضی من سیاته وما یاتی امین والحمد لله رب العلمین
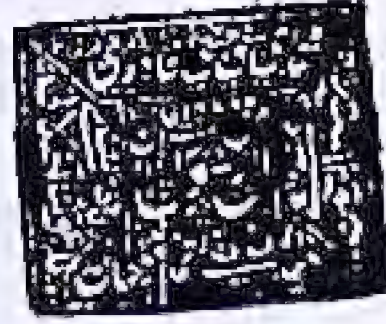
امام احمد رضا خان محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی سند کا عکس
جو آپ نے
حضرت مولانا سید دیدار علی شاہ الوری رحمۃ اللہ علیہ
اور حضرت ابوالبرکات سید احمد رحمۃ اللہ علیہ
کو عطاء فرمائی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقدیم

از

استاذ الاساتذہ علامہ حافظ خادم حسین رضوی نقشبندی مجددی مدظلہ العالی

مدرس جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور

الحمد للہ موفق المتقین لشکر النعمة ‘والصلوة والسلام علی من أرسلہ اللہ للعالمین رحمة وعلی آلہ وأصحابہ الھداة’ وعلی سائر من اقتفی أثرہ واھتدی بھداہ.

أما بعد!

اللہ تبارک وتعالیٰ نے سلسلہء انبیاء ورسل امام الأنبیاء حضور پرنور ﷺ کی ذاتِ اقدس پر مکمل کرتے ہوئے اعلان فرمایا:

ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین (الأحزاب:۴۰)

حضور نبی کریم ﷺ نہ صرف آخری نبی ہیں بلکہ آپ ﷺ پر نازل شدہ کتاب آخری الہامی کتاب‘ آپ ﷺ کی امت آخری امت اور آپ ﷺ کا دین (اسلام) آخری اور کامل واکمل دین ہے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی پسندیدگی اور جامعیت کی سندیوں عطا فرمائی۔

الیوم أکملت لکم دینکم وأتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الإسلام دینا (المائدہ:۳)

ترجمہ: آج میں نے کامل کردیا تمہارے لیے تمہارا دین اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور تمہارے لیے اسلام کو دین پسند کیا۔

إن الدین عند اللہ الإسلام (آل عمران:۱۹)

ترجمہ: بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

ان آیات میں اسلام کو کامل دین قرار دیا گیا ہے جس سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ دین اسلام میں انسان کی جملہ ضروریات ومشکلات کا حل موجود ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ نعمت ''کامل'' ہونے کے درجہ کو نہ پہنچتی۔ اسلام کا نظامِ حیات آخری وابدی ہے اسی میں ہماری تمام ضروریات کا حل پنہاں ہے۔

نبی کریم ﷺ کے دورِ مقدس میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی تمام دینی ودنیاوی مشکلات کے حل کے لیے حضور ﷺ کی جانب رجوع فرماتے۔ آپ ﷺ ان کے تمام سوالات کے جوابات عطا فرماتے اور یوں امت محمدیہ میں شرعی ضروریات کے حل کے لیے سوال وجواب کی روایت قائم ہوئی جسے استفتاء اور فتویٰ کا نام دیا گیا۔

لفظ فتویٰ کی لغوی واصطلاحی تحقیق

لفظ فتویٰ فا پر فتحہ (زبر) کے ساتھ (فَتْوٰی) بھی منقول ہے اور ضمہ (پیش) کے ساتھ (فُتْوٰی) بھی۔ اس کا مادہ فتو یا فتی ہے بمعنی قوت وطاقت۔ طاقتور جوان کو بھی فَتیٰ کہتے ہیں لیکن یہاں مراد ''مدلل ومضبوط شرعی حکم'' ہے۔ بعض نے اس کا معنیٰ مطلق ''جواب دینا'' بھی کیا ہے اس میں شرعی وغیر شرعی کی کوئی قید نہیں۔

علامہ میر سید شریف جرجانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

الإفتاء بیان حکم المسئلة (التعریفات : ص: ۲۶)

ترجمہ: حکمِ مسئلہ بیان کرنے کو افتاء کہتے ہیں۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

الإفتاء فإنه إفادة الحکم الشرعی (رد المختار: ج ۴)

ترجمہ: شرعی فیصلے سے آگاہ کرنے کو افتاء کہتے ہیں۔

فتویٰ کے اصطلاحی معنی کو اعلیٰ حضرت عظیم المرتبت رحمۃ اللہ علیہ نے یوں بیان فرمایا ہے:۔

إنما الإفتاء أن تعتمد علی شیء وتبین لسائلک ان هذا حکم شرعی

(فتاویٰ رضویہ: ج ۱)

ترجمہ: افتاء کا مفہوم یہ ہے کہ تو (کتاب وسنت، اجماع وقیاس اور کتب فقہ میں سے) کسی چیز پر اعتماد کر کے سوال پوچھنے والے کو بتائے کہ یہ شریعت مطہرہ کا حکم ہے۔

المصباح ص ۱۶ پر مذکور ہے کہ:

الإخبار بحكم الله تعالىٰ عن مسئلة دينية بمقتضى الأدلة الشرعية لمن سأل عنه فى أمر نازل على جهة العموم والشمول لا على وجه الإلزام

ترجمہ: کسی پیش آمدہ صورت میں، ادلہ شرعیہ کے تقاضے کے مطابق سائل کو دینی سوال کے بارے میں عموم وشمول کے طور پر نہ کہ لازم کرنے کے انداز پر اللہ تعالیٰ کا حکم بتانے کو افتاء کہتے ہیں۔

افتاء کی اہمیت

افتاء کی اہمیت اس سے واضح ہے کہ یہ سنتِ الٰہیہ ہے اللہ رب العزت کا فرمان ہے:

ويستفتونک فى النساء قل الله يفتيكم فيهن (النساء: ۱۲۷)

ترجمہ: اور فتویٰ پوچھتے ہیں آپ سے عورتوں کے بارے میں آپ فرمایئے اللہ تعالیٰ فتویٰ دیتا ہے تمہیں ان کے بارے میں۔

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

يستفتونک قل الله يفتيكم فى الكلالة (النساء: ۱۷۶)

ترجمہ: اے محبوب آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ اللہ تمہیں کلالہ میں فتویٰ دیتا ہے۔

ان آیات میں افتاء کی نسبت تو اللہ تعالیٰ کی جانب ہے مگر اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ ''مفتی'' کا استعمال قطعاً درست نہیں کیونکہ اس سے بہت سی خرابیاں لازم آئیں گی۔ بہرکیف ان آیات بینات کے تحت فتویٰ کی اہمیت سے کوئی ذی شعور انکار نہیں کرسکتا۔

فتویٰ دورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں

ہادی عالم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی کے ذریعے فتویٰ دیا کرتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مقدس جماعت

فسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون (النحل:۴۳)

ترجمہ: پس اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے سوال کرو

کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فتویٰ طلب کیا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو عبادات‘ معاملات‘ اخلاقیات‘ آداب اور معاشرت وغیرہ میں شرعی احکام بیان فرماتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فتاویٰ کی حیثیت اسی قدر اعلیٰ وارفع ہے جس قدر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس اعلیٰ وارفع ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:۔

ما آتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا (الحشر: ۷)

ترجمہ: رسول تم کو جو کچھ دیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس چیز سے تمہیں روکیں رُک جایا کرو۔

فتویٰ دورِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم میں

سید عالم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری طور پر دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم منصبِ افتاء پر فائز ہوئے۔ ان میں حضرت عمر بن الخطاب‘ حضرت علی بن ابی طالب‘ حضرت عبداللہ بن مسعود‘ حضرت زید بن ثابت‘ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کے ساتھ ساتھ حضرت سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سرفہرست ہیں جبکہ تقریباً ایک سو بیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے علاوہ ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک طبقہ حضرت ابوہریرہ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما کی قیادت میں ہمہ وقت حفظِ حدیث اور اس کی روایت میں مصروف رہتا جب کہ درج بالا دوسرا طبقہ نصوص میں تدبر اور غور وفکر کر کے احکام کو اخذ کرتا تھا۔ ان کے پیش نظر قرآنِ کریم‘ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال‘ اعمال اور تقریرات ہوتے تھے۔

مسائل کو اجتہاد کے ذریعے اخذ کرنے کا ثبوت قرآن کریم میں موجود ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

لعلمه الذین یستنبطونه منهم (النساء: ۸۳)

ترجمہ: تو ضرور ان سے اس کی حقیقت جان لیتے (یہ جو بعد میں کوشش کرتے ہیں)

کتب احادیث میں حضرت معاذ بن رضی اللہ عنہ سے مروی وہ حدیث اس بارے میں ٹھوس دلیل ہے جب آپ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا جانے لگا اس موقع پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

تمہارے پاس اگر کوئی جھگڑا آئے تو فیصلہ کیسے کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا کہ اللہ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر تم اللہ کی کتاب میں نہ پاؤ؟ عرض کی رسول اللہ ﷺ کی سنت سے فیصلہ کروں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا سنت میں بھی نہ پایا تو؟ عرض کی بغیر کسی کوتاہی کے پوری کوشش و محنت کے ذریعے اپنی رائے سے معلوم کروں گا۔ پس نبی پاک ﷺ نے ان کے سینے پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے فرمایا: اللہ کا شکر ہے جس نے رسول اللہ کے قاصد کو رسول اللہ کے پسندیدہ عمل کی توفیق دی۔

(ترمذی شریف' ابوداؤد شریف)

فتویٰ بعد از دورِ صحابہ

جب اسلام پھیلتا ہوا بغداد' مصر' روم' بلخ' بخارا' سمرقند' اصبہان' شیراز' آذربائیجان' جرجان' زنجان' طوس' بسطام' استرآباد' خوارزم' مرغینان' دامغان' کرمان' ہند اور یمن وغیرہ تک پہنچا تو مسلمانوں میں آئے روز نت نئے مسائل نے جنم لینا شروع کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جانشین حضرات تابعین رحمۃ اللہ علیہم نے ان مسائل کو حل کرنے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ ان میں سرفہرست حضرت علقمہ بن قیس' حضرت ابراہیم نخعی' حضرت حماد بن مسلم' حضرت نعمان بن ثابت' حضرت سعید بن المسیب اور حضرت عطا بن ابی رباح ہیں۔

فقہ (شرعی احکام) کی ابتداء تو حضور ﷺ کے دورِ اقدس سے ہو چکی تھی اب ضرورت اس امر کی تھی کہ اس کی باقاعدہ تدوین کی جائے۔ چنانچہ اس ضرورت کو امام ابوحنیفہ حضرت نعمان بن ثابت نے پورا کیا اور فقہ کی تدوین شروع کی۔ تدوین کا مطلب یہ تھا کہ کسی بھی مسئلہ سے متعلق آیات و احادیث اور اقوال صحابہ پیش

کیے جاتے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اس میں متعدد احتمالات بیان فرماتے اور ان کی تائید میں نصوص وعبارات پیش کرتے۔ تمام اصحاب (اپنے زمانے کے ہرفن کے ماہر ترین تقریباً چالیس افراد) ان احتمالات کی تنقیح و توضیح فرماتے' جب کسی ایک احتمال پر اتفاق ہو جاتا تو جچے تلے الفاظ میں لکھ لیا جاتا اور بعض اوقات متفق نہ ہونے کی صورت میں وہ احتمال اسی شخصیت کی طرف منسوب کر کے لکھ لیا جاتا۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی اس علمی مجلس کا مرتب کردہ مجموعہ نہایت ضخیم تھا بعض حضرات نے اس میں درج مسائل چھ (۶) لاکھ اور بعض حضرات نے بارہ (۱۲) لاکھ بھی بیان کیا ہے۔ محتاط اندازے کے مطابق ان احتمالات کی تعداد ساٹھ (۶۰) ہزار سے زائد تھی۔

الفقه زرعه عبد الله بن مسعود وسقاه علقمة
وحصده ابراهيم النخعي و داسه حماد
وطحنه أبو حنيفة و عجنه أبو يوسف
وخبزه محمد فسائر الناس ياكلون من خبزه

(درمختار)

ترجمہ: فقہ کا کھیت حضرت عبداللہ بن مسعود نے بویا' حضرت علقمہ بن قیس نے سینچا' حضرت ابراہیم نخعی نے اس کو کاٹا' حضرت حماد بن مسلم نے مانڈا' امام اعظم نے پیسا' حضرت ابو یوسف نے گوندھا اور حضرت محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہم نے روٹیاں پکائیں اور باقی سب اس کے کھانے والے ہیں۔

یعنی اجتہاد واستنباط کا سلسلہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے شروع ہوا' علقمہ نے تقویت پہنچائی' ابراہیم نے اس کے فوائدِ متفرقہ کو جمع کیا' حماد نے فروع کو زیادہ کیا' امام اعظم نے اس کو درجہ کمال تک پہنچایا اور تدوینِ فقہ کی مہم سر کی' آپ ہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے امام مالک' امام شافعی' امام احمد بن حنبل' امام ابو یوسف' امام محمد اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہم نے اصول مرتب کیے۔

ان حضرات نے قرآنِ کریم اور احادیثِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ وہ تمام علوم جو اس دین کی تفہیم

وتفسیر کے لیے ضروری تھے نہ صرف ایجاد کیے بلکہ ان تمام علوم ومعارف میں مختلف افراد نے مہارتِ تامہ حاصل کر کے ان علوم کے قواعد وضوابط تک مرتب کیے اور نسل در نسل ان علوم کے ماہرین کی تیاری کا ایک متواتر سلسلہ قائم فرمایا۔ الحمدللہ یہی سلسلہ آج اس دور میں بھی قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔

فتویٰ برصغیر پاک وہند میں

خلفائے عباسیہ کے دور سے لے کر گذشتہ صدی کے اوائل تک اکثر وبیشتر اسلامی ممالک میں فقہ حنفی قانونی شکل میں رائج تھی۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد فتویٰ نویسی یا افتاء کا کام مدارسِ دینیہ کی جانب منتقل ہو گیا ہے۔ اس وقت سے لے کر اب تک مدارسِ دینیہ بحسن وخوبی یہ خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اسلام کے تحفظ اور افتاء کے کام کو علمائے حق نے سنبھالا' ان میں سرفہرست حضرت مولانا شاہ فضل حق خیرآبادی' حضرت مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی' حضرت مولانا کفایت علی کافی' حضرت مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی' حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی' حضرت مولانا ارشاد حسین رامپوری' حضرت مولانا مفتی نقی علی خان' حضرت مولانا مفتی تقی علی خان' حضرت مولانا مفتی عبدالعلی رامپوری۔ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی' تاجدار گولڑہ حضرت پیر سید مہر علی شاہ' مفتی امیر علی خان' مفتی سید دیدار علی شاہ' مفتی غلام جان ہزاروی' مفتی عطا محمد رتوی' مفتی عبدالحفیظ حقانی' مفتی احمد یار خان نعیمی' مفتی محمد عمر نعیمی' مفتی سید مسعود علی قادری' مفتی امین الدین بدایونی' مفتی اعجاز ولی خان اور مفتی ابوالبرکات سید احمد اور مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی وغیرہ ہیں۔

کتب فتاویٰ کی تاریخ

بعض فقہائے امت نے کتب فقہ مرتب کیں تو بعض نے کتب فتاویٰ کو مرتب کیا۔ خالص فتاویٰ کے تحریری مواد کی تاریخ بھی عہد صحابہ رضی اللہ عنہم سے شروع ہوتی ہے۔ ابوالحسن بصری نے اپنی کتاب "المعتمد فی اصول الفقہ" میں لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ کا مجموعہ بھی کتابی صورت میں پانچویں ہجری تک پایا جاتا تھا۔

کتبِ فقہ کی تاریخ عہدِ صحابہ وتابعین سے شروع ہوکر آج کے اس دور تک پہنچتی ہے۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون اور اسماعیل پاشا بغدادی نے ہدایت العارفین میں بارہویں صدی ہجری سے قبل تک کتب فتاویٰ کا ذکر کیا ہے۔ بارہویں صدی ہجری سے قبل اور اس کے بعد کی کتب فتاویٰ درج ذیل ہیں:

فتاویٰ ابی بکر	فتاویٰ سراجیہ	فتاویٰ قاضی خان
فتاویٰ ظہیریہ	فتاویٰ طرطوسیہ	فتاویٰ بزازیہ
فتاویٰ تاتارخانیہ	فتاویٰ خیریہ	فتاویٰ عزیزیہ
فتاویٰ عالمگیری	فتاویٰ حمادیہ	فتاویٰ رضویہ
فتاویٰ نظامیہ	فتاویٰ مہریہ	فتاویٰ جماعتیہ
فتاویٰ نعیمیہ	فتاویٰ فقیہ ملت	فتاویٰ امجدیہ
فتاویٰ شریفیہ	فتاویٰ مصطفویہ	فتاویٰ فیض الرسول
فتاویٰ اجملیہ	فتاویٰ حامدیہ	فتاویٰ نوریہ
فتاویٰ مسعودی	فتاویٰ مظہریہ	فتاویٰ بریلی
فتاویٰ حزب الأحناف	فتاویٰ دیداریہ	

کچھ صاحبِ فتاویٰ کے بارے میں

آخر الذکر کتاب استاذ المحدثین حضرت علامہ مولانا مفتی سید محمد دیدار علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے دیئے گئے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ موصوف کے حالات زندگی کا احاطہ حضرت قبلہ صاحبزادہ قاضی محمد عبد السلام نقشبندی مجددی سلطانی تفصیلاً کریں گے۔ راقم بھی اس کارِ خیر میں حصہ ڈالنے کی غرض سے استاذ محترم حضرت علامہ محمد عبد الحکیم شرف قادری کی تحریر (موجود در تذکرہ اکابر اہلسنت) کا خلاصہ پیش کرتا ہے جو کہ یہاں نہایت موزوں ہے۔

استاذ العلماء والفقہاء حضرت مولانا سید محمد دیدار علی شاہ ابن سید نجف علی شاہ ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء بروز پیر بمقام الور محلہ نواب پورہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اساتذہ میں سلسلہ نقشبندیہ کے معروف

بزرگ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، محشی بخاری حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری، حضرت مولانا قمر الدین اور جامع العلوم حضرت مولانا ارشاد حسین رامپوری جب کہ ہم درس ساتھیوں میں سلسلہ چشتیہ کی معروف شخصیت تاجدارِ گولڑہ حضرت مولانا پیر مہر علی شاہ گولڑوی اور محدث سورتی حضرت مولانا وصی احمد رحمۃ اللہ علیہم ایسی شخصیات شامل تھیں۔

سلسلہ قادریہ میں آپ امام العاشقین اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت اور خلیفہ مجاز ہوئے۔ بعد میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلی نے آپ کو تمام کتب فقہ حنفی کی روایت کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔

لاہور میں آخری بار تشریف لانے سے پہلے آپ شاہی مسجد واقع آگرہ بھارت کے خطیب ومفتی مقرر ہوئے پھر پاکستان کے دل شہر لاہور میں تشریف لائے اور درس وتدریس کا آغاز فرمایا۔ اس دوران دہلی دروازہ کی قدیم ومعروف مسجد وزیر خان میں خطابت کی ذمہ داری آپ نے احسن انداز سے پوری کی۔ درس وتدریس سے دلی لگاؤ کے پیش نظر ۱۹۲۴ء میں آپ نے دار العلوم حزب الاحناف کی بنیاد رکھی اور دین متین کی خدمت کے لیے سینکڑوں علماء کی ایک جماعت تیار کی۔

آپ کی تصانیف کی تعداد دس سے زائد ہے جن میں تفسیر میزان الادیان، علامات وہابیہ، ہدایت الغوی در رد روافض، تحقیق المسائل اور پیش نظر فتاویٰ کا مجموعہ ''فتاویٰ دیداریہ'' سرفہرست ہیں۔

آپ کا وصال ۲۲ رجب المرجب ۱۳۵۴ھ بمطابق ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو ہوا۔

چند معروضات فتاویٰ دیداریہ کے بارے میں

یہ کتاب اہلسنت کے تین ممتاز مفتیانِ کرام کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ ان میں حضرت مولانا مفتی محمد رمضان، حضرت مولانا مفتی سید محمد اعظم شاہ اور حضرت مولانا مفتی سید محمد دیدار علی شاہ رحمۃ اللہ علیہم شامل ہیں۔ ہر سہ حضرات کے فتاویٰ اس دور کے ہیں جب وہ حضرات یکے بعد دیگرے اکبر بادشاہ کی تعمیر کردہ شاہی مسجد واقع آگرہ ہندوستان کے مفتی وخطیب کی حیثیت سے خدمتِ دین میں مصروف تھے۔

یہ کتاب تین سو چوالیس (۳۴۴) فتاویٰ پر مشتمل ہے۔ جن میں بارہ (۱۲) فتاویٰ حضرت مولانا مفتی محمد رمضان رحمۃ اللہ علیہ کے پچھتر (۷۵) فتاویٰ حضرت مولانا مفتی سید محمد اعظم شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے اور دو سو ستاون (۲۵۷) فتاویٰ اعلیٰ حضرت کے خلیفۂ اجل حضرت مولانا سید محمد دیدار علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے صادر ہوئے۔ امام الفقہاء والمحدثین حضرت مولانا سید محمد دیدار علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ کی تعداد دیگر دو مفتیان کرام کے مجموعی فتاویٰ سے زائد ہے لہذا اسی بناء پر فتاویٰ کے اس مجموعہ کا نام "فتاویٰ دیداریہ" رکھا گیا ہے۔

یہ کتاب صرف فتاویٰ کا مجموعہ نہیں بلکہ فقہی مسائل کا ایک عظیم ذخیرہ ہے اس مجموعہ میں مختلف موضوعات مثلاً عقائد، طہارت، نماز، زکوۃ، طلاق، وقف، سیر، حظر واباحت اور میراث وغیرہ کے متعلق انتہائی پر مغز اور تفصیلی معلومات جواب کی صورت میں موجود ہیں۔ حضرت سید المحدثین نے اپنے فتاویٰ میں بالکل وہی اسلوب اپنایا ہے جسے اعلیٰ حضرت عظیم المرتبت رحمۃ اللہ علیہ نے العطایا النبویہ فی الفتاویٰ الرضویہ میں اپنایا، ان شرعی معلومات سے نہ صرف علماء وخواص بلکہ عوام بھی یکساں مستفید ہو سکتے ہیں۔

اس مجموعہ میں حضرت سید المحدثین کے پہلے فتویٰ پر متعلق تاریخ ۳ رمضان ۱۳۳۴ھ/۱۲ اگست ۱۹۱۶ء رقم ہے جب کہ آپ ۲۶ ذوالحجہ ۱۳۳۷ھ/۲۲ دسمبر ۱۹۱۹ء تک شاہی مسجد آگرہ ہندوستان کے منصب افتاء پر فائز رہے۔ اس لحاظ سے آپ کا شاہی مسجد آگرہ میں منصب افتاء پر فائز رہنے کا کل دورانیہ تقریباً ۳ سال ۱ ماہ ۲۰ دن بنتا ہے۔ حضرت سید الفقہاء کے لازماً فتاویٰ کے کئی ایک مجموعے ہوں گے ان کو تلاش کر کے منظر عام پر لانا علمائے اہلِ سنت پر فرض ہے تا کہ ان کو زمانہ کی دست برد سے بچایا جاسکے۔ حزب الاحناف کا کتب خانہ ان کا مخزن ہوسکتا ہے۔ وہاں ان کی تلاش ضروری ہے۔

اس مجموعہ میں سب سے زیادہ فتاویٰ میراث کے باب میں ہیں اور سب سے طویل فتویٰ وقف کے باب میں موجود ہے، یہاں دلچسپ امر یہ ہے کہ اس کا سوال بھی تقریباً سب سے مختصر ہے۔

حضرت سید المحدثین نے بعض فتاویٰ میں اپنے نام کے ساتھ رضوی لکھا ہے۔ یہ نسبت امام موسیٰ رضا رحمۃ اللہ علیہ کی جانب ہے اعلیٰ حضرت عظیم المرتبت رحمۃ اللہ علیہ کی جانب نہیں چونکہ فتاویٰ کے اس مجموعہ کے

زمانہ میں آپ کو اعلیٰ حضرت سے خلافت اور سند حدیث نہیں ملی تھی۔

حضرت مولانا مفتی سید محمد اعظم شاہ نے بعض اوقات عربی عبارت نقل کرتے وقت یہ وضاحت نہیں کی وہ عبارت کس کتاب سے ماخوذ ہے؟ بعض جگہوں پر اصل عبارت اور درج شدہ عبارت میں فرق بھی ہے گویا حضرت والا نے بعض مقامات پر روایت بالمعنی سے بھی کام لیا ہے۔

فتاویٰ دیداریہ کی انفرادیت

فتاویٰ دیداریہ اکثر کتب فتاویٰ سے کئی جہتوں میں ممتاز ہے' ان میں سے چند خوبیاں درج ذیل ہیں۔

☆ حضرت امام الفقہاء المحدثین رحمۃ اللہ علیہ نے سائل کا شرعی حکم بیان کرتے وقت کثرت سے معتبر کتب سے حوالہ جات نقل کیے ہیں۔ اس بنا پر وہ فتویٰ جہاں عام افراد کو شرعی معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ بنے گا وہیں علماء کرام کے لیے معلومات کا ایک بیش بہا خزینہ ثابت ہوگا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حوالہ جات بیان فرمانے میں مفصل اسلوب اپنایا ہے اور صرف کتب کا نام بتانے پر ہی اکتفاء نہیں فرمایا بلکہ جلد نمبر' صفحہ نمبر اور مطبع کا ذکر بھی فرمایا ہے۔

☆ جواب دیتے وقت صرف ہاں یا نہ سے کام نہیں لیا گیا بلکہ جواب کے متعلقہ امور پر بھی انتہائی مفید بحث فرمائی ہے اس طرح جواب اور اس کے متعلقہ امور خوب نکھر کر واضح ہوتے ہیں اور ایک جواب کئی سوالات کا جواب بن جاتا ہے۔

☆ بعض مقامات پر شرعی حکم کی وضاحت کرتے ہوئے دیگر ائمہ کرام کے متعدد اقوال نقل فرمائے ہیں اور آخر میں مفتی بہ قول کو بھی ذکر فرمایا ہے۔

☆ پیشِ نظر فتاویٰ میں کئی مقامات پر فقہی قواعد کو بیان فرما کر مسائل کا استخراج کیا ہے اور تقریباً دس فقہی قواعد بھی درج فرمائے ہیں۔ ان فقہی قواعد کو مخدوم العلماء حضرت مولانا مفتی محمد علیم الدین نقشبندی دامت برکاتہم نے فہرستِ مضامین کے آخر میں یک جا محفوظ فرما دیا ہے۔

☆ متعدد نادرست فتاویٰ کی زبردست دلائل کے ساتھ اصلاح فرمائی' کہیں کسی مفتی کے مجمل فتویٰ کی

وضاحت فرما کر اس کے اجمال کو دُور فرمایا تو کہیں کسی مفتی صاحب کی نقل کردہ عبارت کے دوران فقہی کتاب کی مجمل عبارت سے اخذ کیے گئے غلط نتیجہ کی درستگی فرمائی آپ نے یہ درستگی اس شاندار انداز میں فرمائی کہ حکم شرعی نکھر کر واضح ہوگیا۔ اس کی واضح مثال فتویٰ ۴۸ (صفحہ ۷۰ تا ۷۴) میں موجود ہے۔

☆ حضرت سید صاحب نے اکابرین کے نقش قدم پر عمل کرتے ہوئے فتویٰ میں غلطی معلوم ہوجانے کی صورت میں بلاخوف وتامل رجوع الی الحق فرمایا۔ اس مجموعہ میں بھی آپ کا دو مقام پر پہلے دیئے گئے فتویٰ سے رجوع کا علم ہوتا ہے۔ پہلا مقام صدقہ فطر کی مقدار کے متعلق اور دوسرا مقام وراثت کے ایک مسئلہ کے متعلق ہے۔ ان کی تفصیل متعلقہ ابواب میں دیکھی جاسکتی ہے۔

کچھ مرتب فتاویٰ دیداریہ کے بارے میں

فتاویٰ کے اس عظیم مجموعہ کو منظر عام پر لانے کے سہرا استاذ العلماء عالم باعمل حضرت علامہ مولانا مفتی محمد علیم الدین نقشبندی متعنا اللہ بطول حیاتہ کے سر ہے۔ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم بہترین مدرس، میدانِ تحقیق کے شاہسوار اور انتہائی منجھے ہوئے مصنف ہیں۔ اللہ رب العزت نے آپ کے سینے میں دینِ متین کی خدمت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے مشاغل واوقات میں بیش بہا برکتیں عطا فرمائی ہیں، آپ کے کاموں کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ آپ ایک شخص نہیں بلکہ ایک ادارہ ہیں۔ اسلاف کی علمی میراث سے حد درجہ محبت فرماتے ہیں اور اس پر مکمل یقین رکھتے ہیں ''البرکۃ مع اکابرکم'' یہ محبت صرف دل ودماغ تک ہی محدود نہیں بلکہ قرطاس وقلم کے ذریعے اس کا اظہار بھی فرماتے ہیں۔

شاعر نے اکابر کی میراث کے متعلق مسلمانوں کو خوب جھنجوڑا ہے:

کبھی اے نوجوان مسلم! تدبر کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا جس کا تو ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاج سردارا

ہمارے اکابر کی ہزاروں قیمتی علمی تحقیقات تاہنوز اشاعت کی منتظر ہیں لیکن نہ تو کوئی ان پر کام کرنے والا ہے اور نہ ہی شائع کرنے والا۔ اکابرِ اہلِ سنت کا بیشتر علمی خزانہ یا تو قصہ ماضی بن گیا ہے یا پھر خوراکِ دیمک۔ ہماری سستی کی وجہ سے اغیار ہماری کتابوں سے مسلسل علمی تحقیقات چرا کر اپنی جانب منسوب کر رہے ہیں لیکن ہم خواب خرگوش میں مست ہیں۔

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمین پر آسمان نے ہم کو دے مارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ
باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابل میراث پدر کیونکر ہو
ہر کوئی مست مے ذوق تن آسانی ہے
تم مسلمان ہو ! یہ انداز مسلمانی ہے
حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے

اس وقت جو مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے یہ بھی ہماری ستم ظریفی کا شکار ہونے ہی والا تھا کہ اللہ رب العزت نے حضرت مولانا مفتی محمد علیم الدین نقشبندی کے دل میں اس مجموعہ کو منظر عام پر لانے کا جذبہ ودیعت فرمایا۔ اگرچہ یہ مجموعہ پون صدی سے زائد عرصہ کے بعد منظر عام پر آیا ہے لیکن اس کا مقدر یہی وقت تھا کل امو مرھون باوقاتھا۔ حضرت مفتی صاحب نے یہ مجموعہ حضرت صاجزادہ قاضی محمد عبد السلام نقشبندی صدیقی سے اور انہوں نے محقق العصر حضرت علامہ محمد عبد الحکیم شرف قادری کی وساطت سے حضرت مولانا محمد جلال الدین قادری (کھاریاں) سے حاصل کیا۔ حضرت مولانا محمد عبد الحکیم شرف قادری نے ہی حضرت مولانا مفتی محمد

جلال الدین کو یہ مجموعہ مرتب کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ بہر کیف اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت حضرت مفتی محمد علیم الدین صاحب کے نصیب میں لکھی۔ مفتی صاحب نے اپنی بے پناہ علمی وذاتی مصروفیات کو پسِ پشت ڈال کر اہلِ سنت کا یہ عظیم ذخیرہ ضائع ہونے سے محفوظ فرمایا۔ شروع میں مفتی صاحب کا ارادہ صرف حضرت سید محمد دیدار علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ کو مرتب کرنے کا تھا لیکن اس سے دیگر دو مفتیان کرام کے فتاویٰ پس منظر میں جانے کا اندیشہ تھا لہذا حضرت مفتی صاحب نے ان فتاویٰ کو بھی شامل کرلیا تاکہ یہ کہیں قصہء ماضی نہ بن جائیں۔

فتاویٰ کا یہ مجموعہ ترتیب پانے سے قبل نہ صرف انتہائی شکستہ تحریرات پر مشتمل تھا بلکہ کئی ہاتھوں کا لکھا ہوا تھا۔ ان تحریرات کو پڑھنا انتہائی دشوار تھا لیکن مفتی صاحب نے اس کام کو مکمل کرنے کا مضبوط ارادہ کررکھا تھا اللہ تعالیٰ نے آپ کی غیبی مدد فرمائی اور تمام مشکلات کو آسانی میں تبدیل فرماتے ہوئے آپ سے یہ عظیم کام لے لیا۔ اس کام کو دیکھ کر اس بات کا بحسن وخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مفتی صاحب پر اللہ تعالیٰ کا کس قدر فضل واحسان اور نبی کریم ﷺ وبزرگانِ دین رحمۃ اللہ علیہم کی کس قدر توجہاتِ کریمانہ ہیں۔

قبلہ مفتی صاحب کے گرانقدر علمی شہ پارے درج ذیل ہیں۔

۱. النبی الأطہر سیرت خیر البشر

تلقیح فهوم أهل الأثر فی عیون التاریخ والسیر مصنف: علامہ محمد عبدالرحمٰن ابن جوزی (۵۹۷-۵۱۰)

علامہ جوزی کی کتاب ۷۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اس میں علامہ نے ابتدائے آفرینش سے اپنے عہد تک کی عظیم شخصیات کا انتہائی دلکش تذکرہ فرمایا ہے۔ کتاب کا ایک اہم جزو حضور خاتم النبیین ﷺ کے بارے میں جس کا ترجمہ علامہ مفتی صاحب نے ۱۸۲ صفحات میں کیا ہے۔

۲. بذل القوة فی حوادث سنی النبوة مصنف: علامہ مخدوم محمد ہاشم سندھی (۱۱۷۴-۱۱۴۱)

کا ترجمہ سیرت سید الأنبیاء کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ سیرتِ نبوی ﷺ کے موضوع پر نہایت جامع اور اہم کتاب ہے۔

حضرت مفتی صاحب نے نہ صرف کتاب کا ترجمہ کیا ہے بلکہ کتاب کو مزید باطنی حسن کے ساتھ نکھارا

ہے۔ کتاب پر کی گئی محنت کو دیکھ کر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مفتی صاحب کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔ ہر صاحب ذوق کے لیے یہ کتاب نہایت ضروری ہے۔

۳. دلیل زائر حرمین دو کتب ہیں، مجمل، مفصل، مصنف: مفتی محمد علیم الدین نقشبندی (صفحات ۴۹۸)

یہ کتابیں حجاج کرام کے لیے بہترین راہنما ہے۔ ان میں حج کے متعلقہ مسائل کو عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ حاجیوں کے لیے بہترین تحفہ ہیں۔

۴۔ احکام طہارت مصنف: مفتی محمد علیم الدین صاحب

اس کتاب میں قبلہ مفتی صاحب نے طہارت کے تقریباً تمام فقہی مسائل کو سہل انداز میں بیان فرمایا ہے۔ اس موضوع پر دور حاضر میں اس قدر جامع کتاب میسر آنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

۵۔ قرآن حکیم کا ترجمہ (زیر طبع)

۶. سبل الھدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد کا ترجمہ (۲ جلدیں زیر طبع)

ان شاء اللہ مفتی صاحب کی یہ کاوشیں ہرگز رائیگاں نہیں جائیں گی کیونکہ اللہ رب العزت کا وعدہ ہے

فمن یعمل من الصالحات وھو مؤمن فلا کفران لسعیہ (سورۃ الأنبیاء: ۹۴)

ترجمہ: پس جو شخص کرتا ہے کوئی نیک کام بشرطیکہ مومن ہو تو رائیگاں نہیں جانے دیا جائے گا۔

آخر میں اللہ تعالیٰ کے حضور نبی ﷺ کے وسیلہ جلیلہ سے دعا ہے کہ وہ مصنفین فتاویٰ کے درجات بلند فرمائے اور حضرت مفتی صاحب اور تمام دوسرے حضرات جو دامے درمے قدمے سخنے اس کاوش میں شریک ہوئے ہیں ان سب کے علم و عمل اور عمر میں مزید برکتیں عطا فرمائے۔ آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ وخیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ وأصحابہ أجمعین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

گزارشات مرتب عفی عنہ

﴿۱﴾ ولایت نسب صداقت حسب حضرت صاحب زادہ مولانا محمد عبدالسلام مدظلہ العالی نے جب جامعہ رضویہ فیصل آباد میں دورہ حدیث شریف پڑھنے کا ارادہ فرمایا تو مستقبل میں تدریس کے ساتھ ساتھ انھوں نے تحریر کے میدان میں آنے کا فیصلہ بھی کرلیا۔اب اس کے لیے ایک ایسے موضوع کی تلاش تھی جو اس قدر شاندار علمی اور روحانی روایات کے حامل اس خانوادے کے نونہال کے شایانِ شان ہو۔اسی دوران استاذ الاساتذہ متکلمِ اسلام ترجمان اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالحکیم شرف مدظلہ العالی کا ایک خط برادرِ مکرم استادِ محترم حضرت مولانا محمد جلال الدین قادری مدظلہ العالی کے پاس آیا کہ استاذ العلماء والمحدثین حضرت مولانا ابوالبرکات سید احمد شیخ الحدیث دارالعلوم حزب الاحناف لاہور اور ان کے والد گرامی حضرت امام الفقہاء و شیخ المحدثین حضرت مولانا محمد دیدار علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہما کے فتاوی پر مشتمل ایک قلمی مجموعہ ترتیب ،تدوین، تخریج اور تحقیق کا منتظر ہے۔انھوں نے اس خط میں فرمائش کی آپ اس مجموعہ کو مرتب فرمائیں۔انھوں نے جواب میں اس پر آمادگی کا اظہار فرمادیا اور وہ قلمی مجموعہ حضرت مولانا محمد جلال الدین قادری مدظلہ العالی کے ہاں کھاریاں پہنچ گیا۔

فقیر راقم الحروف عفی عنہ کو یہ خیال آیا اگر یہ سعادت حضرت صاحب زادہ مدظلہ العالی کے حصہ میں آئے تو نہایت مناسب ہے۔چنانچہ اس نا کارۂ خلائق نے شوق دلا کر ان کو اس عظیم کام کے لیے آمادہ کرلیا۔ان دونوں حضرات کی مہربانی اور بالخصوص حضرت مولانا محمد جلال الدین قادری مدظلہ العالی کے کمال ایثار کے

باعث یہ مجموعہ چندروز کے بعد حضرت صاحب زادہ صاحب کے پاس پہنچ گیا۔آپ نے اس عظیم کام کوشروع فرمایا اللہ تعالیٰ کاشکر کہ کچھ عرصہ کے بعد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا ابوالبرکات سید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ کے اس مجموعہ میں شامل فتاوی کا مجموعہ ''فتاوی دار العلوم حزب الاحناف لاہور'' کے نام سے اشاعت پذیر ہوگیا۔

مخطوط کا باقی ماندہ حصہ مرتب شدہ حصے سے علمی اور تحقیقی اعتبار سے فائق تر تھا۔لیکن اس کا ایک حصہ انتہائی شکستہ تحریرات پر مشتمل اور مختلف ہاتھوں کا لکھا ہوا تھا۔اس حصہ کو پڑھنا انتہائی دشوار اور کٹھن کام تھا۔راقم الحروف جب کبھی انہیں بقیہ حصہ کی ترتیب وتدوین کا کہتا تو وہ پہلوتہی کر جاتے چند بار انھوں نے اس سلسلے میں درپیش مشکلات کوواضح کرنے کے لئے وہ مخطوطہ فقیر غفرلہ کے سامنے رکھ دیا کہ آپ ہی اس کو پڑھ دیں۔راقم الحروف کا خیال تھا کہ یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں، اگر ثابت قدمی اور صبر سے اس پر محنت کی جائے تو وہ پڑھا جاسکے گا انھوں نے باقی ماندہ کواس طرح چھوڑ کر اسے حضرت مولانا شرف قادری مدظلہ العالی کے ہاں واپس ارسال کردیا۔

فقیر کواس کی اس طرح واپسی پر شدید قلق تھا آخر کار فیصلہ کرلیا باقی ماندہ اس حصہ کوفقیر خود مرتب کرے گا۔اللہ تعالیٰ وتقدس کے فضل واحسان اور بزرگان دین کی توجہات کریمانہ سے یہ عاجز اس قابل ہوسکا کہ فتاوی کا یہ مجموعہ ترتیب پاکر ناظرین کے سامنے ہے۔اس سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات کا اندازہ عام قارئین کونہیں ہوسکتا۔صرف وہی لوگ اس کا اندازہ کرسکتے ہیں جنہیں کبھی شکستہ اور مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے مخطوطات پر کام کرنے کا اتفاق ہوا ہو۔

﴿۲﴾ فقیر عفی عنہ نے جس اہم اور بابرکت امانت کوقارئین تک پہنچانے کی مشکل اور نازک ذمہ داری اٹھائی اس سلسلے میں فقیر کی کوششوں کا ایک نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔اس ناکارہ خلائق کوجن مراحل میں کامیابی ہوئی وہ اساتذہ کرام کی شفقتوں، والدین کریمین رحمۃ اللہ علیہما کی دعاؤں اور مرشد گرامی دامت برکاتہم القدسیہ کی توجہات عالیہ کانتیجہ ہے۔لغزشیں اور غلطیاں فقیر کی نالائقی کا باعث ہیں۔قارئین حضرات

سے بھی گزراش ہے کہ ان لغزشوں اور غلطیوں کی نسبت اس ناکارۂ خلائق کی جانب کریں حضرات مفتیان کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کا دامن ان سے پاک ہے نیز ازراہِ کرم فقیر کواس سے آگاہ کریں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کو درست کیا جاسکے۔

﴿۳﴾ فتاوی میں ضمنی مسائل کی نشاندہی کے لئے فہرست میں مذکورہ صفحہ کی متعلقہ سطر پر ستارے کا نشان بنادیا گیا ہے، کتب فتاوی میں یہ جدت ہے اس سے قاری کے لئے مزید سہولت پیدا ہوگی۔

﴿۴﴾ ادارہ مظہر علم لاہور، جہلم، میرپور بلند مرتبہ دینی کتب کا ایک معیاری ادارہ ہے۔ متعدد دینی کتب اس کے زیر اہتمام اعلی معیاری انداز پر شائع ہوکر حسنِ قبول کا درجہ پاچکی ہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو اس کے روح رواں دامت برکاتہ اور خادمین کے پیشِ نظر دینِ متین کی خدمت ہے۔ مال ومتاع اور نام ونمود نہیں۔ اس کی تمام مطبوعات ایک سے ایک عمدہ اور بہتر ہیں۔ فتاوی دیداریہ جلد اول کی اشاعت اسی ادارہ کے اہتمام سے ہورہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مبارک ادارہ کے روح رواں دامت برکاتہ اور دیگر جملہ کارکنان کو دنیا اور آخرت میں اپنی بے کراں رحمتوں سے نوازتا رہے اور روز افزاں ترقیاتِ درجات سے نوازتا رہے۔

آمین ثم آمین

وصلی اللہ علی حبیبہ محمد وآلہ وسلم

محمد علیم الدین نقشبندی عفی عنہ

۲۷ محرم الحرام ۱۴۲۷ھ

۲۵ فروری ۲۰۰۶ء

ہفتہ

معتقدات
مستحسنات
بدعات
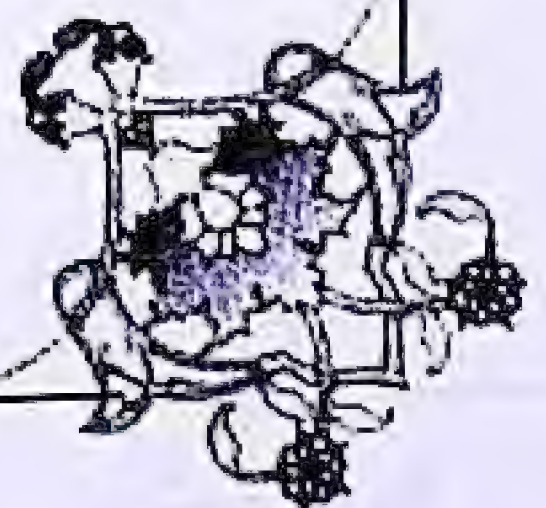
﴿فتویٰ نمبر...... 1﴾

سوال

آخرت میں عبادتِ نمازِ روزہ کیوں نہ ہوگا کیا منعم کا انعام اور عبدیت کا اظہار منافی ہے۔؟

مولوی غلام محی الدین خان صاحب

امام مسجد شاہ جہان پور ۷ دسمبر ۱۵ء

الجواب

آخرت میں شکرِ انعامِ الٰہی ضرور ہے جو بالمعنی عبادت ہے اور وہاں عبادت بغرضِ حصولِ نجات وغیرہ نہیں ہے۔

قرآن شریف ناطق ہے۔

یلیت قومی یعملون بما غفر لی ربی و جعلنی من المکرمین. [1]

(ترجمہ: کاش میری قوم جان لیتی کہ کس کے باعث میرے رب نے مجھے بخش دیا اور معزز لوگوں میں سے کیا)

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

❁❁❁❁❁

---

[1] القرآن الحکیم سورہ یس آیت نمبر ۲۶/ ۲۷.

﴿فتویٰ نمبر......2﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے اسلام اس مسئلہ میں کہ بعض احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے' کہ جنت میں قیامت کے بعد زوجین کی ملاقات ہوگی۔ اس میں دریافت طلب یہ امر ہے کہ ایک عورت نے یکے بعد دیگرے کئی خاوند کئے ہوں' تو وہاں کس سے مل سکے گی اور کس سے نہ ملے گی؟۔ اس کا جواب معہ ادلہ ارسال ہو۔ والسلام

سائل: انوار حسین' ۱۸ شوال ۱۳۳۴ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعد موت علاقۂ زوجیت منقطع ہو جاتا ہے۔ اس طرح بعد انقضاءِ ایامِ عدت کے عورت کو جس کسی سے چاہے نکاح کرنا جائز ہے۔ اور مرد کو مثل اجنبی کے اپنی بیبیوں کو چاہنا ناجائز ہے' بخلاف ازواجِ مطہرات اور حضرت فاطمہ زہرا اور علی رضی اللہ عنہم۔ ☆ اس واسطے جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر اعتراض کیا' کہ تم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کیوں غسل دیا؟ تو اس کے جواب میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یہی جواب دیا' کہ کیا تم نہیں جانتے' کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فاطمہ کو تمہاری زوجیت میں میں نے باعتبار دنیا اور آخرت کے دیا ہے۔ یہ ضرور جنت میں بھی تمہاری ہی بیوی رہیں گی۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ اور تمام لوگوں کا بعد موت علاقۂ زوجیت منقطع ہو جاتا ہے۔ اور یہ ضرور نہیں ہے' جس کی جو بیوی دنیا میں ہو وہی اس آخرت میں ہو۔ ورنہ پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا جواب کیونکر صحیح ہوگا۔

چنانچہ درمختار میں ہے۔

و یمنع زوجھا من غسلھا و مسھا [1]

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۸۵ مطبوعہ بیروت.

(ترجمہ: خاوند کو اپنی فوت شدہ بیوی کو غسل دینے اور چھونے سے روکا جائے گا)

قال الشامی رحمة الله علیه

قوله و یمنع زوجها الخ أشار الی ما فی البحر من ان شرط الغاسل ان یحل له النظر الی المغسول ۱

(ترجمہ: قولہ: مرد کو روکا جائے گا الخ اس میں اس قانون کی طرف اشارہ ہے جو البحر الرائق میں ہے، کہ غسل دینے والے کے لیے شرط یہ ہے مردے کی جانب اس کا دیکھنا جائز ہو)

و ایضا فی الدر المختار

و قالت الائمة الثلاثة یجوز (ای غسل الزوج زوجته) لان علیا رضی الله عنه غسل فاطمة رضی الله عنها قلنا هذا محمول علی بقاء الزوجیة لقوله علیه السلام کل سبب و نسب ینقطع بالموت الاسببی و نسبی مع ان بعض الصحابة انکر علیه شرح المجمع للعینی ۲

(ترجمہ: امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ باقی تین ائمہ نے فرمایا کہ مرد کے لیے اپنی مردہ بیوی کو غسل دینا جائز ہے کیوں کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کو غسل دیا تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ غسل دینا زوجیت کے باقی رہنے پر محمول ہے، کیوں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر تعلق اور نسب موت کے ساتھ منقطع ہو جاتا ہے لیکن میرے ساتھ تعلق اور میرا نسب باقی رہتا ہے اس کے علاوہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے اس غسل دینے کو اچھا نہ سمجھا تھا۔ شرح المجمع للعینی)

قال الشامی

قوله: قلنا الخ قال فی شرح المجمع لمصنفه فاطمة رضی الله عنها غسلتها ام ایمن حاضنته صلی الله علیه وسلم و رضی الله عنها فتحمل روایة غسل علی رضی الله عنه علی معنی التهیئة

---

۱ رد المحتار جلد ۳ صفحه ۵۸ مطبوعه بیروت

۲ الدر المختار مع رد المحتار جلد ۳ صفحه ۸۵ مطبوعه بیروت

والقيام التام بأسبابه و لئن ثبتت الرواية فهو مختص به ألا ترى ان ابن مسعود رضى الله عنه لما اعترض عليه بذلک اجابه بقوله اما علمت ان رسول الله ﷺ قال ان فاطمة زوجتک فی الدنیا والآخرة فادعاء ہ الخصوصیة دلیل علی ان المذهب عندهم عدم الجواز قلت و یدل علی الخصوصیة ایضا الحدیث الذی ذکره الشارح ۱؎ الخ

(ترجمہ: قولہ ہم کہتے ہیں الخ، کتاب "المجمع" کی جو شرح خود مصنف نے تحریر کی اس میں ہے، کہ خاتون جنت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حضور اکرم ﷺ کی پرورش کرنے والی بی بی حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا نے غسل دیا تھا۔ اس صورت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے غسل دینے کی روایت کو ان معنوں پر محمول کیا جائے گا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے غسل پورے اسباب مہیا کیے اور اس کا بندوبست فرمایا۔ اور اگر غسل دینے کی روایت ثابت ہو جائے تو ایسا حکم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مخصوص شمار ہوگا۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ جب حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اعتراض فرمایا تو انہوں نے جواب میں یوں ارشاد فرمایا کہ کیا تمہیں علم نہیں ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ فاطمہ تمہاری دنیا اور عقبیٰ میں زوجہ ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا اپنی خصوصیت کا دعویٰ فرمانا، اس بات کی دلیل ہے، کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مذہب یہ تھا کہ خاوند کے لیے اپنی زوجہ کو غسل دینا جائز نہیں ہے۔ اور خصوصیت پر وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے جسے شارح نے ذکر فرمایا ہے)۔

ہاں ممکن ہے کہ بذریعہ شفاعتِ زوج یا زوجہ یا خواہش زوجین، اللہ جس کو چاہئے اس کو دنیا ہی کی بیوی گو وہاں مستحق نار ہو، بخش کر اس کو ہی عطا فرما دے۔ علیٰ ہذا ممکن ہے کہ شوہر بشفاعتِ زوجہ بخشا جائے اور بحسب خواہشِ زوجہ وہ شوہر اس کو عطا فرمایا جائے۔ ۲؎

کتبہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی المجد دی

۱؎ رد المحتار جلد ۳/ صفحہ ۸۵۸/ مطبوعہ بیروت.

۲؎ سوال ہذا کے مفصل جواب کے لیے ملاحظہ ہو الفتاویٰ الحدیثیہ صفحہ ۴۱، ۴۲، مطبوعہ مصر ۱۹۳۷ء

﴿فتویٰ نمبر......3﴾

سوال

حضرت آدم علیہ السلام کی جب استغفار قبول ہوگئی تو اس بعد ہبوط کا حکم خلافِ قرینہ ہے۔اس کے متعلق تحقیقی جواب ارشاد ہو۔

جناب مولوی غلام محی الدین خان صاحب
امام جامع مسجد شاہجہاں پور۔۷ادسمبر ۱۵ء

الجواب

حضرت آدم علیہ السلام کا ہبوط مصالحِ الٰہی سے تھا اس کا تعلق استغفار سے کچھ نہیں۔ تقدیم وتاخیرِ زمانی منافی حکمتِ الٰہیہ کو نہیں ہے۔

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

✿✿✿✿✿

﴿فتوی نمبر......4﴾

سوال

حضرت ہاجرہ قبل سے مومنہ تھیں یا نہیں۔ اور کنیزگی کا داغ ان پر کس قسم کا ہے کیوں کہ اس سے نسب اسماعیل علیہ السلام پر شائبہء مملوکیت پیدا ہوتا ہے۔

الجواب

☆ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا خوردسال تھیں جس وقت بادشاہ نے سارہ کو شکرانہء دعا میں دیا تھا اور کہا تھا

ھا اجرك

یعنی اب میں تم کو اجر تیری دعا کا دیتا ہوں

لہٰذا ان کا نام ہاجرہ ہوگیا۔ پھر جب قریب بلوغ ہوئیں تو بی بی سارہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بخش دیا۔ اور کنیز بمعنے دختر وصبیہ ہے نہ بمعنے بردہ کیوں کہ دراصل بی بی سارہ کو خاندانِ شاہی کی دختر واسطے تبرک اور خدمت کے بادشاہ نے عنایت کی تھی۔

لفظ کنیز کے معنوں میں اشتباہ ہوگیا ہے جیسا کہ غلام، عبد، مولی وغیرہ ہے۔ روضۃ الصفا میں ہے

و ھاجر بغایت جمیلہ بود چوں بشرفِ صحبت و مصاحبتِ ابراھیم مشرف شد
ھماں وقتِ قالبِ مطھرش صدفِ دُرِ وجودِ حضرت اسماعیل شد۔[1]

(ترجمہ: حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نہایت خوبصورت تھیں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صحبت اور مصاحبت کے شرف سے مشرف ہوئیں اسی وقت آپ کا جسمِ اطہر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے موتی جیسے وجود کے لیے صدف بن گیا)

اور یہ سب امور حسب الحکم ربانی ظاہر ہوئے تھے اور بی بی سارہ کو بذریعہ الہام حکم دیا گیا تھا جس کی تعمیل انہوں نے فرمائی۔ پس کوئی شبہ دربارۂ طہارتِ نسبِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں رہا۔ اور ان کے اسلام میں بھی شک نہ رہا۔

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

---

[1] روضۃ الصفا جلد صفحہ مطبوعہ

﴿فتوی نمبر......5﴾

سوال

کرامات حضرت غوث اعظم جو بارہ برس کی برات ڈوبی ہوئی نکالنا مشہور ہے اور مردہ پانصد سالہ کو ''قم باذن اللہ'' کہہ کر اٹھانا' میلاد خوان بیان کرتا ہے برات کا نکالنا ضعیف روایت ہے اور مردہ جلانا قوی ہے۔ شرعاً اس کا ثبوت کیا ہے؟

سائل: رحمت علی محلہ راوی آگرہ

۱۷ فروری ۱۹۱۶ء

الجواب

ہو المصوب

حضرت سید السادات ابو محمد عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ غوثِ اعظم تھے ان کی کرامات درجہ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔ جیسا کہ امام یافعی نے لکھا ہے۔

ان کراماته تواترت او قربت من التواتر و معلوم با لاتفاق اله لم یظهر ظهور کرامته بغیره من شیوخ الافاق کرامةً۔

☆ (ترجمہ: آپ کی کرامات متواتر یا تواتر کے قریب ہیں اور علماء کے اتفاق سے یہ امر معلوم ہے کہ آپ کی مانند کرامات کا ظہور آپ کے بغیر آفاق کے مشائخ میں سے کسی سے نہیں ہوا)

☆ مگر حکایت برات نکالنے کی کسی معتبر نے نہیں لکھی اور نہ مردہ کو قم باذن اللہ کہہ کر کسی مقام پر زندہ کیا ہے اور اس سے یہ لازم نہیں کہ حضرت غوث صاحب رضی اللہ عنہ اس درجہ کے نہ تھے۔ اکثر میلاد خوان بوجہ عدمِ واقفیت مہمل روایات اولیاء وانبیاء کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے کہ اگر یہ یہاں غلط ہے تو بھی ان کی تعریف پوری ہم نے کر دی۔ متوقع ثواب کے ہوتے ہیں۔ خیر خدا ان پر رحم کرے۔

ہزاروں کرامات اولیاء اللہ سے اور اصحاب رسول علیہ السلام سے ظاہر نہ ہوئیں تو کیا جھوٹی روایت کہہ

دینے سے ان کا رتبہ بڑھ جائے گا۔ ہرگز نہیں اصحابِ رسول تمام غوث وقطب واولیاء سے افضل ہیں اور تحقیق سے ثابت ہے کہ اولیاء اللہ کی کرامات اکثر اصحاب سے زیادہ ہیں۔ بہرحال ہر دو روایت جن کو پوچھا ہے کسی معتبر نے نہیں لکھی ہیں۔ اور امکان عقلی سے کوئی امر یقینی نہیں ہوسکتی۔

ہاں جو شخص منکر کراماتِ غوثِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے وہ خطا کار ہوگیا کیونکہ تواتر سے ثابت ہے۔

واللہ اعلم بالصواب و عندہ ام الکتاب.

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......6﴾

سوال

کوئی شخص اپنے مریدوں سے اپنے کو رسول اور پیغام آور کہلاتا ہو اور اس کا مطلب حقیقی معنی نہ ہوں اور اس کے مرید اس کو تمام القاب آداب میں داخل کرتے ہوں تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے کیوں علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل حدیث میں ہے پھر محذور ہونے کی کیا وجہ ہے۔

الجواب

جو پیر ایسا لفظ کہنا جائز رکھتا ہے تو وہ بدعتی اور بدکار ہے کیوں کہ شرعاً اس لفظ کو استعمال کرنا، جس میں شائبہ دوسرے معنے کفر کا ہونا جائز ہے۔ توبہ کرنا چاہیے۔ اور

☆ **علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل**

(ترجمہ: میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی مانند ہیں)

کے بعد صحت یہ معنے ہیں کہ کثرت علماء اوران کا فیوض ہوگا نہ یہ کہ انبیاء اور اولیاء ایک ہی مدارج میں ہوں گے۔

النبوة افضل من الولاية (۲)

(ترجمہ: نبوت ولایت سے افضل ہے)

مسئلہ عقائد کا ہے۔

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

✿✿✿✿✿

---

(۱) کشف الخفاء جلد ۳ صفحہ ۶ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

(۲) لا جرم نبوت افضل باشد از ولایت خواہ ولایتِ نبی باشد خواہ ولایتِ ولی۔
(ترجمہ: یقینی طور پر نبوت سے ولایت افضل ہوگی خواہ وہ نبی کی ولایت ہو یا ولی کی ولایت)

مکتوبات امام ربانی دفتر اول مکتوب نمبر ۱۵

﴿فتویٰ نمبر...... 7﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دینِ متین اس مسئلہ میں کہ ایصالِ ثواب احیاء کا اموات کو نافع ہے یا نہیں اور اگر ایصالِ ثواب ثابت ہے تو ایک چیز کا ثواب چند لوگوں کو پہنچایا جائے تو بالسویہ پہنچتا ہے یا تقسیم ہو کر بحسب حصہ لہٰذا بدلائلِ قویہ تحریر فرما کر مثاب و ماجور ہو جایئے جزاکم الله خیر الجزاء

الجواب

اللهم رب زدنی علما.

اہلِ سنت و جماعت خصوصاً حنفیہ کے نزدیک نماز، روزہ، صدقہ وغیرہ کا ثواب بلاکم و کاست اموات کو بخشنا جائز ہے اور ان کو پہنچتا ہے اور ثواب پہنچانے والے کو بھی بلاکم و کاست اس عمل کا ثواب ملتا ہے۔

کما فی الشامی :

صرح علمائنا فی باب الحج عن الغیر بان للانسان ان یجعل ثواب عمله لغیره صلاة أو صوما أو صدقة او غیرها کذا فی الهدایة بل فی زکاة التتارخانیة عن المحیط الافضل لمن یتصدق نفلا أن ینوی لجمیع المومنین والمومنات لانها تصل الیهم و لا ینقص من اجره شیء و هو مذهب اهل السنة والجماعة [1] الخ

(ترجمہ: ہمارے علمائے کرام نے حجِ بدل کے باب میں تصریح کی ہے، کہ انسان کو اختیار حاصل ہے کہ اپنے عمل کا ثواب دوسرے کو دے دے۔ خواہ وہ عمل نماز ہو، روزہ ہو، صدقہ ہو یا ان کے علاوہ اور عمل ہو۔ ہدایہ میں اسی طرح ہے۔ بلکہ فتاوی تارتاخانیہ کی کتاب الزکاۃ میں محیط سے منقول ہے، کہ جو شخص نفلی صدقہ دے، اس کے

---

[1] رد المحتار شرح الدر المختار جلد ۲ صفحہ ۲۴۳ مطبوعہ مصر

نوٹ: یہی عبارت کچھ تبدیلی کے ساتھ جلد/۲، صفحہ/۳۵۷ اور جلد/۲ صفحہ/۵۹۵ پر بھی موجود ہے۔

لیے افضل یہ ہے' کہ تمام اہلِ ایمان مردوں اور عورتوں کے ایصالِ ثواب کی نیت کرے کیوں کہ یہ ثواب ان کو پہنچے گا اور خود اس کے اجر میں کچھ کمی واقع نہ ہوگی۔ یہ اہلِ سنت وجماعت کا مذہب ہے)

☆ رہا یہ امر کہ پھر سب اموات کو حصہ پہنچتا ہے مثلاً ایک الحمد کا ثواب بخشا جائے تو پوری الحمد کا سب کو برابر پہنچتا ہے۔ یہ امر مختلف فیہ ہے۔ مگر امید فضلِ واسع خداوند کریم سے یہی ہے' کہ سب کو برابر پہنچے اور یہی مختار شامی علیہ الرحمۃ ہے۔ چنانچہ شامی علیہ الرحمۃ بعد تحریر اقوالِ مختلفہ تحریر فرماتے ہیں

قلت لكن سئل ابن حجر المكى عما لو قرء لاهل المقبرة الفاتحة هل يقسم الثواب بينهم او يصل لكل منهم مثل ثواب ذلك كاملا فاجاب فانه افتى جمع بالثانى و هو اللائق بسعة الفضل۔ ١

(ترجمہ: میں کہتا ہے کہ امام ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ اگر قبرستان والوں کے لیے فاتحہ پڑھی تو اس کا ثواب ان مردوں کے درمیان تقسیم ہوگا یا ہر ایک مردے کو اس کی مثل کامل (فاتحہ) کا ثواب ملے گا تو آپ نے جواب دیا کہ علماء کی ایک جماعت نے دوسری شق کے مطابق فتوی دیا ہے اور اللہ تعالی کے وسیع فضل وکرم کے لائق یہی صورت ہے)

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی المجددی

☆☆☆ **ذلک کذلک. إنی مصدق لذلک**

نمقه بقلمه وقاله بفمه

العبد الجانی أبو البرکات سید أحمد القادری

الرضوی الألوری

✿✿✿✿✿

---

١ رد المحتار علی الدر المختار جلد/۲ صفحہ/۲۴۴ مطبوعہ مصر

﴿فتویٰ نمبر......8﴾

سوال

محفلِ میلاد شریف میں قیام لازم ہے یا نہیں؟

سائل: از بلوچ پور،

۲۲اپریل۱۹۱۶ء

الجواب

هو المصوب

قیام مولود میں نہ سنت ہے نہ واجب۔ بلکہ عاشقانِ رسول کا فعل تھا جو بے خودی میں کرتے ہیں۔اور اس کی مشابہت اور اظہارِ محبت کو کھڑا ہونا اکثر علمانے جائز لکھا ہے اور جو لوگ اس درجہ محبت نہیں رکھتے ان کو کھڑا ہونا نا جائز ہے۔فقط والله اعلم و حکمه حکم.

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

﴿فتویٰ نمبر......9﴾

سوال

بجز مدینہ و بیت المقدس و خانہ کعبہ اور کسی زیارت کو سفر کرنا جائز ہے یا نہیں مثلاً خواجہ صاحب وغیرہ۔

سائل: از بلوچ پور،

۲۲اپریل ۱۹۱۶ء

الجواب

ھو المصوب

حدیث میں ہے **لا تشدوا الرحال الا الی ثلاثة مساجد** [۱]

(یعنی تم بغرضِ عبادت سوائے تین مسجدوں کے اور کسی مسجد یا گھر کا سفر نہ کرو)

یہ مطلب نہیں ہے کہ زیارت نہ کرو۔ بلکہ زیارتِ قبور سنتِ رسول اور اصحاب وغیرہ ہے اور حدیث صحیح میں ہے۔

☆ **کنت نھیتکم عن زیارة القبور فالان زوروھا** [۲]۔

☆(ترجمہ: یعنی میں اول تم کو زیارت قبور سے منع کرتا مگر اب تم زیارت کیا کرو) فقط

المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

✿✿✿✿✿

---
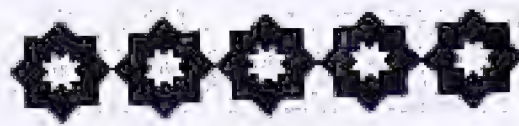
[۱] الجامع الصغیر مع شرح فیض القدیر جلد ۶/ صفحہ ۴۰۳/ مطبوعہ دار المعرفة بیروت.
بحوالہ مسند احمد ، صحیح البخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ

[۲] مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۳۵۶ المکتب الاسلامی

﴾فتویٰ نمبر......10﴿

سوال

لڑکے نے ختم قرآن کیا تو اس کا ختم کس طرح ہو؟ اور وہ ثواب لے تو کس طرح لے؟ کیا دعا پڑھے؟

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لڑکے کے ختمِ قرآن کا کوئی طریقہ معین نہیں۔ ☆ختمِ قرآن کی خوشی میں اگر کھانا کھلایا جائے تو عمدہ بات ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول بھی ہے۔ ☆خواہ شیرینی پنج آیت پڑھ کر حضور ﷺ کو ثواب ہدیۃ پہنچا کر یا بغیر شیرینی کے ہر طرح جائز ہے اور موجب خیر و برکت ہے۔ فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر...... 11﴾

سوال

فاتحہ وسلامتی کن کن سورتوں سے ہوتی ہے اور معمولی پڑھے (کو) جو ایک پارہ جانتا ہے کیا کیا پڑھنا چاہئے؟

الجواب

بسم الله الرحمن الرحيم۔

اللهم رب زدني علما

☆ عوام جو اللہ کی سلامتی پہنچاتے ہیں یہ امر بے اصل ہے۔☆ بزرگوں کو ثواب پہنچانے کا یہ طریقہ ہے کہ کھانا غریبوں کو کھلا کر خواہ شیرینی تقسیم کر کے خواہ کھانے اور شیرینی کے ساتھ الحمد اور تین قل پڑھ کر خواہ اس سے زیادہ جس قدر ہو سکے پڑھ کر بعدہ درود پڑھ کر یہ دعا مانگے۔ یا اللہ اس کلام کا ثواب حضور ﷺ کو اور بعدہ تمام بزرگوں کو جن کا نام لینا مقصود ہو لے کر کہہ دیں کہ ان کو ثواب پہنچے۔ فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبر آباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......12﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ سوم میں جو کہ قرآن مجید پڑھا جاتا ہے اس میں سجدہ جوادانہیں ہوتے اس کا ثواب مردہ کو پہنچتا ہے یانہیں۔

محمد حسین پیش امام مسجد راجہ بازار مادھوگنج باندنکوئی سکنہ الور

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

بغیر سجدہ کئے ہوئے جب قرآن پڑھنے والے ہی کو سجدہ کرنے کا ثواب نہ ہوتو دوسرے کو اس کا ثواب کیوں کر پہنچ سکتا ہے۔☆ مگر اس میں شک نہیں جو لوگ ختم میں سجدہ تلاوت نہیں کرتے وہ بوجہ ترک واجب مستحق عذاب رہتے ہیں اور گناہگار۔☆ لہٰذا ان کو لازم ہے کہ اول تو وقتِ تلاوت ضرور سجدہ کرلیا کریں ورنہ بعد ختم جتنے سجدہ واجب ہوئے ہیں ان کو اکٹھا کرلیا کریں۔

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی

ابومحمد محمد دیدار علی الحنفی المفتی

فی جامع اکبرآباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......13﴾

سوال

مقتدی ایک مرتبہ دعا امام کے ساتھ مانگ چکے ہیں۔ پھر جداگانہ نماز ختم کر کے امام کے ساتھ مکرر دعا کا انتظار کریں یہ امر شرعاً کیسا ہے۔

ثانیاً فجر و مغرب و عشاء میں بعد سنن و نوافل تین مرتبہ امام کے ساتھ دعا مانگنا کیسا ہے۔

سیوم۔ **الفاتحه علی النبی** کہہ کر **الحمد و قل هو الله و درود شریف و ان الله و ملائکته** وغیرہ پڑھ کر ثواب بخشنا یہ کیسا ہے۔

سائل: مولوی مطیع اللہ، توپ خانہ جامع مسجد

۱۳ اپریل ۱۹۱۶ء

الجواب

هو المصوب

بعد المکتوبۃ دعا مستحب یعنی مسنون ہے۔ پھر ہر شخص اپنی نماز ختم کر کے دعا کرے مگر یہ طریقۂ جدیدہ کہ امام صاحب کی مکرر دعا پڑھنے اور ختم کرنے کے مقتدی منتظر رہیں، محض بے اصل اور مصالح شرعیہ اور علمیہ کے خلاف اور فعلِ مذموم ہے کیوں کہ قرآن شریف میں ہے:

فاذا قضيت الصلوة فانتشروا في الارض [1]

(ترجمہ: پھر جب نماز ہو چکے تو پھر زمین میں اپنے کاروبار کے لیے چل پھر سکتے ہو)

اور مراد صلوۃ سے نماز فرض ہے بالاتفاق اور حدیث صحیح میں وارد ہے:

انه كان يصلي جميع السنن والوتر في البيت [2]

---

[1] القرآن الحکیم : سورة الجمعة آیت: ۱۰

[2] سفر السعادہ علی هامش کشف الغمة عن جمیع الامة جلد اول صفحہ ۸۷ میں ارشاد نبوی یوں درج ہے

☆(ترجمہ: نبی کریم ﷺ تمام سنتیں اور وتر گھر میں ادا فرمایا کرتے تھے)

ایها الناس صلوا فی بیوتکم فإن أفضل صلاة الرجل فی بیته إلا المکتوبة

(ترجمہ: اے لوگو! اپنی نمازیں گھروں میں ادا کرو کیونکہ آدمی کے لیے فرض نماز کے علاوہ باقی نمازیں گھر میں نماز ادا کرنا افضل ہے)

☆ پس تمام فقہا نے بہ نسبت مسجد کے گھر پر سنت کا پڑھنا افضل و احسن کہا ہے۔ لہٰذا مقتدی کا انتظار دعائے ثانی خلاف ان نصوصات کے معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ امر پیدا ہونا مطابق حدیث:

قوم یعتدون فی الدعا او الطهور[1]

یعنی ایک گروہ ایسا ہوگا کہ ظاہری پاکی اور دعا کی طوالت و کثرت رکھے گا۔ اور نہایت خشوع کا اظہار کرے گا۔ اور عبادت میں اس قدر دلچسپی نہ کرے گا۔

صاحب مجمع البحار لکھتا ہے۔

والمراد بلا تجهر بصلوتک الدعاء[2] .

(ترجمہ: ولا تجهر بصلاتک میں صلوۃ سے مراد دعا ہے یعنی بلند آواز سے دعا نہ مانگو)

لہٰذا یہ محل قطعی بتکلف اور لائق ترک ہے اور بدعتِ مذمومہ سمجھنا چاہئے۔ ☆اسی طرح بعد نماز فجر و مغرب و عشاء الفاتحه علی النبی کہہ کر الحمد و قل وغیرہ پڑھنا کسی وجہ صحیح نہیں۔ اول تو بہیئت کذائی منقول نہیں۔ دوسرے فاتحہ کا ثواب مروج پیغمبر علیہ السلام خلاف ادب و احتیاط ہے۔ تیسرے خلاف حدیث مذکورہ بالا مکرر سہ کرر دعا یہ سب امور کراہت سے خالی نہیں۔ اگرچہ بظاہر محبوب معلوم ہوتے ہیں۔

---

[1] سنن أبی داؤد کتاب الطهارت : باب الإسراف فی الوضوء: حدیث رقم: ۹۶،

نوٹ: پوری حدیث کے الفاظ یوں ہیں۔ سیکون فی هذه الأمة قوم یعتدون فی الطهور والدعاء

[2] مجمع بحار الانوار جلد ۳ صفحه ۳۴۷ مکتبه دار الایمان المدینة المنورة میں یہ الفاظ یہ ہیں: الصلاة لغة الدعاء

علامہ شامی فتاویٰ تنقیح حامدیہ میں لکھتا ہے۔

مطلب فی اهداء ثواب القراءة علی النبی ﷺ قد اجاز بعض المتاخرین کا لسبکی وبعض المتقدمین من الحنابلة کابی العباس محمد بن اسحاق و السراج النشا پوری من[1] اهداء ثواب القرآن له علیه السلام الذی هو تحصیل الحاصل

و قال ابن تیمیة لا تستجب بل هو بدعة و قال قاضی ابن شهنبه یمنع و ابن العطار ینبغی ان یمنع. و قال ابن الجزری لا یروی عن السلف ونحن بهم نقتدی. ثم قال و اجاب بعضهم بجوازه بل باستحبابه قیاس علی ما کان یهداء الیه فی حیاته فی الدنیا ولما طالب الدعا من عمر رضی الله عنه و حث الامة علی الدعاء بالوسیلة ثم قال فان لم یفعل ذلک فقد وان فعلت به فقد قیل به. قال الکمال بن حمره الحسین الاحوط الترک ملخصا[1]

یہ سب بحالتِ انفراد ہے اور بصورتِ اجتماع بالاتفاق بدعت ہوگا مگر [2] نیم ملالوگوں کے اثر کا ہے جو [2] ہر بدعتِ مذمومہ کو سنت قرار دیتے ہیں۔ خدا رحم کرے۔

والله اعلم و آخر دعوانا ان الحمد الله رب العالمین۔

کتبہ المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

❁❁❁❁❁

---

[1] تنقیح الفتاوی الحامدیه جلد صفحه

[2] اصل مخطوط سے عبارت پڑھی نہیں جا سکی اندازہ سے لکھی ہے۔ محمد علیم الدین نقشبندی عفی عنہ

﴿فتویٰ نمبر......14﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں:

۱۔ قبروں سے ولی اللہ کے لیے دعا مانگنا منت مانگنا سجدہ کرنا درست ہے اور ولی اللہ منت پوری کرتے ہیں۔

۲۔ گانا' ناچنا' باجا درست ہے۔ بزرگانِ دین نے سنا ہے

۳۔ اگر کوئی حافظِ قرآن کوٹ پتلون پہنا کرتا ہو اس کے پیچھے نماز درست ہوتی ہے یا نہیں؟

مولوی صاحب قبروں پر سجدہ کرنے گانے ناچنے کی اجازت دیتے ہیں۔ ان کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ اور ائمہ دین کے نزدیک کیا حکم ہے؟ مولانا صاحب اپنے کو حنفی المذہب کہتے ہیں جواب مہری علماءِ دین کا ہونا چاہئے۔

۱۱ رمضان ۱۳۳۶ھ

مسلمانان قصبہ سدہ پور بذریعہ عبدالعلیم خان

الجواب

اللھم رب زدنی علما۔

صفحہ ۲۴۵ جلد خامس درمختار میں بعد نقل اس روایت کے علامہ حصکفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں

و ان علم اولا بالـلـعـب لا يحضر اصلا سواء كان ممن يقتدى به اولا لان حق الدعوة انما يلزمه بعد الحضور لا قبله ابن كمال' و فى السراج ودلت المسئلة ان الملاهى كلها حرام و يدخل عليهم بلا اذنهم لانكار المنكر قال ابن مسعود صوت اللهو والغناء ينبت النفاق فى القلب كما ينبت الماء النبات. قلت و فى البزازية استماع صوت الملاهى كضرب قصب و نحوه حرام لقوله عليه السلام استماع الملاهى معصية

والجلوس عليها فسق والتلذذ بها كفر أى بالنعمة فصرف الجوارح إلى غير ماخلق لأجله كفر بالنعمة لا شكر فالواجب كل الواجب ان يجتنب كى لا يسمع لما روى (انه) عليه السلام ادخل اصبعه فى اذنه عند سماعه[۱] ال خ

(ترجمہ: اگر معلوم ہو کہ مجلسِ دعوت میں لہو ولعب ہوگا تو بالکل حاضر نہ ہو۔ خواہ وہ ان لوگوں سے ہو جن کی اقتداء کی جاتی ہے یا نہ۔ کیوں کہ دعوت کا حق حاضر ہونے کے بعد لازم ہوتا ہے اس سے پہلے اس کا حق لازم نہیں ہوتا۔ ابن کمال۔ السراج میں ہے کہ اس مسئلہ نے دلالت کی کہ لہو ولعب کی تمام باتیں حرام ہیں لہٰذا بری بات کے انکار کے لیے ان کی اجازت کے بغیر ان کی مجلس چلا جائے۔ حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا لہو ولعب اور گانے کے آواز دل میں اس طرح نفاق اُگاتی ہے جس طرح پانی نباتات کو اگاتا ہے۔ میں کہتا ہوں بزازیہ میں ہے لہو ولعب کی آواز جیسا کہ بانس یا نرکل کو خاص انداز سے بجانا اور اس کی مانند دوسری آوازیں حرام ہیں۔ کیوں کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے لہو ولعب کی آوازوں کا سننا گناہ اس کی خاطر بیٹھنا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس سے لطف اندوز ہونا نعمت کی ناشکری ہے کیوں کہ اعضا کو ان افعال کی طرف پھیر دینا جن کے لیے ان کو پیدا نہیں کیا گیا اس نعمت کی ناشکری ہے، شکر گذاری نہیں۔ لہٰذا یہ حکم پوری طرح واجب ہے کہ ان سے اجتناب کرے تا کہ اسے ان کی آواز سنائی نہ دے۔ کیوں کہ مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اسے سننے کے وقت اپنے کان میں انگلی ڈال دی تھی)

اور قبروں کو معبود سمجھ کر بہ نیتِ عبادت سجدہ کرنا شرک ہے اور غالباً اس نیت سے تو کوئی بھی مسلمان نہیں کرسکتا۔ رہا سجدہ کرنا بہ نیت تعظیم وہ پہلے پیغمبروں کی شریعت میں جائز تھا اور شریعتِ مصطفویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں حرام۔

علی ہذا کوٹ پتلون بہ نیتِ تشابہ نصاریٰ پہننا فسق ہے۔

---

[۱] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۵، صفحہ ۲۲۵، ۲۲۶، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

لہٰذا بوجہ ارتکاب امورِ مذکورہ مولوی صاحب اور حافظ صاحب دونوں فاسق ہوں گے اور فاسق کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمہ ہے اور جو نماز مکروہ تحریمہ ہو اس کا اعادہ واجب ہے۔ ھکذا فی الشامی والکبیری فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی المشہدی المفتی

فی جامع اکبر آباد

حدیث
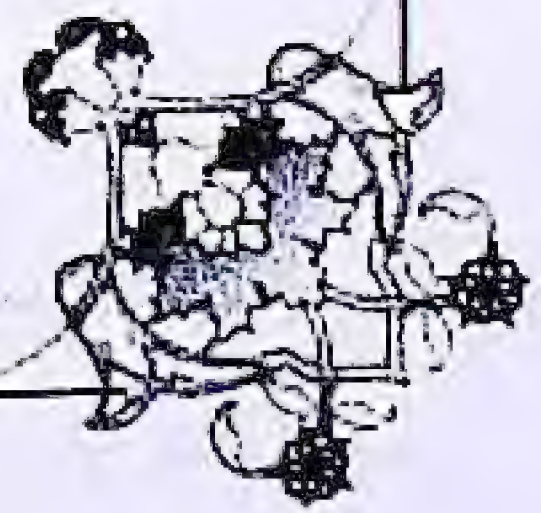
﴿فتویٰ نمبر......15﴾

سوال

و مالنا طعام الا الاسودان التمر والماء.

اس حدیث میں کھجور اور پانی کو اسود یعنی سیاہ فرمایا اس کا کیا مطلب ہے؟۔

سائل: مولانا غلام محی الدین خان صاحب

امام جامع مسجد شاہ جہان پور

۱۴ فروری ۱۹۱۶ء

الجواب

مدینہ کے کھجور سیاہ ہوتے ہیں اور عمدہ ترین غذا ہے اور پانی بھی جب زیادہ ہو جائے تو مائل بہ سیاہی ہو جاتا ہے اس واسطے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا مجمع البحار میں ہے:

و مالنا طعام إلا الأسودان أى التمر والماء والسواد هو الغالب على تمور المدينة ووصف الماء به للتغليب [1]

(ترجمہ: ہمارے لیے دو سیاہ چیزوں یعنی کھجور اور پانی کے سوا کھانا نہیں ہے۔ مدینہ منورہ کی کھجوروں پر سیاہی کا غلبہ ہوتا ہے اور تغلیب کے لیے پانی کا بھی یہی وصف بیان کر دیا)۔

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

✿✿✿✿✿

---

[1] مجمع بحار الأنوار جلد/ ۳/ صفحہ/ ۱۴۴/ مطبوعہ مکتبہ دار الایمان المدینۃ المنورۃ

﴿فتویٰ نمبر......16﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان اس مسئلہ میں کہ ایک مسجد بادشاہ جلال الدین اکبر کے زمانہ کی بنوائی ہوئی اختیار خان فوجدار کی ہے۔ اور اس مسجد کے متعلق جائیداد بھی ہے اور اس کی نسبت مقدمات عرصہ سے چل رہے ہیں۔ اور انہی مقدمات کی بابت ایک ڈگری بنام علیم الدین وغیرہ ہوئی اور علیم الدین کی گرفتاری بھی نکلوائی۔ اسکی ادائیگی کے واسطے اہلِ اسلام امداد کریں تو اس کی بابت شرع کا کیا حکم ہے؟ اور امداد دینے والے کیا اجر پائیں گے؟ جو کچھ بیان فرمادیں اس کا اجر پائیں گے۔ مقدمات ہائی کورٹ اور ضلع میں بابت اسی مسجد کے چل رہے ہیں اس کے واسطہ بھی روپیہ درکار ہے۔

۲۲ شعبان ۱۳۳۶ھ

علیم الدین گھڑی ساز کناری بازار

احمد حسین وغیرہ کناری بازار متصل مسجد اختیار خان

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسجدِ مذکور کی نسبت جو مقدمہ چل رہا ہے مجھ سے زیادہ اہل شہر اس سے واقف ہیں اور کیفیت ڈگری سے بھی جس قدر اہلِ شہر کو علم ہے میں اس سے زیادہ واقفیت حاصل نہیں کرسکتا۔ مگر ایسے موقع پریشانی میں مطلقا ہر مسلمان سنی مقلد خوش عقیدہ کی امداد بلاشبہ موجبِ اجرِ عظیم ہے۔ خصوصا ایسے شخص کی جس کا اعلان مسجدوں کی رہائی کے متعلق ہمیشہ اکثر جمعوں میں سنتے رہتے ہیں۔ حدیث صحیح میں وارد ہے۔

ما کان العبد فی عون اخیہ المسلم کان اللہ فی عونہ[1] او کما قال

---

[1] موسوعۃ اطراف الحدیث النبوی : ج/لد ۱، صفحہ/ ۱۵۵ دار الکتب العلمیہ بیروت

ترجمہ: جب تک بندہ اپنے بھائی مسلمان کی مددگاری میں رہتا ہے اللہ اس کی امداد میں رہتا ہے۔

اور دوسری حدیث میں ہے کہ جو کوئی کسی مسلمان کی کڑی مشکل پوری کرے۔ البتہ اس کی ستراڑی ہوئی مشکلات قیامت کے دن آسان کرے گا۔

بحوالہ مسلم، ابوداؤد، ترمذی، احمد غیرہم بالفاظِ ذیل:

اللہ فی عون العبد مان کان العبد فی عون اخیہ

اور یہ تو ظاہر ہے، اللہ قرآنِ مجید میں فرماتا ہے:

☆ **انما یعمر مساجد اللہ من امن باللہ و الیوم الآخر**[۱]

ترجمہ: بلاشبہ اللہ کی مسجدوں کو جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائیں وہی آباد کرتے ہیں

اور حدیث صحیح میں ہے:

من بنی مسجدا للہ بنی اللہ لہ بیتا فی الجنۃ[۲]

ترجمہ: جو شخص اللہ کے واسطے مسجد بنادے اللہ اس کے واسطے جنت میں گھر بناتا ہے۔ فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی المفتی شہر اکبرآبادی جامع مسجد

❁❁❁❁❁

---

[۱] القرآن المجید، سورۃ التوبہ: آیت: ۱۷

طہارت

﴿فتویٰ نمبر...... 17﴾

سوال

کیا فرماتے ہے علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں زید نے بعد وضو کے اپنا ستر کھولا اور اس کے اندامِ نہانی کو اور لوگوں نے بھی جو باوضو تھے دیکھا۔اب ایسی حالت میں زید کا وضو اور ان لوگوں کا وضو جن کی نظر اندامِ نہانی پر پڑی قائم رہا یا نہیں؟

الجواب

بسم الله الرحمن الرحيم

اللهم رب زدني علما

حنفیوں کے نزدیک اپنا یا کسی غیر کا اندامِ نہانی دیکھنے سے تو قطعاً وضو نہیں ٹوٹتا۔البتہ کسی غیر کے اندامِ نہانی پر قصداً نظر ڈالنا یا ننگا ہوکر کسی کو اپنی اندامِ نہانی دکھانا بہت بڑا گناہ ہے۔ بلکہ بعد وضو اگر کوئی پانی سے استنجا کرنا یا آبدست لینا بھول جائے اور یاد آنے پر استنجا پانی سے کرے یا آب دست لے لے جب بھی وضو نہیں ٹوٹتا۔اس واسطے کہ وضو کے توڑنے والی بالاتفاق اتنی باتیں ہیں۔

☆ اول ناپاک چیز کا مثل زرد پیپ' لہو کے یا پیشاب' پاخانہ نکلنا بدن انسان سے۔خواہ سر کے پھوڑے سے بہنے یا زخم سے ہو یا پیٹ کے۔خواہ پاؤں کے زخم یا پھوڑے سے' خواہ آنکھ یا کان کے زخم سے' یا پھنسی سے۔

اور نکلنے کے یہ معنے ہیں کہ اتنا خون وغیرہ نکلے کہ نکلنے کی جگہ چھل جائے۔اور خون کا قطرہ باریک باریک ظاہر ہوکر خشک ہو جائے اور مطلقاً نہ بہیں تو وضو ہرگز نہ ٹوٹے گا۔

مع ہذا اگر زخم یا پھوڑے سے خشک کیڑے جھڑ پڑیں یا زخم سے بغیر خون پیپ کے لکڑی کی پھانس یا کنکر نکل آئے خواہ نکالا جائے یا زخم یا پھوڑے سے یا مردار گوشت گر پڑے یا کاٹ کر جدا کر دیا جائے وضو نہیں ٹوٹتا۔

البتہ پیشاب پاخانہ کی جگہ سے اگر خشک کیڑا یا کنکر نکلے یا نکالا جائے پاخانہ کی جگہ سے بادسری یعنی ہوا نکلے خواہ آواز کے ساتھ یا بلا آواز تو بلاشبہ وضوٹو جائے گا مگر فقط بادسری (ہوا نکلے) کے شبہ اور وہم سے وضو ہرگز نہ ٹوٹے گا۔

اور منہ بھر قے آئے' خواہ پت کی قے کڑوی ہو' خواہ ترش' بلغم کی ہو' یا سودا کی' یا کھٹا پانی' خون جما ہوا ہو' یا بہتا ہوا تو بلاشبہ وضوٹوٹ جائے گا۔ البتہ اگر دماغ سے جما ہوا خون یا کتنا ہی بلغم نکلے وضو ہرگز نہ ٹوٹے گا۔

علی ہذا اگر کھانسی سے کتنا ہی بلغم نکلے وضو نہ ٹوٹے گا۔

اور اگر نماز میں مسنونِ حالت پر کتنی بھی دیر سوتا رہے نہ وضوٹوٹے گا نہ نماز ٹوٹے گی۔ مگر جب جاگے سونے کی حالت میں جو ارکانِ نماز ادا کیے ہیں یا کچھ بھی پڑھا ہے اس کو پھیر لے اور اس کا اعادہ کرے۔ ورنہ اگر ارکان فرض یا قراءت بقدرِ فرض کو دوبارہ نہ پھیرے تو نماز نہ ہوگی۔ مگر وضو بدستور قائم رہے گا۔

البتہ نماز میں التحیات میں یا قیام وغیرہ میں ایسا غافل ہو گیا کہ زمین پر گر پڑا ضرور وضوٹوٹ جائے گا۔ اگر گرتے گرتے درمیان میں ہوشیار ہو گیا وضو ہرگز نہ ٹوٹے گا۔ اور اگر چت سو گیا یا کروٹ پر سو گیا یا ایسا تکیہ لگا کر سو گیا کہ اگر وہ جدا ہو جائے تو گر پڑے ضرور وضوٹوٹ جائے گا۔

بہرنہج سونے کی حالت میں اس وقت وضوٹوٹے گا جب اعضا اتنے سست ہو جائے کہ بادسری (ہوا نکلنے) کا گمان غالب ہو ورنہ مجرد سونے سے وضو نہیں ٹوٹتا اسی واسطے علامہ شامی صفحہ ۱۰۴ جلد اول ردالمحتار مصری میں تحریر فرماتے ہیں:

☆ کہ جو شخص ایسا معذور ہو کہ ہر وقت اس کی ریاح خارج ہوتی رہتی ہے ایک ادنیٰ وقت نماز کا بھی نہیں گزرتا مگر بادسری (ہوا خارج ہوتی) رہتی ہے یا ہر وقت قطرہ آتا رہتا ہے تو اس کا وضو اگر اول وقتِ ظہر میں کیا ہے جب تک عصر کا وقت نہ آئے' اس خاص بیماری سے جس میں وہ مبتلا ہے خواہ وہ قطرہ کی بیماری ہو یا خون بہنے کی یا کوئی اور اس کا وضو نہ ٹوٹے گا۔

لٰہذا اگر بادسری کی بیماری ہو اور اول وقتِ عشا یا ظہر میں وضو کر کے سو جائے تو جب تک ظہر یا عشا کا وقت باقی رہے گا اس کا وضو نہ ٹوٹے گا۔

اور عاقل بالغ مرد عورت اگر نماز میں اتنی آواز سے ہنس دیں کہ دوسرے سن لیں، جب بھی وضو ٹوٹ جائے گا۔ نابالغ کا نہ ٹوٹے گا۔ ان امور کے سوا اور کسی بات سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ درمختار، ہدایہ، شامی وغیرہ تمام کتبِ فقہ میں اس طرح لکھا ہے۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی المفتی
فی جامع اکبر آباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......18﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین مفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ نسوار یا ناس کا ناک میں چڑھانا ناقض وضو ہے جیسے کہ فتاویٰ عالمگیریہ میں لکھا ہے۔

وان استعط فخرج السعوط من الفم و كان ملاء الفم نقض و ان خرج من الاذنين لا ينقض كذا فى السراج الوهاج.

صفحه ۴۰ سطر ۳۰ مطبوعه دهلی مطبع احمدی ۱۲۷۸ھ

(ترجمہ: اگر کسی شخص نے ناک میں کوئی چیز چڑھائی۔ وہ چیز منہ سے باہر نکلی اور منہ بھر ہوتو وضوٹوٹ جائے گا اور اگر دونوں کانوں سے نکلی تو نہ ٹوٹے گا۔ السراج الوہاج)

اوراس کے مطابق بحوالہ فتاویٰ عالمگیریہ اپنے رسالہ میں ایک عالم اس نسوار کو ناقض وضو لکھتے ہیں اونکی عبارت یہ ہے فتاویٰ عالمگیریہ میں لکھا ہے کہ خروج نسوار کا اندرون دھن ناقض وضو ہے پس معلوم ہوا اس سے کہ تمبا کو کی نسوار لینے والے جو غافل ہیں اس مسئلہ سے واجب ہے ان پر اعادہ تمام عمر کی نمازوں کا۔

انتهى بلفظه رساله شرب الدخان صفحه ۵۴ سطر ۱۱۔۱۲۔۱۳۔۱۴۔

مہربانی فرما کر جواب سے مرہونِ منت فرمادیں۔ خداوند کریم اجر دے۔

اس نسوار کا لینا بعض اشخاص بالخصوص پیشوایان وامامِ نماز نے تو یہاں تک اختیار کرلیا ہے کہ عین نماز میں یعنی ختم امامت و جماعت یا جماعت تراویح کے ترویحہ میں بار بار ناک میں چڑھاتے ہیں اور تھوکنے کے وقت وہی نسوار کا کھنگار یا بلغم بعینہ حلق میں آ کر منہ سے برآمد ہوتی ہے۔ فتاوی عالمگیریہ اور دیگر کتب فقہ کو بغور ملاحظہ فرما کر اطمینان فرمائیں۔ فقط زیادہ والسلام

۱۱ ذی الحجہ ۱۹۱۶ء

قاضی فضل احمد انسپکٹر پولیس لودھیانہ پنجاب

الجواب

بسم الله الرحمن الرحیم

اللھم رب زدنی علما

عبارت فتاویٰ عالمگیریہ سے ظاہر ہے کہ سعوط یعنی ناس یا نسوار اس وقت ناقض وضو ہے جب سعوط منہ سے منہ بھر کر نکلے اور منہ بھر کے نکلنے کی تعریف صحیح یہ ہے جو فتاوی عالمگیریہ میں محیط سے نقل کی ہے۔

والحد الصحیح فی ملاء الفم ان لا یمکنہ امساکہ الابکلفۃ و مشقۃ کذا فی محیط السرخسی [1]

☆(ترجمہ: منہ بھر کی صحیح تعریف یہ ہے کہ اسے دقت اور مشقت کے بغیر روکنا ممکن نہ ہو)

اور منہ بھر کر نکلنا غیر ممکن ہے جب تک سعوط معدہ تک جا کر معدہ کی نجاست سے مل کر باہر نہ نکلے جس کو قے کہتے ہیں جو بالاتفاق اگر منہ بھر کے ہو ناقض وضو ہے۔ چنانچہ یہ امر بہت ظاہر ہے اس دوسرے مسئلہ سے جو فتاوی مذکور صفحہ ۱۱ جلد اول میں مسئلہ مذکورہ سوال کے اوپر ہی مسطور ہے

و لو صب دھنا فی اذنہ فمکث فی دماغہ ثم سال من اذنہ او من انفہ لا ینقض الوضوء و عن ابی یوسف رحمۃ اللہ علیہ ان خرج من فمہ فعلیہ الوضوء لانہ لا یخرج من الفم الابعدما وصل الی المعدۃ وھی محل النجاسۃ فصارلہ حکم القیٔ کذا فی المحیط [2]

☆(ترجمہ: اگر کان میں تیل ٹپکا یا وہ دماغ میں رک گیا پھر کان یا ناک سے بہا تو وضو نہ ٹوٹے گا۔ اور حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے ☆ کہ اگر وہ تیل منہ سے نکلا تو اس پر وضو کرنا لازم ہے کیوں کہ وہ معدہ میں پہنچے بغیر منہ سے نہیں نکل سکتا اور وہ نجاست کا مقام ہے اس کا حکم قے کا ہو جائے گا۔ محیط)

---

[1] الفتاوی العالمکیریہ مع ترجمہ اردو جلد اول صفحہ ۵۶ مطبوعہ المکہ پریس لاہور

[2] الفتاوی العالمکیریہ مع ترجمہ اردو جلد اول صفحہ ۵۲ مطبوع المکہ پریس لاہور

☆ اور یہی مضمون تمام کتب فقہ سے ثابت ہے البتہ نسوار کا بلاوجہ اس کثرت سے سونگھنا خصوصاً نماز کے وقت جس کی دھانس اور بدبو سے عام مسلمان نمازیانِ مسجد نسوار نہ سونگھنے والوں کو تکلیف پہنچے بلاشبہ مکروہ ہے۔

چنانچہ حدیث صحیح سے ثابت ہے:

☆ کہ بعلت بدبو اور ایذا نمازیوں کے کچی پیاز لہسن کھا کر مسجد میں آنے سے سرورِ عالم ﷺ نے قطعاً ممانعت فرمادی:

حیث قال صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم من اکل من ھذہ الشجرۃ فلا یقربن مسجدنا[1]

☆(ترجمہ: جس نے اس پودے سے کچھ کھایا ہو وہ ہماری مسجد کے قریب بالکل نہ آئے)

اور درمختار میں ہے

ویکرہ اکل نحو ثوم و یمنع منہ و کذا کل موذ ولو بلسانہ[2]

☆(ترجمہ: مسجد میں لہسن کی مانند بدبودار چیز کھانا مکروہ ہے اور اس سے روکا جائے گا اور ایسے ہی ایذاء دینے والی ہر چیز سے روکا جائے گا ☆ اگر کوئی زبان سے ایذا دے تو اسے بھی مسجد آنے سے روک دیا جائے گا)۔

حررہ العبد العاصی رحمۃ ربہ القوی

محمد دیدار علی الرضوی مفتی جامع مسجد اکبر آباد

❁❁❁❁❁

---

[1] اصحیح البخاری جلد ۱ صفحہ ۲۱۶ مطبوعہ دار الفکر

iiصحیح مسلم کتاب المساجد / ۱ / ۷ مطبوعہ عیسی الحلبی

سنن ابی داؤد کتاب الأطعمہ حدیث رقم ۲۱

iiiوغیرہ من کتب الاحادیث تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو

موسوعہ اطراف الحدیث النبوی جلد ۸ صفحہ ۱۴۰، ۱۴۳

[2] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۴۸۹ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر......19﴾

سوال

غسل کے وضو سے اگر غسل برہنہ کیا جائے تو نماز جائز ہے یا نہیں؟ اگر کسی کو برہنہ دیکھ لیا تو وضو میں کچھ خرابی آتی یا نہیں؟ اور اس سے نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

غسل کے وضو کے بعد دوبارہ وضو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اگرچہ برہنہ ہی غسل کیا ہو۔ ☆اس واسطے کہ اپنی شرمگاہ یا دوسرے کی شرمگاہ دیکھنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ البتہ اپنی شرمگاہ کو برہنہ چھو لینے سے امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ مگر دیکھنے سے تو ان کے نزدیک بھی نہیں ٹوٹتا۔ اور امامِ اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک تو نہ دیکھنے سے ٹوٹے نہ چھونے سے۔ لہٰذا اگر شرمگاہ بعد وضو چھو لی ہو تو بلحاظِ تحقیقِ امام شافعی رحمہ اللہ اگر وضو کر لے اولیٰ ہے نہ کہ ضروری۔ فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......20﴾

سوال

جناب پیش امام صاحب بعد سلام سنت الاسلام درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات تحریر فرمائیں؟

1۔ حوض دہ دردہ گز یعنی چالیس گز گھیرے کا ہے۔ کتنا گہرا ہونا چاہیئے؟

2۔ حوض پر چھت ڈال کر پانی ڈھاپنا ہو تو کتنے حصے کو ڈھانپ سکتے ہیں یا تمام حوض کو کھلا رکھنا ضروری ہے۔

3۔ تھوک یا ناک سے نکلنے والے مواد کو پانی میں ڈالنے سے کچھ نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لیے حوض کے ساتھ علیحدہ نالی بنالی جائے تو بہتر ہے یا نہیں؟ حوض میں ڈالنے سے کچھ شرعی ممانعت تو ہونی چاہیئے۔

سائل: محمد ساجی سلمان راجپوری

۹ شوال ۱۳۳۴ھ

الجواب

حامدا ومصلیا و مسلما و علیکم السلام و رحمة الله و بر کاته .

☆ حوض کم از کم دس گز لمبا اور دس گز چوڑا اور کم از کم اتنا گہرا ہونا چاہیئے کہ اس میں بلا تکلف چلو بھر کر پانی لے سکیں اور پانی خراب نہ ہو۔ ☆ اور کسی کا تھوک سینک چونکہ پاک ہے پانی ان سے ناپاک نہیں ہوتا۔ مگر علیحدہ تھوک وغیرہ کے واسطے نالی بنا دینا اولیٰ وافضل ہے تا کہ پانی صاف رہے اور لوگوں کو نفرت پیدا نہ ہو اور اگر بقدر وضو کی جگہ کے باقی سب حوض پاٹ دیا جائے جائز ہے۔ اس طرح ہمارے فقہا کی کتب حنفیہ میں ثابت ہے۔

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر...... 21﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ علاوہ چمڑے کے موزوں' کپڑے کے موزوں پر یا اون' کرچ کے موزہ پر یا سوراخ دار موزہ پر مسح کرنا درست ہے یا نہیں۔

سائل بدرالدین ۱۲دسمبر ۱۹۱۵ء

الجواب

هو الملهم للحق و الصواب

بانات' کپڑا' ٹاٹ وغیرہ کا موزہ جو اس قدر گاڑھا ہو کہ پانی نہ چھنے اور بغیر باندھے ٹخنے سے چمٹا رہے اس پر مسح کرنا درست ہے۔ اور سوراخ بقدر تین انگلی پاؤں کے جو سب سے چھوٹی ہیں مسح کو ناجائز کر دیتا ہے اور اس سے کم پر جائز ہے۔ **في المراقي الفلاح.**

و لو كان الخفان متخذين من شيء ثخين غير الجلد كلبد وجوخ و كرباس يستمسك على الساق من غير شد لا يشف الماء وهو قولهما وإليه رجع الامام وعليه الفتوى لأنه في معنى المتخذ من الجلد... والرابع خلو كل منهما أي الخفين عن خرق قدر ثلاث اصابع من اصغر القدم [۱]

(ترجمہ: موزے اگر چمڑے کے علاوہ کسی گھنی بُنی ہوئی چیز جیسے کہ نمدہ' اونی کپڑا (کمبل) کھدرُ سے بنائے ہوئے ہوں اور باندھنے کے بغیر پنڈلی پر رکے رہیں اور پانی ان سے گذر کر پاؤں تک نہ پہنچے (تو ان پر مسح کرنا جائز ہے) یہ صاحبین کا قول ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی طرف رجوع فرما لیا اور اسی پر فتویٰ ہے کیوں کہ ایسے موزے چمڑے سے بنائے ہوئے موزوں کے معنوں میں ہیں۔ (اور مسح کے جائز ہونے کی) چوتھی شرط یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک قدم کی چھوٹی تین انگلیوں کی مقدار کی پھٹن سے خالی ہو) **والله أعلم بالصواب.**

عاجز محمد رمضان

مفتی واعظ جامع مسجد آگرہ ۱۲/دسمبر ۱۹۱۵ء

---

[۱] مراقی الفلاح شرح نور الایضاح علی هامش الطحطاوی صفحه ۶۹'۷۰ مطبوعه نور محمد اصح المطابع کراچی

﴿فتویٰ نمبر......22﴾

سوال

ایک شخص کوئی جب بستر سے اٹھا غسل (فرض) پایا اور وہ حالتِ بیماری میں ہے یا موسم سردی کا ہے یا دیگر اور اسباب مانع ہیں۔ اگر نہائے تو اس کو ضرر پہنچے۔ اور نماز کا وقت موجود ہے تو ایسی حالت میں وہ کیا کرے ؟ تیمم اسے کیسا ہے؟ نماز ادا کرنا ہوگی یا کہ نہا کر قضا نماز ادا کرے گا؟ اور ایسے شخص کو مسجد میں جانا اور کھانا کھانا کیسا ہے؟

۱۷رمضان ۱۳۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیمار یا ضعیف کو اگر نہانے کی حاجت ہو جائے اور مرض بڑھنے کا یقین ہو' مجرد حیلہ جوئی نہ ہو' لازم ہے کہ غسل کا تیمم کر کے نماز پڑھے۔ ☆ اور چونکہ تیمم خلیفہ غسل کا ہے جس طرح کھانا پینا' مسجد میں جانا بعد غسل کے جائز ہے بعد تیمم کے بھی جائز ہے۔ ☆ البتہ جب طاقتِ غسل آ جائے اور خوف زیادتیِ مرض غسل سے نہ رہے' غسل کرنا واجب ہو جائے گا اور تیمم فوراً ٹوٹ جائے گی۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ

ابو محمد محمد دیدار علی المفتی

فی جامع اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر......23﴾

سوال

ہاتھی پر امام چڑھ جائے اور نماز پڑھائے تو وہ نجس ہوگا یا نہیں؟

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

ہاتھی پر چڑھنے سے جب تک کوئی نجاست یا ہاتھی کا پسینہ نہ لگے کوئی ناپاک نہیں ہوتا۔ فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبرآباد

﴿فتویٰ نمبر......24﴾

سوال

دھوبی اگر روئی دار کپڑے کو دھلا وے تو ناپاک سمجھا جائے گا یا نہیں؟

الجواب

دھوبی اگر روئی کا کپڑا دھلا وے تو کوئی وجہ اس میں شبہ کی نہیں ہے کیوں کہ روئی کے کپڑے کا یہی حکم ہے کہ اس کو بھگو کر اچھی طرح نچوڑ دیا جائے تو پاک ہو جاتا ہے۔ کذا فی منیۃ المصلی [1]

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

❁❁❁❁❁

---

[1] منیۃ المصلی : صفحہ ۱۴۸ مطبوعہ مکتبہ قادریہ جامعہ نظامیہ لاہور

وقیل إذا غسل الثوب مرة وعصره بالمبالغة يطهر وقيل لا يطهر ما لم يغسل ثلاث مرات ويعصر فی کل مرة والفتوی علی الأول

(ترجمہ: بعض علماء نے فرمایا جب کپڑے کو ایک مرتبہ دھولیا اور خوب نچوڑ لیا تو پاک ہو جاتا ہے اور بعض علماء نے فرمایا جب تک تین بار نہ دھویا جائے اور ہر بار نہ نچوڑا جائے پاک نہیں ہوتا اور فتویٰ پہلے قول پر ہے)

﴿فتویٰ نمبر......25﴾

سوال دستیاب نہ ہوسکا۔

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

جب تک نجس پانی کے دودھ وغیرہ میں ملانے کا یقین نہ ہواس دودھ دہی کا بلاشبہ کھانا جائز ہے۔
☆ مجرد شبہ سے کوئی شے ناپاک نہیں ہو جاتی ۔اور جس کا مسلمان کو کھانا پینا جائز ہے اس کا ثواب پہنچانا بھی عبادت ہے۔ فاتحہ دلانا جائز ہے۔☆ اس واسطے کہ اصل ہر چیز میں شرعا طہارت ہے۔ تاوقتیکہ یقینِ نجاست نہ ہو جائے کوئی شے نجس نہیں ہو جاتی۔

☆ **الیقین لا یزول بالشک** قاعدہ مسلمۂ فقہاء ہے۔☆ مگر حتی المقدور مشرکوں کے کھانے پینے کی چیزوں سے بچنا افضل ہے۔اور ان کا استعمال میں لانا مکروہ۔

چنانچہ صفحہ ۴۸۳ جلد خامس فتاوی عالم گیریہ میں ہے:

ویکرہ الاکل والشرب فی اوانی المشرکین قبل الغسل مع ھذا لواکل اوشرب فیھا قبل الغسل جاز و لا یکون آکلا و لا شاربا حراما و ھذا اذا لم یعلم بنجاسۃ الاوانی فاما اذا علم فانہ لا یجوز ان یشرب و یاکل منھا قبل الغسل لو شرب اواکل کان شارباو آکلا حراما و ھو نظیر سور الدجاجۃ اذا علم انہ کان علی منقارھا نجاسۃ فانہ لا یجوز التوضی بہ والصلوۃ فی سراویلھم نظیر الأکل والشرب من أوانیھم.[1]

☆ (ترجمہ: مشرکین کے برتنوں میں ان کو دھونے سے پہلے کھانا پینا مکروہ ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی دھونے سے پہلے ان میں کھا پی لے تو جائز ہے۔ایسی صورت میں وہ حرام کھانے یا پینے والا نہ ہوگا۔ یہ حکم اس

---

[1] الفتاویٰ العالم گیریہ : جلد ۵ ، صفحہ ۳۴۷، مطبوعہ مصر

صورت میں ہے جب کہ اسے ان برتنوں کے ناپاک ہونے کا علم نہ ہو۔ اور جب اسے ان کا ناپاک ہونا معلوم ہو جائے تو ان سے کھانا پینا جائز نہیں ہے جب تک دھو کر ان کو پاک نہ کر لے۔ اگر ایسی حالت میں کھایا یا پیا تو حرام کھانے اور حرام پینے والا ہو گا۔ اس کی مثال مرغی کے جھوٹے کی سی ہے کہ جب معلوم ہو کہ اس کی چونچ پر نجاست ہے تو اس کے جھوٹے پانی سے وضو کرنا جائز نہیں ہے۔ اور ان کے پاجاموں اور دیگر کپڑوں میں نماز ادا کرنا ان کے برتنوں میں کھانے پینے کی مانند ہے)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ
ابو محمد محمد دیدار علی المفتی
فی جامع اکبر آباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......26﴾

سوال

مردہ کی چیرا پھاڑی سے وضو یا غسل میں تو کچھ خرابی نہیں آتی؟

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

مردے کی چیر پھاڑ سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا نہ غسل۔ البتہ اگر اس کا خون یا گوشت ناپاک بدن سے لگ جائے اس کا دھونا اور پاک کرنا ضرور لازم ہے۔ واللہ اعلم و علمہ احکم

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبر آباد

نماز

﴿فتویٰ نمبر...... 27﴾

سوال

عید میں اذان کس طرح ہے اور کون آیہ ہے اور چھ تکبیر کس طرح پڑھنا چاہئے تکبیر تحریمہ چھ میں شامل ہے یا نہیں اس کا مسئلہ تحریر فرمایئے گا۔

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

عید کے دن نہ اذان کہنا سنت ہے نہ تکبیر کہنا۔☆ اگر راستہ میں آہستہ آہستہ عید گاہ تک آدمی آتے نظر آئیں اور وقت تنگ ہو تو رومال وغیرہ سے اشارہ کر دینے کا' الصلوۃ جامعۃ پکار دینے کا مضائقہ نہیں۔

چنانچہ صفحہ ۲۱۰ فتح القدیر مطبوعہ مصر مع الہدایہ میں ہے:

فلا یوذن للعید والکسوف و فی مسلم عن جابر بن سمرۃ صلیت مع رسول اللہ ﷺ العید غیر مرۃ ولا مرتین بغیر اذان ولا اقامۃ ☆و عن عائشۃ رضی اللہ عنہا خسفت الشمس علی عھد رسول اللہ ﷺ فبعث منادیا ینادی بالصلوۃ جامعۃ[1] فقط

☆(ترجمہ: عید اور کسوف کی نماز کے لیے اذان نہ پڑھی جائے۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نمازِ عید ایک یا دو مرتبہ نہیں کئی مرتبہ' بغیر اذان اور اقامت کے پڑھی۔☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانۂ اقدس میں سورج گرہن لگا آپ نے ندا کرنے والے کو بھیجا کہ وہ پکار کر کہے کہ نماز با جماعت ہونے والی ہے)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی مسجد جامع اکبر آباد

---

[1] فتح القدیر: جلد ۱ صفحہ ۱۶۷ مطبوعہ مصر

﴿فتویٰ نمبر......28﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ بعد دفن کرنے میت کے قبر کا منہ بند کر کے اور مٹی ڈال کر اس موت پر اذان دینا کیسا ہے۔

۲۷ شعبان ۱۳۳۶ھ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ محکمہ ٹھیکہ ضلع بانس بریلی مسکونہ تاج گنج آگرہ کڑہ عمر خاں

الجواب

وهو الموفق۔ بسم الله الرحمن الرحیم۔

اللهم رب زدنی علما

اذان کہنا، دفن کے وقت، مٹی ڈالنے سے پہلے یا پیچھے متقدمین فقہا کے نزدیک کہیں نظر سے نہیں گزرا اور علماءِ متاخرین سے بعض مستحب فرماتے ہیں اور بعض اس کی تردید فرماتے ہیں چنانچہ صفحہ ۲۸۳ درالمختار میں ہے:

قد یسن الأذان لغیر الصلاة کما فی اذن المولود والمصروع والغضبان ومن ساء خلقه من انسان أو بهیمة وعند مزدحم الجیش و عند الحریق و عند انزال المیت القبر قیاسا علی اول خروجه للدنیا لکن رده ابن حجر فی شرح العباب تغول الغیلان ای عند تمرد الجن لخبر صحیح فیه اقول و لا بعد فیه عندنا الخ أی لأن ما صح فیه الخبر بلا معارض فهو مذهب للمجتهد و ان لم ینص علیه لما قد مناه فی الخطبة عن الحافظ ابن عبدالبر والعارف الشعرانی عن کل الائمة الاربعة انه قال اذا صح الحدیث فهو مذهبی علی انه فی فضائل الاعمال یجوز العمل بالحدیث الضعیف[۱]۔

---

[۱] رد المحتار : جلد اول صفحه ۲۸۳ ،مکتبه رشیدیه کوئٹه

(ترجمہ: بلا شبہ نماز کے علاوہ اور مواقع پر اذان مسنون ہے جیسا کہ نومولود غم میں مبتلا مرگی کے مریض غصے والے اور انسانوں اور چوپایوں میں جس کے اخلاق میں برائی آ جائے ان سب کے کانوں نیز فوج کے جھمگٹے آگ لگنے اور میت کے قبر میں اتارنے کے وقت اذان مسنون ہے۔ لیکن حضرت حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے شرح العباب میں اس کی تردید کی ہے۔ ان مواقع کے علاوہ جنات کی سرکشی کے وقت بھی اذان پڑھنا مسنون ہے کیوں کہ اس بارے میں صحیح حدیث وارد ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہمارے نزدیک اس میں کوئی بعد نہیں ہے۔ کیوں کہ جس عمل کے

بارے میں معارض صحیح حدیث وارد ہو وہ مجتہد کا مذہب ہوتا ہے اگر اس پر مجتہد نص بیان نہ کرے کیوں کہ خطبہ میں ہم حافظ ابن عبد البر اور عارف شعرانی نے ائمہ اربعہ سے یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ جب حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔ علاوہ بریں حدیث فضائلِ اعمال میں وارد ہے جہاں ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز ہے)

لہٰذا اگر اذان وقتِ دفن کہی جائے اس میں مزاحمت کرنا ہرگز نہ چاہئے اور اس درجہ اس کا ثبوت بھی نہیں ہے کہ ضرور ہی کہی جائے۔ واللہ اعلم و علمہ احکم

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی المشہدی المفتی شہر آگرہ۔
واعظ جامع مسجد اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر......29﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اندریں صورت کہ تکبیر صف میں ایک مقام پر کھڑے ہو کر مقتدی کہے یا دروازہ مسجد سے تکبیر شروع کرے اور چلتا جائے اور صفِ اولی تک ختم کر دے جس طرح یہاں لاہور میں مولانا اکرام الدین صاحب بخاری امام مسجد وزیر خان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تعاملِ علماءِ بخارا اسی طرح ہے۔

۳ رجب ۳۶ھ

فضل الدین طالب علم

حمایت الاسلام لاہور

الجواب

بسم الله الرحمن الرحيم۔

اللهم رب زدنی علما

درمختار مطبوعہ مصر علی هامش رد المحتار کے صفحہ ۲۹۱ میں ہے

کره مشیه فی اقامته[1]

(ترجمہ: تکبیر میں چلنا مکروہ ہے)

قال الشامی رحمه الله

قوله: كره ذكره فی روضة الناطفی واختلفوا عندا تمامها ای عند قد قامت الصلوة فقيل يتمها ماشيا و قيل فی مكانه اماما كان الموذن او غيره و هو الاصح كما فی البدائع و قصر فی السراج الخلاف على ما اذا كان اماما فلو غيره يتمها فی موضع البداية بلا خلاف[1]

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۲ صفحه ۵۹، ۶۰ مطبوعه دار التراث العربی بیروت

(ترجمہ: قولہ: تکبیر میں چلنا مکروہ ہے۔ روضۃ الناطفی میں اسے ذکر کیا۔ اقامت کے اختتام یعنی قد قامت الصلوۃ کے وقت چلنے میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا اسے چلتے چلتے مکمل کرے، اور بعض نے فرمایا اپنی جگہ پر کھڑا رہ کر اسے
مکمل کرے اگرچہ مؤذن ہی امام ہو یا امام اس کے علاوہ کوئی اور ہو۔ اصح قول یہی ہے جیسا کہ البدائع میں ہے۔ اور السراج الوہاج میں اختلاف صرف اسی صورت میں ذکر کیا ہے جب کہ مؤذن خود امام ہو اور اگر امام کوئی اور ہو تو جس جگہ کھڑے ہو کر اقامت کا آغاز کیا تھا اسی جگہ پر اسے مکمل کرے اس سے میں کوئی اختلاف نہیں ہے)

یعنی اصح قول تو یہی ہے کہ مکبر امام ہو خواہ موذن مقتدی جہاں تکبیر شروع کرے وہاں ہی ختم کرے۔ اسی طرح بدائع الصنائع میں ہے مگر بعض فرماتے ہیں کہ اگر امام ہی موذن و مکبر ہو تو تکبیر صفِ اولی میں کہہ کر قد قامت الصلوۃ کہتا ہوا مصلی تک تمام کردے اور اگر مکبر و موذن غیرِ امام ہے تو بالاتفاق جہاں تکبیر شروع کرے اسی جگہ تمام کردے

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ
ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی المفتی
فی جامع اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر......30﴾

سوال

انگوٹھے (چومنا) وقتِ نامِ پیغمبر علیہ السلام بعض کتب مثل جامع الرموز کنز العباد خزانۃ الروایات وغیرہ مستحب لکھا ہے۔ مولانا عبدالحی انار اللہ برہانہ نے حدیث مرویہ اور روایات منقولہ کو ضعیف لائق اعتبار نہیں فرمایا ہے ما۔ لہٰذا کیا ہوگا؟

سائل: مولوی مطیع اللہ صاحب توپ خانہ جامع مسجد

۱۳ اپریل ۱۹۱۶ء

الجواب

هو المصوب

تقبیل ابہامین وقتِ نامِ رسول علیہ السلام بعض روایاتِ ضعیفہ میں وارد ہے۔ جن کی بابت بعض نے ضعف کا خیال اور بعض نے موضوع فرمایا ہے۔ لہٰذا جو تقبیل کرتا ہو اس کی منع نہ کیا جائے گا اور جو نہ کرتا ہو اس کو حکم نہ دیا جائے گا۔ کیوں کہ فضائلِ اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل منع نہیں اور لا یصح لا یثبت کے لکھ دینے سے حدیث کا موضوع ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ تحفۃ میں درباره ضعف و موضوعیت حدیث مسح علی الرقبہ لکھا ہے:۔

ما (الف) بعض فقہاء (تقبیل ابہامین را مستحب نوشتہ اند وحدیثے ہم دریں باب نقل می سازند مگر صحیح نیست۔

(ترجمہ: بعض فقہاے نے انگوٹھے چومنے کے مستحب لکھا ہے اور ایک حدیث بھی اس بارے میں نقل کرتے ہیں لیکن وہ حدیث صحیح نہیں ہے) مجموعہ فتاوی مولانا عبدالحی لکھنوی جلد ۳ صفحہ ۴۲ مطبوعہ ملک سراج الدین کشمیری بازار لاہور۔

(ب) أما فی الأذان فقد ورد ذلک (أی تقبیل الابهامین) فی احادیث مرفوعة وموقوفة کلها ضعیفة ولا یصح فی هذا الباب حدیث مرفوع. السعایة فی کشف ما فی شرح الوقایة: جلد ۲ : صفحه ۴۶: سهیل اکیڈمی لاهور

قال احمد بن حجر فی شرحه الفتح المبین لانه ان کان صحیحا فی نفس الامر فقد اعطی حقه والاما[1] لم یترتب علی العمل به مفسدة تحلیل و تحریم ولا ضیاع حق للغیر[2]

(ترجمہ: امام احمد بن حجر رحمۃ اللہ علیہ اپنی شرح الفتح المبین میں فرمایا چونکہ یہ حدیث در حقیقت صحیح ہے لہٰذا اسے اس کا حق دیا جائے گا بشرطیکہ اس پر عمل سے کوئی فساد نہ پڑے جیسا کہ حرام کو حلال قرار دینا یا حلال کو حرام قرار دینا اور نہ ہی اس سے کسی کے حق کا ضائع ہونا لازم آئے)

(وفیه) و ذلک لیس من باب الاختراع فی الشرع و انما هو ابتغاء فضیلة و رجاء هامع امارة ضعفه من غیر ترتب مضرة علیه[3] انتهی

(ترجمہ: شریعت میں یہ خود ساختہ حکم کے قبیل سے نہیں ہے بلکہ یہ عمل فضیلت کے حاصل کرنے اور اس کی امید کے لیے ہے باوجودیکہ ضعف کی علامت موجود ہے اور اس پر کوئی نقصان بھی مرتب نہیں ہوتا)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس فعل کو مسنون یا واجب سمجھنے سے انکار فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ مگر بدعت یا مکروہ یا عدمِ استحبابِ مشائخ مرقوم نہیں فرمایا جو باعث تکلیف ہو۔

هذا ما سنح لی عند التحقیق والله اعلم و حکمه احکم۔

کتبہ المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

❁❁❁❁❁

---

[1] لفظ "الا" تحفة الطلبه کے حاشیہ میں المطبع المصطفائی (۱۳۱۱ھ) اور ادارۃ المعارف والعلوم الاسلامیہ کراچی (۱۴۱۹ھ) دونوں مطبوعہ نسخوں میں موجود ہے لیکن یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

[2] تحفة الکملة علی حواشی تحفة الطلبة مع تحفة الطلبة ص ۱۱ شامل در مجموعہ رسائل اللکنوی: جلد اول: صفحہ ۲۵۹ مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی

[3] تحفة الکملة علی حواشی تحفة الطلبة مع تحفة الطلبة ص ۱۱ شامل در مجموعہ رسائل اللکنوی: جلد اول: صفحہ ۲۵۹ مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی

﴿فتویٰ نمبر......31﴾

سوال

زمانۂ طاعون ووبا میں اذان دینے میں بعض مقام پر بعد دفن مردہ اذان کا رواج دے دیا ہے۔ اس کی شرع میں کہاں تک اصل ہے۔

جناب مولوی غلام محی الدین خان صاحب

امام جامع مسجد شاہجہاں پور۔

۱۷ دسمبر ۱۵ء

الجواب

زمانۂ طاعون میں اذان دینا کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ ہاں وقتِ نزولِ بلیہ تکبیر ودعا کا حکم ہے۔ اہلِ اعمال نے اس کو دفعیہ کے واسطے مجرب سمجھ کر جاری کر دیا ہے۔

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

﴿فتویٰ نمبر......32﴾

سوال

اگر دو یا چار رکعت کی نیت باندھی اور پھر نماز میں خیال آیا کہ نیت غلط باندھی یعنی بجائے دو کے چار یا چار کے دو کی باندھ لی تو کیا کرنا چاہئے؟

۲۹ رمضان ۱۳۶ھ ڈاکٹر صغیر حسین گلاب خانہ آگرہ

الجواب

بسم الله الرحمن الرحيم۔

اللهم رب زدني علما

نیت نام دل کے قصد کا ہے۔ لہٰذا قبل تکبیرِ تحریمہ دل میں اتنا قصد ضروری ہے کہ میں ظہر کی نماز پڑھتا ہوں یا عصر کی قضا پڑھتا ہوں یا ادا فرض پڑھتا ہوں یا سنت۔ چنانچہ اگر وضو کے وقت یا گھر سے مسجد کو چلنے کے وقت بھی یہ قصد دل میں ہو اور وقت تکبیر تحریمہ مطلقاً کسی امر کا خیال نہ رہے اور اس وقت سے تکبیرِ تحریمہ تک علاوہ چلنے کے کوئی امر مفسدِ نماز مثل بات وغیرہ کے سرزد نہ ہو تو وہ نیت بھی معتبر ہوگی۔

☆ اور اگر قبل تکبیرِ تحریمہ نہ وقت تکبیر تحریمہ مطلقاً کچھ بھی نیت نہ ہو اور بعد تکبیرِ تحریمہ دل میں قصد کیا جائے کہ میں ظہر کے فرض پڑھتا ہوں یا سنت بقولِ قوی و مفتی بہ معتبر نہ ہوگی۔ اور بعد اس نیت کے اگر تکبیر تحریمہ دوبارہ نہ کہی جائے گی تو نماز نہ ہوگی۔ گو بقول علامہ کرخی بعد تکبیر تحریمہ بعد رکوع تک بھی نیت کر لی جائے مگر یہ غیر مفتی بہ ہے۔

☆ اور زبان سے نیت کرنا بغرضِ صحتِ عزمِ قلبی مستحب و مستحسن ہے۔ چنانچہ صفحہ ۲۳۱ ہدایہ مطبوعہ مصر مع الشروح الاربعۃ میں ہے:

و المتقدم على التكبير كالقائم عنده اذا لم يوجد ما يقطعه و هو عمل لا يليق بالصلوة و لا معتبر بالمتاخرة منها عنه لان ما مضى لا يقع عبادة لعدم النية وفى الصوم جوزت للضرورة والنية هى الارادة والشرط ان يعلم بقلبه اى صلوة يصلى اما الذكر باللسان فلا معتبر به و يحسن ذلك

لا جتمـاع عزيمته. ثم ان كانت الصلوة نفلا يكفيه مطلق النية و كذا ان كانت سنة فى الصحيح و ان كانت فرضا فلا بدمن تعيين الفرض كالظهر مثلا لا ختلاف الفروض۔ [1]

(ترجمہ: تکبیرِ تحریمہ سے پہلے نمازی کا کھڑا ہونا ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی شخص اس کے پاس کھڑا ہو جب تک اس کو قطع کرنے والی کوئی چیز نہ پائی جائے اس کا صرف کھڑا ہونا نماز میں شمار نہیں ہو سکتا۔ اور یہ ایک ایسا عمل ہے جو نماز کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اور تکبیرِ تحریمہ کے بعد نیت کا اعتبار نہیں ہے کیوں کہ نیت سے پہلے جو نماز کا حصہ ادا ہوا وہ عبادت نہیں ہوا کیوں کہ اس میں نیت شامل نہیں ہے۔ اور روزے کی صورت میں جواز ضرورت کی بنا پر ہے۔ ☆ اور نیت کے لیے شرط یہ ہے کہ اپنے دل سے جانے کہ کون سی نماز ادا کر رہا ہے۔ صرف زبان کے ساتھ اس کا ذکر کرنے کا اعتبار نہیں ہے اور دلی ارادہ کے ساتھ اس کا جمع ہونا مستحسن ہے۔ پھر اگر نماز نفل ہو تو مطلق نماز کی نیت کافی ہے صحیح قول کی رو سے سنت میں بھی حکم یہی ہے۔ اور اگر نماز فرض ہو تو فرض کو متعین کرنا مثلاً ظہر کی نماز ادا کرتا ہوں لازم ہے کیوں کہ فرض نمازیں مختلف ہیں)

اور تعدادِ رکعات میں اگر خطا ہو جائے مثلاً فرض ظہر میں دو کی نیت کرے اور فجر میں چار کی نیت کرے تو اس سے نماز میں کچھ نہیں ہوتا۔ جب ظہر کی پوری چار ادا کر لے اور فجر کی فقط دو رکعت پڑھے۔ چنانچہ ۳۰۹ در مختار مطبوعہ مصر مع الشامی میں ہے:

و لا بـدمـن التـعيـين عند النية لفرض و لو قضاء و و اجب دون تعيين عدد ركعاته لحصولها ضمنا فلا يضر الخطاء فى عددها [2] مختصرا بقدر الحاجة

(ترجمہ: نیت کے وقت 'فرض اگر چہ قضا ہو' اور اسی طرح واجب نماز کی تعیین ضروری ہے۔ ان کی رکعتوں کو متعین کرنا ضروری نہیں۔ کیونکہ ان کی نیت اس کے ضمن میں حاصل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ان کی تعداد میں غلطی کر دے تو اس سے کچھ نقصان نہیں ہوتا)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی مسجد جامع اکبر آباد

---

[1] الهدايه مع فتح القدير وغيره: جلد ۱ ' صفحه ۱۸۵ تا ۱۸۷ مطبوعه مصر

﴿فتویٰ نمبر......33﴾

سوال

کیا وجہ ہے کہ جب حدیث صحیح لاصلوة الا بفاتحة الکتاب موجود ہے تو اس کے عامل کو احناف خاطی کہتے ہیں۔ حدیث جو درجہ صحت کو پہنچ گئی اس کا عامل کس طرح خاطی ہوگا۔ جواب محققانہ نہ متعصّبانہ مرقوم ہو۔

سائل: عزیز اللہ خان بھوپال

۱۶ مارچ ۱۹۱۶ء

الجواب

هو المصوب

حدیث کے صحیح ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے معنی یا مطلب بھی صحیح ہوئے۔ خصوصاً جب کہ ترکیبِ نحوی اور اسلوبِ اہلِ عرب مختلف ہو۔ یہاں پر ظرف بفاتحہ الکتاب کا محذوف ہے اور ہر جگہ ظرف کا محذوف ہونا واجب ہے۔ پس عبارت یہ ہوئی کہ ☆لا صلوة کاملة الا بفاتحة الکتاب[1] .

☆ (ترجمہ: فاتحہ الکتاب کے بغیر نماز کامل نہیں ہوتی)

☆ جس طرح لا وضو الا بالسواک[2] .

(ترجمہ: مسواک کے بغیر نماز نہیں)

☆ لا صلوة لجار المسجد الا فی المسجد[3]

---

[1] i سنن الترمذی جلد اور صفحہ ۲۸۴ مطبوعہ دار الفکر بیروت
میں ان الفاظ سے یہ حدیث مروی ہے: لا صلوة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب
ii سنن ابن ماجہ جلد اور صفحہ ۲۵۷ مطبوعہ دار المعرفة بیروت
میں ان الفاظ سے مروی ہے۔ لا صلوة لمن لم یقرأ فیها بفاتحة الکتاب

[2]

[3] الجامع الصغیر مع شرحہ فیض القدیر جلد ۶ صفحہ ۴۳۱ مطبوعہ دار المعرفة بیروت

(ترجمہ: مسجد کے پڑوسی کی نماز سوائے مسجد کے نہیں ہے)

اور یہ خیال غلط ہے کہ عاملِ حدیث صحیح خاطی ہو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب تک اس کے معنے نہ معلوم ہوں اور عمل کرے گا تو بے شک خاطی ہوگا۔ فرب مبلغ اوعی من سامع[۱] حدیث موجود ہے یعنی سننے والے سے زیادہ نہ سننے والا سمجھنے والا ہوتا ہے اگر معنوں میں حصر لیا جائے گا تو اول اس کی سند چاہئے اور اگر عموم کیا جائے تو سینکڑوں احادیث کے معنی بگڑ جائیں گے۔

☆ چنانچہ لا مھدی الا عیسی[۲]

(ترجمہ: عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر کوئی مہدی نہیں)

☆ لا فتی الا علی[۳]

(ترجمہ: حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی جوان نہیں)

وغیرہ پس احادیث جو عدمِ جواز میں وارد ہیں ان کو اور اس حدیث کو مطابق کیا جائے گا۔ پس یا تو بوجہ تعارض دونوں کو چھوڑ دیں گے اور کتاب اللہ پر عمل کریں گے اور کتاب اللہ دوبارہ عدمِ قراءت ناطق ہے۔

اذا قرئ القران فاستمعوا له وانصتوا[۴]

(ترجمہ: جب قرآن مجید پڑھا جائے سنو اور خاموش رہو)

یا کثرتِ عاملین اصحاب پر جن میں مجتہدین خصوصاً خلفائے اربعہ کا فعل لائق حجت علی الغیر ہوگا اور وہاں بھی عدمِ قرأت مرجح ہے لہٰذا عملِ احناف عقلاً و نقلاً بالکل صحیح ہے اور اس کے خلاف خطا ہے۔

والله اعلم و حكمه احكم هكذا فهم من الميزان للشعرانی فلينظر اليه۔

المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

۱

۲

۳

۴ القرآن الحکیم: سورہ الاعراف آیت: ۲۰۴

﴿فتویٰ نمبر......34﴾

سوال

قرآنِ مجید کو تجوید سے پڑھنا کیسا ہے۔ اہلِ عرب صحیح پڑھتے ہیں یا اہلِ ہند۔ حرکات زیر زبر پیش معروف پڑھنا چاہیے یا مجہول۔ زید حرکات کو معروف مثل علمائے عرب کے پڑھتا ہے۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں اور غلط بتاتے ہیں۔ طریقۂ تعلیم وتلاوت میں قراءِ عرب کی تقلید جائز ہے یا حفاظِ ہند۔

سائل: حافظ رحمت اللہ

مدرسہ احمدیہ کہار آگرہ ۵ مارچ ۱۹۱۶ء

الجواب

قرآن شریف کو اس قدر (تجوید کے ساتھ) پڑھنا کہ جس میں وہ غلطی جس سے معنیٰ کا فساد لازم آئے، اس سے محفوظ رہے، واجب ہے۔ ☆اور بقیہ قواعدِ ترقیق وتفخیم وادغام وشدومد، ان کا جاننا افضل ومستحب ہے۔ اور قرآن شریف مطابق لغتِ عرب وقواعدِ نحویہ کے پڑھے۔

حدیث میں وارد ہے:

☆ **تعلموا اللحن فی القرآن کما تتعلمونه** [1]

(ترجمہ: قرآن مجید میں لحن کو سیکھو جس طرح کہ خود اس کو سیکھتے ہو)

☆ **و اللحن اللغة والنحو وایضا الخطاء فی الاعراب فھو من الاضداد مجمع البحار** [2]

☆(ترجمہ: لحن کا معنیٰ لغت اور نحو ہے نیز یہ لفظ اعراب میں غلطی کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے یہ لفظ اضداد سے ہے)

اقرء وا القرآن بلحون العرب وأصواتها وایاکم و لحون اهل العشق ولحون اهل

---

[1] مجمع بحار الانوار جلد۴ صفحہ۴۸۷ مکتبہ دار الایمان المدینة المنورة

[2] مجمع بحار الانوار جلد۴ صفحہ۴۸۷ مکتبہ دار الایمان المدینة المنورة

الکتابین ھو والإلحان جمع لحن ھو التطریب وترجیح الصوت وتحسین القراءۃ والشعر والغناء[1]

(ترجمہ: قرآن مجید کو عربی خوش آوازی اور عربوں کی آوزوں کے ساتھ پڑھو اہلِ عشق اور اہلِ کتاب کی سروں سے پرہیز کرو۔ لحون اور الحان دونوں لحن کی جمع ہیں اس کا معنی ہے سُر نکالنا آواز کو گھمانا، گانے، شعر اور قراءت کو اچھی طرح سے ادا کرنا)

ملا علی قاری شرح منظومۃ الجزری رحمہ اللہ علیہ میں لکھتے ہیں

الواجب علی القاری ان یعلم من علم النحو للقران المجید مقدار ما یمتنع عن اللحن الجلی المخل للمعنی و اما ما زاد علی ذلک من الترقیق والتفخیم والمدود و الادغام فھو امر مستحب. انتھی (حدیقہ)[2]

(ترجمہ: قاری پر واجب ہے کہ قرآن مجید کے لیے نحو اتنی مقدار میں سیکھے جس سے وہ لحن جلی سے بچ سکے جو معنی میں خلل انداز ہوتا ہے اور اس سے جو امور زائد ہیں جیسے باریک پڑھنا، پُر پڑھنا، مد کے ساتھ پڑھنا اور ادغام یہ مستحب امور ہیں)

اعراب کا معروف پڑھنا عموما مکروہ ہوگا کیوں کہ اکثر جگہ (لیا بالسنتھم[3]) کا حکم لازم آئے گا۔ مثلاً راعنا[4] راعینا پڑھنا تو غلط ہوگا اور حروف مدو لین کا فرق دشوار ہوگا۔ اور تقلید ان اہلِ عرب کی ہوگی جو صحت و لحن جانتے ہیں، والا فلا، ھکذا فی کتب القراء رحمۃ اللہ علیھم اجمعین

(علمائے قراءت رحمۃ اللہ علیہم کی کتابوں میں اسی طرح ہے)

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

---

[1] مجمع بحار الانوار جلد۴ صفحہ ۴۸۷ مکتبہ دار الایمان المدینۃ المنورۃ

[2] المنح الفکریۃ شرح المقدمۃ الجزریۃ صفحہ مطبوعہ قراءت اکیڈمی لاھور

[3] القرآن الحکیم : سورہ النساء: آیت : ۴۶

[4] القرآن الحکیم : سورہ البقرہ: آیت : ۱۰۴

﴿فتویٰ نمبر......35﴾

سوال

ضواد پڑھیں یا ظواد؟ قول فیصل کیا ہے۔

سائل: مولوی علاء الدین ضلع کھیڑی اودھ

۱۵اپریل ۱۹۱۶ء

الجواب

دراصل نہ ضواد ہے نہ ظواد بلکہ ضواض پڑھا جائے۔ زبان کی جڑ کو داڑھ میں لگا کر پڑھو تو نہ دواد ہو نہ ظواد۔ یہ ہے قول فیصل۔

اور رسالۂ مرسلہ میں نے دیکھا اس میں صرف اس قدر ہے کہ جو مشتبہ الصوت حروف ہیں ان کو ایک دوسرے کی جگہ پڑھنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ باقی یہ نہیں ہے کہ ض کو ظ اور ص کو س قصداً پڑھا کرو۔

واللہ اعلم و حکمه احکم.

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......36﴾

سوال

ضواد لفظ عربی میں کس طرح ہے اور بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ فارسی ہندی لوگوں کو ظاء پڑھنا جائز ہے۔افسوس اس مسئلہ کا اب تک فیصلہ نہیں ہوا مفصل جواب دیا جائے۔

ایک رسالہ ارشا دفی سلسلة الضاد بھی ارسال کروں گا۔

سائل: مولوی علاء الدین نکا حسن

پرگنہ کھیڑی موضع نگلہ

۲۳ فروری ۱۹۱٦ء

الجواب

اس مسئلہ میں اصل حرف اس قدر ہے کہ ضواد مشابہ دال ہے یا ظ کے ہے۔بس سب کے نزدیک مشابہ ظاء کے ہے۔

اس کا مطلب یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ ظ کے لہجہ سے پڑھا جائے یہ بالکل غلط ہے۔ ورنہ لازم آئے گا کہ ذ' ز' ظ' ض' س' ش سب ایک ہی آواز ہو جائیں۔ کیوں کہ ذ' ث' ظ' ض مخرج ذ' ث اور ظ' ض کا س ص کا الگ ہے یا قریب قریب ہے۔ پس معلوم ہوا کہ قرب مخارج کو اتحاد آواز لازم نہیں۔ بلکہ ہر ایک حرف اپنی اصلی صفت سے علیحدہ دوسرے حرف سے ہے۔

ض کا ادا کرنا زبان کی جڑ کو دانتوں سے رگڑ کر ہے جس میں آواز دال اور ظ کے درمیان رہتی ہے اور جو اس پر قادر نہ ہوں جیسے فارسی میں تو ان لوگوں کو جس لہجہ میں پڑھیں جائز ہے۔ اور اب ہند کو عوام میں یہ کہا جاتا ہے کہ ضواد یعنی؟ پڑھو۔ جو علمائے قدیم کا دستور ہے اور یہ خیال مہمل ہے کہ لفظ ضاد در اصل ظ یا ذ ہے تو ایک حرف قرآن سے حذف ہو گیا۔ جس کی بابت ارشاد ہے:

☆ انا افصح من نطق بالضاد[۱]۔

(ترجمہ: میں ضاد کا نطق کرنے والوں میں سب سے زیادہ فصیح ہوں)

دوسرے فارسی یا ہندی میں ح، ث، ص، ض، ط، ظ، ع، ق، ذ نہیں آتے تو مناسب ہے کہ یہ لفظ پڑھانے سے نکال دیئے جائیں اور اکثر غیر مقلدین دھوکہ دیتے ہیں اور دھوکہ کھاتے ہیں۔

صرف ضاد میں اس قدر طوالت ہی کیا اور حرفوں میں یہ حکم نہیں ہے کہ اگر بدل کر پڑھے گا تو نماز نہ ہو گی؟

اس مسئلہ میں کوئی فیصلہ طلب بات نہیں ہے۔ رہی علماء کی تحقیق تو وہ قیامت تک جاری رہے گی۔ عوام کو اس میں دلچسپی لینا غیر مناسب ہے۔ ان کو تو مفتی بہ مسئلہ پر عمل کافی ہے۔ خیر اس میں ہے کہ اس حرف کو نہ تو دال پڑھا جائے اور نہ ظ بلکہ درمیانی حرف زبان کی جڑ کو داڑھوں میں رگڑ کر نکالو تو صاف نکلتا ہے۔ ذرا سی توجہ درکار ہے۔ افسوس کہ اپنے کام کی تحقیق میں دنیا بھر کی تکلیف گوارہ ہو اور ایک حرف کا پڑھنا اور مشق کرنا ایسا دشوار ہو کہ قرآن سے نکالنے پر راضی ہو جائیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون.

هذا ماسنح لی عند التحقیق والعلم بجمیع المعلومات عند الله ما یلیق.

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

✿✿✿✿✿

---

[۱] المصنوع فی احادیث الموضوع صفحہ ۶ مطبوعہ محمدی لاہور

﴿فتویٰ نمبر...... 37﴾

سوال

اگر بجائے چار رکعت کے پانچ پڑھ لیں تو کیا کرنا چاہیے؟ یعنی چوتھی رکعت کے بعد بغیر سلام پھیرے کھڑا ہو جائے اور پڑھنا شروع کر دے اور پھر یاد آئے کہ یہ پانچویں رکعت ہے تو کیا کرنا چاہئے؟

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

☆ چار رکعت والی نماز میں بقدر التحیات آخر میں بیٹھنا فرض ہے۔ اور اس میں التحیات کا پڑھنا واجب ہے۔ ☆ جیسے بیچ کا قعدہ واجب ہے اور اس میں التحیات کا پڑھنا سنت ہے [1]۔

---

[1] پہلے قعدہ میں التحیات کے پڑھنے کی شرعی حیثیت کے بارے میں مراقی الفلاح شرح نور الایضاح علی ہامش الطحطاوی صفحہ نمبر ۱۳۶ میں ہے۔

ویجب قراءة التشهد فيه' ای فی الأول وقوله فی الصحیح متعلق بکل من القعود وتشهده. وهو احتراز عن القول بسنیتهما او بسنیة التشهد وحده.

(ترجمہ: پہلے قعدہ میں تشہد کا پڑھنا واجب ہے فی الصحیح کا تعلق قعدہ اور تشہد دونوں کے ساتھ ہے۔ یعنی صحیح قول یہ ہے کہ پہلا قعدہ واجب ہے اور اس میں تشہد کا پڑھنا بھی واجب ہے۔ اس سے دونوں کے سنت ہونے کے قول یا صرف تشہد کے سنت ہونے کے قول سے احتراز ہے)

اور الدر المختار علی ہامش رد المحتار جلد ا صفحہ ۳۴۴ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ میں ہے۔

(ھی ای من واجبات الصلاة) التشھدان (دونوں قعدوں میں تشہد پڑھنا واجب ہے)

ردالمحتار میں اس کی وضاحت یوں فرمائی۔

ای التشھد القعدة الأولی وتشھد الأخیرة.

(یعنی پہلے قعدہ کا تشہد اور دوسرے قعدہ کا تشہد پڑھنا واجب ہے)۔ محمد علیم الدین نقشبندی عفی عنہ

☆ لہٰذا اگر اخیر کا قعدہ کر کے پانچویں رکعت کو کھڑا ہوا ہے تو جب تک پانچویں رکعت کا سجدہ نہیں کیا ہے اگر یاد آ جائے فوراً بیٹھ کر درود دعا پڑھ کر اگر نہ پڑھی ہو سلام پھیر کر سجدہ سہو کر لے۔

اور اگر پانچویں رکعت کا سجدہ کرنے کے بعد یاد آئے تو چھٹی رکعت پڑھ کر بعد التحیات اور درود دعا سلام پھیر کر سجدہ سہو کر لے چار فرض ہو جائیں گے اور یہ دو رکعت زائد نفل ہو جائے گی۔

☆ اور اگر بغیر قعدہ اخیرہ پانچویں کو کھڑا ہو گیا تو پانچویں کے سجدہ سے پہلے اگر یاد آ جائے فوراً بیٹھ کر التحیات' درود' دعا پڑھ کر سلام پھیر کر سجدہ سہو کر لے۔ چاروں فرض کامل ہو جائیں گے۔

اور اگر پانچویں کا سجدہ کرنے کے بعد یاد آئے تو چھٹی رکعت پڑھ کر سجدہ سہو کرے یہ ساری نماز نفل ہو جائے گی اور فرض دوبارہ پڑھے۔ فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبرآباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......38﴾

سوال

اگر صرف التحیات پڑھ کر سلام پھیرے اور درود شریف بھول گئے تو کیا نماز ہوگی؟

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

اخیر قعدہ میں بعد التحیات درود پڑھنا سنتِ موکدہ ہے۔ اور اس کے بعد ادعیہ ماثورہ سے کوئی بھی دعا پڑھنا مستحب ہے۔☆ اور ترکِ سنت یا مستحب سے چونکہ سجدہ سہو نہیں آتا لہٰذا کلیہ مقرر کیا گیا ہے☆ کہ مستحب کے ترک سے نماز کا پھیرنا مستحب ہوتا ہے۔ اور ترکِ سنت سے نماز کا پھیرنا سنت اور ترک واجب سے اگر سجدہ سہو بھی ترک ہو جائے تو نماز کا اعادہ واجب ہوتا ہے۔ فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......39﴾

سوال

اگر الحمد شریف کے بعد کوئی اور سورت پڑھنا بھول گئے اور رکوع میں چلے گئے تو کیا کرنا چاہئے؟

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما۔

بعد الحمد سورت ملانا بھول کر رکوع میں چلا جائے مضائقہ نہیں۔ اس واسطے کہ سورت ملانا واجب ہے۔ ☆اور ترکِ واجب سے سجدہ سہو واجب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آخر میں سجدہ سہو بھی بھول جائے تو اس نماز کا دہرانا واجب ہے۔ اگر دوبارہ نہ پڑھے گا گنہگار ہوگا۔

☆ اور ایسی صورت اگر امام سے واقع ہو اور بوجہ ترک کرنے ضمِ سورت کے اور نہ کرنے سجدہ سہو کے اس نماز کو امام دوبارہ پڑھے تو اس نماز میں وہی نمازی شریک ہو سکتے ہیں جو اصل نماز میں شریک تھے۔ ☆دوسرے نئے نمازی اس جماعت میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اس واسطے کہ جو نماز امام نے اول پڑھی تھی فرض نماز تو وہی تھی۔ اب جو دوبارہ پڑھی جاتی ہے واجب ہے نہ کہ فرض۔ ☆اور نئے نمازیوں نے ابھی جو نماز فرض تھی وہی ادا نہیں کی۔ تو اس رفعِ نقصان کی نماز میں کس طرح شریک ہو سکتے ہیں۔

اور اگر رکوع سے وقت یاد آنے کے سورت ملانے کی غرض سے کھڑا ہو گیا تو اب بعد سورت ملانے کے دوبارہ رکوع کرے۔ اور آخر میں سجدہ سہو کرے اور اگر سجدہ سہو نہ کیا تو اس نماز کا اعادہ واجب ہوگا۔ فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......40﴾

سوال

قومہ اور جلسہ کا کیا حکم ہے۔ اگر قومہ ترک ہو جائے تو نماز ہو جائے گی یا نہیں۔

جناب مولوی غلام محی الدین خان صاحب
امام جامع مسجد شاہجہاں پور۔ ۷ ادسمبر ۱۵

الجواب

قومہ اور جلسہ التحیات کا ایک ہی حکم ہے۔ جن کے نہ کرنے سے نماز کا اعادہ کرے گا۔ اگر سجدہ سہو نہ کیا ہو۔ ذخیرہ میں ہے۔

انما القیام بینھما و القعود بین السجدتین فرض عند ابی یوسف فترکہ تبطل الصلوۃ عندہ و عندھما الواجب وھو الاصح المذکور فی شرح البخاری. فیجب بترکہ سجود السھو[۱]

(ترجمہ: رکوع اور سجدہ کے درمیان قیام اور دونوں سجدوں کے درمیان قعود حضرات امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے نزدیک فرض ہے لہذا اس کا ترک آپ کے نزدیک نماز کو باطل کردے گا اور امام اعظم اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک وادب ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے جو کہ شرح بخاری میں مذکور ہے۔ لہذا اس کے ترک سے سجدہ سہو واجب ہوگا)

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

✿✿✿✿✿

---

[۱] ذخیرہ

﴿فتویٰ نمبر......41﴾

سوال

جب ایک شخص کوامام مسجد، متولی نے مقرر کیااور نمازی دوسرے امام سے راضی ہیں اور اول کے پیچھے نماز پڑھنے سے منکر ہیں۔تو شرعاً کیا حکم ہے؟

ازمحلّہ میوہ کڑہ

۵مارچ ۱۹۱۶ء

الجواب

هو المصوب

اگراہلِ محلہ نمازیوں کاامام مقرر کردہ یا تشخیص شدہ افضل ہے تو متولی کا تقرر نہ مانا جائے گا اور اگر برعکس ہے تو اس کا تقرر صحیح ہے۔غنیۃ المستملی میں ہے۔

و ان تنازع البانی فی نصب الامام والموذن مع اهل المحلة فان کان من اختاره اهل المحلة اولی من الذی اختاره البانی فاختیار اهل المحلة اولی لان ضرره و نفعه عائد الیهم و ان کانا سواء فاختیار البانی اولی. کذا فی البزازیة والخلاصة[1]

(ترجمہ: اگرامام اورموذن کے مقرر کرنے میں مسجد کے بانی اور اہل محلہ میں اختلاف ہوجائے تو جس کو اہل محلّہ نے پسند کیا ہے وہ بانی کے پسندیدہ امام وموذن سے بہتر ہوتو اہل محلّہ کا پسند کردہ امام ومؤذن مقرر کرنا بہتر ہے کیونکہ اس کا نفع اور نقصان اہل محلّہ کی جانب راجع ہوتا ہے اور اگر دونوں برابر ہوں تو بانی کے پسندیدہ کو مقرر کرنا اولی ہے۔فتاوی بزازیہ اور خلاصہ میں اسی طرح درج ہے)

واللہ اعلم بالصواب

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

---

[1] غنیۃ المستملی فی شرح منیۃ المصلی صفحہ ۵۷۱ مطبوعہ دیوبند

﴿فتوی نمبر......42﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اندریں صورت کہ دو مرد و عورت اگر برابر کھڑے ہو کر نماز پڑھیں تو دونوں کی نماز ہو جائے گی یا مرد کی ٹوٹ جائے گی؟ اور اگر میاں بی بی نماز پڑھیں اور میاں امام ہو تو عورت کس طرح کھڑی ہو؟

۲۲ شوال ۳۶ھ　　　　از کلاں پلٹن عرف کالی پلٹن

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

اگر مکلف مرد اور عورت مشہاۃ مکلفہ دونوں ایک نماز میں ایک امام کے مقتدی ہوں خواہ ایک عورت کسی مرد کی اقتداء کرے اور امام نے امامت عورتوں کی یا ایک عورت کی نیت بھی کی ہو اور اس طرح جمیع حیثیات سے ایک نماز میں شریک ہوں یہ بھی شرط ہے کہ باعتبار جہت کے بھی شریک ہوں۔ پھر اس طرح ایک رکن کی مقدار برابر کھڑے ہوں کہ مرد کے بعض اعضا عورت کے بعض اعضا سے بلا حائل برابر ہو جائیں تو بلاشبہ اس مرد کی نماز جو عورت کے برابر ہوگا خواہ داہنی طرف ہو یا بائیں طرف فاسد ہو جائے گی۔ اور اگر امورِ مذکورہ سے ایک بھی شرط مفقود ہو جائے گی تو مرد کی نماز فاسد نہ ہوگی۔ مگر اگر امام نے وقت تکبیر تحریمہ میں امامت عورتوں کی نہ کی تھی تو مرد کی نماز مطلقاً فاسد نہ ہوگی۔ بلکہ عورتوں کی نماز فاسد ہو جائے گی۔

چنانچہ صفحہ ۵۶۹، ۵۷۰ کبیری میں ہے

اما (الترتیب) بینھم (أی بین الرجال وبین النساء) ففرض عندنا حتی لوحاذت امراۃ اوصبیۃ مشتھاۃ تعقل الصلوۃ رجلا أو تقدمت علیہ قدر رکن و صلوتھما مطلقہ مشترکۃ تحریمۃ واداء و اتحد المکان والجھۃ بلا حائل و نویت امامتھا فسدت صلوۃ الرجل

فشروط المحاذاة المفسدة عشرة الاول كونها بالغة او صبية مشتهاة والثانی کونها تعقل الصلوة والثالث ان یکون المحاذاة قدر رکن الرابع ان یکون الصلوة مطلقة ای ذات رکوع و سجود الخامس کون الصلوة مشترکة من حیث التحریمة بان تبنی المراة تحریمتها علی تحریمة الرجل او بنیا تحریمتهما علی تحریمة ثالث فلا تفسد المحاذاة اذا صلیا منفردین السادس کون الصلوة مشترکة من حیث الأداء. السابع اتحاد المکان الثامن اتحاد الجهة التاسع عدم الحائل بینهما. العاشر ان ینوی الامام امامة النساء[1] انتهی مختصرا بقدر الحاجة[1].

☆(ترجمہ: مردوں اور عورتوں کے درمیان صفوں میں ترتیب ہمارے نزدیک فرض ہے۔حتیٰ کہ اگر کوئی عورت یا شہوت والی بچی جسے نماز کی سمجھ بوجھ ہو کسی مرد کے برابر ایک رکن ادائیگی کے برابر یا اس سے آگے رہے اور دونوں کی نماز تحریمہ اور ادائیگی کے اعتبار سے مشترک ہو نیز مکان اور دونوں نماز ادا کرنے کی جہت ایک ہو، دونوں کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو اور امام نے عورت کے امامت کی نیت بھی کی ہو تو اس صورت میں مرد کی نماز فاسد ہو جائے گی۔اس سے معلوم ہوا کہ نماز کو فاسد کرنے والی محاذات کی شرطیں دس ہیں۔ (۱) برابر کھڑی ہونے والی عورت بالغ ہو یا شہوت والی نابالغ لڑکی ہو۔(۲) وہ عورت نماز کو سمجھتی ہو۔(۳) محاذات ایک رکن کی ادائیگی کے برابر ہو(۴) نماز مطلق ہو یعنی نماز رکوع اور سجود والی ہو(۵) نماز تحریمہ کے لحاظ سے مشترک ہو اس کی صورت یہ ہے کہ عورت اپنے تحریمہ کی بنا مرد کے تحریمہ پر کرے یا دونوں یعنی مرد اور عورت کسی تیسرے شخص کے تحریمہ پر بنا کریں۔لہٰذا ان دونوں میں سے ہر ایک اگر اپنی منفرد نماز ادا کر رہا ہو تو یہ محاذات نماز کو فاسد نہیں کرتی (۶) نماز ادا کے اعتبار سے مشترک ہو(۷) دونوں ایک جگہ کھڑے ہوں (۸) دونوں کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو(۹) دونوں کا رخ ایک سمت میں ہو(۱۰) امام عورتوں کی امامت کی نیت کرے)

---

[1] الکبیری: صفحہ ۴۸۵، ۴۸۶ مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ دیوبند.

و فی صفحہ ۴۲۳ من الجزء الاول من الدرالمختار المطبوعہ فی المصر علی هامش ردالمحتار

واذا حاذته امراة مشتهلة ولاحائل بينهما اقله قدر ذراع فی غلظ اصبع او فرجة تسع رجلا فی صلوة مطلقة خرج الجنازة مشتركة فمحاذاة المصلية لمصل ليس فی صلاتها مكروهة لا مفسد تحريمة و ان سبقت ببعضها واداء و لو حكما كلاحقين واتحدت الجهة فلواختلفت كما فی جوف الكعبة و ليلة مظلمة فلا فساد فسدت صلوته لو مكلفا والا لا ان نوی الامام وقت شروعه لا بعدها امامتها و ان لم تكن حاضرة و ان لم ينوها فسدت صلوتها[1] انتهی مختصرا.

(ترجمہ: اور صف میں جب کسی مرد کے محاذات میں شہوت والی عورت کھڑی ہو جائے اور دونوں کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو۔ اور اس حائل کی کم از کم مقدار ایک گز اونچائی اور انگلی کے برابر موٹائی ہونی چاہیئے۔ یا دونوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہو جس میں ایک مرد کے کھڑا ہونے کی گنجائش ہو۔ اور نماز مطلق ہو۔ اس سے نمازِ جنازہ خارج ہوگئی۔ اور وہ نماز دونوں کی مشترک ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز پڑھنے والی ایسی عورت کی کسی مرد کے ساتھ محاذات کہ مرد وہ نماز ادا نہ کر رہا ہو جو عورت ادا کر رہی ہو مکروہ تو ہے لیکن اس سے مرد کی نماز کی فاسد نہیں ہوتی۔ دونوں کی نمازوں کا اشتراک تحریمہ اور ادائیگی میں ہو۔ اگرچہ عورت نے نماز کا کچھ حصہ پہلے ادا کر لیا ہو۔ اور ادائیگی میں اشتراک اگرچہ حکمی ہو۔ اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دونوں لاحق ہوں۔ اور دونوں کا رخ ایک جانب ہو اگر دونوں کا رخ ایک جانب نہ ہو جیسے کہ کعبہ معظمہ کے اندر دونوں نماز ادا کر رہے ہوں یا تاریک رات میں دونوں نماز ادا کر رہے ہوں اور دونوں کا رخ ایک سمت میں نہ ہو تو نماز فاسد نہ ہوگی نماز کے فاسد ہونے کی شرط یہ ہے کہ مرد بھی مکلف ہو۔ اگر مرد مکلف نہ ہو تو نماز فاسد نہ ہوگی۔ نماز کے فاسد ہونے کی شرط یہ بھی ہے کہ امام نے عورت کی امامت کی نیت نماز کے آغاز میں کی ہو۔ اگرچہ عورت اس وقت

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار : جلد اول ' صفحہ ۴۲۳ تا ۴۲۶، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ.

حاضر نہ ہو اگر نماز شروع کر چکنے کے بعد عورت کی امامت کی نیت کی تو مرد کی نماز فاسد نہ ہوگی بلکہ عورت کی نماز فاسد ہوگی)

☆ اگر ایک عورت مجرد مقتدی ہو تو اس کو لازم ہے کہ تنہا امام کے پیچھے کھڑی ہو۔ اور اگر دو مرد مقتدی ہوں تو عورت پھر بھی تنہا دونوں مردوں کے پیچھے کھڑی ہو۔ چنانچہ صفحہ ۴۱۹ جلد اول درمختار مذکور میں ہے

یقف الواحد ولو صبیا اماالواحدة فتتاخر محاذیا أی مساویا لیمین امامه علی المذهب[1]

ترجمہ: مقتدی صرف ایک مرد ہو اگر چہ وہ بچہ ہو تو امام کے محاذات میں یعنی اس کے برابر دائیں طرف کھڑا ہو یہی مختار مذہب ہے۔ اور اگر مقتدی صرف ایک عورت ہو تو وہ امام کے پیچھے کھڑی ہوگی)

قال الشامی رحمه الله

(قوله فتتاخر) فلو کان معه رجل ایضا یقیمه عن یمینه والمراة خلفهما و لو رجلان یقیمهما خلفه والمراة خلفهما بحر. وتاخر الواحدة محله اذا اقتدت برجل لا بامراة مثلها ط عن البرجندی[2]

(ترجمہ: اگر امام کے ساتھ ایک مرد اور ایک عورت ہو تو امام مرد کو اپنے دائیں جانب اور عورت کو اپنے پیچھے کھڑا کرے، اور اگر دو مرد اور ایک عورت ہو تو مردوں کو اپنے پیچھے اور عورت کو ان دونوں کے پیچھے کھڑا کرے۔ ایک مقتدی عورت ہو تو امام کی جگہ سے پیچھے کھڑی ہو جب کہ وہ مرد کی اقتداء کر رہی ہو۔ اور اگر وہ عورت دوسری عورت کی اقتداء کرے تو اس کے ساتھ کھڑی ہو پیچھے نہ کھڑی ہو)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی مسجد جامع اکبرآباد

❁❁❁❁❁

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار : جلد اول ، صفحہ ۴۲۳ / تا ۴۲۶ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ.

[2] رد المحتار : جلد ۱ / ، صفحہ ۴۱۹ / ، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

﴿فتوی نمبر 43﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین دریافت طلب یہ امر ہے کہ مسجد واقع محلہ بلوچ پورہ آگرہ میں اس کے دروں کے آگے ایک چبوترہ، جس کی اونچائی ایک بالشت کی ہے، بنا ہوا ہے اور چبوترہ پر ٹین کا سائبان پڑا ہوا ہے۔ چبوترہ کے آگے مسجد کا صحن ہے۔ بعض اوقات بوجہ زیادتی آدمیوں کے امام اس چبوترہ پر اندر سائبان کے کھڑا ہو جاتا ہے اور مقتدی اس کے پیچھے مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے ہیں۔ یعنی امام اونچائی پر کھڑا ہوتا ہے اور مقتدی نیچے اس طرح سے نماز ہو جائے گی یا نہیں۔

۲۳ شعبان ۱۳۳۶ھ

اعجاز الدین خان بلوچ پورہ کلاں آگرہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

بعض فقہاءِ متاخرین کا فتوی اس امر پر ہے کہ اگر قدِ آدم امام اونچا کھڑا ہوگا تو نماز مکروہ ہوگی ورنہ بلا کراہت جائز ہے۔ بعض فقہاءِ متاخرین کا اس امر پر فتوی ہے کہ بقدرِ ذراع شرعی جو ایک ہاتھ نو انگل کا تقریبا ہوتا ہے مقتدیوں سے امام کا اونچا کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ اور اگر اس مقدار سے کم اونچائی پر امام کھڑا ہو تو بلا کراہت نماز ہو جائے گی۔ اور بعض کے نزدیک اتنی اونچائی پر بھی کھڑا ہونا امام کو مقتدیوں سے مکروہ ہے کہ جس سے امام اور مقتدیوں کے درمیان اونچائی نیچائی کی تمیز ہو جائے۔ خواہ وہ اونچا ایک انگل کے ہو یا اس سے کم یا زیادہ خواہ بہت زیادہ بقدرِ آدم چنانچہ مرقاۃ شرح مشکوۃ میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:۔

قیل مقدار قامة و قیل ما یقع به الامتیاز و قیل مقدار ذراع و علیه الاعتماد و کذا

فی شرح المنیة[۱] والفتاوی العالمگریة والفتاوی الخانیة[۲]

(ترجمہ: بعض علماء نے فرمایا کہ قد کی مقدار امام کا مقتدیوں سے اونچائی پر کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ اور بعض دیگر علماء نے فرمایا کہ اتنا اونچا کھڑا ہونا جس سے امام اور مقتدیوں کے درمیان امتیاز ہو جائے مکروہ ہے۔ اور بعض نے فرمایا ایک ذراع نمازیوں سے اونچا کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ اعتماد اسی قول پر ہے شرح منیہ' فتاوی عالم گیریہ اور فتاوی خانیہ میں اسی طرح ہے)

بہرنہج قول آخر پر عمل کرنے سے بالاتفاق نماز بلا کراہت ہوگی اور قول دوم پر عمل کرنے سے اگرچہ قول اول اور قول دوم کے اعتبار سے کراہت ہوگی مگر قول سوم کے اعتبار سے ضرور کراہت باقی رہے گی۔ لہٰذا اگر صحن میں اتنی گنجائش ہو کہ امام اور مقتدی سب صحن میں کھڑے ہو سکیں بلا ضرورت امام کو اونچائی پر اگرچہ اونچائی کتنی ہی ہو ہرگز کھڑا ہو کر مفت بقول آخر مرتکب کراہت نہ ہونا چاہئے۔ ☆ اور اگر صحن میں گنجائش نہ ہو بضرورت اونچائی پر اگر امام کھڑا ہو جائے بالاتفاق عند الضرورت کراہت نہیں رہتی مگر حتی المقدور قول سوم کا لحاظ ضرور ہے الواقع کہ قول سوم ظاہر الروایت ہے چنانچہ علامہ شامی رحمہ اللہ ماتحت عبارت درمختار:

وقیل ما یقع به الامتیاز (ای بین مقام الامام والمؤتمین) هو الاوجه ذکره الکمال وغیره۔[۳]

(ترجمہ: ایک قول یہ ہے کہ امام کو اتنا اونچا کھڑا ہونا مکروہ ہے جس سے امام اور مقتدیوں کے درمیان امتیاز پیدا ہو جائے یہی قول برتر ہے اسے علامہ کمال اور دیگر علمائے کرام نے ذکر فرمایا ہے۔)

آگے تحریر فرماتے ہیں:

وهو ظاهر الروایة کما فی البدائع قال فی البحر والحاصل ان التصحیح قد اختلف

---

[۱] مرقاۃ المفاتیح : جلد ۳/ صفحہ ۷۷/ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان

[۲] والفتاویٰ العالمکیریه والفتاوی الخانیه. یہ الفاظ مرقاۃ المفاتیح کے نہیں ہیں۔ محمد علیم الدین نقشبندی عفی عنہ۔

[۳] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۲ صفحہ ۳۵۸ مطبوعہ احیاء التراث العربی بیروت

والاولی العمل بظاهر الروایة و اطلاق الحدیث و کذا رجحه فی الحلیة[1]

☆(ترجمہ: یہ ظاہر روایت ہے جیسا کہ بدائع میں ہے۔ البحرالرائق میں فرمایا کہ خلاصہ یہ ہے کہ تصحیح میں اختلاف ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ظاہر روایت اور اطلاق حدیث پر عمل کیا جائے)

☆ یعنی صحت کے تینوں قولوں میں اختلاف ہے بعض قولِ اول کو صحیح فرماتے ہیں بعض قول دوم کو اور بعض قول سوم کو۔ ایسی صورت میں صاحب بحر اور اشباہ والنظائر علامہ زین الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ ظاہر روایت یعنی قول سوم پر جو اطلاق حدیث کے مطابق ہے عمل کرنا اولیٰ ہے۔ اور علامہ شامی رحمہ اللہ صفحہ ۵۳ جلد اول رد المحتار مطبوع مصر مع الدرالمختار کے باب رسم المفتی میں تحریر فرماتے ہیں۔

و کذا (ای یرجح احد القولین المصححین) لو کان احدها ظاهر الروایة و به صرح فی کتاب الرضاع من البحر حیث قال الفتوی اذا اختلفت کان الترجیح بظاهر الروایة و فیه من باب المصرف اذا اختلف التصحیح و جب الفحص عن ظاهر الر وایة والرجوع الیها[2]

(ترجمہ: اسی طرح صحیح قرار دادہ دو قولوں میں سے ایک کو ترجیح دی جائے گی اگر ان دونوں میں ایک ظاہر الروایہ ہو، البحرالرائق کی کتاب الرضاع میں اس کی تصریح کی گئی ہے۔ وہاں فرمایا فتویٰ جب مختلف ہو جائے تو ظاہر الروایہ کو ترجیح دی جائے گی اور اسی کتاب کے باب مصرف میں ہے جب تصحیح کے درمیان اختلاف ہو تو ظاہر روایت کی تلاش اور اس کی جانب رجوع کرنا واجب ہے) فقط

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی
ابومحمد محمد دیدارعلی المفتی فی جامع مسجد اکبرآباد

✿✿✿✿✿

---

[1] رد المحتار : جلد ۲ صفحہ ۳۵۸ مطبوعہ احیاء التراث العربی بیروت

[2] رد المحتار : جلد ۱ صفحہ ۱۵۹، ۱۶۰ مطبوعہ احیاء التراث العربی بیروت

﴿فتویٰ نمبر......44﴾

سوال

اکثر جولاہوں میں عورتیں لہنگا پہنتی ہیں۔ ان کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں۔ اور جن کی عورتیں باہر پھرتی ہیں اور لہنگا پہنتی ہیں بوجہ مفلسی کے تو اس کا کیا حکم ہے۔

الجواب

☆ لہنگا خاص طریقہ ہنود کا ہے۔ ☆ بے ضرورت اس کا پہننا مکروہ ہے۔ مگر غریب ہو اور کوئی لباس پر قادر نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ البحر الرائق میں ہے۔

انما الممنوع فیما له بدما۔

(ترجمہ: منع اس کے لیے ہے جس کا بس چلتا ہو)

اور جن کی عورتیں (ضرورت کی بنا پر ۲) باہر پھرتی ہیں اور باعصمت ہیں ان کے پیچھے نماز مکروہ نہیں۔ اسی طرح عورت کی نماز کا حکم ہے۔

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم غفرلہ

❁❁❁❁❁

---

۱ البحر الرائق جلد صفحہ

۲ قوسین میں اضافہ مرتب عفی عنہ کی جانب سے ہے۔

﴿فتویٰ نمبر......45﴾

سوال

پیش امام اگر بازو ٹوٹا ہوا ہو اور تکبیر تحریمہ کے وقت وہ پورے طور پر کانوں تک ہاتھ نہ لے جا سکے اور کھانا بھی بائیں ہاتھ سے تناول کرے اس کو امام کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور ایسے امام پیچھے نماز فاسد یا مکروہ ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب

اگر دوسرا اس سے علم و عمل میں بہتر نہ ہو اس کے پیچھے نماز جائز ہے ورنہ مکروہ ہے۔

کما فی الدر المختار

و یکرہ خلف امرد و سفیه و مفلوج وابرص شاع برصه [۱]

(ترجمہ: نماز امرد، بے وقوف، فالج زدہ اور برص کے ایسے مریض کی اقتداء میں مکروہ ہے جس کا برص ظاہر ہو)

قال الشامی تحت عبارة المذکورة فی صفحه ۴۱۶

و کذالک اعرج یقوم ببعض قدمه فالا قتداء بغیرہ اولی تاترخانية و کذا اجذم بیرجندی و مجبوب و حاقن ومن له ید واحدة فتاوی الصوفیة [۲]۔

(ترجمہ: یونہی لنگڑا، جو قدم کے ایک حصہ پر کھڑا ہوتا ہوا اس کے علاوہ کسی اور صحیح کی اقتداء میں نماز اولیٰ ہے۔ تاتارخانیہ، یہی حکم جذامی کی امامت میں نماز ادا کرنے کا ہے بیرجندی۔ یہی حکم اس کے پیچھے نماز ادا کرنے کا ہے جس کا آلہ تناسل کٹا ہوا ہو، جس نے پیشاب روکا ہوا ہو اور جس کا صرف ایک ہاتھ ہو فتاوی صوفیہ)

حررہ: العبد الراجی رحمة ربه القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی

مفتی جامع مسجد اکبر آباد

---

[۱] الدر المختار مع رد المحتار جلد اول صفحه ۴۱۵، ۴۱۶، مطبوعه مکتبه رشیدیه کوئٹه

[۲] رد المحتار جلد اول صفحه ۴۱۶، مطبوعه مکتبه رشیدیه کوئٹه

﴿فتویٰ نمبر......46﴾

سوال

بدعتی کے پیچھے نماز پڑھے تو اُسی وقت اعادہ کرے یا گھر پر جا کر یا نہیں۔

جناب مولوی غلام محی الدین خان صاحب
امام جامع مسجد شاہجہاں پور۔۷ادسمبر ۱۵ء

الجواب

بدعتی کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے۔

من و قر صاحب بدعة فقد اعان علی هدم الاسلام [۱]

(ترجمہ: جس نے کسی بدعتی کی عزت وتوقیر کی اس نے اسلام کو گرانے پر اعانت کی)

حدیث موجود ہے۔

نماز کو اسی وقت اعادہ کرے اور اگر خوف فساد کا ہو تو گھر پر اعادہ کرے۔

☆ **اتقوا مواضع التهم** [۲].

(ترجمہ: تہمتوں کے مقامات سے بچو)

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

✿✿✿✿✿

---

[۱] الجامع الصغیر مع شرح فیض القدیر، جلد ٦ صفحہ ۲۳۷ دار المعرفه بیروت

[۲] کشف الخفاء جلد ۱ صفحہ ۳۸ دار الکتب العلمیه بیروت

﴿فتویٰ نمبر 47﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسلہءذیل میں کہ جو شخص تعزیہ داری اور تعزیہ پرستی کو رونق اسلام جانے اور اس بدعتِ ضلالہ میں دامے درمے قدمے سخنے کوشاں اور شریک ہو کر ترقی دے اور نماز کے فرائض وواجبات وسنن ومستحبات سے نابلد ہو۔علم دینی میں بجز قرآن شریف کے اور کچھ پڑھا ہوا نہ ہو۔صرف پنج وقتہ نماز پڑھتا ہو۔عام مسلمانوں کی غیبت کرتا ہو اور سب کی تحقیر کرنا اس کا معمول ہو' تو ایسے شخص کا امام بنانا نماز فرائض میں از روئے شریعتِ غرائے محمد رسول ﷺ کیسا ہے؟۔**بینوا وتوجروا**

الجواب

هو الموفق للصواب بسم الله الرحمن الرحيم۔

اللهم رب زدنی علما

☆ ایسا شخص بدعتی ہے اور فاسق ہے۔اور بدعتی کو امام بنانا سخت گناہ ہے اور اس کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے۔جس کا دوبارہ پھیر لینا واجب ہے۔

کما فی الکبیری صفحہ ۴۷۹:

و یکره تقدیم المبتدع ایضا لانه فاسق من حیث الاعتقاد و هو اشد من الفسق من حیث العمل[۱]

(ترجمہ:بدعتی کو امامت کے لیے آگے کھڑا کرنا مکروہ ہے کیونکہ وہ اعتقاد کے اعتبار سے فاسق ہے اور یہ عمل کے لحاظ سے فسق سے زیادہ سخت ہے)

حررہ: العبد العاصی ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی

المفتی جامع مسجد اکبرآباد غفر الله له ولوالدیه

---

[۱] غنیۃ المستملی ص ۵۱۴ مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور

﴿فتوی نمبر......48﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شہر کی جامع مسجد میں نمازِ تراویح پڑھانے کے لیے کئی ایک داڑھی منڈا حافظ مقرر کیا گیا ہے وقتِ تقرر ''زید'' سے بایں عبارت فتوی طلب کیا گیا کہ ایک حافظ بوجہ ملازمت داڑھی منڈواتے ہیں آیا ایسے حافظ کے پیچھے تراویح پڑھنا شرعا جائز ہے یا نہیں؟ ''زید'' نے حسب ذیل عبارت میں جواز کا فتوی دے کر خود اس حافظ کے پیچھے نماز پڑھنا شروع کی اور دوسروں کو بھی اس کے پیچھے نماز پڑھنے کی ترغیب دی۔

عبارتِ جوابِ استفتاء

داڑھی منڈوانا حرام ہے۔اور مرتکب حرام فاسق ہے۔اور فاسق کے پیچھے نماز مکروہ تنزیہی ہے۔جیسا کہ درمختار میں ہے۔

یکره تنزیها امامة عبد اعرابی فاسق اعمی مبتدع[1]

(ترجمہ: غلام' دیہاتی' فاسق' اندھے اور بدعتی کی امامت مکروہ تنزیہہ ہے)

اور حدیث ابوداؤد میں ہے

لا یقبل الله صلوة من تقدم قوماهم لها کارهون[2]

(ترجمہ: اللہ تعالٰی نہیں قبول فرماتا نماز اس امام کی کہ مقتدی اس سے کراہت کرتے ہیں)

اب جناب عالی کی خدمت میں حسب ذیل سوالات کے جواب بروئے شرع ارقام فرمائے جانے کی استدعا ہے۔

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۱ ' صفحه ۴۱۳ ' ۴۱۴ ' ۴۱۶ ' مختصرا مکتبه رشیدیه ' کوئٹه

[2] سنن ابی داؤد : جلد ۱ ' صفحه ۵۹ ' مکتبه امدادیه ' ملتان

۱۔ آیا صورتِ مسئولہ میں جواب جو زید نے دیا صحیح ہے یا کیا؟

۲۔ فاسق ومبتدع کے پیچھے مکروہ تحریمی ہوتی ہے یا مکروہ تنزیہی؟

۳۔ اگر سوال مذکور کا جواب زید کی جانب سے ٹھیک نہیں ہے اور فاسق ومبتدع کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہوتی ہے تو ایسی حالت میں ایسے غلط فتویٰ تحریر کرنے کی بابت کیا حکم ہے؟

الجواب

بسم الله الرحمن الرحيم۔

اللهم رب زدني علما

اصل عبارت تنویر الابصار متن درمختار یہ ہے

و يكره امامة عبد و اعرابي و فاسق و اعمى الا ان يكون اعلم القوم فهو اولى[1]

(ترجمہ: مکروہ ہے امامت غلام اور اعرابی اور فاسق اور اندھے کی لیکن اگر یہ لوگ سب قوم میں سے مسائلِ دین زیادہ جانتے ہوں تو ان کے پیچھے بالکل بلاکراہت جائز بلکہ اولیٰ ہے)

لیکن چونکہ عبارتِ متن ساکت تھی اس امر سے کہ آیا ان سب کی امامت مکروہ تحریمی یا تنزیہی اور فی الواقع بعض ان میں وہ لوگ ہیں جن کی امامت مکروہ تنزیہی ہے۔ اور ان میں فاسق کی امامت مکروہ تحریمہ۔ علامہ حصکفی رحمہ اللہ نے اپنی شرح درمختار میں ویکرہ کی شرح میں تحریر فرمایا دیا کہ اس مقام پر مراد کراہت سے کراہت تنزیہی ہے۔ اور اس تفسیر سے چونکہ یہ امر متوہم ہوتا تھا کہ فاسق کی امامت بھی مکروہ تنزیہی ہے اس کی بابت اس سے آگے اخیر میں تحریر فرما دیا کہ جن کی امامت مکروہ تنزیہی ہے چونکہ علتِ کراہت ان لوگوں میں جہالت تھی مسائلِ دینیہ سے اس واسطے کہ غلام کو بوجہ خدمت ہونے غالباً فرصتِ تحصیل نہیں ہوتی اور اعرابی یعنی

---

[1] تنویر الابصار مع الدر المختار و رد المحتار : جلد اول، صفحہ ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۴ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

نوٹ: فهو اولى کے الفاظ متن تنویر الابصار کے نہیں بلکہ اس کی شرح الدر المختار کے ہیں

گاؤں والے اکثر مسائل سے جاہل ہوتے ہیں۔اور اندھا بوجہ معذور ہونے کے اکثر پاکی ناپاکی میں احتیاط بہت کم کرسکتا ہے۔اور تحصیلِ علمِ دین سے بھی معذور رہ جاتا ہے لہٰذا اگر یہ لوگ اعلم القوم ہوں یعنی سب میں زیادہ جاننے والے مسائلِ دینیہ کے تو پھر بوجہ رفع ہو جانے علتِ کراہت ان کی امامت بہ نسبت اوروں کے اولی ہوگی۔☆ مگر فاسق کی امامت چونکہ مکروہ تحریمی اور علتِ کراہت اس کی بے پرواہی ہے امورِ دینیہ سے بوجہ فاسق ہونے ☆ یعنی داڑھی منڈوانے یا ایک مشت داڑھی نہ رکھنے اور کتروانے کے علی ہذا القیاس تحریر فرما دیا کہ مکروہ تنزیہی ہونا اعلم القوم ہونے کے اس کی امامت کا اولی ہوجانا مخصوص ہے فقط ان لوگوں کے ساتھ جو فاسق نہ ہوں۔☆ ورنہ فاسق تو اگر اعلم بھی ہو جب بھی اس کی امامت مطلقاً مکروہ رہے گی یعنی مکروہ تحریمی نہ کہ مکروہ تنزیہی۔

چنانچہ صفحہ ۳۷۶ شامی مطبوعہ دہلی میں علامہ شامی رحمہ اللہ ماتحت قولہ غیر الفاسق کے تحریر فرماتے ہیں۔

و لعل وجهه ان تنفير الجماعة بتقديمه يزول اذا كان افضل من غيره بل التنفير يكون فى تقديم غيره و اما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بانه لا يهتم لا مر دينه و بان فى تقديمه للامامة تعظيمه و قد وجب عليهم اهانته شرعا و لا يخفى انه اذا كان اعلم من غيره لا تزول العلة فانه لا يؤمن ان يصلى بهم بغير طهارة فهو كالمبتدع تكره امامته بكل حال بل مشى فى شرح المنية على ان كراهة تقديمه كراهة تحريم لما ذكرنا قال و لذا لم تجز الصلوة خلفه اصلا عند مالک و رواية عن احمد فلذا حاول الشارح فى عبارة المصنف دخول الاستثناء على غير الفاسق[1] والله اعلم[1]

(رد المحتار جلد اول صفحه ٥٦٠ مطبوعه مصر)

(ترجمہ: یہ جو صاحب درمختار تحریر فرماتے ہیں کہ اگر یہ لوگ اعلم القوم ہوں تو پھر فاسق کے علاوہ ان کی امامت مکروہ نہ رہے گی بلکہ اولی ہوگی غالباً اس کی یہی وجہ ہے کہ جب وہ لوگ عالم ہوں گے لوگ ان سے نفرت نہ

---

[1] رد المحتار : جلد اول ، صفحه ۴۱۴ ، مطبوعه مکتبه رشیدیه ، کوئٹه

کریں گے مگر فاسق اگر عالم بھی ہو تو اس کی امامت مکروہ ہے اس واسطے کہ جب وہ دین سے بے پرواہ ہے تو خوف ہے کہ بے وضو ہی نماز پڑھا دے لہٰذا مثل بدعتی کی امامت کے ہر حال میں اس کی امامت بھی مکروہ ہے۔ خواہ وہ عالم ہو یا جاہل۔ بلکہ شرح منیہ میں اس کے واسطے نص کر دی کہ امامتِ فاسق مکروہ تحریمہ ہے۔ اور اسی قصد سے صاحب درمختار شارحِ تنویر نے استثناء کو کلامِ ماتن میں غیر فاسق پر محمول کر کے ظاہر کر دیا کہ صاحبِ تنویر کے نزدیک بھی فاسق کی امامت مکروہ تحریمہ ہے۔ اور اوروں کی مکروہ تنزیہی)

ہاں البتہ اگر ایسا امام فاسق ہو کہ اس کو دور نہ کر سکیں اور کسی دوسری جگہ بھی نماز با جماعت صالح امام کے پیچھے نہ مل سکے تو ترکِ جماعت سے فاسق کے پیچھے نماز پڑھ لینا بہتر ہے۔ اور ترکِ جماعت کا گناہ فاسق کے پیچھے نماز پڑھ لینے سے زائد ہے۔ اسی واسطے جب با جماعت نماز بجز اقتداءِ امامِ فاسق کے کہیں میسر نہ آئے بالاتفاق سب تحریر فرماتے ہیں کہ فاسق کے پیچھے نماز جائز ہے مگر چونکہ بالاتفاق جائز مع الکراہتہ ہے☆ جمہور فقہا تحریر فرماتے ہیں کہ اس نماز کو دوبارہ پھیر لیا جائے۔☆ اور جو شخص دوبارہ نہ پھیرے گا فاسق اور گنہگار ہو گا۔

چنانچہ صفحہ ۳۰۶ درمختار مطبوعہ مطبع دھلی علی ہامش ردالمحتار میں مطلب واجبات الصلوۃ میں ہے:

و لها واجبات لا تفسد بتركها و تعاد وجوبا فى العمد والسهو ان لم يسجد له و ان لم يعدها يكون فاسقا اثما. و كذاحكم كل صلوة اديت مع كراهة التحريم تجب اعادتها[1]

(ترجمہ: نماز کے کچھ واجبات ہیں جن کے ترک کر دینے سے نماز فاسد نہیں ہوتی لیکن ان کے جان بوجھ کر ترک کر دینے اور بھول کر چھوڑنے سے بشرطیکہ اس صورت میں سجدہ سہو نہ کیا ہو اعادہ واجب ہے۔ اگر اعادہ نہ کرے گا تو گناہ گار اور فاسق ٹھہرے گا یہی حکم ہر اس نماز کا ہے جسے کراہت تحریمہ کے ساتھ ادا کیا گیا ہو کہ اس کا اعادہ واجب ہے)

اور بصورتِ تنزیہی بھی نماز کا دوبارہ پھیرنا مستحب ہے صفحہ ۳۰۷ ردالمحتار میں ہے

---

[1] الدر المختار و رد المحتار : جلد اول ، صفحہ ۳۳۶، ۳۳۷، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ ، کوئٹہ

والحق التفصيل بين كون تلك الكراهة كراهة تحريم فتجب الاعادة او تنزيهة فتستحب۔[1]

(ترجمہ: حق یہ ہے کہ اس کراہت میں تفصیل ہے اگر وہ کراہت تحریمی ہے تو نماز کا اعادہ واجب ہے اور اگر کراہت تنزیہی ہے تو اعادہ مستحب ہے)

البتہ اتنا شبہ بعض عباراتِ کتبِ فقہ اور عقائد سے پیدا ہوتا ہے کہ ان میں امامتِ فاسق کو بلا قید تحریم و تنزیہہ مطلقاً مکروہ لکھا ہے۔ پھر بلا وجہ اس کو کراہت تحریمہ پر کیوں محمول کیا جاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں کراہۃ مطلقاً بلا قید تحریم و تنزیہہ بیان کی جائے اس سے مراد کراہت تحریمہ ہوتی ہے اور کراہتِ تحریمہ کا ارتکاب حرام کے برابر ہوتا ہے۔ چنانچہ صفحہ ۲۱۴ درمختار مذکور میں ہے

كل مكروه اى كراهة تحريم حرام اے كالحرام فى العقوبة بالنار عند محمد رحمه الله وعندهما الى الحرام اقرب۔[2]

(ترجمہ: ہر مکروہ یعنی مکروہ تحریمی حرام ہے یعنی دوزخ میں عذاب کے اعتبار سے حرام کی مانند ہے یہ حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے اور حضرات شیخین رحمۃ اللہ علیہما کے ہاں حرام کے زیادہ قریب ہے)

قال الشارح

قوله كراهة تحريم و هى المراد عند الاطلاق كما فى الشرح۔[3]

(ترجمہ: قولہ: کراہتِ تحریمی کے ساتھ مکروہ۔ جب لفظِ مکروہ مطلق ہو تو اس سے مراد یہی مکروہ ہوتا ہے)

علاوہ بریں جن فقہا نے تصریح کراہت تحریمہ کی کر دی ہے وہ مفسر ہے ان روایات کی جن میں کراہۃ

---

[1] رد المحتار : جلد اول، صفحہ ۳۳۷، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ

[2] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۹، صفحہ ۴۰۹، مطبوعہ دارا لتراث العربی بیروت

[3] رد المحتار : جلد اول، صفحہ ۴۰۹، مطبوعہ دار التراث العربی بیروت

مطلقہ ہے جس کا ذکر بحوالہ شرح منیہ عبارتِ مذکورہ ردالمحتار میں گزر چکا۔لہٰذا زید فتوی دہندہ بھی بوجہ تعظیم وترویج اہلِ فسق فاسق ہو گیا اور زید اگر ایسے لوگوں کے پیچھے گا ہے گاہے نماز پڑھ لیتا ہے تو مرتکبِ گناہِ صغیرہ ہے۔اور اگر ایسے فاسقوں کے پیچھے نماز پڑھنے کی اوروں کو ترغیب دیتا ہے اور خود بھی بلاضرورت ہمیشہ پڑھتا ہے تو اس کی عدالت بھی ساقط ہو جائے گی۔اور رویتِ ہلال تک میں اس کی شہادت غیر معتبر ہو گی چہ جائے کہ دیگر معاملاتِ دینی میں اس کا اعتبار کیا جائے۔صفحہ ۳۰۲ شامی میں ہے

صرح العلامة ابن نجيم فى رسالته المولفة فى بيان المعاصى بان كل مكروه تحريمامن الصغائر وصرح ايضا بانهم شرطوا لاسقاط العدالة بالصغيرة الادمان عليها[1]

(ترجمہ: علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ نے گناہوں کے بیان میں تالیف فرمودہ اپنے رسالہ میں اس امر کی صراحت فرمائی ہے کہ ہر مکروہ تحریمی کا ارتکاب گناہِ صغیرہ ہے۔نیز علماء نے صغیرہ گناہ کے ارتکاب کے باعث عدالت کے اسقاط کے لیے اس پر مداومت کو شرط قرار دیا ہے) **واللہ اعلم وعلمہ أحکم**

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبرآباد

✿✿✿✿✿

---

[1] ردالمحتار : جلد اول، صفحہ ۳۳۷، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر......49﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین

1۔ ایک شخص نے جان بوجھ کے قصداً بسبب دنیاوی رنجش کے فعلِ حلال کو حرام کردیا۔

2۔ غیر مقلدوں کو امداد دی۔

3۔ شرعی معاملہ میں بحلف جھوٹی شہادت دے

4۔ چار مسلمان اہلِ سنت وجماعت سے شرعی فعلِ حلال کو حق اور سچا تسلیم کرکے منحرف ہوگیا۔

اور یہ شخص پیش امام ہے۔ ایسے شخص کے واسطے شرع شریف نے کیا حکم دیا ہے؟ اور اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟ بحوالہ کتاب تحریر کریں اور اپنی مہر ثبت کریں۔

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما.

ایسے شخص کے پیچھے نماز مکروہ تحریمہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کا امام بنانا قطعاً ناجائز ہے اور موجب گناہ ہے۔ اس واسطے کہ وہ فاسق ہے اور فاسق کے پیچھے نماز مکروہ تحریمہ ہوتی ہے۔ چنانچہ کبیری میں ہے۔

ولو انھم قدموا فاسقا یا ثمون بناءً علی ان کراھة تقدیمه کراھة تحریم لعدم اعتنائه بأمور دینه [1]

(ترجمہ: اگر لوگوں نے کسی فاسق کو امامت کے لیے آگے کردیا تو وہ گناہ گار ہوں گے۔ کیونکہ اسے امامت کے لیے آگے کرنا مکروہ تحریمی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے دین کے معاملات میں توجہ نہیں دیتا)

---

[1] کبیری شرح منیة المصلی صفحہ ۴۷۹ مطبوعه دیوبند

اور اگر حرامِ قطعی کو حلال یا حلالِ قطعی کو اس نے حرام کر دیا ہے، تو اس سے توبہ کرا کر اس کی بیوی سے اس کا دوبارہ نکاح پڑھا دینا ضروری ہے۔☆اس واسطے کہ حرامِ قطعی کو حلال اور حلالِ قطعی کو حرام کہہ دینے سے کافر ہو جاتا ہے۔

کمافی شرح العقائد:

والاستحلال کفر [۱]

(ترجمہ: حرام کو حلال قرار دینا کفر ہے)

حررہ:

محمد دیدار علی حنفی، مفتی

جامع مسجد اکبر آباد

❁❁❁❁❁

---

[۱] شرح العقائد: صفحہ ۱۹۰ مطبوعہ ایچ. ایم سعید کمپنی کراچی

﴿فتویٰ نمبر......50﴾

سوال

شریعت کے مطابق بیان فرمائیں کہ کوئی شخص صبح کی نماز ہمیشہ قضا پڑھتا ہو فرضوں کے بعد والے نفل بھی نہ پڑھتا ہو آیا ایسے شخص کے پیچھے نماز کسی وقت کی ادا کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نمازِ صبح بلا عذرِ شرعی ہمیشہ قضاء پڑھنا فسق ہے بلکہ صبح اور عشاء کی نماز کی بہ نسبت تو صریح حدیث صحیح میں وارد ہوا ہے کہ یہ دونوں نماز پڑھنا منافقوں پر بہت ہی بھاری ہے اور یہ اس وقت ارشاد فرمایا جب بعض اشخاص کو بعد نماز صبح جماعت میں نہ پایا چنانچہ صفحہ ۹۲ مشکوٰۃ شریف میں ہے۔

☆ عن ابی ابن کعب قال صلی بنا رسول اللہ ﷺ یوما الصبح فلما سلم قال اشاهد فلان قالوا لا قال اشاهد فلان قالوا لا قال ان هاتين الصلوتين أثقل الصلوات على المنافقين (۱)

☆ (ترجمہ: حضرت ابی بن کعب سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں نمازِ صبح پڑھائی جب سلام پھیرا فرمایا کیا فلاں موجود ہے صحابہ نے عرض کیا نہیں فرمایا کیا فلاں موجود ہے صحابہ کرام نے عرض کیا نہیں فرمایا یہ دو نمازیں منافقوں پر سب سے زیادہ بھاری ہیں)

اور صفحہ ۹۷ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ

☆ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دن سلیمان نامی صحابی کو جو ہمیشہ شب بیدار مشغولِ عبادتِ پروردگار رہتے تھے۔ صبح کی نماز میں بوجہ تکانِ شب بیداری حاضر نہ پایا بے چین ہو گئے اور فرمایا کہ اگر وہ واقف ہوتے

---

(۱) مشکوۃ المصابیح مع شرح مرآۃ المناجیح ،جلد اول صفحہ ۱۷۲ مطبوعہ ضیاء القرآن لاہور

اس فضیلت جماعت صبح سے جس کو میں جانتا ہوں تو رات بھر سوتے مگر صبح کی نماز با جماعت قضا نہ کرتے (۱)

اور تیسری حدیث مسلم شریف میں وارد ہے کہ جو سوتا رہ جاتا ہے اور نماز کو نہیں اٹھتا۔ اس کے دونوں کانوں میں شیطان پیشاب کر دیتا ہے (۲)

☆ پھر ایسے شخص کے جو ہمیشہ نمازِ صبح قضا کر کے پڑھتا ہو فاسق ہونے میں کیا کلام ہے۔ لہٰذا جب تک وہ توبہ نہ کر لے اور صبح کی نماز مثل دیگر نمازوں کے جماعت سے پڑھنا شروع نہ کر دے ہر گز اس کو امام بنانا جائز نہیں ☆ اور اس کو امام بنا ہی دیا گیا تو جماعت کا ثواب مل جاوے گا مگر اس نماز کا دوبارہ پھیرنا بوجہ مکروہ ہو جانے نماز کے بلاشبہ واجب ہے **کما ھو من الشامی وغنیة المستملی و غیر ھما من کتب الفقه فقط**

---

(۱) مشکوۃ المصابیح مع شرح مرآۃ المناجیح، جلد اول صفحہ ۱۷۹ مطبوعہ ضیاء القرآن لاہور

نوٹ: حدیث پاک کے الفاظ یوں ہیں

☆ عن ابی بکر بن سلیمان بن ابی حثمة قال إن عمر بن الخطاب فقد سلیمان بن ابی حثمة فی صلوة الصبح وإن عمر غدا إلی السوق ومسکن سیلمان بین المسجد والسوق فمر علی الشفا ام سلیمان فقال لها لم أر سلیمان فی الصبح فقالت إنه بات یصلی فغلبته عیناه فقال عمر لأن أشهد صلوة الصبح فی جماعة أحب إلی من أن أقوم لیلة . رواہ مالک. مشکوۃ المصابیح صفحہ ۹۷ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان

(ترجمہ: حضرت ابو بکر بن سلیمان بن ابی حثمہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت سلیمان بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ کو نمازِ صبح میں نہ پایا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ صبح کے وقت بازار گئے۔ حضرت سلیمان رضی اللہ عنہ کا مکان مسجد اور بازار کے درمیان تھا آپ رضی اللہ عنہ حضرت سلیمان رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ حضرت ام شفا رضی اللہ عنہا کے پاس سے گزرے انہیں کہا میں نے سلیمان کو صبح کی نماز میں نہیں دیکھا وہ عرض کرنے لگیں اس نے ساری رات نماز (نفل) ادا کرتے گذار دی تو (صبح کے وقت) ان کی آنکھ لگ گئی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے صبح کی نماز کے وقت جماعت میں حاضر ہونا رات بھر کے قیام سے زیادہ پسندیدہ ہے اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے)

(۲) صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۳۴۱ کتاب ۱۹ باب ۱۳

نوٹ: حدیث پاک کے اصل الفاظ یوں ہیں۔

ذکر عند النبی ﷺ رجل فقیل مازال نائما حتی اصبح ما قام إلی الصلاة فقال بال الشیطان فی إذنه

اور دیگر نفل کو بے وقعت سمجھ کر کسی وقت بھی نہیں پڑھتا یا نفل جو سنت رسول اللہ ﷺ ہے اس کو ہلکا اور بے وقعت سمجھ کر نہیں پڑھتا ہے تو خوف کفر ہے۔ اس واسطے کہ چھوٹی سنتِ رسول اللہ ﷺ کو بھی ہلکا سمجھنا کفر ہے:

چنانچہ بحرالرائق میں

من تخفف سنة من سنن المرسلين فقد كفر (۱).

☆(ترجمہ: جس شخص نے انبیائے کرام علیہم السلام کی سنتوں میں سے کسی سنت کو ہلکا جانا وہ کافر ہو گیا)

اور صفحہ ۲۹ خاتمہ مسامرۃ میں ہے

قد حكموا بالكفر بالمواظبة على ترك السنة استخفافا بها (۲)

(ترجمہ: علمائے کرام نے سنت کو ہلکا جان کر ہمیشہ ترک کرنے پر کفر کا حکم عائد فرمایا ہے) فقط

حررہ: العبد الراجی رحمتہ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی مفتی جامع مسجد

❀❀❀❀❀

(۱) البحر الرائق شرح كنز الدقائق جلد ۵، صفحہ ۱۳۰، مطبوعہ: دار المعرفہ بیروت

زیر نظر نسخہ میں الفاظ یوں ہیں (ویکفر) باستخفافه بسنة من السنن

(۲) المسامرہ صفحہ

﴿فتویٰ نمبر...... 51﴾

سوال

جناب مفتی صاحب السلام علیکم !

عرض یہ ہے کہ سود خور اور سود دینے والے اور تعزیہ میں چندہ دینے والے کے پیچھے جماعت ہو سکتی ہے یا نہیں۔

بینوا توجروا

۲۰ مارچ ۱۹۱۷ء

الجواب

بسم الله الرحمن الرحیم

اللهم رب زدني علما

☆ ایسا شخص فاسق ہے اور فاسق کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمہ ہے **کما فی الهدایه**

و یکره العبد لأنه لا یتفرغ للتعلیم والأعرابی لأن الغالب فیهم الجهل والفاسق لانه لا یهتم لا مر دینه (۱)

(ترجمہ: غلام کو امام بنانا مکروہ ہے کیوں کہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اس کو فراغت نہیں ہوتی۔ دیہاتی کو بھی امام بنانا مکروہ ہے کیوں کہ ان میں زیادہ تر جہالت ہوتی ہے۔ اسی طرح فاسق کو امام بنانا مکروہ ہے کیوں کہ وہ اپنے دین کے معاملہ کا اہتمام نہیں کرتا)

و فی الشرح الوقایة:

فان ام عبد او اعرابی او فاسق او اعجمی او مبتدع او ولد الزنا کره (۲)

---

(۱) الهدایه، جلد اول جزء ۱ صفحه ۳۶۴، ۳۶۵ مطبوعه ادارة القرآن والعلوم الاسلامیة کراچی۔

(۲) شرح الوقایة جلد اول صفحه ۱۵۲ مطبوعه شیخ غلام علی اینڈ سنز لاهور

(ترجمہ: اگر غلام یا بدوی یا فاسق یا بدعتی یا ولد الزنا نے امامت کرائی تو وہ مکروہ ہے)

و فی صفحہ ۴۷۹ من الکبیری :

لو قدموا فاسقا یا ثمون بناء علی ان کراهة تقدیمه کراهة تحریم لعدم اعتنائه بامور دینه و تساهله فی الاتیان بلوازمه فلا یبعد منه الاخلال ببعض شروط الصلوة و فعل ما ینافیها بل هو الغالب بالنظر الی فسقه و لذا لم تجز الصلوة خلفه اصلا عند مالک رحمه الله و روایة عن أحمد إلا أنه جوزناها مع الکراهة لقوله علیه الصلوة و السلام صلوا خلف کل بر و فاجر (۱)

(ترجمہ: اگر لوگوں نے کسی فاسق کو امام بنالیا تو وہ گنہ گار ہوں گے اس لیے کہ اس کو امام بنا کر آگے کرنا مکروہ تحریمی ہے کیوں کہ وہ اپنے دینی امور میں توجہ نہیں دیتا اور اس کے لوازمات کو ادا کرنے میں سستی کرتا ہے تو اس سے کوئی بعید نہیں کہ نماز کی بعض شرطوں میں خلل ڈال دے اور ایسے کام کرے جو اس کے منافی ہوں اس کے فسق کو مد نظر رکھتے ہوئے یہی گمان غالب ہے لہٰذا امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اس کے پیچھے نماز اصلا جائز نہیں اور امام احمد رحمہ اللہ کی ایک روایت بھی یہی ہے لیکن ہم نے کراہت کے ساتھ اس کی امامت کو جائز رکھا ہے کیوں کہ نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے کہ ہر نیک اور بد کے پیچھے نماز ادا کرو)

☆ علاوہ بریں تعزیہ میں چندہ دینے والا اگر ثواب سمجھ کر چندہ دیتا ہے بدعتی ہے اور بدعتی کا امام بنانا سخت تر مکروہ ہے سو اس واسطے کہ بدعت محلِ فسق و فجور سے بہت ہی بدتر ہے کما فی الکبیری

یکره تقدیم المبتدع ایضا لانه فاسق من حیث الاعتقاد و هو اشد من الفسق من حیث العمل لان الفاسق من حیث العمل یعترف بانه فاسق و یخاف لیستغفر بخلاف المبتدع (۲)

---

(۱) i غنیة المستملی شرح منیة المصلی صفحہ ۴۷۹ مطبوعہ دیوبند

ii غنیة المستملی شرح منیة المصلی صفحہ ۵۱۳، ۵۱۴ مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور۔

(۲) i غنیة المستملی شرح منیة المصلی صفحہ ۴۷۹ مطبوعہ دیوبند

ii غنیة المستملی شرح منیة المصلی صفحہ ۵۱۳، ۵۱۴ مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور۔

(ترجمہ: بدعتی کو امامت کے لیے آگے کھڑا کرنا بھی مکروہ ہے کیونکہ وہ اعتقاد کے اعتبار سے فاسق ہے اور یہ عمل کے اعتبار سے فسق سے زیادہ سخت ہے کیونکہ عمل کے لحاظ سے فاسق اپنے فاسق ہونے کا اعتراف کرتا ہے اور ڈرتا رہتا ہے کہ استغفار کرے جب کہ بدعتی کا حال اس کے خلاف ہے)

اور درمختار مطبوعہ مصر فی صفحہ ۲۳۷ جلد اول میں ہے

کل صلوۃ ادیت مع کراھۃ التحریم تجب اعادتھا والمختار انہ جابر للاول لان الفرض لا یتکرر(۱)

(ترجمہ: ہر نماز جسے کراہت تحریمی کے ساتھ ادا کیا جائے اس کا اعادہ واجب ہے اور مختار یہ ہے کہ دوبارہ پڑھی گئی نماز پہلی کے نقصان کا ازالہ کرتی ہے کیوں کہ فرض نماز کا تکرار نہیں)

یعنی جو نماز کراہتِ تحریمہ کے ساتھ ادا کی جاوے اس کا پھیرنا واجب ہے چنانچہ شامی کے اسی صفحہ مذکورہ ردمحتار میں ہے:

والحق التفصیل بین کون تلک الکراھۃ تحریمۃ فیجب الاعادۃ او تنزیھۃ فتستحب(۲)

(ترجمہ: حق یہ ہے کہ اس بارے میں تفصیل ہے اگر کراہت تحریمی ہے تو اعادہ واجب ہے اور اگر تنزیہی ہے تو مستحب)۔

فقط: واللہ تعالی اعلم بالصواب
ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مفتی جامع مسجد اکبرآباد
۲۸ جمادی الاول ۱۹۳۵ء

❀❀❀❀❀

(۱) الدر المختار مع رد المحتار جلد اول صفحہ ۳۳۷ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ
(۲) رد المحتار جلد اول صفحہ ۳۳۷ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر......52﴾

سوال

میں نے مسل متعلقہ آغا فرید صاحب کو حسب الارشاد ڈپٹی صاحب سلمہ من اولہ الی آخرہ دیکھا۔ روئیدادِ مسلسل سے ظاہر ہے کہ عہدِ عدالت مہد حضرت سلطان عالم گیر غازی رحمۃ اللہ علیہ میں بعوض خدمتِ خطابت و امامت عیدگاہ حافظ عبداللطیف صاحب مرحوم کا ایک روپیہ روز مقرر ہوا تھا اور پھر وہ وظیفہ کچھ کمی کے ساتھ ان کی اولاد میں مرزا حیدر صاحب تک منتقل ہوتا ہوا چلا آیا اور بدستور اب تک ان کو اور ان کی اولاد کو بلا لحاظ ادائے خدمت مذکور ملتا رہا اور مل رہا ہے اور بوجہ جاہل رہ جانے اولاد حافظ عبداللطیف صاحب مرحوم اور باوصف تنبیہات مکررہ نہ کوشش کرنے مرزا حیدر صاحب ان کے صاحبزادہ آغا فرید صاحب تحصیل علوم ضروریہ دینی میں اور ناخوش ہونے نمازیوں کے جن میں علماء بھی ہوتے ہیں ان کو خطابت اور امامت یعنی خدمتِ خطابت و امامت سے باوصف جاری رکھنے وظیفۂ معینہ سے علیحدہ کر دیا گیا۔ پھر جب ان کی درخواستِ امامت وخطابت پر مولانا رمضان صاحب مرحوم کو حکم امتحان دیا گیا اور حسبِ درخواست مرزا صاحب موصوف مرزا صاحب کو امتحان دینے کے بھی آٹھ سات دن کی مہلت بھی دی گئی۔ مگر بایں ہمہ بعد امتحان مرزا صاحب مواجہہ مولانا سعادۃ اللہ صاحب و امام صاحب مداللہ ظلہا مولانا مرحوم تحریر فرماتے ہیں۔

”کچھ مسائل دریافت کیے تھے جن میں سے فرائض وواجبات پورے نہیں بیان کیے ترکیبِ نمازِ عید بھی کامل نہیں بتائی قرآن مجید کی صحتِ قراءت بھی قابل اطمینان نہیں مخارج سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں“

اندریں صورت حکم مورخہ ۷ نومبر ۷۱ء ڈپٹی صاحب سلمہ اللہ عن جمیع آفات الدینیہ والدنیویہ کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجھ سے فتویٰ اس امر کے بارے میں مطلوب ہے کہ ایسے خطیب کی امامت وخطابت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

صفحہ ۴۱۳ درمختار میں ہے۔

و لو ام قوما و هم له کارهون ان الكراهة لفساد فيه اولانهم احق بالامامة منه كره له ذلک تحريما لحديث ابی داؤد ☆ولا يقبل الله صلوة من تقدم قوما وهم له کارهون. و ان هو احق لا والكراهة عليهم [1]

(ترجمہ: اگر کسی نے ایسے لوگوں کی امامت کرائی' جو اسے ناپسند کرتے ہیں' اگر ان لوگوں کی ناپسندیدگی اس میں کسی بگاڑ کے باعث ہے یا اس لیے ہے کہ وہ خود اس سے امامت کے زیادہ مستحق ہیں تو اس کے لیے امام بننا مکروہ تحریمی ہے۔ کیونکہ سنن ابی داؤد میں حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی نماز قبول نہیں فرماتا جو ان لوگوں کے آگے ہو کر امامت کرائے جو اسے ناپسند کرتے ہوں۔ اور اگر وہ خود امامت کا زیادہ مستحق ہے تو کراہت نہیں پھر ان کی کراہت ان پر لوٹ جائے گی)

قال الشامی رحمة الله

قوله لحديث هكذا رواه فی النهر بالمعنى و عزاه الى الحلبى صاحب الحلية مع انه فی الحلية ذكره مطولا و نقله فی البحر عنها [2]

(ترجمہ: قولہ: حدیث کی وجہ سے' النہر میں ہے اسی طرح بالمعنیٰ روایت ہے۔ علامہ حلبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صاحب حلیہ کی طرف منسوب فرمایا ہے حالانکہ حلیہ میں یہ طوالت کے ساتھ ہے اور البحر میں اسی سے نقل فرمایا ہے)

یعنی اگر کوئی شخص کسی قوم کی امامت کرے اور وہ لوگ اس کی امامت سے کراہت کریں اگر ان کی

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۲' صفحہ ۲۵۴ ' مطبوعه دار احياء التراث العربی بیروت

[2] رد المحتار: جلد ۲' صفحہ ۲۵۴ ' مطبوعه دار احياء التراث العربی بیروت

کراہت بوجہ کسی فسادِ دینی کے ہو یا اس وجہ سے ہو کہ وہ بہ نسبت اس کے امامت کے زیادہ حق دار ہیں تو اس کو امامت کرنا مکروہ تحریمہ ہے اس واسطے کہ ابوداؤد میں ہے کہ حضور رسالت مآب ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ نہیں قبول کرتا نماز اس شخص کی جو کسی قوم کا امام بن جائے اور وہ لوگ اس سے کراہت کرتے ہوں۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ

یہی مضمون نہر میں ہے اور ایسا ہی حلیہ میں ہے اور صاحب حلیہ، حلبی کی طرف اس روایت کو نسبت کرتے ہیں اور ایسا ہی البحر الرائق میں۔

اور صورتِ مسئولہ میں ظاہر ہے کہ کراہت لوگوں کی شخص مذکور کی امامت وخطابت میں بوجہ فسادِ دینی کے ہے (جس کا شرعاً اعتبار ہے) نہ کہ نفسانیت سے کہ جو ہرگز قابل اعتبار نہیں۔ یا اس وجہ سے ہے کہ بہ نسبت شخص مذکور زیادہ حق دارِ امامت وخطابت باعتبارِ علم وفضل کے جماعت میں موجود ہوتے ہیں اور غالباً اسی وجہ سے ان کو ان کے عہدہ سے علیحدہ کیا گیا ہے۔ فقط

حررہ: العبد المفتقر إلی رحمۃ ربہ الغنی

ابو محمد محمد دیدار علی مفتی

جامع مسجد اکبر آباد

۱۴ نومبر ۱۷ء

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......53﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ عرصہ بیس بائیس سال سے ایک شخص مسجد لال کرتی میں امامت کرتا تھا۔ چونکہ عرصہ چار سال سے اس کی حرکات ناشائستہ مثل قمار بازی وغیرہ کے متواتر اس کی دیکھنے میں آئیں۔ لہٰذا اس کو چند مرتبہ اس فعلِ قبیح سے متنبہ بھی کیا گیا۔ لیکن باوجود فہمائشِ کامل کے وہ حرکاتِ ناشائستہ سے باز نہ آیا۔ اور چند مرتبہ معافی تقصیرات کی دی گئی۔ اب اُس امام کو اہلِ محلہ نے عرصہ ایک ماہ سے مسجد سے علیحدہ کر دیا۔ اس نے چند آدمیوں کو اپنا مشیر بنا کر احاطۂ مسجد سے باہر لوگوں کو علیحدہ نماز پڑھانا شروع کر دیا۔ جس وقت مسجد کے اندر جمعہ کا خطبہ اور اذان نماز ہوتی ہے اس وقت وہ دوسرا امام بھی مسجد کے باہر یہی کام کرتا ہے اور مسجد کی آواز باہر اور باہر کی آواز اندرون مسجد آتی ہے اس صورت میں مسجد کے اندر اور باہر نماز ہوئی یا نہیں۔ بینوا توجروا

سائل: حافظ رحمت اللہ۔ ۲۳ دسمبر ۱۹۱۵ء

الجواب

ھو أعلم للحق والصواب

ایسا امام شرعاً لائق امامت نہیں تمام کتب میں ہے۔

تکرہ امامۃ الفاسق ما۔

(ترجمہ: فاسق کی امامت مکروہ ہے)

ما قدوری مع شرح اللباب جلد اول صفحہ ۹۰ مطبوعہ بیروت میں ہے:

ویکرہ تقدیم العبد والاعرابی والفاسق

(ترجمہ: غلام بدوی اور فاسق کو امامت کے لیے آگے کرنا مکروہ ہے)

☆ اور جن لوگوں نے اُس کی اعانت کی ہے اور ایک نئی جماعت مسجد سے علیحدہ قریب مسجد قائم کی ہے وہ سب گنہگار ہیں اور تعزیر کے لائق ہیں قرآن مجید میں ہے:

﴿والذین اتخذوا مسجدا ضرارا و کفرا وتفریقا بین المومنین وارصاداً لمن حارب اللہ و رسولہ من قبل ولیحلفن ان اردنا الا الحسنی واللہ یشھد انھم لکذبون[1]﴾

(یعنی جنہوں نے ایک نئی مسجد ضد اور کفر پر بنائی اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے واسطے اور جو خدا اور سول سے لڑ رہا ہے یعنی بدکار ہے اس کی تھانگی (سراغ رساں) بننے اور قسم کھائی جائے گی کہ یہ کام ہم نے اچھا سمجھ کر کیا تھا۔ پس اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں)

ان لوگوں کو توبہ کرنا چاہئے اور خدا کے عذاب اور حکمِ شریعت کے خلاف کرنے سے بچیں۔ اور جہاں تک ممکن ہو مسجد کے برابر دوسری جماعت نہ کرنے دیں۔ مسجد والوں کی نماز میں کچھ نقصان نہیں۔فقط

واللہ اعلم بالصواب وعندہ علم الکتاب.

عاجز محمد رمضان عفی عنہ
مفتی واعظ جامع مسجد آگرہ
۲۵ دسمبر ۱۹۱۵ء

❁❁❁❁❁

---

[1] القرآن الحکیم : سورہ التوبہ آیت ۱۰۷

﴿فتویٰ نمبر......54﴾

سوال

اقتداء حنفی کی مالکی مذہب کے پیچھے جو آمین بالجہر نہ کرتا ہو جائز ہے؟ اور جمعہ کے سوا اور وقتِ نماز میں جماعت کا عادی نہ ہو تو اس کے پیچھے نماز کا کیا حکم ہے؟

سائل: سلامت علی متولی مسجد فتح آباد ضلع آگرہ

یکم جولائی ۱۹۱۶ء

الجواب

هو الصواب

اقتداء مالکی مذہب کے پیچھے درست ہے جب تک کسی مختلف فیہ مسئلہ پر احتیاط کرتا ہو۔ كذا فی الشامی

ذهب عامة مشائخنا إلى الجواز إذا كان يحتاط فی موضع الخلاف وإلا فلا [۱]

(ترجمہ: ہمارے عام مشائخ کا مذہب یہ ہے، کہ حنفی مذہب نہ رکھنے والے امام کی اقتداء جائز ہے، جب کہ اختلاف کے مواقع میں احتیاط کرتا ہو ورنہ جائز نہیں ہے)

☆ جو شخص بلاوجہ ترکِ جماعت کرتا ہو اس کے پیچھے نماز مکروہ ہوگی۔

لو تركها اهل مصر يومرون بها فان قبلوا والا يقاتلون عليها لانها من شعائر الاسلام[۲]. فقط

☆ (ترجمہ: اگر کسی شہر والوں نے اسے (نماز باجماعت کو) ترک کر دیا، تو ان کو اس کا حکم دیا جائے گا۔ اگر قبول کریں تو فبہا۔ ورنہ اس وجہ سے ان سے جنگ کی جائے گی، کیونکہ یہ اسلام کے شعائر سے ہے) والله اعلم وحكمه احكم.

المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

---

[۱] رد المحتار: جلد اول صفحه ۵۶۳ مطبوعه مصر

[۲] الاختیار لتعلیل المختار جلد اول صفحه ۸۰ مطبوعه دار المعرفة بیروت

﴾فتویٰ نمبر......55﴿

سوال

پیش امام حنفی مذہب کا اگر شافعی مذہب کے طریقہ پر نمازِ فجر میں دعاءِ قنوت اور دیگر دعائیں پڑھے تو مقتدیوں کی نماز جائز ہوگی یا نہیں۔ اسی حالت میں جبکہ وہ امام دعائے قنوت پڑھنے میں مشغول اور دعا کرنے میں مصروف ہو بعض مقتدی رکوع میں اور بعض سجود میں ہوتے ہیں اور پریشان۔ ان کی نماز ہوئی یا نہیں؟۔

الجواب

اگر امام شافعی المذہب ہے اور تمام مقتدی یا اکثر حنفی اور حنفیوں میں قابلِ امامت دوسرا شخص موجود بھی ہے' بلاشبہ حنفیوں کا شافعی کو امام بنانا بہتر نہیں۔ افضل یہی ہے کہ حنفی اپنا امام حنفی ہی کو بنائیں۔ اور اگر حنفیوں میں کوئی قابلِ امامت نہیں ہے ☆ اور امام شافعی جو امور حنفیوں کے نزدیک مفسدِ نماز ہیں اور اس کے نزدیک مفسد نہیں ہیں جیسے چوتھائی سر کا مسح کرنا یا خون بہہ نکلنے اور قے سے وضو نہ کرنا اور نماز میں ایک رکن کے اندر تین حرکت کرنا وغیرہ کہ ان سب صورت میں مقتدیوں کی نماز نہیں ہوتی ☆ اور اگر وہ ایسے امور میں حنفیوں کی رعایت سے قے اور خون سے وضو کرلیا کرے چوتھائی سر کا مسح ترک نہ کرے۔ علی ہذا جمیع مفسدات عند الحنفیہ سے محترز رہے' تنہا پڑھنے سے اس کے ساتھ بشرکتِ جماعت نماز پڑھنا افضل ہے۔

کما فی صفحه ۴۱۷ من ردالمحتار المصری

لا جدال بعد اتفاق عالمی المذهبین و هما رملی الحنفیه و رملی الشافعیة رحمهما الله تعالی فحصل ان الاقتداء بالمخالف المراعی فی الفرائض افضل من الانفراد اذا لم یجد غیره والا فالا قتداء بالموافق افضل. [۱]

☆ (ترجمہ: حنفی اور شافعی ہر دو مذاہب کے دونوں عالموں یعنی علامہ رملی حنفی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ رملی شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس امر پر اتفاق کے بعد کوئی جھگڑا باقی نہ رہا کہ مذہب مخالف کا امام جو فرائض میں مقتدی کے

---

[۱] رد المحتار : جلد اول صفحه ۵۶۳ مطبع مصطفی البابی الحلبی مصر

مذہب کی رعایت کرتا ہو اس کی اقتداء میں نماز ادا کرنا' اکیلے نماز پڑھنے سے بہتر ہے جب کہ اس امام کے بغیر کوئی اور امام میسر نہ آئے ورنہ موافق مذہب کے امام کی افضل ہے)

☆ اور اگر وہ غیر مقلد ہے یعنی باوصف حنفی ہونے کے وہ امور (جو) حنفیوں کے نزدیک مکروہ ہیں جیسے بلاضرورتِ نازلہ اور وقوعِ مصیبتِ سخت کے اغیار سے جماعتِ اہلِ اسلام پر قنوت صبح کا پڑھنا' رفع یدین کرنا' آمین بالجہر کہنا' کبھی ایک بال کا مسح کرنا' کبھی سارے سر کا مسح کرنا' کبھی مسِ ذکر سے وضو کرنا' کبھی نہ کرنا' ایسے شخص کے پیچھے نماز ہرگز جائز نہیں۔ ☆اس واسطے کہ وہ بوجہ مخالفتِ جمہورِ اہل سنت اور ترکِ تقلید، فاسق اور بدعتی ہے۔ اور بدعتی اور فاسق کے پیچھے نماز مکروہ تحریمہ واجب الاعادہ ہوتی ہے جس کا پھیرنا واجب ہوتا ہے۔

کما فی صفحہ ۴۷۹ من الکبیری

ویکرہ تقدیم المبتدع ایضا لانہ فاسق من حیث الاعتقاد و ھو اشد من الفسق من حیث العمل لان الفاسق من حیث العمل یعترف بانہ فاسق و یخاف و یستغفر بخلاف المبتدع والمراد بالمبتدع من یعتقد شیئا علی خلاف یعتقدہ اھل السنۃ والجماعۃ[1]

(ترجمہ: امامت کے لیے بدعتی کو آگے کرنا بھی مکروہ ہے کیونکہ وہ اعتقاد کے لحاظ سے فاسق ہوتا ہے یہ عمل کے اعتبار سے فاسق سے زیادہ سخت ہوتا ہے کیونکہ عملی فاسق اعتراف کرتا ہے کہ وہ فاسق ہے۔ وہ خوف زدہ ہوتا ہے اور استغفار کرتا ہے۔ جب کہ بدعتی اس کے خلاف ہوتا ہے۔ بدعتی سے مراد ایسا شخص ہے جو کسی چیز کے بارے میں ایسا اعتقاد رکھے جو عقائد اہل سنت و جماعت کے خلاف ہو)

اور غیر مقلدین کا مخالفِ عقائدِ اہل سنت والجماعت مقلدینِ مذاہبِ اربعہ ظاہر ہی ہے اور اگر ان کے عقائد کی زیادہ ضرورت منظور ہو "جامع الشواھد فی اخراج الوھا بیین عن المساجد" اور "کشف الحجاب" مولانا القاری عبدالرحمٰن پانی پت ملاحظہ ہو۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی مفتی جامع مسجد اکبرآباد

---

[1] کبیری شرح منیۃ المصلی صفحہ ۴۷۹، ۴۸۰ مطبوعہ دیوبند

﴿فتویٰ نمبر......56﴾

سوال

جس شخص نے رمضان کا روزہ قصداً نہیں رکھا کیا وہ جمعہ کی امامت کر سکتا ہے؟ اور وہ عید کی نماز پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟ مقتدی روزہ دار اور باشرع ہیں۔

۲۰ رمضان ۳۶ھ

دفعدار محمد شاہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

بغیر مرض اور سفر کے رمضان کے روزہ قصداً ترک کرنے والا علی ہذا ایک دو وقت قصداً نماز نہ پڑھنے والا یا ہمیشہ قضا کر کے نماز پڑھنے والا فاسق ہے۔☆ اور فاسق کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمہ ہے۔ اگر پڑھ لی جائے تو دوبارہ دہرانا واجب ہے۔ **ھکذا فی الشامی والکبیری و جمیع الفقہ**

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبر آباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر 57﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین ان مسائل کے بارے میں جو ذیل میں لکھے ہیں۔ جو شخص امانت میں خیانت کرے۔ جو شخص کبھی نماز پڑھے کبھی نماز نہ پڑھے۔ جو شخص خدا اور سول کو درمیان میں دے کر کسی کا مال مار بیٹھے۔ جو شخص لڑکا لڑکی پر منت مان کر بکرا بکری ذبح کرے۔ آیا ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے یا نادرست؟ جواب دیجئے خدا اجر دے گا۔

وزیر خان بلوچ پورہ آگرہ ۲۰ شعبان ۱۳۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

ان میں سے اکثر امور فسق وفجور ہیں اور مرتکب ان کا فاسق ہے اور فاسق کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمہ ہے۔ جس کا دوبارہ پھیرنا واجب ہے۔ لہٰذا جب تک دوسرے امام کے پیچھے جو فاسق نہ ہو نماز با جماعت ممکن ہو اور جماعت مل سکے فاسق کے پیچھے ہرگز نماز نہ پڑھی جائے چنانچہ شرح عبارت درمختار و یکرہ امامۃ فاسق الخ میں علامہ شامی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں۔

و فی المعراج قال اصحابنا لا ینبغی ان یقتدی بالفاسق الا فی الجمعة لانه فی غیرها یجد اماما غیره قال فی الفتح و علیه فیکره فی الجمعة اذا تعددت اقامتها فی المصر علی قول محمد المفتی به لانه بسبیل الی التحول[1]

(ترجمہ: معراج میں ہمارے علمائے کرام نے فرمایا جمعہ کے علاوہ کسی اور نماز میں فاسق کی اقتدا نہ کرنی چاہئے

---

[1] رد المحتار: جلد اول، صفحہ ۵٦۰، مطبوعہ مصر

کیوں کہ جمعہ کے علاوہ اور نمازوں میں اس کے بغیر اور امام پا سکتا ہے۔ فتح القدیر میں فرمایا اس صورت میں اگر جمعہ شہر میں متعدد مقامات پر قائم ہوتا ہو تو پھر فاسق امام کی اقتداء مکروہ ہے۔ یہ حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا مفتیٰ بہ قول ہے کیوں کہ وہ فاسق امام سے غیر فاسق امام کی طرف پھر کر جا سکتا ہے)

☆ بناء علیہ اگر فاسق کے پیچھے نماز پڑھ بھی لے تو واجب ہے کہ اس کو دوبارہ پھیرے۔

چنانچہ صفحہ ۳۳۷ درمختار مطبوعہ مع ردالمحتار مصری میں ہے:

کل صلوۃ ادیت مع کراھۃ التحریم تجب اعادتھا[1]

(ترجمہ: ہر وہ نماز جسے کراہتِ تحریمہ کے ساتھ ادا کیا گیا ہو اس کا اعادہ واجب ہے)

اور فسق و فجور ہونا امور مذکوران آیات واحادیثِ معتبرہ سے ظاہر ہے۔ صفحہ ۷۱ طریقہ محمدیہ مطبوعہ مصر مصنفہ برکوی رحمہ اللہ میں ہے۔

☆ **عن انس رضی اللہ عنہ انہ قال خطبنا رسول اللہ ﷺ انہ قال لا ایمان لمن لا امانۃ لہ و لا دین لمن لا عھد لہ و تجری الامانۃ والخیانۃ فی القول ایضا (د) عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ انہ قال قال رسول اللہ ﷺ المستشار موتمن و من افتی بغیر علم کان اثمہ علی من افتاہ و من اشار علی اخیہ بامر یعلم ان الرشد فی غیرہ فقد خانہ قال اللہ تبارک و تعالی یا ایھاالذین امنوا لم تقولون ما لا تفعلون کبر مقتا عند اللہ ان تقولوا مالا تفعلون (م) عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ انہ قال قال رسول اللہ ﷺ آیۃ المنافق ثلاث و ان صام و صلی و زعم انہ مسلم اذا حدث کذب و اذا وعد اخلف و اذا ائتمن خان (خ م) عن عمرو بن العاص اربع من کن فیہ کان منافقا خالصا و من کانت فیہ خصلۃ منھا کان فیہ خصلۃ من النفاق حتی یدعھا اذا ائتمن خان و اذا حدث کذب و اذا عاھد غدر و اذا خاصم**

---

[1] الدر المختار: جلد ۲، صفحہ ۱۳۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

فجر فالوعد بنية الخلف كذب عمدا حرام و اما بنية الوفاء فجائز ثم انه لا يجب عند اكثر العلماء رحمهم بل يستحب فيكون خلفه مكروها تنزيها بدليل قوله عليه السلام اذا وعد الرجل و نوى ان يفى له فلم يف به فلا جناح عليه و فى رواية فلا اثم عليه رواه (ت.د) عن زيد بن ارقم و عند الامام احمد و من تبعه الوفاء واجب والخلف حرام مطلقا ففيه شبهة الخلاف و آية النفاق و شان السالک الاجتناب من الخلاف والاخذ بالوفاق.[1]

(ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ایک روز ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا ''جس میں امانت نہیں اس کا ایمان نہیں اور جس میں وعدہ کا پاس نہیں اس کا دین نہیں'' امانت اور خیانت گفتگو میں ہوتی ہے۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ آپ نے کہا کہ حضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جس سے مشورہ طلب کیا جائے' امانت اس کے سپرد کی جاتی۔ اور جسے فتویٰ دیا گیا بغیر علم کے تو اس کے غلط فعل کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہوگا۔ اور اپنے بھائی کو کوئی مشورہ دینے والے جس شخص کو علم ہو کہ بھلائی اس کے علاوہ اور کام میں ہے تو یقیناً اس نے اس سے خیانت کی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے غضب کی بات ہے کہ تم وہ کہو جس پر خود عمل نہ کرو۔'' امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا منافق کی تین نشانیاں ہیں اگرچہ وہ روزے رکھے اور نمازیں ادا کرے جب بات کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے۔ جب وعدہ کرتا ہے اس کا خلاف کرتا ہے اور جب اس کو امانت سپرد کی جائے خیانت کرتا ہے۔ امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ جس شخص میں چار عادتیں ہوں وہ خالص منافق ہوتا ہے اور جس میں ان میں ایک عادت ہو اس میں نفاق کی ایک نشانی ہوتی ہے جب تک وہ اسے ترک نہ کردے جب اسے امانت سپرد کی جائے خیانت کرتا ہے' جب

---

[1] الطریقة المحمدیه مع الحدیقة الندیة جلد ۱ صفحه ۶۵۲ تا ۶۵۷

بات کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے' جب معاہدہ کرتا ہے دھوکہ دیتا ہے اور جب جھگڑا کرتا ہے حق سے تجاوز کرتا ہے۔ پس توڑ دینے کی نیت سے وعدہ کرنا جان بوجھ کر جھوٹ بولنا اور حرام ہے۔ لیکن ایفا کی نیت سے وعدہ کرنا جائز ہے۔ پھر اکثر علماء کے نزدیک اس کا ایفاء مستحب ہے لہٰذا اس کا خلاف مکروہ تنزیہی ہے۔ اس کی دلیل نبی پاک ﷺ کا یہ ارشاد مبارک ہے جب کوئی شخص وعدہ کرے نیت اس کی پورا کرنے کی ہو پھر وہ پورا نہ کرے تو اس کے ذمہ کوئی معصیت نہیں اور دوسری روایت میں ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اسے امام ترمذی اور امام بن ماجۃ رحمہ اللہ علیہما نے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ امام احمد رحمہ اللہ علیہ اور ان کے اتباع کے نزدیک وعدہ کا پورا کرنا واجب ہے اور اس کا خلاف مطلقاً حرام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وعدہ خلافی میں ائمہ کے درمیان اختلاف کا شبہ ہے اور یہ منافق کی نشانی بھی ہے اور سالک کی شان اختلاف سے بچنا اور اتفاقی امور پر کاربند ہونا ہے)

اور صفحہ ۵۸' ۵۹ مشکوۃ شریف مطبوعہ مجتبائی دہلی میں ہے۔

عن عبدالله بن عمرو بن عاص عن النبی ﷺ انه ذکر الصلوة یوما فقال من حافظ علیها کانت له نورا و برهانا و نجاة یوم القیمة و من لم یحافظ علیها لم یکن له نورا ولا برهانا ولا نجاة و کان یوم القیمة مع قارون و هامان و ابی بن خلف رواه احمد والدارمی و البیهقی فی شعب الایمان۔[1]

☆(ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا کہ آپ نے ایک دن نماز کا ذکر فرمایا اور ارشاد فرمایا جو اس کی حفاظت کرے قیامت کے دن یہ اس کے لیے نور' برہان اور نجات ہوگی اور جس نے اس کی حفاظت نہ کی اس کے لیے نہ نور ہوگا اور نہ برہان اور نہ ہی نجات۔ وہ قیامت کے دن قارون' ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔ احمد' دارمی' شعب الایمان' بیہقی)

---

[1] مشکوۃ المصابیح صفحہ ۵۸' ۵۹' مکتبہ امدادیہ ملتان

و فیه فی صفحة ۵۸

☆ **عن عبادة بن الصامت قال قال رسول الله ﷺ خمس صلوات افترضهن الله تعالی من احسن وضوئهن و صلاهن بوقتهن و اتم رکوعهن و خشوعهن کان له علی الله عهدا ان یغفر له و من لم یفعل فلیس له عهد ان شاء غفرله و ان شاء عذبه رواه احمد و ابو داؤد وروی مالک و النسائی نحوه[۲] . فقط**

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں فرض کیں ۔جس نے ان کے لیے اچھی طرح وضو کیا' انہیں بروقت ادا کیا' ان کے رکوع اور خشوع کو پوری طرح ادا کیا اللہ تعالیٰ کے ذمۂ رحمت پر اس کے لیے وعدہ ہے کہ وہ اسے بخش دے اور جس نے ایسا نہ کیا اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی وعدہ نہیں اگر وہ چاہے تو معاف فرمادے اور اگر چاہے تو اسے عذاب میں مبتلا فرمادے احمد' ابوداؤد نیز امام مالک اور امام نسائی نے اسی کی مانند روایت کیا)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبر آباد

❁❁❁❁❁

---

[۲] مشکوۃ المصابیح صفحہ ۵۸' ۵۹' مکتبہ امدادیہ ملتان

﴿فتویٰ نمبر......58﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیانِ شرع متین اس صورت میں کہ ایک امام نے ایک عورت بدکار سے جس نے علی الاعلان حرام کاری ایک مدت تک کر کے زنا کے پیسہ سے جائیداد تقریباً پانچ ہزار کی جس کی آمدنی تقریباً پچاس یا ساٹھ روپیہ ماہوار ہے' خرید کی تھی' اس کے لالچ میں آ کر نکاح کر لیا اور نکاح میں اس کے بجز مولوی دین محمد کے اور کوئی نہ تھا۔ اور وہ امام ایک مدت تک پوشیدہ اس عورت کے ساتھ رہتا تھا۔ اور اس کا حرام مال اور اس جائیداد حرام کی آمدنی کھاتا تھا۔ اور جب یہ امر ظاہر ہوا اور ایک شخص نے اشتہار چھپوا کر اس امر کے متعلق فتوی پوچھا تو اس نے اس فتوی پوچھنے کو اپنی ہتک سمجھ کر ہتک کی نالش کر دی۔ لہٰذا گزارش ہے کہ ایسے امام کا کیا حکم ہے۔ اور جو مولوی اس طرح نکاح کرے اجازت مالِ حرام دے دے یا اس طرح مالِ حرام کے کھانے کی تدبیر کر دے اور منع نہ کرے اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب

وهو الموفق للصواب

بسم الله الرحمن الرحيم۔

اللهم رب زدنی علما

ایسا امام فاسق ہے۔ اور فاسق کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمہ ہے۔ دوبارہ پڑھنا اور پھیرنا واجب ہے۔ چنانچہ صفحہ ۴۱۴ ردالمحتار میں علامہ شامی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں۔

و اما الفاسق فقد عللوا کراهة تقدیمه بانه لا یهتم لامر دینه و بان فی تقدیمه للإمامة تعظیمه و قد وجب علیهم اهانته شرعا و لا یخفی انه اذا کان اعلم من غیره لا تزول العلة فانه لا یومن ان یصلی بهم بغیر طهارة فهو کالمبتدع تکره امامته بکل حال.

بل مشی فی شرح المنیة إن کراهة تقدیمه تحریم لما ذکرنا[1] .

(ترجمہ: فاسق کوامامت کے لیے آگے کرنے کی کراہت کی وجہ علمائے کرام نے یہ بیان کی ہے کہ وہ اپنے دینی معاملات کی فکرنہیں کرتا نیز اس کوآگے کرنے میں اس کی تعظیم ہوتی ہے حالانکہ شرعا اس کی اہانت واجب ہے یہ امرمخفی نہیں ہے کہ اگر وہ دوسروں سے زیادہ عالم ہوتو کراہت کی یہ وجہ زائل نہیں ہوتی کیونکہ اس پر اعتماد نہیں ممکن ہے انہیں بغیر طہارت کے نماز پڑھادے تو اس کا حکم بدعتی کی مانند ہے جس کی امامت ہر حال میں مکروہ ہے بلکہ منیہ کی شرح یہ روش اختیار کی کہ ایسے کوامام بنانا مکروہ تحریمی ہے اس کی وجہ وہی ہے جو ہم نے ذکر کی ہے)

پھر اگر بوجہ فسق یعنی حرام خوری یا شبہ حرام خوری یا زنا وغیرہ کے لوگ اس کی امامت سے کراہت کرتے ہیں یا اس وجہ سے کراہت کرتے ہوں کہ اس امام سے افضل دوسرا شخص قابل امامت ان میں موجود ہے اور وہ جبرا امامت کرے تو اس کوامام بنا بھی مکروہ تحریمہ ہے بلکہ بموجب ظاہر روایت معنی حدیث اس کی نماز مقبول نہیں ہوتی اور جب امام کی نماز مقبول نہیں ہوتی تو مقتدی کی نماز کس طرح کامل ہوسکتی ہے۔ حالاں کہ باتفاق مقتدی کی نماز جواز وعدمِ جواز میں تابع ہوتی ہے نمازِ امام کے چنانچہ صفحہ ۳۵۰ کبیری میں ہے۔

و یکره للامام ان یوم قوما و هم له کارهون بخصلة ای بسبب خصلة توجب الکراهة اولان فیهم من هو اولی منه بالامامة لقوله علیه الصلوة و السلام ثلاث لا تجاوز صلاتهم آذانهم العبد الأبق حتی یرجع و امرأة باتت وزوجها علیها ساخط و امام قوم و هم له کارهون. و فی حدیث آخر ثلثة ☆لا تقبل لهم صلوة من تقدم قوما و هم له کارهون الخ[2]۔

☆(ترجمہ: امام کے لیے مکروہ ہے کہ لوگوں کی اس حالت میں امامت کرائے کہ وہ اسے کسی ایسی خصلت

---

[1] رد المحتار جلد اول صفحہ ۴۱۴ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

[2] غنیة المستملی صفحہ ۸۵۰ مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ دیوبند.

کے باعث ناپسند کرتے ہوں جو کراہت کا باعث بنے۔ کیوں کہ اس صورت میں مقتدیوں میں ایسے لوگ موجود ہوں گے جو اس سے امامت کے زیادہ حقدار ہوں گے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے تین اشخاص ایسے ہیں جن کی نماز ان کے کانوں سے اوپر تجاوز نہیں کرتی۔ا۔ بھاگا ہوا غلام جب تک واپس نہ آجائے۔۲۔ عورت جس نے رات گذاری اس حالت میں کہ اس کا خاوند اس پر ناراض ہو۔۳۔ لوگوں کا امام جس کی امامت کو لوگ ناپسند کرتے ہوں۔ دوسری حدیث میں ہے کہ تین افراد ایسے ہیں جن کی کوئی نماز قبول نہیں ہوتی۔ا۔ جو لوگوں سے آگے امامت کے لیے بڑھ گیا جب کہ وہ اس کو ناپسند کرتے ہوں الخ)

☆ اور اگر امام یا کوئی اور مولوی بلکہ جو کوئی بھی مسلمان حرامِ قطعی کو حلال سمجھ لے اور اس کو حلال سمجھ کر کھائے یا کھانے کی اجازت دے تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔

كما هو مصرح من جميع كتب الفقه و العقائد.

لہٰذا اس امام اور مولوی پر لازم ہے کہ اس کے حلال سمجھنے اور کھانے سے توبہ کرے اور نو مسلمان ہو کر دوبارہ اپنی بیوی سے نکاح کرے ورنہ کافر اور مومن کے درمیان نکاح قائم نہیں رہتا۔ اور جب نکاح قائم نہیں رہا تو اولاد حلال سے نہیں ہو سکتی۔

حررہ: العبد العاصی
ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی المفتی
فی جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......59﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماء دین ایسی صورت میں کہ امام کو متشابہ لگنے پر یا بھول سے قراءت سے رکا مقتدی نے لقمہ دیدیا امام نے لقمہ لے لیا آیا اس صورت میں دونوں کی نماز فاسد ہوگئی یا فقط مقتدی کی یا فقط امام کی؟ بینوا توجروا

۳ ربیع الاول ۳۵ھ

مولا بخش راجہ منڈی

الجواب

اللھم رب زدنی علما.

صورتِ مسئولہ میں نہ امام کی نماز فاسد ہوئی نہ مقتدی کی۔ مقتدی کے لقمہ دینے اور امام کے لقمہ لینے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ البتہ مقتدی کو لقمہ دیتے ہوئے جلدی کر دینا اور امام کو بعد تین آیت پڑھنے کے انتظار لقمہ کرنا جائز نہیں ہے مگر اگر بلا انتظار آیت کو بغرض یاد آ جانے کے لوٹا رہا تھا اور مقتدی نے بتا دیا تو دونوں کی نماز بلا کراہت ہوجائے گی۔ کچھ حرج نہیں ہے۔ کما فی الدر المختار

بخلاف فتحه علی امامه فانه لا یفسد مطلقا لفاتح و آخذ بکل حال[۱]

(ترجمہ: نمازی اپنے امام کے علاوہ کسی اور نمازی کو لقمہ دے گا تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی) بخلاف اس کے اگر اس نے اپنے امام کو لقمہ دیا تو نماز مطلقاً فاسد نہ ہوگی۔ یعنی ہر حال میں نہ لقمہ دینے والے کی اور نہ ہی قبول کرنے والے کی نماز فاسد ہوگی)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد دیدار محمد دیدار علی الرضوی مفتی جامع مسجد اکبر آباد

---

[۱] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۲۹ مطبوعہ بیروت

﴿فتویٰ نمبر......60﴾

سوال

جن اوقات میں نماز وسجدہ مکروہ ہے اوران میں کس قسم کے سجدے منع ہیں اور کس قسم کی نماز؟

جناب مولوی غلام محی الدین خان صاحب امام جامع مسجد شاہجہاں پور۔ ۱۷ دسمبر ۱۵ء

الجواب

اوقاتِ منہیہ میں نفل٬ واجب٬ فرض تینوں سجدہ مکروہ ہیں۔ مراقی الفلاح میں ہے۔

ویصح اداء ما وجب فیها ای الأوقات الثلاثة لکن مع الکراهة فی ظاهر الروایة کجنازة اذا حضرت و سجدة آیة تلیت فیها و نافلة شرع فیها او نذر ان یصلی فیها الخ[۱] .

☆(ترجمہ: جونماز٬ ان تین مکروہ اوقات میں واجب ہوجائے٬ اس کی ادائیگی ظاہر روایت کی رو سے کراہت کے ساتھ جائز ہے۔ مثلاً جنازہ جب ان اوقات میں آجائے٬ آیتِ سجدہ کی تلاوت جوان اوقات میں کی جائے٬ نفل نماز جوان اوقات میں شروع کردی جائے یاان اوقات میں نماز نفل پڑھنے کی نذر مان لے)

پس علاوہ فرض٬ نمازِ جنازہ وسجدۂ تلاوت بھی مکروہ ہے۔

کتبه المفتی السید محمد اعظم شاه غفر له

❁❁❁❁❁

---

[۱] طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح میں ہے

☆ **وفی البحر عن التحفة الأفضل أن یصلی علی جنازة حضرت فی تلک الاوقات ولا یوخرها بل فی الإیضاح والتبیین التاخیر مکروه.**

ترجمہ: البحر الرائق میں تحفۃ الفقہاء سے ہے کہ اگر ان اوقات میں جنازہ آجائے تو نمازِ جنازہ پڑھے اسے غیر مکروہ وقت تک موخر نہ کرے۔ الایضاح والتبیین میں ہے کہ ان اوقات میں آئے ہوئے جنازہ کی نماز کو موخر کرنا مکروہ ہے۔

حاشية الطحطاوی علی هامش٬ مراقی الفلاح صفحه ۱۰۰ مطبوعه نور محمد کار خانه تجارت کتب کراچی

محمد علیم الدین نقشبندی عفی عنہ

﴿فتویٰ نمبر...... 61﴾

سوال

تجہیز و تکفین و نمازِ جنازہ بوقتِ زوال درست ہے کہ نہیں؟

۱۷ رمضان ۱۳۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

ٹکیہ آفتاب کی نمودار ہونے سے اس وقت تک جب آفتاب کی شعاعوں سے آنکھ نہ چھپے اور غروب کے وقت سوائے اس دن کی عصر کے ☆ علی ہذا نصف نہار شرعی سے 'یعنی صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک جتنے گھنٹے دن ہوا اس کے نصف دن' ☆ آفتاب کے ڈھلنے سے پہلے تک نہ سجدۂ تلاوت جائز نہ نمازِ جنازہ جائز' علی ہذا نہ قضا نماز جائز' نہ ادا نماز جائز' نہ نفل نماز جائز' نہ واجب نماز جائز' نہ سنت جائز۔

چنانچہ ۴۲۴ جلد اول در مختار مصری مطبوعہ مع رد المحتار میں ہے

و کره تحريما و كل ما لا يجوز مكروه صلوة مطلقا و لو قضاء او واجبة او نفلا او على جنازة و سجدة تلاوة و سهو مع شروق واستواء و غروب الاعصر يومه[1] (انتهى مختصرا)

(ترجمہ: مطلقاً ہر نماز' اگرچہ وہ قضا ہو' یا واجب ہو' یا نفل ہو' یا نمازِ جنازہ ہو[2] یا سجدۂ تلاوت ہو' یا سجدہ سہو ہو'

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار: جلد اول 'صفحه ۲۷۲' ۲۷۳' ۲۷۴' مطبوعه مكتبه رشيديه كوئٹه

[2] الدر المختار جلد / اول صفحه / ۲۷۵ على هامش رد المحتار میں ہے:

فلو وجبتا فيها لم يكره فعلهما اى تحريما وفى التحفة الأفضل أن لا تؤخر الجنازة.

☆ (ترجمہ: اگر سجدہ تلاوت اور نمازِ جنازہ مکروہ اوقات میں واجب ہوئے۔ یعنی ان اوقات میں آیہ سجدہ کی تلاوت کی یا جنازہ ان اوقات میں آ گیا تو ان کی ادائیگی ان اوقات میں مکروہ تحریمی نہیں ہے اور التحفہ میں ہے کہ افضل یہ ہے کہ نمازِ جنازہ کو مؤخر نہ کیا جائے)

سورج کی ٹکیہ چمکنے، سر پر آنے اور غروب ہونے وقت، سواء اس دن کی عصر کے، ادا کرنا مکروہ تحریمی ہے، نیز وہ نمازیں جو ان اوقات میں جائز نہیں ان کا ادا کرنا بھی مکروہ ہے)

☆ پھر نصف النہار ائمۂ ماوراء النہر کے نزدیک نصف النہار عرفی ہے کہ اس سے مراد ٹھیک دوپہر اور سایہ کے ٹھہرنے کا وقت ہے اور ائمۂ خوارزم کے نزدیک مراد نصف النہار شرعی ہے۔

مثلاً صبحِ صادق چار بجے ہو اور غروبِ آفتاب ساڑھے سات بجے اس حساب سے دن ساڑھے پندرہ گھنٹہ کا ہو جس کا نصف پونے آٹھ گھنٹہ ہوئے۔ لہٰذا مشائخ خوارزم کے نزدیک پونے بارہ بجے سے زوال تک وقت کراہیت جمیع نمازوں اور سجدہ تلاوت کا ہوگا چنانچہ صفحہ ۴۰۳ جلد اول ردالمحتار میں ہے۔

و عزا فی القهستانی القول بان المراد انتصاف النهار العرفی الی ائمة ماوراء النهر و بان المراد انتصاف النهار الشرعی وهو الضحوة الکبری الی الزوال إلی ائمة خوارزم [1]

(ترجمہ: قہستانی میں یہ قول، کہ نصف النہار سے مراد عرفی دن کا نصف ہے، ماوراء النہر کے علماء کی جانب منسوب ہے اور یہ قول کہ اس سے مراد شرعی دن کا نصف ہے، جو کہ ضحوی کبریٰ ہے، خوارزم کے ائمہ کرام کی طرف منسوب ہے)

☆ ائمۂ خوارزم اور علمائے خوارزم کی تحقیق پر فتوی دینے میں احتیاط معلوم ہوتی ہے اور چونکہ نصف النہار عرفی کے جو سایہ گھٹ کر بڑھنے کا وقت ہے اتنا قلیل وقت ہے کہ جس میں تو نیت بھی نہیں ادا ہوسکتی بلکہ حقیقتاً ایک رکعت ادا کرنے کی بھی اس وقت میں گنجائش نہیں ہوتی اور اس کی عموماً ہر شخص تحقیق بھی نہیں کرسکتا پھر ایسے قلیل غیر معلوم وقت میں ممانعت کے کیا معنی؟ لہٰذا قولِ اہلِ خوارزم ہی قوی معلوم ہوتا ہے کہ مراد نصف النہار سے زوال تک حدیثِ ممانعتِ نماز میں نصف النہار شرعی ہی ہے۔ چنانچہ اسی کے صفحہ ۴۷۳ میں علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] رد المحتار: جلد اول، صفحہ ۴۷۳، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

قد وقع فی عبارات الفقهاء ان الوقت المکروه هو انتصاف النهار الی ان تزول الشمس ولا یخفی ان زوال الشمس انما هو عقیب انتصاف النهار بلا فصل و فی هذا القدر من الزمان لا یمکن اداء صلاۃ فلعل المراد انه لا تجور الصلوۃ بحیث یقع جزء منها فی هذا الزمان اوالمراد بالنهار هوالنهار الشرعی. و هو من اول طلوع الصبح الی غروب الشمس و علی هذا یکون نصف النهار قبل الزوال بزمان یعتدبه اسماعیل ونوح وحموی وفی القنیة واختلف فی وقت الکراهة عند الزوال فقیل من نصف النهار إلی الزوال لروایة أبی سعید عن النبی ﷺ أنه نهی عن الصلاۃ نصف النهار حتی تزول الشمس قال رکن الدین الصباغی وما أحسن هذا لأن النهی عن الصلاۃ فیه یعتمد تصورها فیه [1]

(ترجمہ: فقہائے کرام کی عبارات میں ہے کہ مکروہ وقت نصف النہار سے لے کر سورج کے زوال تک ہے۔ اور یہ مخفی نہیں ہے کہ سورج کا زوال نصف النہار کے متصل بعد ہوتا ہے۔ (اور اگر مراد عرفی دن کا نصف ہو تو) وقت کی اتنی قلیل مقدار میں کوئی سی نماز بھی ادا کرنا بھی ممکن نہیں۔ تو شاید اس سے مراد اس وقت میں نماز جائز نہیں ہے یہ ہے کہ نماز کا کوئی حصہ اس وقت میں نہ پایا جانا چاہئے یا پھر دن سے مراد شرعی دن ہے جو کہ صبح صادق کے طلوع سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک ہوتا ہے۔ تو اس صورت میں نصف النہار زوال سے اتنے پہلے وقت میں ہوگا جس کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ اسماعیل 'نوح' حموی۔ اور قنیہ میں ہے کہ زوال کے وقت کی مقدار میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ یہ وقت نصف النہار سے لے کر زوال تک ہے کیوں کہ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپ نے نصف النہار سے لے کر سورج کے زائل ہونے تک نماز ادا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ امام رکن الدین صباغی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ وضاحت کتنی خوب ہے کیوں کہ ایسے وقت میں نماز سے منع کیا گیا ہے جس کی مقدار میں نماز کی ادائیگی کا تصور

---

[1] رد المحتار: جلد اول، صفحہ ۲۷۳، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

کیا جاسکتا ہے)

اور جمعہ کے دن جوازِ نماز کا قول بوقتِ زوال اور مکہ مکرمہ میں جوازِ نمازِ رکعاتِ طواف کا قول جمیع اوقاتِ مکروہ میں ضعیف ہے چنانچہ صفحہ ۱۵۱ جلد اول میں علامہ سرخسی نے تضعیف اس قول کی بہت تفصیل سے بیان کی ہے۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر......62﴾

سوال

اگر تیسری رکعت میں بیٹھ کر التحیات پڑھنے لگے اور پھر یاد آئے تو کیا کرے؟

اگر بجائے دو کے تیسری رکعت پڑھنی شروع کر دے اور پھر یاد آ گیا تو کیا کرے فجر کی نماز میں ایسا ہو تو کیا کرے؟

الجواب

بسم الله الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

دو رکعت والی نماز میں تیسری رکعت کو بجائے پانچویں رکعت سمجھ لینا چاہئے مگر چوں کہ طلوعِ صبحِ صادق سے طلوعِ کامل تک مطلقاً بجز دو سنت فجر کے قبل اداءِ فرض نفل۔ سنت پڑھنا مکروہ ہے اور ناجائز لہٰذا جب تیسری رکعت کا سجدہ کرنے کے بعد یاد آئے تو کیا کرے اس واسطے کہ اس صورت میں اگر قعدہ اخیرہ کر کے کھڑا ہوا تھا تو دو رکعت نفل بعد فرض پڑھے جائیں گے اور اگر قبل قعدہ اخیرہ کھڑا ہوا تھا اور بعد سجدہ کر لینے تیسری رکعت کے یاد آیا اور چار پوری کر کے سجدہ سہو کر لیا تو ساری چاروں رکعت نفل ہو جائے گی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ صبحِ صادق سے طلوعِ آفتاب تک قصداً نوافل پڑھنا مکروہ ہے۔ اور بلا قصد سہواً اگر پڑھے تو کچھ حرج نہیں۔ اللہ جل شانہ اس کو ثوابِ نوافل بلاشبہ عطا فرمائے گا۔ اس واسطے ان اوقات میں اگر قصداً بھی نفل پڑھ لے گا ثوابِ نفل کا ضرور مستحق ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس اگر طلوع اور غروب اور ٹھیک دوپہر بلکہ ضحوی کبری یعنی نصف النہار شرعی سے جو طلوع صبحِ صادق سے غروبِ آفتاب تک کا نصف ہوتا ہے ٹھیک دوپہر تک ☆، جن اوقات میں خواہ نفل، سجدہ تلاوت ہو یا نمازِ جنازہ ایسے اوقات میں بھی اگر نماز پڑھے گا نماز ہو جائے گی مگر گنہگار نافرمانی ممانعت کا بہر صورت رہے گا۔

چنانچہ صفحہ ۲۰۲ ہدایہ مصری مع الشروح الاربعۃ کے شرح کفایہ میں ہے:۔

(قوله لا تجوز الصلوة عند طلوع الشمس) هذ ابا طلاقه لا تكاد تستقيم ويحتمل

انه اراد بقوله لا تجوز الكراهة فيتناول الفرائض والنوافل لان الكراهة اذا كانت لمعنى فی الوقت توجب نقصانا فی الصلوة و انما لا يجوز الفرائض فيها لانها وجبت كاملة فلا تتاوی بالنقصان حتی يجوز عصر يومه لانه وجب ناقصا والنقصان سببه فاذا لا منافاة بين الكراهة و عدم جواز الفرائض و يحتمل انه اراد به قضاء الفرائض والواجبات كالوتر و سجدة التلاوة و جبت بتلاوة فی وقت غير مكروه فاما لو تلا آية السجد ة فيها و سجدها او حضرت جنازة فيها فصلی عليها تجوز مع الكراهة لانها وجبت ناقصة فاداها كما وجبت و فی شرح الطحاوی و لوا وجب علی نفسه صلوة فی هذه الاوقات فالافضل ان يصلی فی وقت مباح و لو صلی فی هذا الوقت يسقط عنه و كذالک اداء التطوعات فی هذا الوقت يجوز مع الكراهة [1]

(ترجمہ: قولہ: سورج کے طلوع ہونے کے وقت نماز جائز نہیں ہے۔ یہ مسئلہ اپنے اطلاق کے ساتھ درستی کے قریب نہیں ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ صاحب ہدایہ رحمۃ اللہ عنہ نے لاتجوز سے مراد مکروہ ہونا لیا ہے۔ تو اس صورت میں یہ حکم فرائض اور نوافل دونوں کو شامل ہو جائے گا کیوں کہ اس وقت میں نماز ادا کرنے کی کراہت کا باعث وقت میں پایا جاتا ہے جو نماز کو ناقص بنا رہی ہے۔ فرض نمازوں کی ادائیگی ان اوقات میں اس لیے جائز نہیں ہے کہ یہ کامل واجب ہیں۔ اور نقصان کے ساتھ ادا کرنے سے ادا نہ ہوں گے حتی کہ اس دن کی عصر اس وقت جائز ہے کیوں کہ یہ واجب ہی ناقص ہوئی ہے اس کے نقصان کا سبب یعنی وقت ہے۔ اس تاویل سے کراہت اور فرائض کے عدم جواز میں منافات نہ رہی۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ صاحب ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ کی مراد فرائض کی قضا اور واجبات مثلاً وتر، سجدۂ تلاوت ہو جو غیر مکروہ وقت میں تلاوت کے باعث واجب ہوا ہو۔ لیکن اگر ان اوقات میں کسی نے آیت سجدہ کی تلاوت کی اور سجدہ کر لیا یا ان اوقات میں جنازہ آیا اس کی نماز ادا کر لی تو

---

[1] الکفایہ شرح الهدایه : جلد صفحه مطبوعه

کراہت کے ساتھ جائز ہے۔ کیونکہ یہ سجدہ اور نماز جنازہ ناقص ہی واجب ہوئی تھیں۔ لہٰذا اسے اسی طرح ادا کرلیا جس طرح کی واجب ہوئی تھیں۔ شرح الطحاوی میں ہے اگر کسی شخص نے ان اوقات میں نماز اپنے اوپر واجب کرلی تو افضل یہ ہے کہ مباح وقت میں ادا کرے۔ اور اگر اس وقت ادا کرلی تو اس کی ادائیگی سے عہدہ برآ ہوجائے گا۔ اور اسی طرح اس وقت میں نوافل کی ادائیگی بھی کراہت کے ساتھ جائز ہے)۔

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی

ابومحمد محمد دیدارعلی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبرآباد

﴿فتویٰ نمبر......63﴾

سوال

نمازِ فجر ملنے کا گمان کامل نہ ہو تو سنتِ موکدہ مقتدی کو ترک کرنا واجب ہوگا کہ جماعت میں (ملنا) لازمی ہوگا۔ بعضے بتلاتے ہیں کہ جب فرض نہ ملنے کا یقین ہو تو سنت ترک کے شامل جماعت ہو جانا چاہیے۔ سنت بعد طلوع آفتاب ادا کرے۔ اگر خالی نیت باندھ کر بلا رکوع و سجود سلام پھیر کر شامل فرض ہو جائے ایسی شکل میں قبل طلوع سنت ادا ہو سکتی ہے۔ اور یہ مسئلہ شرح وقایہ کے حاشیہ کا بتلایا جاتا ہے۔ لہٰذا ان سب باتوں میں کونسا مسئلہ صحیح ہے؟

الجواب

☆ جب خوف، جماعت سے فرض نہ ملنے کا ہو، سنت ضرور ترک کر دی جائے۔ اور سنت قضا نہیں کی جاتی لہٰذا بعد طلوعِ آفتاب اس جرمانہ میں دو چار چھ جتنی چاہے نفلیں پڑھ لے۔ اور اسی واسطے بعد نمازِ فرض تا طلوعِ آفتاب چونکہ نفل پڑھنا مکروہ ہے۔ ان سنتوں کے عوض اگر پڑھنا چاہے قبلِ طلوع نہیں پڑھ سکتا۔ اور یہ بعض فقہا نے لکھا کہ سنت کی نیت کر کے توڑ دے تاکہ اس کا ادا کرنا واجب ہو جائے بوجہ توڑ دینے کے یہ سنت واجب ہو جائے گی۔ بعد ادائے فرض قبلِ طلوع ان کا ادا کرنا بھی جائز ہو جائے گا مگر یہ قول مردود ہے اور نا قابلِ عمل بوجہ برائی شروع کرنے عبادت کے توڑ دینے کی نیت سے چنانچہ صفحہ ۴۱۴ ہدایہ مع الشروح الاربعۃ میں ہے۔

و من انتهی الی الامام فی صلوة الفجر و هو لم یصل رکعتی الفجر ان خشی ان تفوته رکعة و یدرک الاخری یصلی رکعتی الفجر عند باب المسجد ثم یدخل لانه امکنه الجمع بین الفضیلتین و ان خشی فوتهما دخل مع الامام لان ثواب الجماعة اعظم والوعید بالترک الزم[1].

---

[1] الهدایه مع فتح القدیر وغیره جلد / ۱ صفحه / ۳۳۹ مطبوعه مصر

(ترجمہ: جو شخص نمازِ فجر میں امام کے پاس پہنچا لیکن اس نے ابھی فجر کی دو رکعت سنت ادا نہیں کی۔ اگر اسے خوف ہو کہ ایک رکعت جماعت کے ساتھ فوت ہو جائے گی اور دوسری رکعت امام کے ساتھ پالے گا تو مسجد کے دروازے کے پاس فجر کی دو رکعت سنت ادا کرے پھر اندر آئے۔ کیوں کہ اس کے لیے دونوں فضیلتوں یعنی سنت کی ادائیگی اور باجماعت نماز کو جمع کرنا ممکن ہے۔ اور اگر اسے خوف ہو کہ دونوں رکعتیں فوت ہو جائیں گے تو امام کے ساتھ نماز میں شامل ہو جائے کیوں کہ جماعت کا ثواب بڑا ہے اور اسے ترک کرنے کی وعید زیادہ پختہ ہے)

قال ابن كمال رحمه الله فى شرحه المسمى بفتح القدير:

الحاصل انه اذا أمكن الجمع بين الفضيلتين ارتكب و الارجح و فضيلة الفرض بجماعة اعظم من فضيلة ركعتى الفجر و لو كان يرجو ادراكه فى التشهد قيل هو كادراك الركعة عندهما و على قول محمد لا اعتبار به كما فى الجمعة والوجه اتفاقهم على صلوة الركعتين هذا بما سنذكر و ما عن الفقيه اسماعيل الزاهد انه ينبغى ان يشرع فى ركعتى الفجر ثم يقطعها فيجب القضاء فيتمكن من القضاء بعد الصلوة و دفعه الامام السرخسى بان ما وجب با لشروع ليس باقوى مما وجب بالنذر و نص محمد ان المنذور لا يودى بعد الفجر قبل الطلوع وايضا شروع فى العبادة بقصد الافساد[1] انتهى مختصرا۔

(ترجمہ: خلاصہ یہ ہے کہ جب اس کے لیے دونوں فضیلتوں کو جمع کرنا ممکن ہو تو کرے ورنہ ترجیح دے دے اور فرض کو باجماعت ادا کرنے کی فضیلت فجر کی دو سنتوں سے بڑھ کر ہے اور اگر اسے امید ہو کہ امام کو تشہد میں پالے گا تو بعض علماء نے فرمایا کہ یہ ایک رکعت پالینے کی مانند ہے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی رو سے تشہد

---

[1] فتح القدير : جلد ۱، صفحه ۳۳۹ مطبوعه مصر

کو پانے کا کوئی اعتبار نہیں ہے جس طرح کہ جمعہ میں ہے۔ مقصودِ کلام یہ ہے کہ اس موقع پر ادا یا قضا کے طور پر دو رکعت ادا کرنے پر اتفاق ہے۔ جیسا کہ ہم عنقریب ذکر کریں گے اور امام فقیہ اسماعیل زاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ ایسی صورت میں مناسب یہ ہے کہ فجر کی دو رکعت سنتوں کو شروع کر کے توڑ ڈالے اس طرح ان کی قضا واجب ہو جائے گی تو اسے وقت کے فرض نماز کے بعد ادا کرنے کے قدرت حاصل ہو جائے گی لیکن امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تردید یوں کی ہے کہ شروع کرنے کے بعد جو نفل یا سنت نماز واجب ہوتی ہے وہ نذر مانی ہوئی نماز سے زیادہ قوی نہیں ہے۔ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے نص فرمادی ہے کہ نذر مانی ہوئی نماز فجر کی نماز کے بعد سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ادا نہ کی جائے۔ نیز اس صورت میں عبادت کو فاسد کرنے کی نیت سے شروع کرنے کی خرابی بھی لازم آتی ہے)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ
ابو محمد محمد دیدار علی المفتی
فی جامع اکبر آباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......64﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ جو شخص تراویح نہ پڑھے وہ گناہ گار ہے یا نہیں۔

۲۵ رمضان المبارک ۳۶ھ

نئے خان تیکونیہ بازار آگرہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

تراویح سنتِ موکدہ ہے لہٰذا جس طرح فجر کی دوسنتیں اور ظہر کی چھ سنتوں کا چھوڑنا جائز نہیں اسی طرح تراویح کا چھوڑنا بھی جائز نہیں۔ چنانچہ صفحہ ۱۴۵ جلد دوم مبسوط امام شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ میں ہے

فی بیان کون التراویح سنة متوارثة أم تطوعا مطلقة متبداء ة اختلفوا فیھا و ینقطع الخلاف بروایة الحسن عن ابی حنیفة رحمھما اللہ ان التراویح سنة لا یجوز ترکھا لان النبی ﷺ اقامھا ثم بین العذر فی ترک المواظبة علی ادائھا بالجماعة فی المسجد وھو خشیة أن تکتب علینا وواظب علیھا الخلفاء الراشدون رضی اللہ عنھم و قد قال النبی ﷺ علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین من بعدی و ان عمر رضی اللہ عنه صلاھا بالجماعة مع اجلاء الصحابة فرضی به علی رضی اللہ عنه حتی دعا له بالخیر بعد موته کما و رد و امر به فی عھده ۔[1]

---

[1] المبسوط : جزء ثانی ' صفحه ۱۴۵ دار المعرفه بیروت

(ترجمہ: تراویح کے متوارث سنت یا نئے سرے سے مطلقاً نفل نماز ہونے کے بارے میں علماء نے اختلاف فرمایا ہے حضرت امام حسن رحمۃ اللہ علیہ کی حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کے ساتھ یہ اختلاف منقطع ہو جاتا ہے کہ آپ نے فرمایا تراویح سنت ہے۔ اس کا ترک کرنا جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے اسے قائم فرمایا زاں بعد اس کی مسجد میں جماعت کے ساتھ ادائیگی پر مواظبت کرنے کے بارے میں عذر بیان فرمایا کہ خوف تھا کہ وہ ہم پر کہیں فرض نہ ہو جائیں۔ حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے ان کی ادائیگی پر مواظبت فرمائی۔ اور نبی پاک ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ تم میری اور میرے بعد خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑو۔ نیز حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اسے جلیل القدر صحابہ کرام کے ساتھ جماعت کے ساتھ ادا فرمایا ہے تو اس پر حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ راضی ہوئے اور ان کے وصال کے بعد ان کے لیے دعائے خیر فرمائی جس طرح کہ وارد ہے اور اپنے زمانہ خلافت میں اسے قائم رکھنے کا حکم دیا)

لہٰذا تارکِ تراویح اتنا گناہ گار ہے جتنا تارکِ سنت گناہ گار ہوتا ہے۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبر آباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......65﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے متعلق کہ اگر کوئی مصلی امام کے ساتھ فجر کی نماز میں شریک ہو جائے بوجہ نہ پانے وقت کے سنت چھوڑ جائے تو اس کو بعد ادا فرضوں کے سنت کی قضا ہے یا نہیں؟ اگر ہے کس ترتیب اور ترکیب کے ساتھ ہے؟ اس میں اپنے مذہب کے مسائل اور مذہب جو کہ ادا کرنے کے قائل ہیں مسائل لکھنا چاہیے معہ علت اور دلیل کے۔

۱۸ شوال ۳۶ھ

خان ملا پیش امام مسجد رنگ ریزان راجہ منڈی

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صبح کی سنتیں اگر کسی وجہ سے فوت ہو جائیں تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو ان کی قضا نہ قبل طلوع آفتاب کے جائز ہے اور نہ بعد طلوع۔ البتہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بعد طلوع آفتاب، قبلِ زوال اگر قضا کر لی جائے تو ثواب سنت ہی کا مل جائے گا۔ اور شیخین کے نزدیک چوں کہ حضور سرور صلی اللہ علیہ وسلم سے ممانعتِ قضائے سنت فجر حدیث مسلم سے ثابت ہے لہٰذا ان کے نزدیک بعد طلوع آفتاب کوئی اگر پڑھے تو نفل ہو جائیں گے نہ کہ سنت۔ البتہ اگر مع فرض فجر کے سنت بھی قضا ہو گئی ہوں تو بالاتفاق بعد طلوع آفتاب فرض و سنت دونوں قضا کیے جائیں گے۔

چنانچہ صفحہ ۱۶۱ جلد اول مبسوط علامہ شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ میں ہے:

و لو صلی الرجل الفجر ثم ذکر انہ لم یصل رکعتی الفجر لم یقضھما فی قول ابی حنیفة و ابی یوسف رحمھما اللہ تعالیٰ و قال محمد رحمہ اللہ احب الی ان یقضیھا اذا

ارتفعت الشمس. اما سائر السنن اذا فاتت عن موضعها لم تفض عندنا خلافا للشافعی رضی الله عنه و دلیلنا حدیث ام سلمة رضی الله عنها حین قالت لرسول اللهﷺ انقضیها نحن فقال لا. و لان السنة عبارة عن الاقتداء برسول اللهﷺ فی ما تطوع به وهذا المقصود لا یحصل بالقضاء بعد الفوات. وهی مشروعة للفصل بین الاذان والاقامة فلا یحصل هذا بالقضاء بعد الفراغ من المکتوبة. فاما سنة الفجر فلو فاتت مع الفجر قضاها معه استحسانا لحدیث لیلة التعریس ☆فان النبیﷺ صلی رکعتی الفجر ثم صلی الفجر و لان هذه السنة من القوة ما لیس لغیرها. ☆قالﷺ صلوها فان فیهما الرغائب و ان انفردت بالفوات لم تقض عند ابی حنیفة و ابی یوسف رحمهما الله تعالیٰ لان موضعها بین الاذان والاقامة و قدفات ذلک بالفراغ من الفرض و عند محمد رحمه الله تعالیٰ یقضیها اذا ارتفعت الشمس قبل الزوال هکذا روی عن ابن عمر رضی الله عنهما و لان ما قبل الزوال فی حکم اول النهار و عند الشافعی رحمه الله یقضیها قبل طلوع الشمس بناء علی اصله فی الصلوات لها سبب . والله سبحانه و تعالی اعلم.[1]

ترجمہ: اگر کسی شخص نے فجر کی نماز ادا کی۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس نے فجر کی دو رکعت سنتیں ادا نہیں کیں۔ تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان دونوں رکعتوں کی قضا نہ کرے۔ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا مجھے پسند یہ ہے کہ جب سورج بلند ہو جائے تو ان کو قضا ر کرے۔ لیکن اس کے علاوہ باقی سنتیں جب اپنے موقع سے رہ جائیں تو ان کو قضا نہیں کیا جائے گا۔ اس میں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے۔ ہماری دلیل ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث ہے کہ جب آپ رضی اللہ عنہا نے حضور نبی کریم ﷺ سے دریافت فرمایا کیا ہم ان کی قضا کریں تو فرمایا نہیں۔ نیز (اس

---

[1] المبسوط: جلد ۱، صفحہ ۱۶۱، ۱۶۲، دار المعرفہ بیروت

کی عقلی دلیل یہ ہے کہ) سنت سے مراد نوافل میں نبی کریم ﷺ کی اقتداء ہے۔ اور یہ مقصد سنتوں کے فوت ہونے کے بعد قضاء سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اور یہ اذان اور اقامت کے مابین فصل کے لیے مشروع ہیں لہٰذا یہ مقصد فجر کی نماز کی ادائیگی کے بعد حاصل نہیں ہوسکتا۔ مگر فجر کی سنتیں جب فجر کے فرضوں سمیت فوت ہو جائیں تو ان کو فرضوں سمیت استحساناً قضا کرے کیوں کہ حدیث لیلۃ التعریس میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے پہلے فجر کی دو رکعت سنتیں ادا فرمائیں اور اس کے بعد فجر کے فرض ادا فرمائے۔ نیز ان سنتوں میں اتنی قوت ہے جو دوسری سنتوں میں نہیں ہے۔ ☆ نبی پاک صاحبِ لولاک ﷺ نے فرمایا ان سنتوں کو پڑھو کیوں کہ ان میں عطیات ہیں۔ اور اگر صرف یہ سنتیں فوت ہوں تو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان کی قضاء نہ کرے۔ کیوں کہ ان کی ادائیگی کا مقام اذان اور اقامت کے درمیان ہوتا ہے۔ اور جب فرض سے فارغ ہو چکا تو وہ موقع فوت ہو گیا۔ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جب سورج بلند ہو جائے تو ان کو قضا کرے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے۔ کیوں کہ زوال سے پہلے وقت کا حکم دن کے آغاز کا ہوتا ہے۔ لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سورج کے طلوع ہونے سے قبل ان کی قضاء کرے ان کا یہ حکم مبنی ہے اس اصل پر کہ نمازوں کے اسباب ہیں (اور جب سبب موجو ہوں ان کو ادا کیا جا سکتا ہے)

علاوہ بریں دلیلِ شیخین رحمہما اللہ غالباً یہ حدیث ہے جو مشکوٰۃ شریف مطبوعہ مطبع اسلامی لاہور کے صفحہ ۹۴ باب اوقاتِ نہی میں بروایتِ بخاری و مسلم مروی ہے۔

☆ **عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ لا صلوة بعد الصبح حتی ترتفع الشمس ولا صلوة بعد العصر حتی تغیب الشمس** [۱]

(ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ صبح کے بعد سورج کے بلند ہو جانے تک اور عصر کے بعد سورج کے غروب ہو جانے تک نماز (نفل) درست نہیں ہے)

---

[۱] مشکوۃ المصابیح : صفحہ ۹۴، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ، ملتان۔

اور یہ جو ترمذی شریف مطبع مجتبائی دہلی کے صفحہ ۵۷ جلد اول حضرت قیس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

☆ **قال خرج رسول الله ﷺ فاقيمت الصلوة فصليت معه الصبح ثم انصرف النبي ﷺ فوجدني اصلي فقال مهلا يا قيس اصلاتان معا فقلت يارسول الله ﷺ اني لم اكن ركعت ركعتي الفجر قال فلا اذن** [1]

☆ (ترجمہ: حضرت قیس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی پاک ﷺ باہر تشریف لائے۔ اقامت کہی گئی۔ میں نے آپ ﷺ کے ساتھ صبح کی نماز ادا کی۔ پھر نبی اکرم ﷺ واپس آئے اور مجھے نماز پڑھتے دیکھا۔ فرمایا اے قیس رک جاؤ۔ کیا دو نمازیں اکٹھی ادا کر رہے ہو؟ میں نے عرض کی میں نے فجر کی دو رکعت سنت ادا نہیں کی تھیں۔ اس پر آپ نے فرمایا اب نہیں)

اول تو یہ حدیث مرسل ہے اور علامہ قاری رحمہ اللہ مرقات میں تحریر فرماتے ہیں

سياتي ان الحديث لم يثبت فلا يكون حجة على ابي حنيفة رحمه الله [2]

(ترجمہ: عنقریب یہ بات آرہی ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں ہے لہٰذا یہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف حجت نہیں بن سکتی)

و قال ابو عيسى الترمذي و اسناد هذا الحديث ليس بمتصل [3]

(ترجمہ: حضرت امام ابوعیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس حدیث کی سند متصل نہیں ہے)

علاوہ بریں ظاہر معنے "فلا اذن" کے یہی ہوتے ہیں کہ حضور سرور عالم ﷺ نے میری یہ عرض سن کر کہ میں نے دو سنت فجر کی نہیں پڑھی تھی اور شریک جماعت ہو گیا تھا فرمایا "فلا اذن" یعنی پس اس وقت نہ۔

---

[1] جامع الترمذی : صفحہ ۱۱۴ ، حدیث رقم ۴۲۲ ، مطبوعہ دار السلام للنشر والتوزیع الریاض۔

[2] مشکوۃ المصابیح : صفحہ ۹۵ ، حاشیہ نمبر ۳ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ، ملتان

[3] i. جامع الترمذی : صفحہ ۱۴۴ دار السلام للنشر والتوزیع الریاض

ii. مشکوۃ المصابیح : صفحہ ۹۵ ، حاشیہ نمبر ۳ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ، ملتان

یعنی اگر ان سنتوں کو پڑھنا ہی ہے تو اس وقت نہ پڑھو بلکہ بعد طلوع آفتاب کے پڑھنا۔

چنانچہ اس کی مصرح دوسری حدیث ترمذی مذکورہ کے اسی صفحہ میں ہے

☆ **عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ من لم يصل ركعتی الفجر فليصلهما بعد ما تطلع الشمس۔**[1]

☆(ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جس نے فجر کی دو رکعت سنت نہ پڑھی ہو اسے چاہئے کہ سورج طلوع ہو چکنے کے بعد انہیں پڑھ لے)

بناء علیہ امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ

واحب ان يقضيهما بعد طلوع الشمس۔[2]

(ترجمہ: مجھے پسند ہے کہ فجر کی سنتوں کو سورج کے طلوع ہونے کے بعد قضا کرے)

ورنہ یہ حدیث بھی بمقابلہ اس حدیث کے جس کی بنا پر شیخین فرماتے ہیں کہ مجرد سنتِ فجر نہ قبل طلوع شمس قضا کی جائیں نہ بعد طلوع ضعیف ہے۔ **كما هو ظاهر من كلام الترمذی رحمه الله حيث قال**

ولا يعلم احد روى هذا الحديث عن همام بهذا الاسناد نحو هذا الاعمرو بن عاصم الكلابی۔[3]

(ترجمہ: حضرت عمر بن عاصم کلابی کے سوا کسی ایسے شخص کے بارے میں علم نہیں جس نے اس حدیث کو حضرت ہمام رحمۃ اللہ علیہ سے اس سند کے ساتھ اس طرح روایت کیا ہو) فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی مسجد جامع اکبر آباد

---

[1] جامع الترمذی : صفحہ ۱۱۴ ، حدیث رقم ۴۲۳ ، مطبوعہ دار السلام للنشر والتوزیع الریاض۔

[2] المبسوط : جلد ۱ ، صفحہ ۱۶۱ ، دار المعرفہ بیروت

[3] جامع الترمذی : صفحہ ۱۱۴ ، ۱۱۵ ، مطبوعہ دار السلام للنشر والتوزیع الریاض۔

﴿فتویٰ نمبر......66﴾

سوال

وتر واجب رمضان میں اول رکعت میں انا انزلناہ پڑھا اور دوسری میں تبت یدا پڑھا اور تیسری میں قل ھو اللہ پڑھا وتر کی دوسری رکعت میں بجائے قل یاایھا الکافرون کے تبت یدا پڑھنے سے نماز ہوئی یا نہیں؟

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وتر میں اکثر آنحضرت ﷺ اول رکعت میں سبح اسم دوسری میں قل یا ایھا الکفرون اور تیسری رکعت میں قل ھو اللہ تلاوت فرمایا کرتے تھے۔لہٰذا ان سورتوں کا پڑھنا مستحب ہے۔اور اگر کوئی انا انزلنا اور تبت یدا اور قل ھو اللہ سے یا کسی اور سورت سے پڑھ لے جب بھی (نماز) وتر بلا کراہت ہو جائے گی کوئی حرج نہیں۔فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر...... 67﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ امام نے تیسری رکعت میں ایک آیت الحمد شریف کی جہر سے پڑھی۔ اور مقتدی کے لقمہ دینے سے آہستہ شروع کی۔ آیا سجدہ سہو لازم آیا یا نہیں؟۔ **بینوا وتوجروا**

الجواب

بسم الله الرحمن الرحيم۔

اللهم رب زدني علما

سجدہ سہو کا ترک کردینے کسی واجب کے واجباتِ نماز سے یا تاخیر واجب یا تاخیر فرض سے واجب ہوتا ہے۔ چنانچہ صفحہ ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷ درمختار مطبوعہ علی ہامش ردالمحتار مصری میں ہے

سجود السهو يجب بعد سلام واحد عن يمينه فقط سجدتان و تشهد و سلام بترك واجب مما مر فى صفة الصلوة سهوا و ان تكرر كركوع قبل قراءة[1] الخ مختصرا

(ترجمہ: سجدہ سہو' صفت صلوۃ میں مذکور واجبات میں کسی واجب کے سہو کے ساتھ ترک ہوجانے سے واجب ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ تکرار کے ساتھ ہو۔ جیسا کہ قراءت سے پہلے رکوع کرنا' سجدہ سہو صرف دائیں جانب ایک سلام کے ساتھ دو سجدوں' تشہد اور سلام کے ساتھ ادا ہوتا ہے)

اور ظاہر ہے ہر آیتِ الحمد بقولِ احوط واجب مستقل ہے۔ لہٰذا اگر ایک آیت الحمد بھی سہوا چھوڑ دی سجدہ سہو واجب ہوگا۔

چنانچہ صفحہ ۳۳۸ درمختار مذکور میں ہے

و فى المجتبى يسجد بترك آية منها (اى الفاتحة) وهو اولى قلت عليه فكل آية واجبة[2]

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار : جلد اول ' صفحه ۵۴۵' ۵۴۶' ۵۴۷ 'مكتبه رشيديه كوئٹه.

[2] الدر المختار مع رد المحتار : جلد اول ' صفحه ۳۳۸ ' مكتبه رشيديه كوئٹه.

(ترجمہ: سورۃ فاتحہ کی ایک آیت کے ترک سے سجدہ سہو کرے۔ یہی اولی قول ہے۔ میں کہتا ہوں اس سے ثابت ہوا کہ اس کی ہر آیت ایک علیحدہ واجب ہے یہ المجتبیٰ میں ہے)

☆ اور جہر جب جہری نماز میں امام پر واجب ہے لامحالہ ہر آیت الحمد کا جہر واجب ہوگا۔ اور اگر ایک آیت کا جہر ترک ہو جائے گا لازم آئے گا یا کل الحمد کا۔ لہٰذا اگر آیت الحمد سے سری میں جہراً پڑھی جائے گی علی ھذا اگر امام جہری میں سراً پڑھے گا ضرور اس پر سہو واجب ہوگا۔

حررہ: العبد الراجی ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی

المفتی فی جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......68﴾

سوال

اگر چار رکعت پڑھنے ہوں اور دوسری رکعت میں التحیات معہ درود پڑھ لیا تو کیا کرنا چاہئے۔

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

☆ یہ کلیہ ہے کہ ترکِ واجب اور تاخیرِ فرض اور واجب سے سجدہ سہو واجب ہوتا ہے۔اور سجدہ سہو کر لینے سے نقصان ترکِ واجب یا تاخیرِ فرض پورا ہوتا ہے۔اسی واسطے بصورتِ ترکِ سجدۂ سہو اس نقصان کے پورا کرنے کے واسطے اس نماز کا اعادہ واجب ہوتا ہے۔☆ لہٰذا چار رکعت والی نماز میں چونکہ بعد التحیات کھڑا ہو جانا فرض ہے اور بوجہ پڑھنے درود پاک کے بقدر اللھم صل بھی فرض میں تاخیر ہو جاتی ہے سجدہ سہو واجب ہو جاتا ہے خواہ درود پڑھنے خواہ اللھم صل [!] ہی کہہ کر یاد آتے ہی کھڑا ہو جائے۔فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبرآباد

✿✿✿✿✿

[!] صاحب الدر المختار نے علامہ زیلعی کے حوالہ سے فرمایا کہ اصح یہ ہے کہ اللھم صل علی محمد سے سجدہ سہو واجب ہوگا۔ اس کی عبارت یوں ہے۔

وتاخیر قیام ای الثالثۃ بزیادۃ علی التشھد بقدر رکن وقیل بحرف وفی الزیلعی الأصح وجوبہ باللھم علی محمد . الدر المختار مع رد المحتار جلد اول صفحہ ۸۴۵ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ۔ بہار شریعت میں بھی صاحب در مختار کا ارشاد نقل کیا گیا ہے۔

محمد علیم الدین نقشبندی عفی عنہ

﴿فتویٰ نمبر......69﴾

سوال

اگر پہلی رکعت میں التحیات پڑھنی شروع کردے تو کیا کرے؟ اگر تیسری یا پہلی رکعت میں سلام پھیر دے تو کیا کرے؟ اور اچھی طرح یاد نہ ہو یعنی شبہ ہو تو کیا کرے؟

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

☆ اگر پہلی یا تیسری رکعت میں پوری التحیات یا ایک دو کلمہ پڑھ لیا یا بھول کر سلام پھیر دیا تو بوجہ تاخیرِ فرض بعد پوری کرنے نماز کے سجدہ سہو واجب ہوگا۔ اور اگر اس امر میں شک ہو کہ پہلی رکعت ہے یا دوسری علیٰ ہذا تیسری ہے یا چوتھی تو اس کو چاہئے کہ سوچے اور جس امر کا ظن غالب ہو اسی پر بنا کرے۔ اور اگر دونوں جانب سے کسی طرف ظن غالب نہ ہو بلکہ دو طرفہ برابر شک ہے کہ نہیں معلوم پہلی ہے یا دوسری علی ھذا تیسری ہے یا چوتھی تو پہلی ہی رکھے۔ علیٰ ھذا تیسری ہی سمجھے مگر اس پہلی میں بیٹھ کر التحیات پڑھے اور اسی طرح تیسری میں بھی بیٹھ کر التحیات پڑھے پھر دوسری علی ھذا چوتھی رکعت التحیات درود دعا پڑھ کر سلام پھیر کر سجدہ سہو کر کے پھر التحیات درود دعا پڑھ کر سلام پھیر دے۔ اس واسطے کہ اگر فی الواقع وہ دوسری تھی تو بیچ کا قعدہ جو واجب ہے ادا ہو گیا۔ اور اگر چوتھی تھی تو قعدہ فرض ادا ہو گیا۔ اور ایک رکعت زائد پڑھنے سے جو خروج عن الصلوۃ میں یعنی سلام پھیرنے میں جو تاخیر ہوئی تھی اس کا نقصان سجدۂ سہو سے جاتا رہا۔ علیٰ ہذا بصورت ہونے اس پہلی رکعت کے دوسری حقیقتاً۔ اگر یہ تیسری میں اس کو دوسری سمجھ کر بیٹھا اور پھر ضرور ہے کہ تیسری میں بیٹھے اس واسطے کہ وہ فی الواقع چوتھی ہوگی۔ اور قعدہ اخیرہ فرض ہے۔ تو پھر چوتھی پڑھے گا اور فی الواقع وہ پانچویں ہوگی سجدہ سہو آخر میں کرنے سے یہ سارے نقصان سے نکل جائیں گے اور نماز کامل ہو جائے گی۔ فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی مسجد جامع اکبر آباد

﴿فتوی نمبر......70﴾

سوال

پائجامہ یاتہ بند ٹخنوں کو چھپاتا ہوا جائز ہے اور نماز ہو جائے گی یا مکروہ؟ مرد کو اس کا پہننا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

پائجامہ یاتہ بند ٹخنوں تک ہو تو جائز ہے مگر ٹخنوں سے نیچے مکروہ ہے اور نماز بھی مکروہ۔ حدیث ابوداؤد میں ہے۔

ان اللہ جل ذکرہ لا یقبل صلوۃ رجل مسبل ازارہ [1]

☆ (ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالی اس آدمی کی نماز قبول نہیں فرماتا جو اپنا تہ بند لٹکائے)

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم غفرلہ

✿✿✿✿✿

---

[1] سنن ابی داؤد جلد اول صفحہ ۲۱۲ حدیث رقم ۶۳۸ مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ بیروت

﴿فتویٰ نمبر...... 71﴾

سوال

بعد نماز گوشۂ جانماز کولوٹ دینا دیکھا گیا ہے اس کی شرع میں کہاں تک اصل ہے۔

الجواب

بعد نماز گوشۂ جانماز کولوٹ دینا کسی معتبر کتاب میں نظر سے نہ گزرا۔

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

﴿فتویٰ نمبر......72﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسلمان کلمہ گو اہلِ سنت و جماعت قوم شیخ پیشہ خاک روبی کرتے ہیں۔آیا یہ لوگ مسجد میں نماز جماعت سے یا علیحدہ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں اور مسجد ہذا کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں یا نہیں۔شرع شریف کیا حکم دیتا ہے؟

سائل: علیم الدین گھڑی ساز کناری بازار آگرہ

۱۰ستمبر۱۹۱۶ء

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما.

ہر مسلمان سنی حنفی ہر ایک مسجد میں استحقاق نماز پڑھنے کا اور مسلمانوں کے ساتھ کھانے پینے کا استحقاق رکھتا ہے۔خواہ وہ خاک روبی پیشہ کرے خواہ پاخانہ اٹھائے۔البتہ یہ ضرور ہے کہ جب مسجد میں آئے پاک صاف ہو کر آئے۔اور نہ ایسی چیز کھا کر جس کی بو سے مسلمانوں کو ایذا پہنچے جیسے پیاز لہسن۔اگر بسند (بدبو) ہے مسجد میں آئے مکروہ ہے۔حضور سرور عالم ﷺ فرماتے ہیں۔

من اکل من ھذہ الشجرۃ فلا یقربن مسجدنا[1]

---

[1] (الف)صحیح البخاری جلد ا صفحہ ۲۱۶ مطبوعہ دار الفکر
(ب) صحیح مسلم المساجد /۱۷ مطبوعہ عیسی الحلبی
(ج) سنن ابی داؤد کتاب الاطعمہ حدیث رقم ۴۱
وغیرھا کتب الأحادیث تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو موسوعۃ اطراف الحدیث النبوی
جلد ۸ صفحہ ۱۴۰ تا ۱۴۳ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

☆ یعنی وہ شخص جو اس درخت یعنی پیاز لہسن سے کھائے بلاشبہ ہماری مسجد میں نہ آئے۔

علی ہذا جس کے بغل گندہ یا مونہ کی بدبو یا کوڑہ یا گنج وغیرہ سے لوگوں کو تکلیف ہو اگر وہ بسند (بدبو) سے ہو لوگ پریشان ہوتے ہوں اس کی جماعت اور حاضری مسجد معاف ہے۔ اور جب کچھ نہیں تو بھنگی چمار مسلمان سنی حنفی کو مسجد میں وضو کرنے پانی پینے نماز پڑھنے کا حق حاصل ہے۔ جو ایسے مسلمان کو فقط بوجہ خاک روبی کے نماز پڑھنے سے منع کرے سخت گناہگار ہے اور پیرو طریق کفارِ نابکار۔

حررہ

ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی

مفتی مسجد جامع آگرہ

❁❁❁❁❁
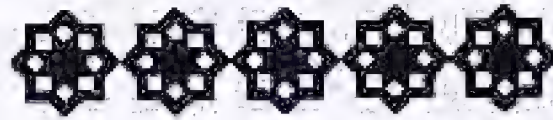
﴿فتویٰ نمبر......73﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جامع مسجد بھرت پور میں بروزِ جمعہ اکثر سائل اپنے کو غریب الوطن نادار مسافر اور ایسے الفاظ سے ملقب کر کے نمازیوں کی صف کے آگے پیچھے گشت لگا کر بآوازِ بلند سوال اپنی امداد کا زرِ نقد سے کرتے ہیں۔ ایسے وقت میں کوئی نمازی ادائے سنت میں کوئی اپنے دیگر اذکار میں مشغول ہوتے ہیں۔ آپ از روئے شریعت اطلاع بخشیں کہ ایسے وقت ان سائلان کو سوال کرنے سے باز رکھا جائے تو خلاف سنت ہوگا؟ بینوا توجروا

الجواب

بسم الله الرحمن الرحیم۔

اللهم رب زدنی علما

فقہائے کرام کے نزدیک تو مسجد میں سوال کرنا حاجت مند ہو یا غیر حاجت مند دونوں کو حرام ہے☆ اور مسجد میں سوال کرنے والے کو دینا مکروہ ہے۔ چنانچہ صفحہ ۴۸۸ جلد اول درمختار مطبوعہ مصر علی ہامش ردالمحتار میں ہے:

و یحرم فیه السوال و یکره الاعطاء مطلقا و قیل ان تخطی[۱]

☆ (ترجمہ: مسجد میں مانگنا حرام ہے اور دینا مطلق مکروہ ہے بعض علماء نے فرمایا کہ اگر سائل لوگوں کی گردنوں کو پھلانگے تو دینا مکروہ ہے)

یعنی بعض فرماتے ہیں کہ اگر سائل مسجد میں صفوں پر کودتا اور صفوں کو چیرتا پھرے اور نماز پڑھنے والوں کو اور مسجد میں انتظارِ نماز میں بیٹھے ہوؤں کو تکلیف دے تو اس طرح سوال کرنا بھی حرام ہے اور ایسے سائل کو دینا

---

[۱] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۱ صفحه ۴۸۸ مکتبه رشیدیه کوئٹه

بھی مکروہ ہے ورنہ دینے میں کوئی حرج نہیں۔اس واسطے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حالتِ نماز میں سائل کو انگوٹھی نکال کردے دی اس پر اللہ نے ان کی تعریف فرمائی حیث قال اللہ

و یوتون الزکوۃ و ھم راکعون[۱]

(ترجمہ:اور وہ زکوۃ ادا کرتے ہیں اس حال میں جب کہ وہ رکوع میں ہوتے ہیں)

چنانچہ درمختار مذکورہ میں صفحہ 296 جلد خامس کتاب الحظر والاباحۃ میں ہے

ویکرہ اعطاء سائل المسجد الا اذا لم یتخط رقاب الناس فی المختار کما فی الاختیار ومتن مواھب الرحمن لأن علیا رضی اللہ عنہ تصدق بخاتمہ فی الصلوۃ فمدحہ اللہ بقولہ ویوتون الزکوۃ و ھم راکعون[۲]

(ترجمہ:مختار قول کی رو سے مسجد میں مانگنے والے کو دینا مکروہ ہے ہاں اگر وہ لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگے تو مکروہ نہیں ہے جیسا کہ الاختیار اور مواہب الرحمٰن کے متن میں ہے۔کیوں کہ حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے دورانِ نماز اپنی انگشتری صدقہ کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی تعریف یوں فرمائی کہ یہ لوگ رکوع کی حالت میں صدقہ ادا کرتے ہیں)

قال الشامی رحمہ اللہ :

قولہ (الا اذا لم یتخط) أی ولم یمر بین یدی المصلین قال فی الاختیار فان کان یمر بین یدی المصلین و یتخطی رقاب الناس یکرہ لانہ اعانۃ علی اذی الناس حتی قیل ھذا فلس لا یکفرہ سبعون فلسا[۳].

(ترجمہ:قولہ:ہاں اگر لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگے تو مسجد کے سائل کو دینا مکروہ نہیں۔یعنی نہ ہی وہ نمازیوں کے

---

[۱] القرآن المجید : سورۃ المائدہ : آیت / ۵۵

[۲] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۵ صفحہ ۲۹۶ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

[۳] رد المحتار : جلد ۵ صفحہ ۲۹۶ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

آگے سے گذرے الاختیار میں ہے کہ اگر سوال کرنے والا نماز ادا کرنے والوں کے آگے سے گذرے اور لوگوں کی گردنوں کو پھلانگے تو اسے دینا مکروہ ہے کیوں کہ یہ لوگوں کو تکلیف پہنچانے پر اعانت ہے بعض علماء نے فرمایا کہ اس طرح دیئے ہوئے ایک پیسہ کے گناہ کا کفارہ ستر پیسے بھی نہیں ہو سکتے)

یعنی اگر سائل نمازیوں کے آگے سے نکل یا صفوں کو چیرتا اور ایذا دیتا پھرے تو اس کو ایک پیسہ دینے کے گناہ کا کفارہ اگر ستر پیسہ اللہ واسطے دے دے جب بھی نہیں ہو سکتا۔

بہر نہج جو سائل فی الواقع حاجت مند ہو اور قرینہ سے معلوم ہو کہ مجبور پریشان ہو کر سوال کرتا ہے یا قرینہ سے معلوم ہو کہ یہ سائل جو کرایہ ریل یا سواری مانگ رہا ہے بوجہ شدتِ مشقتِ سفر مانگتا ہے۔ اگرچہ پیدل چلنے پر قادر ہے یا جاڑوں میں بغیر سرمائی کے گزر کر سکتا ہے مگر بوجہ مشقتِ شاق سردی کے سوال کرتا ہے تو چونکہ اس کو سوال کرنا جائز ہے اگر مسجد میں سوال نہ کرے یا مسجد ہی میں کرے مگر اس طرح نہ کرے کہ صفوں کو چیرتا پھرے اور نمازیوں کو اس کے سوال سے ایذا نہ پہنچے اور لوگوں کے ورد و وظائف اور نماز میں خلل انداز نہ ہو تو اس کو دینا بھی جائز ہے۔ بلکہ موجبِ ثواب ہے **کما حققه الغزالی رحمه الله فی کتاب الفقر والزهد من الجزء التاسع لا حیاء العلوم فی صفحه 306-307-308 من احیاء المطبوعة علی هامش اتحاف السادة** اور ایسی صورت پر محمول ہیں یہ حدیثیں۔

☆ **قال النبی ﷺ للسائل حق و لو جاء علی فرس**[۱]

(ترجمہ: مانگنے والے کا حق ہے اگرچہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے)

و قال النبی ﷺ لا یمنعن احدکم السائل ان یعطیه و ان کان فی یده قلبا من ذهب[۲]

---

[۱] i. احیاء علوم الدین : جلد ۴ صفحہ ۳۲۷ مطبوعہ دار الوعی حلب

[۱] ii. احیاء علوم الدین مع اتحاف السادة المتقین جلد ۱۱ صفحہ ۵۹۴ دار الکتب العلمیہ بیروت

[۲] اتحاف السادة المتقین جلد ۱۱ صفحہ ۵۹۴ دار الکتب العلمیہ بیروت

(ترجمہ: تم میں کوئی بھی سائل کو ہرگز نہ روکے کہ اس کو کچھ دینا پڑے گا اگر چہ اس کے ہاتھ میں خالص سونا موجود ہو)

و قال ﷺ لو صدق السائل ما افلح من ردہ[۱]

(ترجمہ: سائل اگر سوال میں سچا ہو تو جس نے اس کو خالی لوٹا دیا اس نے فلاح نہ پائی)

حالانکہ صفحہ ۳۰۳ جلد تاسع اتحاف السادۃ المتقین شرح احیاء علوم الدین میں بہ نسبتِ حدیث اول منقول ہے کہ یہ حدیث بے اصل ہے۔ **حیث قال صاحب الاتحاف رحمہ اللہ**

عن احمد بن حنبل انہ قال اربعۃ احادیث تدور فی الاسواق لیس لھا اصل منھا للسائل حق الخ[۲]

(ترجمہ: حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ چار احادیث بازاروں میں کثرت سے بولی جاتی ہیں لیکن ان کی کوئی اصل نہیں ہے ان میں پہلی ہے للسائل حق الخ۔)

اور حدیثِ ثانی کی نسبت تحریر فرماتے ہیں اس کی سند میں عثمان بن فائذ ضعیف ہیں[۳]۔

اور حدیث سوم کو بھی اگر چہ علامہ ابن المدینی سے نقل کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک صحیح نہیں ہے[۴]

مگر تاہم یہ حدیث مفسر ہے پہلی دونوں حدیثوں کی خبر کی۔

خلاصہءِ مضمون دونوں احادیثِ مذکور اور نیز آیہ کریمہ

اما السائل فلا تنھر (سوالی کو مت جھڑکو)

---

[۱] اتحاف السادۃ المتقین — جلد ۱۱ صفحہ ۵۹۴ — دار الکتب العلمیہ بیروت

[۲] اتحاف السادۃ المتقین — جلد ۱۱ صفحہ ۵۹۴ — دار الکتب العلمیہ بیروت

[۳] اتحاف السادۃ المتقین جلد ۱۱ صفحہ ۵۹۴ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، میں ہے کہ:

وفیہ عثمان بن فائد وھو ضعیف

[۴] ایضاً: میں ہے۔ قال ابن المدینی ثلاثۃ اشیاء لا یصح عن النبی ﷺ منھا لو صدق السائل

یہی ہوتا ہے کہ اگر سائل فی الواقع حاجت مند معلوم ہو گو اس کے ہاتھ میں سونا بھی ہو یا گھوڑے پر سوار ہو اور بوجہ زیادتِ مقدارِ ادائے دینِ لازمہ وغیرہ مثلاً وہ حاجت مند اور سچا معلوم ہو تو اللہ فرماتا ہے اس کو مت جھڑکو اور اگر اس کو باوصف طاقت خالی ہاتھ کوئی پھیر دے گا وہ فلاح یاب نہ ہو گا۔ اور ایسے ہی حاجت مند سائل کے پھیر دینے کی نسبت بعض احادیث میں وارد ہوا ہے کہ قیامت کے دن اللہ فرمائے گا کہ اے میرے بندے میں بھوکا تھا تو نے مجھ کو کھانا نہیں کھلایا۔ میں پیاسا تھا تو نے مجھ کو پانی نہیں پلایا۔ میں ننگا تھا تو نے مجھ کو کپڑا نہیں پہنایا۔ جب بندہ عرض کرے گا تو تو ان سب امور سے پاک ہے تو ارشاد ہو گا ہمارا فلاں بندہ بھوکا تھا پیاسا تھا ننگا تھا اس نے تجھ سے مانگا اگر تو اس کو دیتا گویا ہم کو دیتا یعنی جب وہ فی الواقع حاجت مند تھا اور سچا اور تو اس کی حاجت روائی پر قادر تھا تو تو نے اس کو نہ کھلایا گویا ہم کو ہی نہ کھلایا علی ہذا القیاس۔

☆ اگر غریب خستہ حال کے واسطے سوال کرے تو وہ بھی جائز اور داخلِ اعانتِ غرباء وفقرائے خستہ حال ہے۔ اور جن سے بے تکلفی ہو جیسے اپنے بزرگ یا حکام یا دوست جو بلا سوال بھی دیتے رہتے ہوں اور اس کے سوال سے ناراض نہ ہوں بلکہ خوش ہو کر دیں نہ کہ شرما کر تو ان سے بھی مانگ لینے کا مضائقہ نہیں چنانچہ صفحہ ۳۰۲ اتحاف السادۃ شرح احیاء العلوم کی جلد نہم میں علامہ زبیدی حنفی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

قوله (انه قد وردت مناه كثيرة في السوال وتشديدات) عظمية تدل على تحريمه والمراد بالسوال ههنا سوال الناس عامة و يكون ذلك لنفسه و خرج بذلك إذا كان يسال لغيره فهذا غير داخل في تلك التشديدات بل هو معونة و خرج بذالك أيضا ما اذا كان لنفسه و لكنه سال الاقارب والاصدقاء فهو طريق القوم وعليه العمل لأن الأصدقاء يفرحون بذلك ويرون الفضل والمنة للصديق القاصد واليه يشير قوله وورد فيه أيضا ما يدل على الرخصة إذ قال ﷺ للسائل حق انتهى[1] .

(ترجمہ: مانگنے کے بارے میں بہت سی ممانعتیں اور عظیم وعیدیں وارد ہیں جو اس کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں

---

[1] اتحاف السادة المتقين جلد ۱۱ صفحہ ۵۹۴ مطبوعه دار الكتب العلميه بيروت

یہاں پر سوال سے مراد عام لوگوں سے مانگنا ہے اور وہ بھی اپنی ذات کے لیے۔ ان ممانعتوں سے وہ صورت خارج ہے جب کہ کسی دوسرے کے لیے مانگا جائے تو وہ ان وعیدوں میں داخل نہیں ہے بلکہ وہ تو کسی کی مدد کرنا ہے اور اس سے وہ صورت بھی خارج ہے جب کہ اپنے لیے مانگے لیکن رشتہ داروں اور دوستوں سے سوال کرے یہ صوفیۂ کرام کا طریقہ ہے اور اسی پر دور حاضر میں عمل ہے کیوں کہ دوست اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اور قصد کرنے والے دوست کا اسے احسان اور مہربانی شمار کرتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ نیز آپ سے وارد ارشاد میں اس طرح سوال کرنے کی رخصت پر دلالت پائی جاتی ہے کیوں کہ آپ کا ارشاد مبارک ہے للسائل حق الخ)

☆ ورنہ بلاضرورت سوال کرنے والوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا درّوں سے پٹوانا اور زیادہ حاجت سے جو اس نے جمع کر رکھا تھا اس کا فقراء حاجت مندوں کو دلوانا روایتِ صحیحہ سے ثابت ہے۔

چنانچہ صفحہ ۳۰۵ جلد نہم احیاء العلوم میں مذکور ہے:۔

و سمع عمر رضی الله عنه سائلا یسال بعد المغرب فقال لواحد من قومه عش الرجل فعشاه ثم سمعه ثانیا یسال فقال الم اقل لک عش الرجل قال عشیته فنظر عمر فاذآ تحت یده مخلاة مملوء ة خبزا فقال لست سائلا و لکنک تاجر ثم اخذ المخلاة و نشرها بین یدی اهل الصدقة و ضربه بالدرة قال لا تعد[1]

☆ ترجمہ: حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو مغرب کے بعد مانگتے سنا آپ نے اپنے خاندان کے ایک فرد کو فرمایا اس شخص کو رات کا کھانا کھلا دو۔ اس نے اس کو کھانا کھلا دیا۔ آپ نے دوبارہ اسے مانگتے ہوئے سنا تو پوچھا کیا میں نے تم کو نہیں کہا تھا کہ اس شخص کو کھانا کھلا دو۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو اس نے ہاتھ کے نیچے ایک توبرا روٹیوں سے پُر تھا۔ تو آپ نے فرمایا تم مانگتے نہیں ہو تم تو تاجر ہو۔ پھر وہ توبرا لے لیا اور صدقہ کے مستحق افراد کے سامنے اسے پھیلا دیا اور اسے دُرّہ سے سزا دی اور فرمایا آئندہ ایسا مت کرو۔)

---

[1] احیاء علوم الدین مع اتحاف السادة المتقین جلد ۱۱ صفحہ ۵۹۹ دار الکتب العلمیه بیروت

اور اتحاف مذکورہ کی جلد نہم صفحہ ۳۰۴ میں ہے:

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم :

☆ "من سال عن غنی فانما یستکثر من جمر جهنم و من سال و له ما یغنیه جاء یوم القیمة وو جهه عظم یتقعقع لیس علیه لحم".

قال العراقی رواه ابو داؤد و ابن حبان...

و لمسلم من حدیث ابی هریرة

"من سال الناس اموالهم تکثرا فانما یسال جمرا"..

و للبزار و الطبرانی من حدیث ابن مسعود و ابن عمر

"لا یزال العبد یسال و هو غنی حتی یخلق وجهه ."

و فی اسناده لین.

و للشیخین من حدیث ابن عمر

"ما یزال الرجل یسال الناس حتی یاتی یوم القیامة لیس فی وجهه مزغة لحم".

و ایضا فیه و روی عبدالله بن احمد فی زوائد المسند من حدیث علی

"من سال مسئلة عن ظهر غنی استکثر بها من رضف جهنم"

و روی ابن حبان و ابن شاهین و تمام و الضیاء من حدیث عمر

"من سال لیثری ماله فانما هو رضف من النار یلقمه من شاء فلیقل و من شاء فلیکثر"

وایضا فیه و فی روایة للطبرانی فکان یلقم الرضفة الخ[1]

(ترجمہ: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فراخ دستی کے باوجود جو شخص سوال کرتا ہے وہ دوزخ کے انگاروں کو زیادہ

---

[1] اتحاف السادۃ المتقین جلد ۱۱ صفحہ ۵۹۷ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

کر رہا ہے۔اور جس شخص نے مانگا حالانکہ اس کے پاس اتنا تھا جو اس کے لیے کافی تھا وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا چہرہ صرف ہڈی ہوگا جو حرکت کر رہی ہوگی)

علامہ عراقی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ''اسے امام ابوداؤد نے اور امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہما نے روایت کیا ہے''

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

''جس نے اپنا مال بڑھانے کے لیے لوگوں سے سوال کا وہ انگارے مانگ رہا ہوتا ہے''

امام بزار اور امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہما نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ ۔

''آدمی امیر ہونے کے باوجود سوال کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کا چہرہ بوسیدہ ہو جاتا ہے''

اس حدیث کی سند میں کچھ نرمی ہے

امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی

''آدمی لوگوں سے مانگتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا''

امام عبداللہ بن احمد رحمۃ اللہ علیہما نے زوائد مسند میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ

''جو شخص باوجود فراخ دستی کے سوال کرتا ہے وہ صرف دوزخ کے گرم پتھر زیادہ کر رہا ہوتا ہے''

امام ابن حبان' امام ابن شاہین' امام تمام اور امام ضیاء رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی:

''جو شخص مال دار ہونے کے لیے سوال کرتا ہے مانگا ہوا وہ مال دوزخ کے گرم پتھر ہوتے ہیں جنہیں وہ نگلے گا اب جو چاہے کم مانگے جو چاہے زیادہ سوال کرے''

امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت میں ہے کہ:

''وہ گرم پتھر نگلے گا۔الخ''

پھراس مال کی مقدار جس کے بعد سوال کرنا حرام ہے بحسب اختلاف حالات لوگوں کے اوراختلاف اوقاتِ حاجت کے بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ صبح اور شام کا کھانا ہے اس کا یا اس کے کھانے اور اس کے اہل وعیال کے کھانے کا اور زیادہ سے زیادہ اس کی مقدار پچاس درہم ہے جو تقریباً پندرہ روپیہ کے قریب ہوتے ہیں یا اس قیمت کا سامان بیان کیا گیا ہے۔چنانچہ ۱۲۰۹احیاءالعلوم مذکورہ میں ہے۔

و قد ورد فی الحدیث

"استغنوا بغنی الله تعالی عن غیره قالوا و ما هو قال غداء یوم و عشاء"

و فی حدیث آخر

"من سال و له خمسون درهم اوعدلها من الذهب فقد سال الحافا"

و فی لفظ آخر

"اربعون درهما"[1]

(ترجمہ: حدیث پاک میں آیا ہے

''اللہ تعالیٰ کی غنا کے ساتھ اس کے ماسوا سے غنی ہو جاؤ۔ صحابہ نے عرض کی وہ کیا ہے؟ فرمایا ایک دن کے صبح اور رات کھانا''

دوسری حدیث میں آیا ہے

''جس کے پاس پچاس درہم یا ان کے برابر رقم ہو اور وہ مانگے تو اس نے لوگوں سے لپٹ کر مانگا ہے''

ایک روایت کے الفاظ یوں ہیں:

''اس کے پاس چالیس درہم ہوں۔الخ''

---

[1] احیاء علوم الدین مع اتحاف السادۃ المتقین ،جلد /۱۱ صفحہ /۲۰۸ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

قال الزبیدی رحمه اللہ فی شرح فی بیان حدیث الاول

و فی حدیث سہل بن الحنظلیة قالوا و ما یغنیه یا رسول اللہ قال قدرما یغدیه ویعشیه

رواہ احمد وابو داؤد و ابن خزیمه و ابن حبان و ابن جریر و الطبرانی و الحاکم

فی حدیث علی قالوا و ما ظهر غنی قال عشاء لیلة ...

رواہ عبداللہ بن احمد و اسنادہ حسن

وھذا ھو المختار من مذھب ابی حنیفة رضی اللہ عنه[1] .

(ترجمہ: علامہ زبیدی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی حدیث کی شرح میں فرمایا: حضرت سہل بن حنظلیہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے صحابہ نے عرض کی کونسی چیز آدمی کے لیے کافی ہوتی ہے فرمایا اتنی مقدار جس سے صبح اور شام کا کھانا ہو سکے۔ اسے امام ابوداوٗد امام ابن خزیمہ امام ابن حبان امام ابن جریر امام طبرانی ' امام حاکم نے روایت کیا

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے فراخ دستی کیا ہے؟ فرمایا ایک رات کا کھانا۔

اسے امام عبداللہ بن احمد رحمۃ اللہ علیہما نے روایت کیا اور اس کی سند حسن ہے

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ عنہ کا مختار مذہب یہی ہے)

یعنی اس حدیث کو امام احمد اور ابوداوٗد وغیرہ ائمہ حدیث نے سہل بن حنظلیہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور علی رضی اللہ عنہ سے بسندِ حسن دوسری روایت میں اس غنا کی مقدار جس کے بعد سوال حرام ہے فقط شام کے وقت کا کھانا آیا ہے۔ اور یہی مقدار مذہب امام اعظم سے مقدار مختار ہے۔

☆ اور ظاہر ہے کہ علاوہ حاجت مند' بیوہ' یتیم' فقراء' مساکین اور مسافرین کا جس کا قرائن سے فی الواقع ایسا ہی حاجت مند ہونا نہ ثابت ہو جائے ان کو دینا بھی حرام ہے اور اعانت ہے ان کے فعل حرام پر خصوصا جب صفوں کو چیرتے اور نمازیوں کو سختیٔ سوال سے ستاتے پھریں۔ جیسے عید و بقر عید کو بھیک کا پیشہ کرنے والے فقیر

---

[1] اتحاف السادۃ المتقین جلد ۱۱ صفحہ ۶۰۸ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

مسجدوں میں صفوں کو چیرتے اور مسجدوں میں نمازیوں کے آگے گھوڑ دوڑ کرتے پھرتے ہیں۔ ایسوں ہی کے دینے کی نسبت علامہ شامی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ ان کو ایک پیسہ دینے کا گناہ اتنا ہوتا ہے کہ اگر اس کے کفارہ میں ستر پیسہ اللہ واسطے دیئے جائیں جب بھی دینے والا اس گناہ سے بری نہیں ہوتا۔ چنانچہ اول فتوی ھذا میں یہ مضمون معہ عبارت مذکور ہو چکا ہے۔

حررہ العبد الراجی ابو محمد محمد دیدار علی
المفتی فی جامع اکبر آباد

❀❀❀❀❀
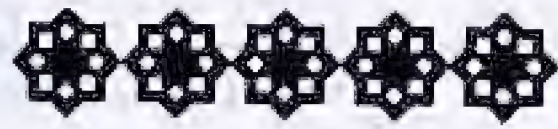
﴿فتویٰ نمبر......74﴾

سوال

جمعہ کو کس وقت خرید وفروخت نہ چاہئے۔اذانِ اول یا اذانِ دوم سے۔

الجواب

هو المصوب

☆ احتیاط یہ ہے کہ وقتِ جمعہ یعنی بعد زوال سے جس وقت تک جامع مسجد میں نماز نہ ہو جائے' خرید فروخت مکروہ تحریمی ہے اوراذانِ اول جو منار پر اول وقت دی جاتی ہے اس پر اکثر علماء کا اتفاق ہے۔

ردالمحتار میں ہے۔

الاصح انه الاول باعتبار الوقت و هو الذى يكون على المنارة بعد الزوال[1] .

(ترجمہ: سعی کا وجوب اور بیع کا ترک جس اذان سے لازم ہو جاتے ہیں اس سے مراد اصح قول کے مطابق وہ ہے جو وقت کے اعتبار سے پہلی ہوتی ہے اور وہ زوال کے بعد منارہ پر پڑھی جاتی ہے)

اور مطلب بیع شراء کے مکروہ کا یہ ہے کہ بیع تو جائے گی مگر یہ فعل گناہ ہوگا۔

والله اعلم بالصواب و عنده ام الكتاب

كتبه: المفتى السيد محمد اعظم شاه

عفى عنه و كفاه

✿✿✿✿✿

---

[1] رد المحتار : جلد ۳ صفحہ ۳۵ دار احياء التراث العربى بيروت

﴿فتویٰ نمبر......75﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین

اول یہ کہ خطبہ علمی یوم جمعہ یا عیدین میں معہ اشعار پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

دوم یہ کہ بخیالِ فہمید گی عوام خطبہ معہ اشعار پڑھنا جائے تو اس کی نسبت علماءِ حقانی کیا حکم صادر فرماتے ہیں؟

سوم یہ کہ اگر خطبہ علمی کا معہ اشعار پڑھنا ناجائز تصور کیا جائے' تو بعد اختتامِ خطبہء اول' وقتِ نشستِ منبر' قبل آغازِ خطبہء ثانی بھی اشعارِ خطبہ علمی و دیگر مسائل کا اذکار کیا جائے تو یہ طریق نزدِ علماء درست ہے یا نہیں؟

سائل: محمد خان پیش امام

الجواب

جلدِ اول فتاوی عالمگیریہ صفحہ ۱۰۶ میں ہے:

و یحرم فی الخطبة ما یحرم فی الصلوة [1]

(ترجمہ: دورانِ خطبہ وہ اعمال حرام ہیں' جو نماز میں حرام ہیں)

اور یہ اس واسطے کہ ظہر کے فرض جمعہ کے دن بوجہِ فرضیتِ جمعہ' دو رکعت ہیں۔ اس کی وجہِ تحقیقی فقہاءِ کرام سے یہ ہی معلوم ہوتی ہے' کہ خطبہ قائم مقام دو رکعتوں کے کر دیا گیا۔ لہٰذا اذانِ اول نمازِ جمعہ سنتے ہی سعی الی الخطبة بموجبِ سیاق اور دلالتِ آیۃ کریمہ:

یا ایها الذین امنوا اذا نودی للصلوة من یوم الجمعة فاسعوا الی ذکر الله [2]

---

[1] الفتاوی العالم گیریہ مع ترجمہ اردو : جلد ۲ صفحہ ۸۱۲ المکہ پریس لاہور

[2] القرآن الکریم : سورہ الجمعہ آیت ۹

(ترجمہ: اے ایمان والو! جمعہ کے روز جب نماز کے لیے ندا دی جائے' تو اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو)

فرض کردی گئی اور نمازِ جمعہ کی اذان کے ساتھ سعی ذکر اللہ کی طرف' جس سے مراد باتفاق' وہ خطبہ ہے' واجب ہو گئی

کما فی الکبیری فی صفحه ۵۱۵

فھی (ای الخطبة) من جملة الخصوصیات التی لم یرد اسقاط الرکعتین الا مع مراعاتها فکانت شرطا و شرط الخطبة کو نها فی الوقت لا تصح قبله لانه من جملة الخصوصیات المقیدیة بها و ان تکون بحضرة الجماعة للتوارث فلو خطب وحده ثم حضرت الجماعة فصلی بهم لا تجوز للتوارث و لقوله فاسعوا الی ذکر الله و هو یشمل الصلوة و الخطبة [1].

(ترجمہ: خطبہ ان خصوصیات میں سے ہے' جن کی رعایت کے بغیر دو رکعتوں کا ساقط ہونا وارد نہیں ہے۔ لہٰذا یہ (خطبہ) جمعہ کے لیے شرط ہے۔ اور خطبہ کی شرائط یہ ہیں)

☆ (۱) خطبہ وقت کے اندر ہو۔ وقت سے پہلے یہ درست نہیں۔ کیونکہ یہ ان خصوصیات میں سے ایک ہے جن کے ساتھ نمازِ جمعہ مقید ہے۔

(۲) یہ جماعت کی موجودگی میں دیا جائے۔ اگر خطیب نے اکیلے خطبہ پڑھ دیا پھر جماعت آ گئی اور ان کے ساتھ اس نے نمازِ جمعہ ادا کی تو جائز نہیں۔ کیونکہ توارث اسی طرح جاری ہے۔ نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے **فاسعوا الی ذکر الله** (یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف بھاگ کر آؤ) اس لفظ کے مفہوم میں نماز اور خطبہ دونوں شامل ہیں۔

چنانچہ روایتِ مذکور سے صاف ظاہر ہو گیا ہے کہ مقصود خطبہ سے مجرد وعظ نہیں ہے بلکہ من وجہ یہ خطبہ حکماً حکمِ نماز میں ہے۔ اس واسطے صاحبِ عالمگیر یہ فرماتے ہیں' کہ جو امور نماز میں حرام ہیں' خطبہ میں بھی

---

[1] الکبیری شرح منیة المصلی صفحه ۵۱۵ مطبوعه دیوبند

حرام ہیں۔[۱]

اور نماز کے متعلق علامہ حصفکی درمختار مصری کے صفحہ ۳۵۷ میں تحریر فرماتے ہیں

و صح شروعه ایضا مع کراهة التحریم بتسبیح و تهلیل و تحمید.... کما صح لو شرع بغیر عربیة ای لسان کان و شرطا عجزه۔[۲]

یعنی تکبیرِ تحریمہ میں اللہ اکبر کی جگہ سبحان اللہ یا لا الہ الا اللہ کے ساتھ نماز شروع کر دی، نماز ہو جائے گی مگر مکروہ تحریمہ ہوگی۔ جیسا کہ فارسی یا کسی دوسری زبان میں مثلاً ''اللہ بہت بڑا ہے'' کے ساتھ مکروہ تحریمہ ہوگی اور صاحبین کے نزدیک شرطِ صحت عجزِ مصلی ہے۔

یعنی بکراہتِ تحریمی بھی جب نماز ہوگی جب مصلی عربی میں اللہ اکبر ادا نہ کر سکے اور مجبوراً اردو میں یا کسی دوسری زبان میں ادا کرے۔

پھر بعد عبارتِ مذکور تحریر فرماتے ہیں۔

و علی هذا الخلاف الخطبة و جمیع اذکار الصلوة [۳]

(ترجمہ: خطبہ اور نماز کے تمام ارکان کے بارے میں بھی یہی اختلاف موجود ہے)

یعنی جو حکم تکبیرِ تحریمہ کا ہے، وہی حکم بموجب اختلافِ اقوالِ امام و صاحبین رحمہما اللہ خطبہ کا ہے۔ لہٰذا بلاشبہ خطبہ کا علاوہ عربی کسی غیر زبان میں گو جائز ہے، مگر مکروہ تحریمہ ہے۔

مگر اب کلام اس امر میں ہے کہ آیا دونوں خطبہ شرطِ جوازِ نماز ہیں یا مجرد ذکر اللہ بقدر الحمد للہ یا سبحان اللہ بھی کافی ہے۔ اور پھر دونوں خطبوں کے بعد، درمیان دونوں خطبوں کے کلام کرنا، یا نصیحت آمیز نظم یا نثر، طویل یا مختصر یا مطلقاً جائز ہے یا ناجائز۔ اور جائز ہے تو جائز مع الکراہت ہے یا بلا کراہت۔ لہٰذا اولاً

---

[۱] الفتاوی العالم گیریه مع ترجمه اردو جلد ۲ صفحه ۸۱۲ المکه پریس لاهور

[۲] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۳ صفحه ۱۶۰، ۱۶۱ دار احیاء التراث العربی بیروت

[۳] مع رد المحتار : جلد ۳ صفحه ۱۶۱ دار احیاء التراث العربی بیروت

تفصیل ان امور کی بیان کی جاتی ہے۔پھر متعلق خطبۂ علمی جواب دیا جائے گا۔

امام اعظم رحمۃ اللہ کے نزدیک شرطِ جوازِ نمازِ جمعہ فقط ذکر اللہ بقدر الحمدللہ یا مجرد لا الہ الا اللہ بہ نیت خطبہ ہے۔جس کا زبان عربی میں ادا کرنا ضرور ہے۔اور اگر سوا عربی کے بھی شروع کر دی تو جوازِ نماز کو کافی ہوگا۔مگر یہ فعل مکروہ تحریمہ ہے۔اور صاحبین کے نزدیک شرطِ صحتِ نماز کم از کم خطبہ کا زبان عربی میں اور عندالعجز' جب عربی میں نہ پڑھ سکے' بقدر التحیات پڑھنا ضرور ہے۔

کما فی الدر المختار صفحہ ۸۴۷

و کفت تحمیدة او تهلیلة او تسبیحة للخطبة المفروضة مع الکراهة وقا لا لا بدمن ذکر طویل و اقله قدر التشهد الواجب بنیتها[1]

(ترجمہ: خطبہ کی فرضیت کی ادائیگی کے لیے ایک بار الحمد للہ یا لا الہ الا اللہ یاسبحان اللہ کہنا کافی ہے لیکن صرف اسی پر اکتفاء کرنا مکروہ ہے۔صاحبین رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں' کہ خطبہ کی فرضیت کی ادائیگی کے لیے طویل ذکر ضروری ہے جس کی کم از کم مقدار تشہد ہے اور یہ خطبہ کی نیت سے پڑھا جانا ضروری ہے۔

☆ اور سنت موکدہ بالاتفاق دو خطبہ ہیں جو بہت دراز نہ ہوں اس واسطے کہ خطبوں کا بہت دراز پڑھنا مکروہ ہے۔**کما فی الدالمختار :**

و یسن خطبتان خفیفتان و تکره زیادتهما علی قدر سورة من طوال المفصل[2] .

☆(ترجمہ: دو ہلکے خطبہ پڑھنا سنت ہے اور ان کا طوالِ مفصل کی ایک سورت سے زیادہ ہونا مکروہ ہے)
اور بقدر تین آیت کے درمیان میں بیٹھنا بھی سنت ہے۔

کما فی الدر المختار :

بجلسة بینهما بقدر ثلث آیات[3]

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۱۹ دار احیاء التراث العربی بیروت

[2]

[3]

(ترجمہ: دو خطبوں کے درمیان تین آیات کی مقدار جلسہ کرے)

☆ ہر خطبہ کے اول میں حمد وثنا اور شہادتین اور صلوۃ وسلام اور کچھ مضامینِ وعظ ساتھ تلاوت آیتِ کلام اللہ کے مسنون ہے۔ چنانچہ خطبہ میں کبھی سورۃ والعصر کبھی رکوع لا یستوی اصحاب النهار الآیۃ کا پڑھنا حضور سرورِ عالم ﷺ سے منقول ہے۔ اس واسطے تارک کسی بھی امر کا امورِ مذکور سے گنہگار ہوتا ہے۔ اور بعد جلسۂ خفیفہ خطبۂ ثانی میں بعد اعادۂ حمد وثناء وصلوۃ وسلام اور مومن مرد اور عورتوں کے واسطے دعا مروی وماثور۔

کما فی البحر الرائق

و هی (ای الخطبة) تشتمل علی عشرة احدها البداء ة بحمد الله و ثانیها الثناء علیه بما هو اهله وثالثها الشهادتان ورابعها الصلوة علی النبی ﷺ و خامسها العظة والتذکیر و سادسها قراء ة القرآن و تارکها مسیٔ روی انه صلی الله علیه و سلم قرأ فیها سورة العصر و مرة اخری لا یستوی اصحاب النار وأصحاب الجنة أصحاب الجنة هم الفائزون و اخری و نادوا یا مالک و سابعها الجلوس بین الخطبتین و ثامنها ان یعید فی الخطبة الثانیة الحمد لله والثناء والصلوة علی النبی ﷺ و تاسعها ان یزید فیها الدعاء للمومنین والمومنات وعاشرها تخفیف الخطبتین بقدر سورة من طوال المفصل ویکره التطویل[1]

☆ (ترجمہ: خطبہ دس امور پر مشتمل ہوتا ہے۔ (۱) الحمد للہ سے آغاز کیا جائے (۲) اس پاک ذات کی ثناء ایسی کہی جائے جس کا وہ اہل ہے۔ (۳) توحید ورسالت کی شہادت (۴) نبی پاک ﷺ پر درود (۵) وعظ ونصیحت (۶) قرآن مجید کی قراءت۔ اس کو ترک کرنے والا ایک برا کام کرنے والا ہے۔ مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ خطبہ میں سورہ عصر کی تلاوت فرماتے اور کبھی لا یستوی أصحاب النار وأصحاب الجنة

[1] البحر الرائق: شرح کنز الدقائق: جلد ۲ صفحہ ۱۵۹ دار المعرفة بیروت

أصحاب االجنة هو الفائزون : (ترجمہ: جنتی اور دوزخی برابر نہیں، جنتی لوگ ہی کامیاب ہیں) اور کبھی ونادوا یا مالک پڑھا کرتے تھے (٧) دو خطبہ کے درمیان بیٹھنا (٨) دوسرے خطبہ میں الحمد للہ اللہ تعالیٰ کی ثنا اور نبی اکرم ﷺ پر درود پاک کا اعادہ کرنا۔ (٩) اس خطبہ میں اہلِ ایمان مردوں اور عورتوں کے لیے دعا کا اضافہ کرنا (١٠) طوالِ مفصل کی ایک سورت کے برابر خطبہ میں تخفیف کرنا ان کو طویل کرنا مکروہ ہے)

☆ اور اخیر میں ذکرِ خلفاءِ راشدین اور عمین مکرمین اور اہلِ بیتِ کرام مستحسن ہے:

كما فى صفحة ١٤٨ من البحر المصرى

ذكر الخلفاء الراشدين مستحسن بذلك جرى التوارث و يذكر العمين

(ترجمہ: خلفائے راشدین کا ذکر مستحسن ہے۔ توارث اسی طرح جاری ہے اور نبی پاک ﷺ کے چچاؤں کا ذکر بھی کرے)

☆ اور دعا کرنا سلطان اسلام کے لئے اور جائز اور اس کو مستحب سمجھنا بدعت۔

كمافى اخر الصفحة المذكورة من البحر

و فى السراج الوهاج واما الدعاء للسلطان فى الخطبة فلا يستحب روى ان عطاءً ا سئل عن ذلك فقال انه محدث و انما كانت الخطبة تذكيرا[1]

☆(ترجمہ: سراج وہاج میں ہے، کہ خطبہ میں بادشاہِ اسلام کے لیے دعا کرنا مستحب نہیں ہے۔ حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا یہ نو ایجاد امر ہے خطبہ تو صرف نصیحت ہوتا ہے)

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ دعا سلاطینِ اسلام کے واسطے امر زائد ہے خطبہ سے اس کو کوئی علاقہ نہیں کسی سے اس پر انکار منقول نہیں۔ بلکہ ظالم بادشاہوں کی تعریفِ بے جا پر یہاں تک انکارِ فقہا منقول ہے کہ اس وقت اگر سامعین باتیں کرنے لگیں اور نہ سنیں تو بہتر ہے۔

---

[1] البحر الرائق: شرح كنز الدقائق: جلد ٢ صفحه ١٦٠ دار المعرفة بيروت

کما فی البحر

ان الخطیب مادام فی الحمد والموعظة فعلیهم الاستماع فاذا اخذ فی مدح الظلمة والثناء علیهم فلا باس بالکلام حینئذ[1]

(ترجمہ: خطیب جب تک وعظ ونصیحت میں مشغول رہے حاضرین پر واجب ہے کہ اسے سنیں اور جب ظالم حکمرانوں کی مدح وثناء شروع کرے تو اس وقت باتیں کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے)

☆ مگر باایں ہمہ نقصانِ سنیتِ خطبہ یا ارکانِ جمعہ کی روایت نہیں پائی جاتی۔☆ اندریں صورت خطبۂ علمی میں تو بعد اختتامِ مضامینِ مذکورۂ خطبہ، زبانِ عربی میں اردو میں مضامینِ وعظ ہی غالباً مسطور ہیں جن کا اول ہی سے اگر خطبہ میں پڑھنا شروع کر دیا جائے جائز ہے گو مع الکراہۃ جائز ہے۔ پھر بعد اختتامِ تمام مضمونِ خطبہ کے زبانِ عربی میں جو طریق مسنون ہے اگر ان مضامینِ اردو کو بغرضِ نفعِ عوام پڑھ دیا جائے بلاشبہ جائز معلوم ہوتا ہے۔ جب دعاء سلاطینِ اسلام کے واسطے جائز ہے تو یہ مضامین باوصف ہونے ان مضامین کے مضامینِ وعظ بغرضِ صحیح اگر پڑھے جائیں کیا حرج ہے۔ البتہ ابتداءً ہی سے قصداً خطبہ اردو میں پڑھا جائے تو بلاشبہ عند الامام مکروہ تحریمہ یعنی جائز مع الکراہۃ ہے۔ اور صاحبین کے نزدیک بلا عجز مطلقاً ناجائز ہے۔ جیسے تکبیر کو علاوہ زبان ِعربی کے کسی زبان میں ادا کرنا جائز مع الکراہت تحریمہ اور نزدیکِ صاحبین بلا عجز مطلقاً ناجائز ہے۔ کما مر فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی النقشبندی القادری
المفتی جامع مسجد اکبرآباد

❁❁❁❁❁

---

[1] البحر الرائق: شرح کنز الدقائق: جلد ۲ صفحہ ۱۶۰ دار المعرفہ بیروت

﴿فتویٰ نمبر......76﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ شرحِ مبین اس مسئلہ میں، کہ ہندوستان میں نمازِ جمعہ کے بعد، جو چار رکعت احتیاطی فرض پڑھے جاتے ہیں، اس کی حقیقت کیا ہے۔ اگر ہندوستان میں جمعہ کی جماعت ہو جاتی ہے تو احتیاطی کے کیا معنی؟ اور اگر نہیں ہوتی تو وہ دو رکعت جو جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں کیا حکم رکھتی ہیں؟ فرض ہیں یا نفل اگر نفل ہیں؟ تو نفلوں کے جماعت کا ثبوت کیا ہے؟ دلائل سے جوابِ باصواب تحریر فرما کر مطلع فرمایئے۔

سائل: انتظام اللہ، انوار حسین، فیاض خان، لیاقت حسین صاحبان

چڑیمار ٹولہ آگرہ ۲/شوال ۱۳۴۴ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

و ھو الموفق للصواب

صورتِ مسئولہ میں چونکہ فرضیتِ جمعہ قطعی الثبوت ہے اور شروطِ جمعہ ظنی الثبوت لہٰذا بوجہ قطعی الثبوت ہونے کے باوصف فقدانِ بعض شروط، مثل شرطِ سلطان وغیرہ کے جمعہ کو عقیدۃً فرض سمجھ کر ضرور ادا کیا جائے اور چونکہ فقدانِ بعضِ شروط اور نیز عدمِ جوازِ جمعہ متعدد مسجدوں میں بقولِ مرجوع مورثِ شبہِ عدمِ صحتِ جمعہ ہے اور شبہات سے بچنا مومن کو ضروری لہٰذا بعد اداءِ جمعہ، چار فرض کا پڑھنا بہ نیت ادرکت وقتہ ولم اؤد بعد یا اس نیت سے کہ ادا کرتا ہوں میں وہ چار فرض اس آخر ظہر کے جو میرے ذمہ ضروری ہے۔ کما فی الشامی

و نقل المقدسی عن المحیط کل موضع وقع الشک فی کونہ مصرا ینبغی لھم ان یصلوا بعد الجمعۃ اربعا بنیۃ الظھر احتیاطا حتی انہ لو لم تقع الجمعۃ موقعھا یخرجون عن عھدۃ فرض الوقت باداء الظھر و مثلہ فی الکافی و فی القنیۃ لما ابتلی اھل مرو باقامۃ

الجمعتين فيها مع اختلاف العلماء في جواز هما امر ائمتهم بالاربع بعدها حتما احتياطا و نقله كثير من شراح الهداية و غيرها و تداولوه و في الظهيرية و اكثر مشائخ بخارىٰ عليه ليخرج عن العهدة بيقين ثم نقل المقدسي عن الفتح انه ينبغي ان يصلي اربعا ينوي بها آخر فرض ادركت وقته و لم اؤده ان تردد في كونه مصرا او تعدددت الجمعة ۱؎ الخ

(ترجمہ: علامہ مقدسی رحمۃ اللہ علیہ نے محیط سے یوں نقل فرمایا کہ ہر مقام جہاں اس کے مصر (شہر) ہونے میں شک ہو وہاں کے رہنے والوں کو چاہئے کہ جمعہ کی جماعت کے بعد احتیاطاً چار رکعتیں ظہر کی نیت سے ادا کریں تا کہ اگر جمعہ اپنے مقام (مصر) میں ادا نہیں ہوا تو وقت میں فرض نماز سے ظہر کی ادائیگی کے ساتھ یقینی طور پر عہدہ برآں ہو جائیں۔ کافی میں اسی طرح ہے۔ اور قنیہ میں ہے کہ جب مرو کو رہنے والے دو جگہ جمعہ قائم کرنے کی آزمائش میں مبتلا ہوئے اور ساتھ ہی ان دو مقامات میں جمعہ کے جواز میں اختلاف بھی تھا تو ان لوگوں کے ائمہ نے ان کو احتیاط کے لیے چار رکعت ضروری طور پر ادا کرنے کا حکم دیا۔ ہدایہ کے شارحین اور دیگر بہت سے علماء نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اور رواج دیا ہے۔ ظہیریہ میں ہے کہ بخاریٰ کے اکثر علماء کا یہی موقف ہے تا کہ ذمہ داری سے یقینی طور پر عہد برآ ہو سکیں۔ اس کے بعد علامہ مقدسی رحمۃ اللہ علیہ نے فتح القدیر سے نقل فرمایا کہ مناسب یہ ہے کہ چار رکعت ادا کرے اور نیت یہ کرے کہ آخری وہ فرض نماز ادا کرتا ہوں جس کا وقت میں نے پایا اور ابھی ادا نہیں کی۔ جب کہ اس جگہ کے شہر ہونے کا شک ہو یا متعدد مقامات پر جمعہ ادا کیا جاتا ہو۔ ۲؎

حررہ: ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی

۳ رمضان ۱۳۳۴ھ

۱؎ رد المحتار على الدر المختار، جلد ۲، صفحه ۱۴۶ مطبوعه مصر

۲؎ امام الفقہاء والمحدثین حضرت مولانا سید محمد دیدار علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا شاہی جامع مسجد اکبر آباد (آگرہ) میں بحیثیت مفتی وخطیب تقرر کے بعد یہ پہلا فتوی ہے۔ فتوی کے اجراء کی تاریخ ۳ رمضان ۱۳۳۴ھ ہے۔ رجسٹر پر غلطی سے سوال کے آنے کی تاریخ ۲ شوال درج ہوگئی ہے۔ آپ کے پوتے حضرت سید محمود احمد رضوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے اس مسجد میں بحیثیت مفتی وخطیب تقرر کی تاریخ ۳ رمضان ہی لکھی ہے (ملاحظہ ہو کتاب سیدی ابو البرکات) لہٰذا اسی کو ترجیح حاصل ہے۔

﴿فتویٰ نمبر......77﴾

سوال

بعض مسلمان ایک متقی امام کے پیچھے عیداور جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں اور بعض لوگ کسی ضد کی وجہ سے امامِ فاسق کے پیچھے پڑھتے ہیں۔ آیا یہ جائز ہے یا نہیں اور ایک شہر میں دو جگہ عیداور جمعہ ہوسکتا ہے یا نہیں۔

۱۹صفر۱۳۳۵ھ

سائل حسام الدین بینواہ علاقہ ریاست الور

الجواب

نمازِ عیدین اور نمازِ جمعہ دو جگہ جائز ہے☆ مگر متقی امام کے ہوتے ہوئے فاسق امام کے پیچھے نمازِ جمعہ وعیدین پڑھنا بلاشبہ مکروہ تحریمہ ہے۔

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ العلی

ابومحمد محمد دیدارعلی الألوری السنی

مفتی جامع مسجداکبرآباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......78﴾

سوال

دستیاب نہیں ہوسکا۔

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

عید کی نماز واجب ہے ساتھ چھ تکبیروں واجب کے' علاوہ تکبیر تحریمہ کے۔ لہٰذا بعد تکبیر تحریمہ سبحانک اللھم پڑھ کر امام' مقتدی سب رفع یدین کے ساتھ تکبیر کہہ کر ہاتھ نہ باندھیں۔ تیسری تکبیر کہہ کر ہاتھ باندھیں پھر امام اعوذ' بسم اللہ' الحمد' سورت پڑھ کے رکوع کرے اور دوسری رکعت میں بعد الحمد اور سورت کے تین تکبیر اسی طرح کہے اور ہاتھ نہ باندھیں اور ہاتھ چھوڑے ہوئے ہی اللہ اکبر کہہ کر رکوع کریں اور زیادہ تصریح ہمارے رسالہ فضائلِ رمضان میں ہے۔ بطریق نمونہ ایک رسالہ ارسال ہے۔ جتنے مطلوب ہوں ڈیڑھ آنہ فی رسالہ سے آپ طلب کر سکتے ہیں۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر......79﴾

سوال

جناب مولوی صاحب کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلۂ ذیل میں بعد انتقال زوجہ کے شوہر اس کو کاندھا دے سکتا ہے اور منہ اس کا دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟ بموجب شرع شریف کے کیا حکم ہے؟ مع نام کتاب وصفحہ سے آگاہی فرمائیں۔

سائل: غلام نبی بازار آگرہ۔ ۲۷ ربیع الأول ۱۳۳۵ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما.

یہ امر تو ظاہر ہی ہے کہ جب غیر کندھا دے سکتے ہیں تو شوہر کے کندھا دینے میں کیا حرج ہے؟ حالانکہ غیر بعد موت بھی عورت کی طرف دیکھنے سے منع کئے گئے ہیں اور شوہر کو بعد موت اپنی زوجہ کا منہ بلکہ بازو تک دیکھنا بلا تکلف جائز ہے۔ کما فی الدر المختار

و یمنع زوجها من غسلها ومسها لا من النظر الیها علی الاصح [1]

(ترجمہ: خاوند کو اپنی مردہ بیوی کو غسل دینے اور ہاتھ لگانے سے روکا جائے گا' لیکن اس کی طرف دیکھنے سے اصح قول کے مطابق نہ روکا جائے گا)

قال الشامی رحمه الله فی صفحه ۶۳ من شرح الدر المختار

قوله من النظر الیها عزاه فی المنح الی القنیة و نقل عن الخانیة انه اذا کان للمرأة محرم یممها بیده و اما الاجنبی فبخرقة علی یده و یغض بصره عن ذراعها و کذا الرجل

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۸۵ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

فی امرأته الافی غض البصر[۱]۔

(ترجمہ: قولہ: اس کی طرف دیکھنے سے نہ روکا جائے گا۔ منح الغفار میں اس قول کو قنیہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اور ☆ فتاوی خانیہ سے نقل کیا ہے کہ جب عورت کا کوئی محرم موجود ہو اور کوئی عورت موجود نہ ہو تو اس کو غسل نہ دیا جائے' بلکہ وہ محرم اپنے ہاتھ سے اسے تیمم کرادے۔ لیکن اجنبی اپنے ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر تیمم کرائے اور تیمم کے وقت اس کے ہاتھ نہ دیکھے۔ خاوند اگر اپنی مردہ بیوی کو تیمم کرائے تو اس کا حکم بھی اجنبی مرد کی مانند ہے۔ لیکن ہاتھوں کو دیکھنے کی اسے اجازت ہے۔

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی

ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی

مفتی جامع مسجد اکبرآباد

✿✿✿✿✿

---

[۱] ردالمحتار جلد ۳ صفحہ ۸۵ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

﴿فتویٰ نمبر......80﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اپنی زوجہ کا جنازہ اٹھا کر گہوارہ اور قبر میں رکھ سکتا ہے یا نہیں؟

۷ مارچ ۱۹۱۸ء

غلام نبی گڑہ گاریاں آگرہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صفحہ ۶۳۳ جلد اول درمختار میں ہے۔

و یمنع الزوج من غسلھا و مسھا لا من النظر الیھا علی الارجح[1]

یعنی شوہر کو منع کیا جائے اپنی بیوی کے غسل دینے سے اور اس کو ہاتھ لگانے سے نہ کہ اپنی بیوی کو دیکھنے سے بعد موت کے بروایت اصح۔

لہٰذا اولی اور افضل یہی ہے کہ قبر میں بھی عورت کو وہی لوگ اتاریں جن پر وہ حرام تھی یعنی اس کے رشتہ دار ذی رحم محرم نہ کہ شوہر۔

صفحہ ۵۵۳ من الکبیری

و ذو الرحم المحرم اولی بوضع المراۃ فان لم یکن فاھل الصلاح من الاجانب ذکرہ فی المحیط[2]

---

[1] الدر المختار علی ھامش رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۶۳۳ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

[2] غنیۃ المستملی شرح منیۃ المصلی صفحہ ۵۵۲ مطبوعہ مکتبہ رحیمیہ دیوبند

(ترجمہ: اولیٰ یہ ہے کہ عورت کو ذی رحم محرم رشتہ دار قبر میں رکھیں۔ اگر کوئی ایسا رشتہ دار موجود نہ ہو تو اجنبی جو اہلِ صلاح ہوں یہ کام سرانجام دیں۔ محیط)

☆ اور جو منقول ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت خاتونِ جنت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کو غسل دیا تھا اول تو اس پر انکارِ صحابہ منقول ہے۔ علاوہ بریں یہ امر مخصوص ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ بوجہ باقی رہنے علاقۂ زوجیت کے درمیان سیدنا علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کے قیامت تک بخلاف دوسرے لوگوں کے، علاوہ حضور ﷺ اور سیدنا علی کرمہ اللہ وجہہ اور حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کے، کہ مرنے کے بعد زوجہ کے سب کا علاقۂ زوجیت منقطع ہو جاتا ہے۔

کما هو ظاهر من رواية المنقولة في الدرالمختار في صفحه ۶۳۳ حيث قال:

وقالت الائمة الثلاثة يجوز لأن عليا رضي الله عنه غسل فاطمة رضي الله عنها قلنا هـذا محـمـول على بقاء الزوجية لقوله ﷺ كل سبب و نسب ينقطع بالموت الاسببي و نسبي مع ان بعض الصحابة انكر عليه شرح المجمع للعيني[1]

(ترجمہ: حضرات ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا خاوند کے لیے اپنی مردہ بیوی کو غسل دینا جائز ہے کیوں کہ حضرت سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کو غسل دیا تھا۔ ہم جواب میں کہتے ہیں کہ غسل دینے یہ روایت ان دونوں حضرات کے درمیان وفاتِ حضرت خاتونِ جنت رضی اللہ عنہا کے باوجود زوجیت کا تعلق باقی رہنے کے باعث ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا موت کے ساتھ ہر تعلق اور نسب ختم ہو جاتا ہے لیکن میرا تعلق اور نسب باقی رہتا ہے۔ علاوہ ازیں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پر انکار بھی فرمایا تھا۔ شرح المجمع للعيني)

حررہ: العبد الراجی
ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی المفتی فی جامع اکبر آباد

---

[1] الدر المختار على هامش رد المحتار جلد ۱ صفحه ۶۳۳ مكتبه رشيديه كوئٹه

﴿فتویٰ نمبر......81﴾

سوال دستیاب نہیں ہوا۔

۱۷رمضان ۱۳۳۶ھ

الجواب

عمامہ پر یا کفنِ میت پر یا پیشانی یا سینۂ میت پر عہد نامہ یا بسم اللہ یا کلمہ طیبہ لکھنے کو بعض فقہا نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اس کی برکت سے میت کو بخش دے چنانچہ صفحہ ۶۶۸ درمختار میں ہے۔

کتب علی جبهة المیت او عمامته او کفنه عهدنامه یرجی ان یغفر الله للمیت و اوصاه بعضهم ان یکتب فی جبهته و صدره بسم الله الرحمن الرحیم ففعل ثم رؤی فی المنام فسئل فقال لماوضعت فی القبر جاء تنی ملائکة العذاب فلما رأوا مکتوبا علی جبهتی بسم الله الرحمن الرحیم قالوا امنت من عذاب الله [1]

(ترجمہ: میت کی پیشانی' اس کے عمامہ اور کفن پر عہد نامہ لکھے تو امید ہے کہ میت کو بخش دیا جائے گا۔ بعض لوگوں نے وصیت کی کہ اس کی پیشانی اور سینہ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا جائے۔ چنانچہ ایسا کیا گیا۔ خواب میں اسے دیکھا گیا اور پوچھا گیا تو اس نے کہا مجھے جب قبر میں رکھا گیا عذاب کے فرشتے آ گئے جب انہوں نے میری پیشانی پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا دیکھا تو کہنے لگے تو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے امن میں رہا)

البتہ مگر روشنائی وغیرہ سے لکھنے میں چونکہ خوفِ تلویث وتوہینِ کلامِ الٰہی ہے بعض فقہا روشنائی سے لکھنے کو منع کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ بلا روشنائی وغیرہ کلمہ کی انگلی سے بسم اللہ پیشانی اور کلمہ طیبہ سینہ پر لکھ دیا جائے چنانچہ صفحہ ۶۶۹ شامی میں ہے۔

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد اول ' صفحه ٦٦٨ مطبوعه مکتبه رشیدیه کوئٹه

نقل بعض المحشين عن فوائد الشرجی ان مما یکتب علی جبهة المیت بغیر مداد بالاصبع المسبحة بسم الله الرحمن الرحیم و علی الصدر لا اله الا الله محمد رسول الله وذلک بعد الغسل قبل التکفین.[1]

(ترجمہ: بعض حاشیہ نگاروں نے فوائد شرجی سے نقل کیا کہ میت کی پیشانی پر سیاہی کے بغیر شہادت کی انگشت کے ساتھ بسم الله الرحمن الرحیم لکھا جائے اوراس کے سینہ پر لا اله إلا الله محمد رسول الله . یہ کام میت کو غسل دینے کے بعد اور کفن پہنانے سے پہلے کیا جائے)

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ

ابومحمد محمد دیدارعلی المفتی فی جامع اکبرآباد

۱۷رمضان ۱۳۳۶ھ

✿✿✿✿✿

---

[1] رد المحتار جلد اول ' صفحه ۶۶۹ مطبوعه مکتبه رشیدیه کوئٹه

﴿فتویٰ نمبر......82﴾

سوال

اگر پارچہ پر کلمہ لکھ کر میت کے سر پر لپیٹ دیتے ہیں یہ عمل ناجائز تو نہیں ہے؟

۱۷رمضان ۱۳۳۶ھ

الجواب

عمامہ میت کے سر پر لپیٹنا مختلف فیہ ہے۔ متقدمین فقہا مکروہ فرماتے ہیں اور متاخرین فقہا فقط علماء و مشائخ کے واسطے غالباً بغرضِ اظہارِ تعظیمِ علم مستحب سمجھتے ہیں۔ چنانچہ صفحہ ۹۳۶ درمختار میں ہے

و تکره العمامة للميت فی الأصح مجتبی و استحسنها المتاخرون للعلماء والاشراف[1]

(ترجمہ: صحیح تر قول کی رو سے میت کو عمامہ پہنانا مکروہ ہے۔ لیکن متاخرین فقہاء نے علماء اور بزرگ لوگوں کے لیے اسے مستحسن قرار دیا ہے)

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی
ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی المفتی فی جامع اکبرآباد
۱۷رمضان ۳۳۶ھ

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد اول، صفحہ ٦٣٦ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر......83﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلۂ ذیل میں کہ جنازہ کو گورستان لے جاتے وقت کون سی رفتار مناسب ہے؟ آہستہ یا تیز یا اپنی معمولی رفتار سے جانا چاہئے؟ اگر تیز رفتاری سے کچھ ضعیف لوگ میت کو کاندھا نہ دے سکیں اور پیچھے رہ جائیں تو کیسا ہے؟

الجواب

هو الموفق للصواب

بسم الله الرحمن الرحیم۔ اللهم رب زدنی علما

جنازہ کو تیز گام حالت سے لے جانا سنت ہے۔ مگر مثلِ ہنود بھاگتے ہوئے لے جانا درست نہیں ہے۔

کما فی الدر المختار: و یسرع بها بلا خبب ای عدو سریع[۱]

(ترجمہ: جنازہ کو اٹھا کر جلدی جلدی چلیں تیز نہ دوڑیں)

قال الشامی رحمة الله علیه حد التعجیل المسنون ان یسرع به بحیث لا یضطرب المیت علی الجنازة للحدیث اسرعوا بالجنازة[۲]

(ترجمہ: جلدی چلنے کی مسنون حد یہ ہے' کہ اتنا تیز چلیں کہ پالکی میں میت ہچکولے نہ کھانے لگے۔ کیونکہ کہ حدیث پاک میں ہے جنازہ کو اٹھا کو جلدی چلو)

البتہ بلحاظ ضعیف لوگوں کے اگر آہستہ کچھ دور تک چلیں کچھ نقصان نہیں معلوم ہوتا۔ مگر طریق سنت وہی ہے' جو نقل کر دیا گیا۔ فقط

حررہ: العبد العاصی

ابو محمد محمد دیدار علی المفتی جامع مسجد اکبر آباد

---

[۱] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۳ صفحه ۱۲۶ 'مطبوعه دار احیاء التراث العربی بیروت

[۲] رد المحتار : جلد ۳ صفحه ۱۲۶ مطبوعه دار احیاء التراث العربی بیروت

﴿فتویٰ نمبر......84﴾

سوال

نمازِ جنازہ کی جونیت ہوتی ہے اس کوامام کامل طور پر نہ کہےاور مثلاًو الدعاء لھذہ المیت پڑھنا چھوڑ دے وہ نماز جائز ہوئی یانہیں؟ بینواتو جروا

الجواب

☆ شرائطِ نمازِ جنازہ چھ امور ہیں۔

(اول) میت کا مسلمان ہونا۔ اور جب تک میت دفن نہ کی جائے میت کا غسلِ مسنون کے ساتھ پاک ہونا۔ ہاں البتہ اگر میت مسلم ہے بلا غسل و نمازِ جنازہ دفن کر دی گئی ہو تو تین دن تک اس کی قبر پر بھی نماز ہوسکتی ہے بلکہ ضرور ہے۔ اس واسطے کہ نمازِ جنازہ فرضِ کفایہ ہے

شرطِ دوم' سوم' چہارم' مصلی کے بدن اور کپڑے اور جاءِ نماز کا پاک ہونا۔ لہٰذا اگر ناپاک جوتے پہنے ہوئے یا اس جوتے پر جس کا تلا ناپاک ہے گو اوپر سے پاک ہو نماز پڑھی جائے جائز نہ ہوگی۔

شرطِ پنجم میت کا امام کے سامنے رکھا جانا۔

اور رکنِ نمازِ جنازہ اول چار تکبیریں ہیں اور رکنِ دوم قیام ہے اگر والدعاء لھذہ المیت زبان سے نہ کہا کچھ نقصان نہیں۔ البتہ دل میں نیت نمازِ جنازہ کی بوقتِ تکبیرِ تحریمہ ہونا ضروری ہے۔ تلفظ بالنیۃ مستحب ہے نہ شرائطِ نماز سے ہے اور نہ ارکان سے۔ فقط

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی مفتی
جامع مسجد اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......85﴾

سوال

کیا نیتِ جنازہ میں مرد وعورت کی ضمیر میں فرق ہے جیسا کہ ذیل میں نیت درج ہے یا دونوں کی ایک نیت ہے اگر ایک ہے تو کیا نیت ہے۔ نیت نمازِ جنازہ بموجب تحریر بالا درج کی جاتی ہے وہ یہ ہے۔

نویت ان اودی اربع تکبیرات صلوة الجنازة الثناء لله تعالی والصلوة علی النبی والدعاء لهذا المیت متوجها الی الکعبة الشریفة. الله اکبر

سائل: غلام نبی کٹرہ گاریان آگرہ

الجواب

بسم الله الرحمن الرحیم۔

اللهم رب زدنی علما

کتبِ فقہ میں بعد تیسری تکبیر کے یہی دعا ماثور ہے

اللهم اغفر لحینا و میتنا وشاهدنا وغائبنا وصغیرنا وکبیرنا وذکرنا وانثانا اللهم من احییته منا فاحیه علی الاسلام و من توفیته منا فتوفه علی الایمان[1]۔

(ترجمہ: اے اللہ! ہم میں سے زندہ، مردہ، موجود، غائب، چھوٹے، بڑے، مرد، عورت کو بخش دے۔ اے اللہ! ہم میں سے جسے تو زندہ رکھے اسے اسلام پر زندگی نصیب فرما اور ہم میں سے جسے تو موت دے اسے ایمان پر موت نصیب فرما)

چونکہ احییتہ و توفیتہ کی ضمیر من کی طرف پھرتی ہے جو عام ہے اور شامل ہے مردگان اسلام کو مرد ہوں خواہ عورت۔ لہٰذا نماز مرد کی ہو خواہ عورت کی یہی ایک ضمیر مذکور رہے گی۔ البتہ اگر اس سے پہلے اگر یہ دعا

---

[1] الدرالمختار علی هامش رد المحتار جلد ۱ صفحه ۶۴۴ مکتبه رشیدیه کوئٹه

پڑھے جس کو علامہ شامی صفحہ ۶۴۴ جلد اول شامی میں نقل فرماتے ہیں۔

اللهم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه واكرم نزله ووسع مدخله واغسله بالماء والثلج والبرد و نقه من الخطايا كما ينقى الثوب الابيض من الدنس و ابدله دارا خيرا من داره واهله خيرا من اهله و زوجا خيرا من زوجه و ادخله الجنة واعذه من عذاب القبر وعذاب النار[1] منح.

(ترجمہ: اے اللہ! اسے بخش دے۔ اس پر رحم فرما۔ اس کو عافیت عطا فرما۔ اس کو معاف فرما۔ عزت کے ساتھ اس کی مہمانی فرما۔ اس کی قبر کو وسیع فرما۔ اس کو پانی' برف اور اولوں سے غسل دے۔ اسے گناہوں سے اس طرح صاف فرما جس طرح کہ سفید کپڑے کو میل کچیل سے صاف کر دیا جاتا ہے۔ اس کو اس کی دنیا والے گھر سے بہتر گھر اور دنیا کے اہل سے بہتر اہل' دنیا کے جوڑا سے بہتر جوڑا بدلے میں عطا فرما۔ اسے جنت میں داخل فرما۔ اسے عذاب قبر اور عذابِ دوزخ سے پناہ میں رکھ)

تو ضرور مرد کی نماز میں اس طرح پڑھے اور عورت کی نماز میں "ہ" کی جگہ "ہا" پڑھنا چاہیے جیسے طفل نابالغ کی نماز میں **اللهم اجعله** پڑھتے ہیں اور نابالغ لڑکی نماز میں **اللهم اجعلها** پڑھتے ہیں اور نیت اول تو قصدِ دل کو کہتے ہیں مگر عربی میں نیت کرے تو مرد کی نماز میں کہے **لهٰذا الميت** اور عورت کی نماز میں **لهذه الميت.**

حررہ: العبد الراجی
ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی المفتی
فی جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[1] رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۶۴۴ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر......86﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ نمازِ جنازہ کی صفوف میں درمیانی فرق (فصل) کتنا ہونا چاہئے؟ اگر نمازی زیادہ ہوں اور جگہ تنگ ہو تو اس صورت میں کم از کم کتنا کتنا فصل رکھا جائے؟

سائل: حبیب احمد آگرہ

الجواب

هو الموفق للصواب

بسم الله الرحمن الرحيم۔

اللهم رب زدني علما۔

نمازِ جنازہ میں سجدہ تو ہوتا نہیں۔ لہٰذا زیادہ فصل کی ضرورت نہیں۔ بقدرِ گنجائش اور وسعت وتنگیٔ جگہ کے اختیار ہے۔ بحسبِ ضرورت جتنا فصل ممکن ہو رکھیں۔ اس واسطے اس کے متعلق فقہا سے تصریح نہیں پائی جاتی۔ فقط

حررہ: العبد العاصی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی المفتی

جامع مسجد اکبر آباد

غفر اللّٰہ لہ ولوالدیہ

﴿فتویٰ نمبر...... 87﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ ذیل میں کہ صفیں نماز جنازہ کی بہ عددِ طاق رہیں گی یا نہیں؟ یعنی ایک اور تین کے بعد نمازیوں کی کثرت پر یہی عمل رہے گا پانچ اور سات وغیرہ یا زیادتی پر اس کا لحاظ نہ کیا جائے گا؟

الجواب

هو الموفق للصواب

بسم الله الرحمن الرحيم۔

اللهم رب زدني علما

صفوفِ جنازہ بحالتِ قلت وکثرتِ رجال ہر حال میں طاق رکھنا مستحب ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے

عن مالک بن هبيره قال سمعت رسول الله ﷺ يقول ما من مسلم يموت فيصلي عليه ثلاثة صفوف من المسلمين اوجب[1]

☆(ترجمہ: حضرت مالک بن ہبیرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے سنا: کہ جو مسلمان مرے اس پر تین صفیں مسلمانوں کی نماز جنازہ ادا کریں تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت واجب فرمادیتا ہے)

حررہ: العاصی

ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی المفتی جامع مسجد اکبرآباد

غفر الله له ولوالديه

✿✿✿✿✿

[1] مشکوۃ المصابیح : صفحہ ۱۴۷، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان

﴿فتویٰ نمبر......88﴾

سوال

کیا مرد و عورت کے دو چار جنازے ہوں تو ان کی ایک ہی نماز جائز ہے یا علیحدہ علیحدہ؟

سائل: غلام نبی کٹرہ گاریان آگرہ

۱۷ مارچ ۱۹۱۸ء

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

اگر کئی جنازے مرد اور عورت کے اکٹھے ہوں تو اولی اور افضل یہی ہے کہ ہر جنازہ کی نماز علیحدہ پڑھائی جائے۔ **کما فی صفحہ ۶۴۸ من الدرالمختار المطبوعة مع الشامی**

و اذا اجتمعت الجنائز فا فراد الصلوة علی کل واحدة اولی من الجمع[1]

(ترجمہ: اگر کئی جنازے اکٹھے ہو جائیں تو ہر جنازہ پر الگ نماز ادا کرنا تمام پر اکٹھی نماز ادا کرنے سے اولی ہے)

اور جو ان میں افضل ہو باعتبار دین و دیانت میں اس کی نماز اول پڑھائی جائے۔

کما فی الدر المختار فی صفحة المذکورة

تقدیم الافضل افضل[2]

(ترجمہ: افضل کی نماز جنازہ پہلے ادا کرنا افضل ہے)

اور اگر سب کی اکٹھی پڑھائی جائے تب بھی جائز ہے۔ اور اندریں صورت اگرچہ جنازوں کا اس طرح رکھنا بھی کہ ایک کا سر دوسرے کے پاؤں کی طرف رہے جائز ہے مگر امام افضل کے پاس ہو۔ مگر اولی یہ ہے کہ سب

---

[1] الدرالمختار علی ھامش رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۶۴۸ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

[2] ایضا

قبلہ کی طرف آگے پیچھے اس طرح رکھے جائیں کہ سب کا سینہ امام کے سامنے رہے تا کہ نماز علی وجہ السنۃ ادا ہو۔ چنانچہ صفحہ ۶۴۸ درمختار میں ہے

و ان جمع جاز ثم ان شاء جعل الجنائز صفا واحدا و قام عند افضلهم و ان شاء جعلها صفا مما یلی القبلہ واحدا خلف واحد بحیث یکون صدر کل جنازۃ مما یلی الامام۔[1]

(ترجمہ: اگر سب کی نمازِ جنازہ اکٹھی پڑھے تو جائز ہے پھر اگر چاہے تو تمام جنازوں کو ایک صف میں رکھ دے اور ان سے افضل کے پاس کھڑا ہو اور اگر چاہے تو قبلہ کی جانب ان جنازوں کی صف بنالے یوں کہ ایک جنازے کے پیچھے دوسرا ہو۔ اور ہر جنازے کا سینہ امام کی سمت میں ہو)

قال الشامی

(ترجمہ: علامہ شامی نے فرمایا:)

ھذا جواب ظاهر الروایة و روی عن ابی حنیفة غیر روایة الاصول ان الثانی اولی لان السنة هی قیام الامام بخداء المیت۔[2]

(ترجمہ: ظاہر روایت کی رو سے یہ جواب ہے۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے اصول کی روایت کے علاوہ اور روایت میں یوں منقول ہے کہ دوسرا طریقہ بہتر ہے کیوں کہ سنت یہ ہے کہ امام میت کے سامنے کھڑا ہو)

مگر مرد کا جنازہ امام کے قریب رہے بعدہ صبی کا پھر عورت کا **کما هو مذکور فی صفحة ۶۴۹ من الدر المختار**

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ
محمد دیدار علی الحنفی المفتی فی جامع اکبر آباد

۞۞۞۞۞

---

[1] الدر المختار علی هامش رد المحتار جلد ۱ صفحه ۶۴۸ مکتبه رشیدیه کوئٹه

[2] رد المحتار جلد ۱ صفحه ۶۴۸ مکتبه رشیدیه کوئٹه

﴿فتویٰ نمبر......89﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ ذیل میں، کہ امام کو جنازہ سے کتنے فاصلہ پر کھڑا ہونا مناسب ہے؟

حبیب احمد آگرہ

الجواب

هو الموفق للصواب.

بسم الله الرحمن الرحيم.

اللهم رب زدني علما

اس کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ البتہ میت کا بجانبِ قبلہ اور امام کے آگے ہونا ضرور ہے۔

کما فی الدر المختار

و شرطها ايضا حضوره و وضعه و كونه هو او أكثره امام المصلى و كونه للقبلة [1]

(ترجمہ: نمازِ جنازہ کے صحیح ہونے کے لیے میت کا موجود ہونا، اس کا پورا یا کچھ جسم، نمازی کے سامنے ہونا اور اس کا قبلہ کی جانب ہونا شرط ہے)

حررہ: العاصی

ابو محمد محمد دیدار علی المفتی جامع مسجد اکبرآباد

غفر الله له ولوالديه

✿✿✿✿✿

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد سوم : صفحه ۹۸، ۹۹، دار احياء التراث العربي بيروت

﴿فتویٰ نمبر......90﴾

سوال

بعد نمازِ جمعہ جنازہ، تجہیز و تکفین کی کراہت کیوں ہے بلکہ بنظر ثواب و کثرتِ جماعت بعد نمازِ جمعہ مناسب ہے۔

الجواب

تعجیلِ نمازِ جنازہ واسطے اہتمامِ نمازِ جمعہ ہے۔ اگر تعجیل ناممکن ہو تو بعدِ نماز دفن کرنا مکروہ نہیں ہے۔ بلکہ صرف اس غرض سے تساہل کرنا کہ جماعتِ کثیر نماز پڑھے گی غیر مناسب ہے۔ اس کو مکروہ تنزیہی یعنی خلاف اولیٰ لکھا ہے۔ کذا فی الطحطاوی ۔[1]

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

❁❁❁❁❁

---

(۱) فلو جهز االميت صبيحة يوم الجمعة يكره تاخير الصلوة عليه ليصلى عليه الجمع العظيم بعد صلوة الجمعة ولو خافوا فوت الجمعة بسبب دفنه يوخر الدفن

(ترجمہ: اگر میت کو جمعہ کے دن صبح کے وقت غسل اور کفن دے کر تیار کر دیا گیا تو اس کی نمازِ جنازہ کو اس لیے موخر کرنا مکروہ ہے کہ نمازِ جمعہ کے بعد بہت بڑی جماعت اس کی نمازِ جنازہ ادا کرے گی اگر دفن کے باعث نمازِ جمعہ کے فوت ہونے کا خوف ہو تو دفن کو موخر کر دیا جائے)

الطحطاوی علی مراقی الفلاح : صفحه ۳۳۲ / مطبوعه نور محمد کارخانه تجارت کتب کراچی

﴿فتوی نمبر...... 91﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ مردہ کو اندر مسجد یا صحن میں رکھ کر نمازِ جنازہ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

۲۷ شعبان ۱۳۳۶ھ

اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ محکمہ ٹھیکہ ضلع بانس

بریلی مسکونہ تاج گنج آگرہ کڑہ عمر خان

الجواب

وهو الموفق۔

بسم الله الرحمن الرحيم۔

اللهم رب زدنی علما

صحنِ مسجد اور بناءِ مسجد یعنی اتنی مسجد جو پٹی ہوئی ہو چونکہ عرفِ عام اہلِ اسلام بانیٔ مسجد کے نزدیک مسجد ہی ہوتی ہے۔ اور عموماً ہندوستان وغیرہ میں یہی عادت ہے کہ کچھ حصہ مسجد پٹوا دیتے ہیں اور اکثر کہیں کم حصہ کھلا ہوا صحن رکھتے ہیں۔ بعض جگہ مسجد کے نیچے جگہ خالی پختہ رکھ کر پانی سے بھر کے اوپر سے پٹوا دیتے ہیں اور دو طرفہ کناروں کی طرف سے کھلا رکھ کر وضو کرنے کی جگہ وضو کے لیے بنا دیتے ہیں اور اس کو خارج مسجد سمجھتے ہیں۔ اس واسطے کہ مسجد کے اندر وضو کرنا بالاتفاق ممنوع ہے اور بعض جگہ مسجد کا سامان رکھنے کی غرض سے مسجد یا صحنِ مسجد کے نیچے سردابہ رکھ دیتے ہیں کہ جو بالاتفاق جائز ہے۔ البتہ اس کی اس زمین کے اندر جتنی زمین مسجد سمجھی جاتی ہے اور بانیٔ مسجد نے اس کو بہ نیتِ مسجد وقف کیا ہو خواہ اس کے نیچے سامانِ مسجد کے لیے جگہ خالی ہو یا مصارفِ مسجد کے پانی کے لیے جگہ ہو علی ہذا خواہ وہ پٹی ہو یا بصورت صحن۔ نمازِ جنازہ بلا عذر پڑھنا بعض کے نزدیک مکروہ تنزیہی اور بعض فقہا کے نزدیک مکروہ تحریمی اور قوی روایت یہی ہے کہ مکروہ تحریمہ ہے چنانچہ آخر

صفحہ ۶۵۲ جلد اول در مختار مطبوعہ مصر مع ردالمختار میں ہے

و کرهت تحریما وقیل تنزیها فی مسجد جماعة هو أی المیت فیه وحده او مع القوم واختلف فی الخارجة عن المسجد وحده او مع بعض القوم والمختار الکراهة مطلقا. خلاصة بناء علی ان المسجد انما بنی للمکتوبة و توابعها کنافلة و ذکر و تدریس علم وهو الموافق لا طلاق حدیث ابی داؤد من صلی (علی) میت فی المسجد فلاصلوة له[1]

ترجمہ: نمازِ جنازہ پنج گانہ جماعت والی نماز مسجد میں ادا کرنا مکروہ تحریمی ہے اور بعض علماء کے ہاں مکروہ تنزیہی ہے اس صورت میں جب کہ صرف میت مسجد میں ہو یا لوگوں سمیت میت مسجد میں ہو۔ اس صورت میں اختلاف ہے جب کہ صرف میت مسجد سے باہر ہو یا کچھ نمازیوں سمیت وہ باہر ہو۔ مختار یہ ہے کہ ہر صورت میں کراہت ہے۔

خلاصہ: اس کراہت کی وجہ یہ ہے کہ مسجد صرف پنج گانہ نماز اور اس کے توابع مثلاً نفل نماز، ذکر، علوم کی تدریس کے لیے بنائی جاتی ہے اور یہی سنن ابوداؤد کے حدیث کے اطلاق کے موافق ہے وہ حدیث یوں ہے۔ من صلی علی میت فی المسجد فلا صلاۃ له.

(یعنی جو مسجد میں کسی آدمی کی نماز جنازہ ادا کرے اس کی نماز نہیں ہے)

اور چونکہ کراہتِ تحریمہ ظاہر الروایۃ ہے لہٰذا یہی روایت مختار ہے اور فتوی کے قابل۔ چنانچہ آخر صفحہ ۶۵۳ ردالمختار مذکور میں ہے

و بهذا التقریر ظهر ان الحدیث موید للقول المختار من اطلاق الکراهة الذی هو ظاهر الروایة[2]

---

[1] الدر المختار مع ر د المحتار : جلد ۱ ، صفحه ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، مکتبه رشیدیه کوئٹه

[2] رد المحتار : جلد ۱ صفحه ۶۵۳، ۶۵۴، مطبوعه مکتبه رشیدیه کوئٹه

(ترجمہ: اس تقریر سے ظاہر ہوا کہ حدیثِ پاک مختار قول کی تائید کرتی ہے کہ کراہت مطلق ہے اور یہی ظاہر روایت ہے)

☆ لہٰذا اگر عذر مینہ وغیرہ کا ہوتو بصورتِ عذرِ صحیح مسجد کے اندر بھی بلا کراہت جائز ہے۔ چنانچہ ۶۵۴ شامی مذکورہ میں ہے

انما تکرہ فی المسجد بلا عذر فان کان فلا[1]

(ترجمہ: جنازہ کی نماز مسجد میں صرف بغیر عذر کے مکروہ ہے اور اگر عذر ہوتو کوئی کراہت نہیں)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی المفتی شہر آگرہ واعظ
فی جامع مسجد اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[1] رد المحتار: جلد ۱ صفحہ ۶۵۴، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر......92﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس امر میں کہ ایک شخص کا انتقال اس کے وطن سے چالیس کوس کے فاصلے پر ہوا اس کے رشتہ دار اس جنازہ کو دو روز میں وطن میں لائے۔ اس عرصہ میں میت کے بدن سے بو آنے لگی تھی اور جنازہ پھول گیا تھا۔ مگر کسی مقام سے پھٹا نہ تھا۔ چنانچہ اس کو غسل بھی دیا گیا۔ لیکن اس کے جسم سے کسی مقام پر زخم تک ظاہر نہ ہوا۔ مگر بموجب فرمانے وہاں کے قاضی کے بغیر نماز جنازہ کے اس میت کو دوسرے دن اس کی موت سے دفن کر دیا گیا۔ جب یہ خبر ایک دوسرے عالم کو ہوئی تو انہوں نے قاضی صاحب کی غلطی ظاہر کر کے تیسرے دن قبر پر نماز جنازہ ادا کی۔ اس پر قاضی صاحب معترض ہیں کہ بوجہ پڑھنے نماز جنازہ کے تیسرے دن قبر پر مولوی صاحب پر کچھ جرمانہ ہونا چاہئے۔ لہٰذا مفصل بحوالۂ کتب معتبرہ تحریر فرمایا جائے آیا نمازِ جنازہ تیسرے دن قبر پر پڑھنا جائز تھا یا نہیں؟ اور قاضی صاحب کا فرمان بجا ہے یا غلط؟ بینوا وتوجروا

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں نمازِ جنازہ میت پر اس وقت تک پڑھنا ضروری ہے جب تک اس کے اعضا نہ بکھریں اور سالم رہیں اور بدن اس کا پھٹا نہ ہو۔ اور اگر میت کو دفن کر دیا ہو بغیر اداءِ نمازِ جنازہ کے اور ظن غالب ہو کہ ابھی تک بدن میت کا پھٹا نہیں ہو گا بلکہ سالم ہو گا تو اس کی قبر پر نمازِ جنازہ ادا کر لی جائے۔

کما فی الھدایة

و ان دفن المیت و لم یصل علیه صلی علی قبره لان النبی علیہ السلام صلی علی قبر امرأ ـة من الانصار ویصلی علیه قبل ان یتفسخ والمعتبر فی معرفة ذلک اکبر الرأی هو

الصحیح لاختلاف الحال و الزمان و المکان؎۱

(ترجمہ: اگر میت کودفن کردیا گیا اوراس پرنمازِ جنازہ نہ پڑھی گئی تواس کی قبر پرنمازِ جنازہ پڑھی جائے گی کیونکہ نبی کریم ﷺ نے انصار کی ایک عورت کی قبر پرنمازِ جنازہ پڑھی تھی۔میت کے پھٹنے سے پہلے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی اوراس کی پہچان میں غالب رائے کا اعتبار ہےاور یہی صحیح ہے کیوں کہ یہ مدت حالت' وقت اور جگہ کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے)

اور میت کے سالم رہنے کا اندازہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابی یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے تین دن کالکھ کر اگر چہ اپنی کتاب امالی وغیرہ میں فرمادیا ہے کہ بعد تین دن کے اگر میت کو بلانمازِ جنازہ دفن کردیا ہوتو تین دن کے بعد نمازِ جنازہ قبر پر پڑھی جائے مگر صحیح یہی ہے کہ یہ اندازہ لازم نہیں ہے اگر بعد کئی دن کے بھی غالب ظن بوجہ موسمِ سرمایا دبلا ہونے میت کے بھی ہو کہ جسمِ میت پھٹا نہ ہوگا بلکہ سالم ہوگا تو بعد تین دن کے بھی نماز جنازہ پڑھی جائے اور اگر قبل تین دن کے بوجہ موٹا ہونے جسمِ میت کے اور شدتِ موسمِ برسات یا گرما کے غالب ظن سب کا یہی ہو کہ اب جسمِ میت پھٹ گیا ہوگا تو جب بھی نماز جنازہ تین دن کے اندر ہی پڑھی جائے۔

کما فی العنایة تحت عبارة الھدایة "ھو الصحیح"

قوله ھو الصحیح احتراز عما روی عن ابی یوسف رحمة الله علیه فی الامالی انه یصلی علی المیت فی القبر الی ثلثةایام و بعده لا یصلی علیه و ھکذا ذکر ابن رستم فی نوادره عن محمد رحمة الله علیه عن ابی حنیفة رحمة الله علیه والصحیح ان ذلک لیس بتقدیر لازم لان تفرق الاجزاء یختلف باختلاف حال المیت من السمن والھزال و باختلاف الزمان من الحر و البرد واختلاف المکان من الصلابة والرخاة؎۲۔

(ترجمہ: قولہ یہی صحیح ہے: یہ اس روایت سے احتراز ہے جو حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے امالی میں ہے

؎۱ الھدایه جلد ۲ صفحه ۱۴۴' ۱۴۵ مطبوعه ادارة القرآن والعلوم الاسلامیه کراچی

؎۲ العنایة شرح الھدایة بھامش فتح القدیر جلد اول صفحه ۴۵۹ ، المطبعة الکبری الامیریه مصر

کہ دفن شدہ میت پر نمازِ جنازہ تین دن تک پڑھی جائے گی اور اس کے بعد نہ پڑھی جائی گی۔ امام ابن رستم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب نوادر میں حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے' حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے یہی روایت نقل کی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ اندازہ لازم نہیں ہے' کیونکہ اعضا کے پھٹنے کی مدت میت کی حالت کے اختلاف یعنی فربہ ہونے اور دبلا ہونے' وقت کے اختلاف یعنی گرمی اور سردی اور جگہ کے اختلاف یعنی قبر کی جگہ کا سخت ادا نرم ہونے' سے مختلف ہوتی ہے)

اور صورتِ مسئولہ میں تو نمازِ جنازہ تیسرے دن پڑھی گئی ہے لہٰذا قول و فعل مولوی صاحب بلا تکلف صحیح ہے اور قاضی صاحب سے جو خطا ہوئی اس سے لازم ہے کہ توبہ کریں نہ کہ اپنی بات سے مولوی صاحب کو مستحق جرمانہ بنادیں اور اگر وہ اپنی ضد سے باز نہ آئیں تو ایسا ضدی قاضی ہرگز قابلِ قضا و فتویٰ نہیں۔

واللہ اعلم وعلمہ احکم

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی

مفتی جامع مسجد اکبر آباد عرف آگرہ

❀❀❀❀❀

﴿فتوی نمبر......93﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ میت کو داہنی طرف سے قبر میں اتارنا کتاب میں تحریر نہیں ہے لیکن اکثر صاحب ایسا کہتے ہیں کہ بعد دوپہر کے بائیں طرف سے میت کو قبر میں اتارنا چاہئے تاکہ سایہ قبر میں اول نہ داخل ہووے۔ ہمزاد سایہ کے ہمراہ دفن ہوتا یا کیا؟

برائے توجہ واحسان جواب جلد مرحمت ہوتا کہ اطمینان ہو فقط

مستفتی احمد نصیر خان۔

امام مسجد بگیانہ

الجواب

جمیع کتب فقہ میں تمام فقہا یہی تحریر فرماتے ہیں کہ جنازہ کو قبر سے قبلہ کی جانب رکھنا چاہئے اور قبلہ ہی کی طرف سے اٹھا کر قبر میں رکھا جائے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے۔

و یدخل المیت الخ یعنی توضع الجنازة فی جانب القبلة من القبر و یحمل منه المیت فیوضع فی اللحد(۱)

(ترجمہ: میت کو قبلہ کی جانب کنارۂ قبر سے داخل کیا جائے۔ یعنی جنازہ کو قبر سے قبلہ کی جانب رکھا جائے وہاں سے میت کو اٹھایا جائے پھر قبر کے اندر رکھا جائے)

---

۱ الهدایه مع حاشیه مولانا عبد الحی لکهنوی رحمة الله علیه' جلد اول جزء ۲ صفحه ۱۵۱ مطبوعه دار القرآن والعلوم الاسلامیه کراچی

وضاحت: ویدخل المیت تک ہدایہ کی عبارت ہے اس سے آگے مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کے حاشیہ کی عبارت ہے۔

لٰہذا یہ عقیدہ خلافِ سنت رکھنا ہے کہ بعد دوپہر بائیں طرف سے اتاریں اور قبل دوپہر داہنی طرف سے بالکل لغو بلکہ بدعت ہے اور بے اصل۔ ایسے عقائدِ باطلہ سے مسلمانوں کو بچنا اور دوسروں کو بچانا ضروری امر ہے۔

حررہٗ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی المشہدی الحنفی
المفتی فی جامع اکبر آباد
، مورخہ ۲۷ محرم الحرام ۱۳۳۴ھ

❁❁❁❁❁
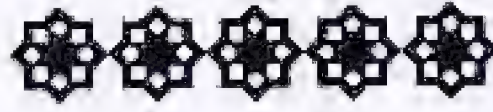
﴿فتوی نمبر......94﴾

سوال

گزارش ہے کہ عرصہ پانچ یا چھ روز گزرے دھوبی ایک عورت کا جنازہ لے کر صبح کی نماز سے پہلے مسجد اکبری میں نماز جنازہ پڑھانے کے واسطے آئے۔ جماعت نمازِ صبح ہونے کے بعد امام صاحب مسجد اکبری نیچے مسجد کے تشریف لائے۔ اور دھوبیوں سے دریافت فرمایا کہ یہ عورت نماز پڑھتی تھی یا نہیں؟ اس مجمع دھوبیوں میں سے کسی نے یہ کہا کہ یہ نماز نہیں پڑھتی تھی۔ امام صاحب نے سنا امر فرمایا کہ ہم نماز نہیں پڑھائیں گے۔ نہیں پڑھائی۔ اور مکان کو چلے گئے۔ چلے جانے کے بعد احمد خان موذن مسجد اکبری نے جنازہ کی نماز پڑھا دی۔ لہٰذا رپورٹ اطلاع ارسالِ حضور ہے۔

نواب علی منصب دار ومحاسب

جناب عالی

مفتی صاحب: براہِ مہربانی مطلع فرمائیں کہ جب امام صاحب کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ متوفیہ مسلمان ہے تو ان کو زیادہ تحقیقات کرنے کی ضرورت تھی یا نہیں؟ اور نماز جنازہ پڑھانے سے انکار کرنا جائز تھا یا نہیں؟

محمد عبدالغفار عفی عنہ ۲۴ جولائی ۱۹۱۸ء

الجواب

اللھم رب زدنی علما ارنا الحق حقا والباطل باطلا

صفحہ ۶۴۲ جلد اول در مختار مطبوعہ علی ھامش ردالمحتار میں ہے

وھی فرض علی کل مسلم خلا اربعة بغاة و قطاع الطریق اذا قتلوا فی الحرب ولو بعده صلی علیھم لانه حد أو قصاص و کذا اھل عصبة و مکابر فی مصر لیلا بسلاح وخناق غیر مرة فحکمھم کالبغاة و من قتل نفسه و لو عمدا یغسل و یصلی علیه و به یفتی و ان کان اعظم و زرا من قاتل غیره و رجح الکمال قول الثانی بما فی مسلم انه علیه

السلام اتی برجل قتل نفسه فلم یصل و لا یصلی علی قاتل احد ابویه اهانة له و الحقه فی النهر بالبغاة[1]

☆(ترجمہ: چار قسم کے لوگوں کے سوا ہر مسلمان کی نمازِ جنازہ پڑھنا فرض ہے۔ اور وہ یہ ہیں (۱) باغی (۲) ڈاکو جب یہ کہ دونوں قسم کے لوگ جنگ میں قتل کر دیئے جائیں۔ اور جنگ کے بعد اگر انہیں قتل کیا جائے تو ان کی نماز جنازہ ادا کی جائے گی کیوں کہ ان کا یہ قتل حد یا قصاص کے طور پر ہوگا (۳) شہر میں رات کو اسلحہ کے ساتھ بے گناہ لوگوں سے تعرض کرنے والا (جگا ٹیکس وصول کرنے والا) (۴) لوگوں کو گلا دبا کر مارنے والا جب کہ یہ بار بار ایسا کرے۔ ان کا حکم باغی افراد کا سا ہے۔ اور جس نے خودکشی کی اگر چہ عمداً کی ہو اسے غسل دیا جائے گا ۔ اور اس پر نماز جنازہ بھی پڑھا جائے گی۔ فتوی اسی پر ہے۔ اگر چہ اس کا گناہ دوسروں کو قتل کرنے سے زیادہ ہے۔ علامہ کمال رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے کیوں کہ صحیح مسلم میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے خودکشی کی تھی۔ اور آپ نے اس کی نمازِ جنازہ نہ پڑھی۔ اپنے ماں باپ میں سے کسی ایک کو قتل کرنے والے کی نماز جنازہ نہ پڑھی جائے گی۔ یہ حکم اس کی اہانت کے لیے ہے۔ اور النہر میں اسے باغیوں کے ساتھ لاحق کیا گیا ہے۔

اور صفحہ ۱۷۲ جلد اول فتاوی عالم گیریہ میں ہے

الصلوة علی الجنازة فرض کفایة اذا قام به البعض واحدا کان او جماعة ذکرا کان او انثی سقط عن الباقین و اذا ترک الکل اثموا هکذا فی التتار خانیة و الصلوة علی الجنازة تتادی بأداء الامام وحده لان الجماعة لیست بشرط الصلوة علی الجنازة کذا فی النهایة و شرطها اسلام المیت وطهارته مادام الغسل ممکنا[2]

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار : جلد اول ' صفحہ ۶۴۲ '۶۴۳ ' مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ.

[2] الفتاوی العالم گیریہ مع اردو ترجمہ ' جلد ۲ ،صفحہ ۸۹۴ ' مطبوعہ فضل ربی پریس راولپنڈی

ماحصل ان تمام عبارتوں کا یہ ہے کہ جنازہ فرضِ کفایہ ہے۔ جو لوگ موجود ہوں ان میں سے اگر ایک آدمی تنہا بھی نمازِ جنازہ ادا کرے گا سب گناہ سے بری الذمہ ہو جائیں گے۔ اور اگر کوئی بھی نہ پڑھے اور بلا نمازِ جنازہ میت دفن کر دی جائے سب گنہگار ہوں گے۔

اور شرط نمازِ جنازہ یہ ہے کہ میت مسلمان ہو۔ مگر اگر میت مسلمان امامِ وقت سے باغی ہو کر حالتِ بغاوت میں ماری گئی ہو یا ڈاکو ڈکیتی کی حالت میں مارا گیا ہو یا جو شخص اپنی ماں کو یا باپ کو قتل کر ڈالے اور ان کے قصاص میں مارا جائے اور بروایتِ راجح جو شخص خودکشی کرے ان کی نمازِ جنازہ بغرض ان کی ذلت ظاہر کرنے اور لوگوں کے زجر و تنبیہ فرمانے کے نہ پڑھی جائے۔ ☆ علاوہ بریں جو شخص قرض دار مر جاتا بغرض زجر فرمانے لوگوں کے قرض نہ ادا کرنے سے حدیث صحیح میں آیا ہے کہ میت کا حال آنحضرت ﷺ لوگوں سے دریافت فرما کر اگر قرض دار ہوتا خود اس کی نماز جنازہ نہ پڑھاتے اور دوسروں کو فرماتے کہ تم پڑھا دو۔ پھر سبیل اداءِ قرض ہو جاتی تو خود آپ بہ نفسِ نفیس علیہ الصلوۃ والسلام پڑھا دیتے ورنہ خود نہ پڑھاتے چنانچہ صفحہ ۲۱۲ مشکوۃ المصابیح مطبوعہ نظامی دھلی میں ہے۔

عن سلمہ بن الاکوع قال کنا جلوسا عند النبی ﷺ اذاتی بجنازۃ فقالوا صل علیھا فقال ھل علیہ دین قالوا لا فصلی علیھا ثم اتی بجنازۃ اخری فقال ھل علیہ دین قیل نعم قال ھل ترک شیئا قالوا ثلثۃ دنانیر فصلی علیھا ثم اتی بالثالثۃ فقال ھل علیہ دین قالوا ثلثۃ دنانیر قال ھل ترک شیًا قالوا لا قال صلوا علی صاحبکم قال ابو قتادۃ ھل یارسول اللہ علیک و علی آلک واصحابک و علی دینہ رواہ البخاری۔[۱]

☆ (ترجمہ: حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں بیٹھے تھے کہ ایک جنازہ لایا گیا لوگوں نے آپ سے عرض کی اس کی نمازِ جنازہ پڑھا دیں۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا اس کے ذمہ کچھ قرض ہے؟ لوگوں نے عرض کی نہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے اس کی نمازِ جنازہ

[۱] مشکوۃ المصابیح صفحہ مطبوعہ

پڑھادی۔ پھر ایک اور جنازہ لایا گیا۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا اس کے ذمہ کچھ قرض ہے؟ لوگوں نے عرض کی ہاں۔ آپ نے پوچھا کیا اس نے کچھ مال چھوڑا ہے؟ لوگوں نے عرض کی تین دینار ترکہ چھوڑا ہے آپ نے اس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھادی۔ پھر تیسرا جنازہ لایا گیا۔ آپ نے پوچھا کیا اس پر قرض ہے؟ لوگوں نے بتایا تین دینار قرض ہے۔ پوچھا کیا کچھ چیز چھوڑی ہے؟۔ لوگوں نے عرض کی نہیں تو آپ نے صحابہ کرام سے فرمایا اپنے ساتھی کی نمازِ جنازہ ادا کرو۔ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی یارسول اللہ! کیا آپ' آپ کی آل' صحابہ اور مجھ پر قرض نہیں ہے؟)

بہرنہج باوجود جاننے اس امر کے کہ یہ مسلمان ہے ضرور استفسار فرمالیتے کہ یہ قرضدار تو نہیں؟ تاکہ آپ کے بذاتِ خاص نماز نہ پڑھانے سے لوگ ادائے قرض کی کوشش کریں۔ اور قرض دار نہ مریں۔ اور شاید آپ کے نماز نہ پڑھانے سے کسی کو رحم آجائے اور وہ اس کا قرض ادا کردے۔ لہٰذا اگر میت اور میت کے لانے والے تمام افراد بے نمازی ہوں اور اتنے ترک نماز سے بے خوف ہوں کہ خود بھی کوئی نماز نہ پڑھے اور مثل مزدوروں کے میت کو رکھ کے علیحدہ جا بیٹھیں۔ اور وقتِ دریافت بے خوفِ خدا بے دھڑک کہہ دیں کہ اس نے بھی کبھی نماز نہ پڑھی۔ اور کوئی بزرگ یا عالم ایسے ہوں کہ ان کی نماز نہ پڑھانے سے وہ سب لوگ یا بعض لوگ نماز پڑھنے لگیں۔ اور تنہا وہ خود نہ پڑھائے اور دوسروں کو کہہ دے یا اشارہ کردے کہ تم پڑھادو۔ تو یہ امر بلاشبہ موافقِ حدیثِ مذکور معلوم ہوتا ہے۔ گو صریح روایت بہ نسبت نماز نہ پڑھانے ایسے بے نمازی کے جنازہ کی اب تک نہیں ملی۔ اور غالباً وجہ نہ ملنے ایسی روایت کی یہی معلوم ہوتی ہے کہ زمانہ رسول اللہ ﷺ بلکہ صحابہ و تابعین میں کوئی مسلمان بے نمازی ہوتا ہی نہ تھا۔ اس واسطے کہ نماز نہ پڑھنے کا گناہ تمام دنیا بھر کے گناہوں سے اتنا زیادہ ہے کہ حدیث صحیح میں وارد ہے۔

☆ **قال النبی ﷺ من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر**[1]

یعنی جو قصداً نماز چھوڑ دے وہ بلاشبہ کافر ہو گیا۔

---

[1] الجامع الصغیر مع فیض القدیر' جلد ٦' صفحہ ١٠٢' دار المعرفہ بیروت

چنانچہ بعض ائمہ دین بموجبِ ظاہرِ حدیث یہی فرماتے ہیں۔ مگر ہمارے امامِ اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ **متعمدا** کے معنے بلحاظ دیگر احادیث **مستحلا** کے ہیں۔ یعنی جو کوئی نماز چھوڑنے کو حلال سمجھ لے وہ بالاتفاق کافر ہو جاتا ہے ورنہ فاسق ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ اور مسلم شریف میں ہے

☆ **قال ﷺ بین العبد و بین الکفر ترک الصلوة**[۱]

(ترجمہ: بندے اور کفر وشرک کے درمیان فرق نماز ترک کرنے کا ہے)

والله اعلم و علمه احکم. اللہ ہم کو اور تمام مسلمانوں کو توفیقِ اتباعِ شریعت اور اجتنابِ بدعت اور ملازمتِ نمازِ پنج گانہ بخوف وخشیت عطا فرمائے آمین ثم آمین

حررہ: العبد الراجی

ابو محمد محمد دیدار علی المفتی

فی جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[۱] صحیح مسلم : صفحہ ۵۱، حدیث رقم ۲۴۷، دار السلام للنشر والتوزیع الریاض

نوٹ: مسلم شریف کے الفاظ یہ ہیں :

بین الرجل وبین الشرک والکفر ترک الصلاة .

ترجمہ: مسلم آدمی اور کفر وشرک کے درمیان فرق نماز کو ترک کرنے کا ہے۔

زکوۃ
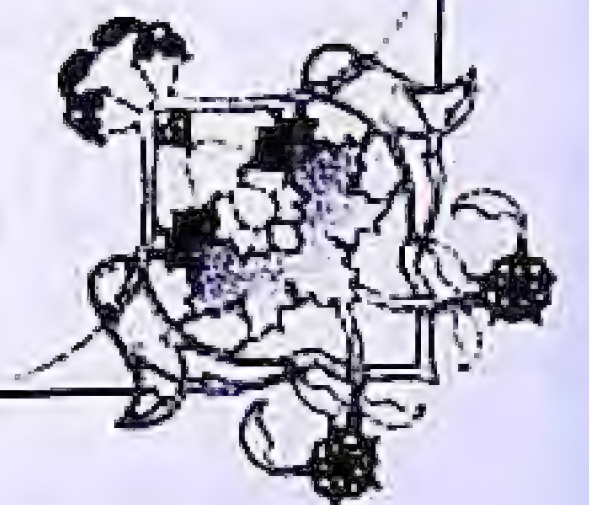
﴿فتویٰ نمبر......95﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس امر میں کہ اگر عشر زکوۃ کو ظالم بادشاہ جبراً وصول کرلیں اور ان کے صرف کرنے کی جگہ صرف نہ کریں تو اصحابِ زکوۃ وعشر وخراج پر اس کے مصارف پر دوبارہ عشر وزکوۃ وغیرہ نکال کر خرچ کرنا لازم ہے؟

۹ رجب المرجب ۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شرعاً دوبارہ نکال کر اس کے مصارف پر خرچ کرنا لازم تو نہیں مگر دیانۃً دوبارہ نکال دے اور مصارف پر خرچ کرے تو افضل ہے تاآنکہ عند البعض خراج بھی دوبارہ نکال کر اس کے مصرف پر خرچ کر دے تو افضل ہے۔

كما فى الدر المختار المطبوعة على هامش ردالمحتار فى صفحه ٢٦ من الجزء الثانى

أخذ البغاة والسلاطين الجابرة زكوة الاموال الظاهرة كالسوائم والعشر والخراج لااعادة على اربابها ان صرف الما خوذ فى محله الآتى ذكره والايصرف فيه فعليهم فيما بينهم و بين الله اعادة غير الخراج لانهم مصارفه[۱]

(ترجمہ: باغی اور ظالم بادشاہ اموالِ ظاہرہ مثلاً چوپایوں کی زکوۃ' عشر اور خراج وصول کرلیں تو نصاب کے مالکوں پر ان کا دوبارہ ادا کرنا لازم نہیں ہے بشرطیکہ وہ وصول کردہ زکوۃ وغیرہ اپنے مصارف پر خرچ کر دیں جن کا ذکر آئے گا۔ اور اگر وہ مال ان مصارف پر خرچ نہ ہوا ہو تو نصاب کے مالکوں پر ان کا دوبارہ ادا کرنا ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان لازم ہے۔ خراج کی دوبارہ ادائیگی لازم نہیں ہے کیونکہ وہ باغی وغیرہ بھی اس کے مصارف ہیں)

---

[۱] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۲ ' صفحه ۲۶ ' مطبوعه مكتبه رشيديه كوئٹه

مگر اس زمانہ میں چونکہ خراج بھی اپنے موقع پر خرچ نہیں کیا جاتا لہٰذا اس کا دوبارہ نکال کر اس کے مصارف پر خرچ کرنا احتیاط ہے۔

کما هو ظاهر من قول الشامی فی صفحه ۲۶ من الجزء الثانی

اما الخراج فلا یفتون باعادته لانهم مصارفه إذ اهل البغی یقاتلون اهل الحرب والخراج حق المقاتلة شرح الملتقی[1]

(ترجمہ: خراج کی صورت میں علمائے کرام اس کے اعادہ کا فتویٰ نہیں دیتے کیونکہ وہ باغی اور ظالم بادشاہ خود بھی ان کے مصارف ہیں کیونکہ باغی لوگ اہلِ حرب سے جنگ کرتے ہیں۔اور خراج جنگ کرنے والوں کا حق ہے۔شرح الملتقی)

اسی واسطے عدمِ اخراجِ خراج کو دوبارہ دینا علامہ زیلعی سے ضعیف معلوم ہوتی ہے۔

حیث قال الشامی رحمه الله فی الصفحة المذکورة .

و ذکر الزیلعی ما یفید ضعفه حیث قال و قیل لانفتیهم باعادة الخراج[2]

(ترجمہ: علامہ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی عبارت ذکر فرمائی ہے جو خراج کے دوبارہ ادا نہ کرنے کے قول کے ضعیف ہونے پر دلالت کرتی ہے۔انہوں نے فرمایا کہ کہا گیا ہے کہ ہم خراج کے اعادہ کا فتویٰ نہیں دیتے)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[1] رد المحتار : جلد ۲ ، صفحه ۲۶ ، مطبوعه مکتبه رشیدیه کوئٹه

[2] رد المحتار : جلد ۲ ، صفحه ۲۶ ، مطبوعه مکتبه رشیدیه کوئٹه

﴿فتویٰ نمبر......96﴾

سوال

مکرمی معظمی مولانا مفتی سید دیدار علی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ بمبئی میں عید بقرعید کے دن مسجدوں میں بوقتِ نماز جس طرح فقیر جن کا پیشہ ہے بھیک ہے اور سوال کرنے کو عیب نہیں' بلکہ ہنر سمجھتے ہیں اور نمازیوں کے آگے سوسو پچاس پچاس بھاگتے پھرتے ہیں اور وظیفہ پڑھنے والوں کو جو با نتظار بیٹھے ہوتے یا بعد نماز طعن وتشنیع کرتے ہیں۔ ان کو دینا اور ان کو جو منع کرنے پر قادر ہو متولی یا اہل محلّہ ان کا منع نہ کرنا اور اس کو نیک کام سمجھنا کیسا ہے؟

۱۵رمضان ۱۳۳۶ھ

مولوی عبدالحلیم امام مسجد جاملی محلہ بمبئی

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

☆ جس کے شخص کے پاس ایک دن کا کھانا موجود ہو یا بالقوہ یعنی وہ شخص جو تندرست اور مزدوری کر کے ایک دن کا کھانا حاصل کرسکتا ہے' وہ حکما اسی شخص کے حکم میں ہے' جس کے پاس ایک دن کا کھانا موجود ہو۔ ایسے شخص کو کھانے کے واسطے سوال کرنا حرام ہے۔ البتہ اگر ایک دن کے کھانے کے لائق موجود ہو مگر کپڑے قدرِ ضرورت نہ رکھتا ہو یا مکانِ سکونت بقدرِ گزر نہ رکھتا ہو علی ہذا مسافر گھر تک پہنچنے کا سامان نہ رکھتا ہو تو بقدرِ رفعِ ضرورت اس کو سوال جائز ہے۔ ضرورت سے زائد اس کو بھی سوال حرام ہے۔ اور ایسے سائل کو دینا بھی حرام بسبب مدد کرنے کے فعلِ حرام پر جو سوال ہے۔

چنانچہ جلد دوم باب المصرف صفحہ ۷۵ در مختار میں ہے:۔

ولا یحل ان یسال شیئا من القوت من له قوت یومه بالفعل او بالقوة کالصحیح

المکتسب و یاثم معطیه ان علم بحاله لاعانته علی المحرم [1]

☆(ترجمہ: جس شخص کے پاس بالفعل ایک دن کی خوراک موجود ہواس کے لیے سوال کرنا حلال نہیں اور اس شخص کے لیے بھی سوال حلال نہیں جس کے پاس بالقوہ ایک دن کی غذا موجود ہو جس طرح کہ وہ شخص جو تندرست اور کمانے والا ہو۔ اگر ایسے سائل کو دینے والے شخص کو اس کا حال معلوم ہو تو وہ گناہ گار ہوگا کیوں کہ اس نے حرام پر امداد کی ہے)

قال الشامی رحمه الله :

قوله ولا یحل قید بالسوال لان الاخذ بدونه لا یحرم بحر و قید بقوله شیئا من القوت لان له السوال ما هو محتاج الیه غیر القوت کثوب شر نبلالیة و اذا کان له دار یسکنها ولایقدر علی الکسب قال ظهیر الدین لا یحل له السوال اذا کان یکفیه مادونها معراج [2]

(ترجمہ: قولہ لاتحل: یعنی اس کے لیے جائز نہیں مصنف علیہ الرحمہ نے اسے سوال کے ساتھ مقید فرمایا کیوں کہ سوال کے بغیر کسی سے کچھ لینا حرام نہیں ہے۔ بحر۔ نیز حضرت مصنف علیہ الرحمۃ نے کچھ خوراک کی قید لگائی۔ کیوں کہ جس کے پاس خوراک موجود ہے اسے اس کے علاوہ اور ضرورت کی چیز مثلاً کپڑے کا سوال کرنا جائز ہے۔ شرنبلالیہ۔ اور جب اس کے پاس گھر ہو جس میں رہ رہا ہو اور وہ کھانے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو امام ظہیر الدین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جب سوال کے بغیر اس کی کفایت ہو سکے تو اسے سوال کرنا جائز نہیں ہے)

☆ اور ظاہر ہے کہ بمبئی کے سائل جو عیدین میں نمازیوں کو تنگ کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ بے نمازی ناپاک بے غسل اس طرح صفوں کے آگے صفوں کو چیرتے ہوئے پھرتے ہیں کہ بالکل حرمتِ مسجد نہیں رہتی۔

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۲ صفحه ۷۵، ۷٦ مکتبه رشیدیه کوئٹه

[2] رد المحتار جلد ۲، صفحه۷۵، ۷٦ مطبوعه مکتبه رشیدیه کوئٹه

لہٰذا ان کو دینا اور منع نہ کرنا ہتکِ حرمتِ مسجد کرانا ہے جو قطعاً حرام ہے۔ اور جو لوگ باوصفِ قدرت ان کو منع نہیں کرتے وہ مرتکبِ حرام اور سخت گناہگار ہیں۔ اور جو ان کو دیتے ہیں وہ بھی بسبب مدد کرنے والے فعلِ حرام کے سخت گنہگار ہیں۔ اور جو ایسے سائلوں کو مسجد سے نکال دیں مستحق ثواب ہیں۔

چنانچہ صفحہ ۶۰۹ جلد اول شامی میں ہے

قال فی النهر والمختار ان السائل إن كان لا يمر بين يدى المصلى و لا يتخطى للرقاب و لا يسال الحافا بل لامر لابد منه فلا باس بالسوال والاعطاء اه و مثله فی البزازية و فيها فلا يجوز الاعطاء اذا لم يكونوا على تلك الصفة المذكورة قال الامام ابو نصر العياضی ارجو ان يغفر الله تعالى لمن يخرجهم من المسجد و عن الامام خلف بن ايوب لو كنت قاضيا لم اقبل شهادة من يتصدق عليهم[1]

(ترجمہ: النہر میں ہے کہ مختار یہ ہے کہ مانگنے والا اگر نمازی کے آگے سے نہ گزرے اور نہ ہی لوگوں کی گردنیں پھلانگے اور اصرار کر کے نہ مانگے بلکہ کسی ایسی چیز کے لیے مانگے جس کے بغیر اسے چارہ نہ ہو تو اس مانگنے اور دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ فتاویٰ بزازیہ میں اسی طرح ہے او اس میں یہ بھی ہے کہ جب سائل اس طرح مذکورہ کیفیت پر نہ ہوں تو ان کو دینا جائز نہیں ہے۔ اور امام ابونصر عیاضی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو معاف فرمادے گا جو انہیں مسجد سے نکال دے۔ اور امام خلف بن ایوب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اگر میں قاضی ہوتا تو ان لوگوں کی شہادت قبول نہ کرتا جو ان کو دیتے ہیں)

یعنی امام خلف بن ایوب فرماتے ہیں کہ اگر میں قاضی ہوتا ایسے سائلوں کو صدقہ دینے والوں کی شہادت کبھی نہ قبول کرتا بناء علیہ صفحہ ۲۹۶ جلد خامس کتاب الکراھیۃ و درمختار میں علامہ حصکفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] رد المحتار جلد ۱، صفحہ ۶۰۹ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

هذا فلس لا یکفره سبعون فلسا[1]

یعنی ایسے سوال پیشہ مسجد میں سوال کرنے والے سائلوں کو ایک پیسہ دینے کا اتنا گناہ ہے کہ اگر اس کے عوض ستر پیسہ اللہ واسطے دیئے جائیں تو وہ اس ایک پیسہ دینے کے گناہ کا کفار نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا متولیانِ مسجد اور اہلِ محلّہ پر لازم ہے کہ ضرور اس طوفانِ بے تمیزی کا علاج کریں اور عیدین کی صفوں میں گشت کرنے سے ان ظالموں کو منع کر کے مستحقِ اجرِ عظیم ہوں۔ فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبرآباد

❁❁❁❁❁

---

[1] رد المحتار جلد ۵، صفحہ ۲۹۶ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

وضاحت: حضرت سند المحدثین رحمۃ اللہ علیہ نے غلطی سے اس حوالہ کو در مختار کی طرف منسوب فرمایا لیکن درحقیقت یہ حوالہ اس پر علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے حاشیہ رد المحتار کا ہے۔

محمد علیم الدین نقشبندی عفی عنہ

﴿فتویٰ نمبر......97﴾

سوال

جناب مولانا صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ اشتہار انجمن اسلامیہ بھرت پور میں جو سیکرٹری صاحب نے صدقہ فطر کا وزن ہمارے سیر مروجہ سے جو اسی روپیہ سیر ہوتا ہے سوا دو سیر لکھا ہے کیا یا صحیح ہے یا غلط؟

سائل: حافظ رفیق احمد امام مسجد بھرت پور

۱۴ شوال ۱۳۴۴ھ

الجواب

از خاکسار دیدار علی بخدمت حافظ محمد رفیق صاحب امام مسجد جامع بھرت پور سلمہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

شرح وقایہ کی جلدِ اول صفحہ ۳۰۱ میں ہے' کہ صاع عراقی حنفیوں کے نزدیک صدقۂ فطر میں معتبر ہے اور صاع حجازی شافعیوں کے نزدیک۔ صاع عراقی میں آٹھ رطل عمدہ نئی گیہوں سماتی ہیں اور حجازی میں ایک ثلث پانچ رطل۔ لہٰذا امام شافعی رحمۃ اللہ کے نزدیک صدقۂ فطر نصف صاع حجازی ہے اور امام صاحب رحمۃ اللہ کے نزدیک نصف صاع عراقی۔

اور وہ دو من کا ہوتا ہے اور من' چالیس استار کا اور استار' ساڑھے چار مثقال کا۔ اس حساب سے ایک من ایک سو اسی (180) مثقال کا ہوا۔ اب حساب کرلو کہ مثقال ساڑھے چار ماشہ کا ہوتا ہے اور نصف صاع دو من کا ہوتا ہے۔ جس کے 360 مثقال اور ایک ہزار چھ سو بائیس (1622) ماشہ ہوئے' جس کے 135 تولہ ہوتے ہیں اور چونکہ ہمارا سیر مروجہ اسی روپیہ بھر کا ہوتا ہے' اور روپیہ ساڑھے گیارہ ماشہ کا۔ لہٰذا 135 تولہ سے فی تولہ جب چار رتی نکالی تو 5 روپیہ (تولہ) 10 ماشہ بھر نکلے اور ان کو جب 135 میں جمع کیا تو 140 روپیہ (تولہ) 10 ماشہ بھر وزن نصف صاع عراقی کا' جو دو من شرعی ہوتا ہے' ہوا۔ اور اب ایک سو چالیس (140) تولہ دس ماشہ بھر وزن کو اسی 80 روپیہ پر جو وزن ہمارے سیر مروجہ کا ہے تقسیم کیا تو پونے دو سیر دس

ماشہ بھر ہمارے سیر سے وزن نصف صاع عراقی کا ہوا جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے نزدیک معتبر ہے۔ لہٰذا احتیاطاً مناسب ہے کہ آدھ پاؤ کم دو سیر صدقۂ فطر نکالا جائے اور پونے دو سیر دس ماشہ بھر سے ہرگز کم نہ ہو۔

نہیں معلوم محمد شرف الدین خان صاحب سیکرٹری انجمن اسلامیہ بھرت پور نے جو فقہائے محققین حنفیہ کی طرف نسبت کر کے نصف صاع کا وزن تقریباً سوا (دو) سیر مروجہ لکھا ہے کس حساب سے بلاحوالہ کتاب اس وثوق سے کیسا لکھا ہے۔ ردالمحتار، درمختار، شرح وقایہ سے جو ثابت ہوتا ہے وہ مفصلاً خدمتِ عالی میں عرض کر دیا گیا۔ لہٰذا سیکرٹری صاحب کی خدمت میں بعد ابلاغِ سلام مسنون میری طرف سے عرض کر دینا کہ اگر اس تحقیق سے خاکسار کو بھی مع حوالۂ کتب مفصلاً مطلع فرمایا جائے (تو) مشکور ہوں گا۔ ورنہ آئندہ بلا تحقیق ایسی جرات نہ فرمائیں۔ اس واسطے کہ بموجب صاعِ حجازی بھی جو مختار امامِ شافعی رحمۃ اللہ ہے تقریباً صاع اڑھائی سیر تیرہ روپیہ (تولہ) اور نصف صاع سوا سیر ساڑھے چھ روپیہ (تولہ) بھر کا ہوتا ہے۔[1]

والسلام

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی

مفتی جامع مسجد آگرہ

۱۴ شوال ۱۳۳۴ھ

✿✿✿✿✿

☆ [1] امام الفقہاء المحدثین حضرت مولانا دیدار علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تحقیق سے رجوع فرمالیا تھا چنانچہ ملاحظہ ہو اسی فتاویٰ کی کتاب الظہار، صفحہ ۵۴۹/فتویٰ نمبر ۲۰۹/ میں ظہار کے بارے میں فرمایا ''اگر بوجہ بڑھاپے یا مرض کے مطلقاً روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھے ساٹھ مسکینوں کو دو دفعہ ترکاری سے پیٹ بھر کھانا کھلانا ہے یا ساٹھ مسکینوں کو فی مسکین سوا تین چھٹانک دو سیر گیہوں دے دینا ہے''

محمد علیم الدین نقشبندی عفی عنہ

روزہ

﴿فتویٰ نمبر......98﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس صورت میں کہ ایک شہر میں انتیس ذیقعدہ کو پیر کے روز منگل کی شب کو رویت ہلال ذوالحجہ ہوئی۔ ایسی حالت میں کہ مطلع صاف نہ تھا۔ بلکہ ابرِ غلیظ محیط تھا دیکھنے والوں میں سے دو آدمیوں نے آ کر ایک جماعت معززینِ شہر کے سامنے شہادۃ چاند دیکھنے کی دی۔ اور ان کی شہادۃ کی تائید میں اور بھی شہر کے مختلف محلوں سے خبریں آئیں' کہ پیر کے روز فلاں فلاں شخص نے چاند دیکھا' جو کہ بعض ثقہ اور بعض مستور الحال ہیں۔ مفتی صاحب نے ایسی حالت میں کہ علت فی السماء رویت کے وقت میں موجود تھی' ان دو شہادتوں کو کافی اور قابل اعتبار تسلیم کر کے اعلان کرا دیا' کہ عیدالضحیٰ حسب الشہادۃ پنجشنبہ کو ہوگی۔ اس شہادت کی تاکید میں بذریعہ خطوط کے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ دکن حیدرآباد' اورنگ آباد ومکہ معظمہ میں بھی عیدالضحیٰ جمعرات کو تھی حسب اعلان بنا بر شہادۃ کل شہر میں جمعرات کو عید ہوئی مگر چند آدمیوں نے جن کی تعداد تیس یا چالیس سے زیادہ نہیں اس شہادت کو غیر معتبر سمجھ کر جمعرات کو عید نہیں کی۔ جن میں اکثر جاہل اور بعض ذی علم ہیں۔ اور اب وہ کہتے ہیں کہ جنہوں نے اس شہادت پر عید کر لی نہ ان کی نماز ہوئی اور نہ قربانی۔ بلکہ سب کی نماز عید اور قربانیاں ضائع گئیں اور یہ سارا فتنہ ایک دیوبندی مولوی صاحب کا ہے کہ انہوں نے ہمارے مولوی صاحب کے فتویٰ کی مخالفت کر کے ہمارے بعض علماء کو جدا کر کے باہم تفرقہ ڈال دیا ہے۔ لہٰذا جو امر حق ہو اس سے جلد مطلع فرمایا جائے۔

الجواب

اللھم رب زدنی علما.

ھدایۃ مع الشروح الاربعہ مطبوعہ مصر کے صفحہ ۲۰۲ جلد ثانی میں ہے

و اذا کان بالسماء علة لم یقبل فی ھلال الفطر الاشھادة رجلین او رجل و امراتین لانه تعلق به نفع العبد و ھو الفطر فاشبه سائر حقوقه والاضحی کا لفطر فی ھذا فی ظاھر الروایة و ھو الاصح خلا فا لماروی عن ابی حنیفة رحمه الله انه کھلال رمضان لانه تعلق

به نفع العباد وهو التوسع بلحوم الاضاحی[1]

(ترجمہ: اور جب آسمان پر علت ہو تو عید فطر کے چاند کے لیے امام صرف دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت کو قبول کرے۔ کیونکہ اس کا تعلق بندوں کے نفع کے ساتھ ہے جو کہ افطار ہے۔ تو اس کی مشابہت بندوں کے باقی حقوق کے ساتھ ہو گئی۔ اور عیدِ قربانی کا حکم بھی ظاہر روایت کی رو سے عیدِ فطر کی مانند ہے۔ اور یہی اصح ہے۔ لیکن اس میں حضرت امامِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ایک روایت مختلف ہے جس کی رو سے عید قربانی کا چاند رمضان المبارک کے چاند کی مانند ہے۔ کیونکہ اس سے بندوں کے منافع کا تعلق ہے اور نفع قربانیوں کے گوشت کے ساتھ فراخ دستی ہے)

قال ابن همام رحمة الله فی شرحه فی صفحه ۲۰۳ من فتح القدیر

قوله لانه تعلق به نفع العباد تعلیل لظاهر الروایة و فی التحفة رجح روایة النوادر فقال والصحیح انه یقبل فیه شهادة الواحد. لان هذا من باب الخبر فانه یلزم المخبر اولا ثم یتعدی الی غیره

وایضا فانه یتعلق به امر دینی و هو وجوب الاضحیة و هو حق الله تعالی فصار کهلال رمضان فی تعلق حق الله تعالیٰ به فیقبل فی الغیم الواحد العدل ولا یقبل فی الصحو الا التواتر[2]

(ترجمہ: قولہ: کیونکہ اس کے ساتھ بندوں کے نفع کا تعلق ہے۔ یہ ظاہر روایت میں بیان کردہ حکم کی تعلیل ہے۔ تحفہ میں نوادر کی روایت کو ترجیح دی گئی ہے۔ صاحبِ تحفہ نے فرمایا کہ صحیح یہ ہے کہ اس بارے میں ایک شخص کی شہادت کو قبول کیا جائے گا۔ کیونکہ شہادت خبر کے باب سے ہے تو پہلے یہ خبر دینے والے پر لازم ہوتی ہے پھر اس سے متعدی ہو کر اوروں پر لازم ہوتی ہے۔ نیز اس کے ساتھ ایک دینی معاملہ کا تعلق ہے۔ اور وہ ہے قربانی کا واجب ہونا جو کہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ تو یہ چاند بھی رمضان المبارک کے چاند کی مانند ہے کہ اس کا تعلق بھی

[1] الهدایه : جلد اول: جز ۲، صفحه ۲۵۲، ادارة المعارف والعلوم الاسلامیه کراچی

[2] فتح القدیر جلد ۲ صفحه ۶۱، ۶۲ المطبعة الکبری الامیریه مصر

اللہ تعالیٰ کے حق کے ساتھ ہے۔ لہٰذا بادل میں ایک عادل کی گواہی قبول کر لی جائے گی۔ لیکن مطلع صاف ہونے کی صورت میں متواتر اخبار کو ہی قبول کیا جائے گا)

و فی صفحه ۵۴ من الجزء الاول للدر المختار

فی شرح المنية للحلبی عند قوله و لا يجوز مس مصحف الا بغلافه اذا تعارض امامان معتبر ان عبر احدهما بالصحيح و الآخر بالاصح فالاخذ بالصحيح اولى لانهما اتفقا على انه صحيح و الاخذ بالمتفق اوفق فليحفظ ؎۱

(ترجمہ: حلبی کی شرح منیہ میں جہاں منیۃ المصلی میں ہے کہ قرآن مجید کو غلاف کے بغیر چھونا جائز نہیں۔ اس پر علامہ حلبی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا جب دو معتبر اماموں کا تعارض ہو ایک نے ایک صورت کو صحیح سے تعبیر کیا جب کہ دوسرے نے دوسری کو اصح سے تعبیر فرمایا تو صحیح والے قول کو اپنانا زیادہ بہتر ہے کیونکہ وہ دونوں اس صورت کے صحیح ہونے پر اتفاق کرتے ہیں تو متفق صورت کو اپنانا اوفق ہے اسے خوب یاد رکھ لو)

لہٰذا ہلالِ عید الضحیٰ میں بقولِ صحیح ایک مرد مسلمان عادل کی بھی گواہی عید اور قربانی کر لینے کے واسطے کافی تھی، گواہی صورتِ مسئولہ میں بموجب روایتِ ظاہر الروایت تو بعض ثقہ اور بعض مستور الحال موجود ہیں۔ اندریں صورت صحتِ نمازِ عید اور صحتِ قربانی میں کسی طرح بھی کلام نہیں ہو سکتا۔ لامحالہ اس کی مخالفت کرنا اور یہ کہنا کہ نہ نماز ہوئی نہ قربانی فی الواقع یہ ایسے ہی مولوی اور ان کے بھولے بھالے متبعین ہی کا کام ہے، جو امکانِ کذبِ جنابِ باری کی قائل ہیں۔ اور مجلس میلادِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کنیا کے جنم اشٹمی سے تشبیہ دیتے ہیں جیسا کہ کلام مستفتی سے ظاہر ہے۔

اعاذنا الله و جميع المومنين من امثال هذه المفتين آمين ثم آمين.

(ترجمہ: اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام اہل ایمان کو اس قسم کے مفتیوں سے اپنی پناہ میں رکھے آمین ثم آمین)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ

ابو محمد محمد دیدار علی المفتی فی جامع اکبر آباد

؎۱ الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۱ صفحہ ۵۴، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر......99﴾

سوال

عرفہ کے روزہ کا کیا حکم ہے۔

محمد اسلام خان

قصبہ شمس آباد ضلع آگرہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما

تفسیر عزیزی میں تفسیر والفجر میں ہے کہ ذی الحجہ کے نو روزوں کے ایک دن کا روزہ برس دن کے برابر ہے [1]۔ اس میں عرفہ آ گیا۔

حررہ: محمد دیدار علی عفی اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[1] تفسیر عزیزی: پارہ عم: صفحہ: ۱۵۸ مطبوعہ لاہور میں ہے

روزہ هر روز آں ده روز برابر یک سال است

ترجمہ: ذی الحجہ کے پہلے دس دنوں میں سے ہر دن کے روزے کا ثواب ایک سال کے روزے کے برابر ہے۔

محمد علیم الدین نقشبندی عفی عنہ

﴿فتویٰ نمبر......100﴾

سوال

آگرہ میں ایک شاہ صاحب نووارد ہیں جو اپنے کو شاہ بہاء الدین کا خلیفہ ظاہر کرتے ہیں۔ وہ ایک مسماۃ کے گھر جوان سے تعارف وارادت رکھتی تھی تشریف لائے۔ عورت نے بوجہ نادانستگی اپنے خورد سال بچے کے ہاتھ پان بناکر ان کے لئے باہر بھیج دیا۔ مگر شاہ صاحب روزہ دار تھے تاہم انہوں نے ٹھیک دس بجے دن کے پان مرسلہ عورت نوش فرماکر اپنا نفل روزہ توڑ دیا یہ کہہ کر کے اس تحفہ پان کو رد کرنا نہیں چاہتا۔ اور پھر دوسرا پان گھر میں سے منگوا کر مسماۃ کے شوہر کو بھی کہ جوان سے عقیدت رکھتا تھا نفل روزہ تڑوا دیا۔ اس معاملہ کے دس پندرہ دن بعد وہی عورت اکّہ پر سوار ہو کر اپنے ایک رشتہ دار کے گھر جاتی تھی۔ شدتِ دھوپ کا وقت تھا۔ شاہ صاحب نے براہِ کرم بہ اصرارِ تمام اس عورت کا نفل روزہ توڑوا دیا۔ تب اس کو دھوپ میں اپنی رشتہ داری میں جانے دیا۔

پس کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس بارہ میں کہ یہ فعل شاہ صاحب کا کس حد تک شرعاً جائز و روا تھا۔ اور اس کا فاعل موجبِ ثواب یا عذاب ہوگا اور اس کا مرتبہ گروہِ اسلام میں کیسا سمجھنا چاہیے؟

۲ شعبان ۱۳۳۶ھ ۱۳ مئی ۱۹۱۸ء
محمد نواب مرزا حکیموں گلی آگرہ

الجواب

اللھم رب زدنی علما۔

☆ نفلی روزہ رکھ کر کسی کی ناراضگی کے خیال سے یا کسی مسلمان کے خوش کرنے کی نیت سے یا خوف شدتِ گرمی یا شدتِ تشنگی سے توڑنا جائز ہے۔ مگر پھر اس روزہ کو قضا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

چنانچہ صفحہ ۱۸۱ مشکوۃ شریف مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی میں ہے

عن عائشة رضی الله عنها قالت دخل علیّ النبیُ ﷺ ذات یوم فقال هل عند کم شیء فقلنا لا قال فانی إذا صائم ثم اتانا یوما آخر فقلنا یارسول الله ﷺ اهدی لنا حیس

فقال ارنیه فلقد صحبت صائما فاکل رواه مسلم[1].

(ترجمہ: ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک روز نبی اکرم ﷺ میرے پاس تشریف فرما ہوئے فرمایا کیا تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ ہم نے عرض کیا نہیں تو آپ نے فرمایا پھر آج میرا روزہ ہے۔ اس کے بعد آپ ایک اور دن تشریف لائے ہم نے عرض کی ہمارے ہاں حیس یعنی ایک کھانا جو کھجور، گھی اور ستو سے تیار ہوتا ہے ہدیہ کے طور پر آیا ہے تو آپ نے فرمایا مجھے دکھاؤ میں صبح سے روزہ سے ہوں آپ نے وہ کھایا۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا)

و عن ام ھانی قالت لما کان یوم الفتح فتح مکة جاء ت فاطمة فجلست علی یسار رسول اللہ ﷺ و ام ھانی عن یمینه فجاء ت الولیدة باناء فیه شراب فناولته فشرب منه ثم ناوله ام ھانی فشربت منه فقالت یا رسول اللہ لقد افطرت و کنت صائمة. فقال لھا أ کنت تقضین شیئا قالت لا قال لا یضرک ان کان تطوعا. رواہ ابو داؤد والترمذی والدارمی و فی روایة لاحمد والترمذی نحوہ و فیه فقالت یا رسول اللہ اما کنت صائمة فقال الصائم المتطوع امیر نفسه ان شاء صام و ان شاء افطر[2]

(ترجمہ: حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے فرمایا جب فتح یعنی فتحِ مکہ کا دن تھا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حاضرِ خدمت ہوئیں اور نبی اکرم ﷺ کے بائیں جانب بیٹھ گئیں اور ام ہانی آپ کے داہنی جانب تھی ایک چھوٹی بچی ایک برتن اٹھائے آئی اس میں پینے کی کوئی چیز تھی۔ آپ ﷺ نے اس سے نوش فرمایا پھر وہ ام ہانی کو دے دیا تو میں نے بھی پیا۔ ام ہانی عرض کرنے لگیں یا رسول اللہ میں روزہ افطار کر دیا حالانکہ میرا روزہ تھا۔ تو نبی اکرم ﷺ نے دریافت فرمایا کیا تم قضا کر رہی تھیں تو اس نے عرض کیا نہیں تو فرمایا اس کا تجھ کچھ نقصان نہیں ہے بشرطیکہ تمہارا یہ روزہ نفلی ہو۔ اسے امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور امام

[1] مشکوۃ المصابیح صفحه ۱۸۱ مکتبه امدادیه ملتان

[2] مشکوۃ المصابیح صفحه ۱۸۱ مکتبه امدادیه ملتان

دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک اور روایت میں بھی اسی طرح ہے اور اس حدیث میں یوں ہے میں نے عرض کی یارسول اللہ! کیا میرا روزہ نہ تھا تو فرمایا نفلی روزہ رکھنے والا اپنے آپ کا حکمران ہوتا ہے چاہے وہ روزہ رکھے اور چاہے افطار کرے)

و عن زهری عن عروة عن عائشه قالت كنت انا و حفصة صائمتين فعرض لنا طعام اشتهيناه فاكلنا منه فقالت حفصة يارسول الله إنا كنا صائمتين فعرض لنا طعام اشتهيناه فأكلنا منه قال اقضيا يو ما آخر مكانه رواه الترمذی[1].

(ترجمہ: امام زہری رحمۃ اللہ علیہ' انہوں نے حضرت عروہ رحمۃ اللہ علیہ اور انہوں نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ انہوں نے فرمایا کہ میں اور حفصہ روزہ سے تھیں ہمارے سامنے کھانا آیا جس کی ہمیں خواہش تھی۔ تو ہم نے اس سے کھالیا۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یارسول اللہ! ہم دونوں روزہ دار تھیں ہمارے سامنے کھانا آیا۔ اس کی ہمیں خواہش تھی تو ہم نے اسے کھالیا تو فرمایا اس کی جگہ ایک دن قضا کرلو۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا)

قال فی اللمعات والمرقات شرحی المشکوة[1]

(ترجمہ: لمعات التنقیح اور مرقاۃ المفاتیح' جو دونوں مشکوۃ شریف کی شرحیں ہیں میں ہے)

قوله ﷺ اقضيا هذا دليل الحنفية على وجوب قضاء صوم التطوع[2].

(ترجمہ: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: تم دونوں قضا کرلو یہ احناف کی دلیل ہے اس حکم شرعی پر کہ نفلی روزہ کی قضا واجب ہے)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی المفتی فی جامع اکبر آباد
۸ شعبان ۱۳۳۶ھ

---

[1] مشکوۃ المصابیح صفحہ ۱۸۱ مکتبہ امدادیہ ملتان
[2] حاشیہ مشکوۃ المصابیح صفحہ ۱۸۱ مکتبہ امدادیہ ملتان

خرید و فروخت

﴿فتویٰ نمبر...... 101﴾

سوال

نوٹ پر کمیشن کرنسی لے کر فروخت کرنا جائز ہے؟ دوکان پر کوئی خرید کرنے آئے تو دوسرے دوکان سے مال لاکر اس کو نرخ پر دینا اور ایک آنہ دلالی لینا جائز ہے؟

سوداگران لکونہ متصل جامع مسجد آگرہ

۵ مارچ ۱۹۱۶ء

الجواب

هو المصوب

نوٹ شرعاً بحکم سرکار عامل ہے جو گم ہو جائے تو مثنی اس کا مل جاتا ہے۔ نہ دراصل روپیہ ہے اور نہ سونا ہے۔ پس بظاہر اس کی کرنسی رواج اور ضرورت پر ہو جائز ہے جیسے سکہ سے چاندی۔ جن کی قیمت زیادہ کم ہو جاتی ہے۔ لہذ جائز سمجھا جائے گا کہ نوٹ کو حسب رواج کم وبیش فروخت کیا جائے اور اگر نوٹ کو روپیہ فرض کیا جائے تو بے شک کرنسی ناجائز ہوگی جیسا کہ بعض علماء نے لکھا ہے مگر اول قول زیادہ محقق ہے۔

اگر شے مبیعہ بوجہ عیب یا دھوکہ دینے بائع کے واپس کرے تو واپس لینا ہوگا۔ من الحامدیۃ

ان غره ای غر المشتری البائع و بالعکس او غره الدلال فله الرد والا فلاوبه افتی صدر الاسلام وغیره و تصرفه فی بعض المبیع قبل علمه بالغبن غیر مانع منه فیرد مثل ما أتلفه و یرجع بکل الثمن علی الصواب علائی علی التنویر الخ ؎۱ .

(ترجمہ: اگر خریدار کو فروخت کنندہ نے دھوکا دیا یا معاملہ اس کے برعکس ہوا یا دلال نے دھوکا دیا تو اسے اجازت ہے کہ بیع کو لوٹا دے ورنہ نہیں لوٹا سکتا حضرت صدر الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علماء نے یہی فتوی دیا ہے اور غبن

؎۱ تنقیح الفتاویٰ الحامدیة جلد اول صفحہ ۲۷۰ مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ

کے علم سے قبل مبیع کے کسی حصہ میں تصرف اس اختیار کے مانع نہیں ہے لہٰذا جتنا خرچ کیا اس کی مثل واپس کرے اور درست قول یہی ہے کہ پوری ادا کردہ قیمت لوٹا لے یہ جزئیہ علائی علی التنویر سے ماخوذ ہے)

ایسی صورت میں کہ دلال بائع سے لے کر خود فروخت کر دے تو اس کو دلالی اصل بائع سے لینا چاہئے ۔فتاویٰ حامدیہ میں ہے۔

الدلال اذا باع العين بنفسه ثم اراد ان ياخذ من المشترى الدلالة ليس له ذلك لانه هو العاقد حقيقة و تجب على البائع الدلالة لانه فعل بامر البائع [1] .

(ترجمہ: دلال جب کسی چیز کو خود فروخت کرے پھر خریدار سے دلالی وصول کرنے کا ارادہ کرے تو اس کو یہ حق حاصل نہیں کیوں کہ حقیقت میں وہ خود معاملہ طے کرنے والا ہے اس کی دلالی فروخت کرنے والے کے ذمہ ہوگی کیوں کہ اس نے فروخت کنندہ کے حکم سے فروخت کی ہے)

واللہ اعلم بالصواب

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

❁❁❁❁❁

---

[1] تنقیحِ الفتاویٰ الحامدیہ جلد اول صفحہ ۲۵۹ مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر......102﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس صورت میں کہ میرا حصہ مکان جس میں ہم تین بھائی شریک ہیں اگر میں بلاتقسیم کسی اجنبی کو بیچوں تو جائز ہے یا نہیں جائز؟ اور اگر بھائی خرید لیں تو مجھ کو ان کو اسی قیمت پر جو دوسروں سے ملتی ہے دینے میں کچھ عذر نہیں ہے۔

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللہ رب زدنی علما

خواہ اجنبی کو حصہ مذکور بیچا جائے' خواہ اپنے دونوں بھائیوں کو' یا ایک کو' جو اس مکان میں شریک ہیں' اگر معہ زمین مشترکہ بیچا جائے بلا اختلاف جائز ہے کوئی حرج نہیں۔

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ

ابو محمد محمد دیدار علی

۱۷ جمادی الاولی ۱۳۳۶ھ

﴿فتویٰ نمبر......103﴾

سوال

مالا بدمنہ ترجمہ اردو ذکر بیع' تجارت وغیرہ میں درج ہے کہ "حضرت رسول اللہ ﷺ جب قرض ادا کرتے تھے تو بجائے ایک وسق کے دو وسق ادا کرتے تھے" لہٰذا کتابِ مذکور کی عبارت سے ایک خیال یہاں پر یہ پیدا ہو گیا ہے کہ جب صاف کتاب بیع میں ایسی عبارت درج ہے تو مسلمان کو بلا شرط اس طور قرض دینے والے کو لینے والا ضرور کچھ فائدہ پہنچائے۔

۱۷رمضان ۱۳۳۶ھ

الجواب

جو کچھ مالا بدمنہ میں لکھا ہے بہت صحیح ہے۔ اور اس پر عمل کرنا مستحب ہے۔ مگر اس وقت تک ہی مستحب ہے کہ جب کبھی قرض دار وقتِ اداءِ قرض اگر کچھ بھی زیادہ (نہ دے) تو قرض خواہ کچھ بھی نہ مانگے نہ شکائت کرے۔ ورنہ قرض دہندہ یہ سمجھ کر دے گا کہ یہ ضرور وقتِ ادائیگی کچھ زیادہ؟[1] دیتا ہے۔☆ اگر کبھی نہ دے گا تو پھر حسب عرف تقاضا کر کے زیادہ لے لوں گا تو پھر بلا شبہ سود ہو جائے گا۔

چنانچہ صفحہ ۳۵ جلد چہار دھم مبسوط شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ میں ہے یہی وجہ ہے کہ اگر قرض لینے سے پیشتر قرض دہندہ کو کبھی کھانا نہیں کھلاتا تھا تو اب بوجہ قرض کھانا۔[1]۔۔۔حرام ہے۔۔[1]۔۔

عن محمد بن سیرین قال اقرض عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ عشرہ الاف درہم و کانت لابی رضی اللہ عنہ نخل بعجل فاھدی ابی بن کعب رضی اللہ عنہ رطبا لعمر رضی اللہ عنہ فردہ علیہ فلقیہ ابی فقال اظننت انی اھدیت الیک لاجل مالک ابعث الی مالک فخذہ فقال عمر لابی رضی اللہ عنھما رد علینا

---

[1] اصل مخطوط سے عبارت صاف نہیں پڑھی جا سکی۔ (محمد علیم الدین نقشبندی عفی عنہ)

هديتنا و به ناخذ فان عمر رضى الله عنه انما رد الهدية مع انه كان يقبل الهدايا لانه ظن انه اهـدى اليه لاجل ماله فكان ذلک منفعة القرض فلما اعلمه ابى رضى الله عنه انه ما اهدى اليـه لاجـل مـالـه قبل الهدية منه وهذا هو الاصل و لهٰذا قلنا ان المنفعة اذا كانت مشروطة فـى الاقـراض فهو قـرض جـر منـفـعة و ان لـم يـكن مشـروطة فلا بـاس بـه لحتـى لو ردالمستقرض اجود مما قبضه فان كان ذلک عن شرط لم يحل لانه منفعة القرض و ان م يكن ذلک عن شرط فلا باس به لانه احسن فى قضاء الدين و هو مندوب اليه[1]

☆ترجمہ: حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو دس ہزار درہم قرض دیا۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا عجل میں کھجوروں کا باغ تھا تو آپ نے پکی ہوئی تازہ کھجوریں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو تحفہ میں ارسال کیں آپ نے وہ ان کو واپس لوٹا دیں۔ پھر حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی آپ سے ملاقات ہوئی۔ اور عرض کیا آپ نے گمان کیا کہ میں نے آپ کو یہ تحفہ آپ کے مال کے باعث بھیجا تھا۔ اپنے مال کی طرف کسی کو بھیج دو اور اسے لے لو۔ اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہمارا تحفہ ہمیں واپس بھیج اور ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں۔ کیوں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تحفہ لوٹا دیا تھا حالانکہ آپ تحفے قبول فرمالیا کرتے تھے کیوں کہ انہوں نے گمان کیا کہ انہوں نے ان کے مال کی وجہ سے ہدیہ بھیجا تھا۔ تو یہ قرض پر نفع ٹھہرتا تھا۔ جب حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے انہیں بتایا کہ انہوں نے مال کی وجہ سے ہدیہ نہ دیا تھا تو آپ نے ہدیہ قبول کرلیا۔ اور یہی قانون ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں جب قرض دینے میں منفعت شرط ہو تو یہ ایسا قرض ہوتا جو نفع کے حصول کا باعث ہوتا ہے۔ اور اگر نفع کی شرط نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ حتی کہ اگر قرض دار نے وصول شدہ مال سے بہتر مال واپس کیا اگر یہ شرط کے باعث نہ ہو تو حرج نہیں۔ کیوں کہ اس نے قرض کی ادائیگی میں بہتر طریق اپنایا اور یہ مستحب ہے)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ

ابو محمد محمد دیدار علی المفتی فی جامع اکبرآباد

---

[1] المبسوط للسرخسی: جزو ۱۴، صفحہ ۳۵، مطبوعہ بیروت

﴿فتویٰ نمبر......104﴾

سوال

ایسی شے تجارت کی جس کا نرخ بازار میں ایک قائم نہیں رہتا جیسے پارچہ یا دیگر' اور یہ ہمراہ روپیہ بارضامندیٔ خریدار' زائد قیمت پر بوعدہ کسی مدت کے' بیع جائز ہے کہ نہیں؟

۱۷ رمضان ۱۳۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اگر خریدار سے یہ معلوم کر کے ادھار خریدے گا دس روپیہ کی چیز کو گیارہ بارہ کو بیچے اور یہ کہہ بھی دے کہ نقد دس کو بیچ رہا ہوں اور وہ اس امر پر راضی ہو جائے' بلا تکلف جائز ہے۔ بوجہ پائے جانے ارکان بیع کے مع الشروط کہ وہ مبادلہ مال کا ہے بتراضی بائع و مشتری۔ البتہ اولیٰ یہی ہے نقد ادھار ایک نرخ سے بیچے۔

البتہ اس طرح بیچنا ناجائز ہے کہ کسی سے اس طرح بیع کرے کہ اگر نقد روپیہ دو گے تو میں نے تم کو یہ مال دس میں بیچا ورنہ بارہ میں چنانچہ صفحہ ۲۴۸ مشکوۃ شریف میں ہے

عن ابی ھریرۃ قال نھی رسول اللہ ﷺ عن بیعتین فی بیعۃ رواہ مالک والترمذی وابوداؤد والنسائی[1]

☆ (ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ایک بیع میں دو بیعوں کو جمع کرنے سے منع فرمایا۔ مالک' ترمذی' ابوداؤد' نسائی)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ
ابو محمد محمد دیدار علی المفتی فی جامع اکبر آباد

❁❁❁❁❁

---

[1] مشکوۃ المصابیح : صفحہ ۲۴۸ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان

﴿فتویٰ نمبر......105﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قربانی کی کھال کی قیمت قبل ذبح طے کرسکتا ہے یانہیں؟ اگر کرسکتا ہے تو کتنے دن پہلے؟

محمد اسلام خان قصبہ شمس آباد ضلع آگرہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما

بقولِ مفتیٰ بہ جو چیز پیدائشی طور سے دوسری چیز میں ملی ہوئی ہو جیسے کھال اور بال' کہ بال کھال سے اور کھال گوشت سے ملی ہوئی ہے' اس کو تاوقتیکہ باہم جدا نہ کرلے' اس کا بیچنا جائز نہیں۔ یہاں تک کہ اگر اس طرح بیچ کر اچھی طرح جدا کر کے خریدار کو دیدی جب بھی بیع فاسد غیر صحیح ہی رہتی ہے خواہ وہ قربانی کی کھال ہو۔

کما فی الدرالمختار

بیع لبن فی ضرع و لؤ لؤ فی صدف وصوف علی ظهر غنم و کذا کل مااتصاله خلقی کجلد حیوان کما مر لما انه معدوم عرفا و لو سلم الصوف او ا اللبن بعد العقدلم ینقلب صحیحا[1] فقط

☆(ترجمہ: تھنوں میں موجود دودھ' سیپی میں موجود موتی اور بھیڑ بکری کی پیٹھ پر موجود اون کی بیع فاسد ہے اور اسی طرح ہر اس شے کی بیع فاسد ہے جس کا اتصال دوسری چیز کے ساتھ پیدائشی طور پر ہو جیسے کہ جانور کی کھال جیسا کہ پہلے گذر چکا کہ یہ عرف میں معدوم شمار ہوتی ہیں' اگر بائع نے عقد بیع کے بعد اون اور دودھ خریدار کے سپرد کردیئے تب بھی یہ بیع صحیح نہیں ہوگی)

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی
ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
جامع مسجد اکبرآباد

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۷ صفحہ ۱۸۴' ۱۸۵' مطبوعہ مصر

﴿فتویٰ نمبر......106﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسلمان کلمہ گو سیندھی یعنی تاڑی (جو ایک منشی شے بمنزلہ شراب کے ہوتی ہے) بیچنے کا سرکار سے اجارہ لینا اور خود بذاتہ فروخت کرنا یا ملازملان سے فروخت کروانا اور فائدہ حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۹ شعبان ۳۶ھ

ایک عالم نے اس کی فروخت کی بابت فتوی دے دیا ہے اور فرماتے ہیں کہ گنے کا رس بیچنا اور اس سے فائدہ اٹھانا عوام کا طریقہ ہے۔ اسی طرح درخت سیندھی یعنی کھجور کا رس المعروف تاڑی کے بیچنے میں بھی کسی قسم کا حرج نہیں۔ کیوں کہ جس زمین میں یہ درخت ہوتے ہیں وہ زمین تو رکی رہتی ہے اور اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا اور سرکاری محصول دینا پڑتا ہے۔ اس لئے اس کا بدلہ اس طریق سے حاصل ہوسکتا ہے۔

لہٰذا اس عالم کا کہنا صحیح ہے یا غلط اور اگر غلط ہے تو ایسا فتوی دینے والے اور اس پر عمل کرنے والے کی بابت شریعت میں کیا حکم ہے؟ بحوالہ عباراتِ کتب مفصل تحریر فرما کر اعزاز فرمائیں اور اجرِ عظیم کمائیں۔

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

☆ سنا جاتا ہے کہ علی الصباح جب جاڑوں میں برتن تاڑی کا درخت سے کھولا جاتا ہے اس میں نشہ نہیں ہوتا اور کچھ دیر بعد اس میں نشہ آتا ہے لہٰذا جس شخص کو بیچی جائے اگر وہ کافر ہے اور تاڑی میں ابھی نشہ بھی نہیں آیا ہے مگر یہ معلوم ہے کہ یہ نشہ کے واسطے خریدتا ہے تو بعض کے نزدیک اس سے بیچ کر قیمت لینا جائز ہے اور بعض کے نزدیک مکروہ تحریمہ ہے اور مسلمان سے بیع کی جائے اور یہ علم ہو کہ نشہ کی غرض سے خریدتا ہے باتفاق مکروہ تحریمہ بلکہ امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک تو حرام ہے۔

چنانچہ صفحہ ۲۷۶ جلد خامس باب الخطر والاباحۃ درمختار میں ہے:

و جاز بیع عصیر عنب ممن یعلم انه یتخذه خمرا لان المعصیة لا تقوم بعینه بل بعد تغیره و قیل یکره لاعانته علی المعصیة و نقل المصنف من السراج والمشکلات ان قوله ممن ای من کافر اما بیعه من المسلم فیکره و مثله فی الجوهرة والباقانی وغیرهما وزاد القهستانی معزیا للخانیة انه یکره بالاتفاق[1]

(ترجمہ: انگور کارس اس شخص کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے جو اسے شراب بنائے گا۔ کیوں کہ گناہ اس کی ذات کے ساتھ قائم نہیں ہے بلکہ اس میں تبدیلی آچکنے کے بعد جو شراب حاصل ہوگی اس کے ساتھ گناہ قائم ہوگا۔ بعض علمائے کرام نے فرمایا کہ ایسا کرنا مکروہ ہے کیوں کہ اس میں گناہ پر اعانت ہوتی ہے۔ حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے السراج اور المشکلات سے نقل فرمایا کہ قولہ اس شخص کے ہاتھ فروخت کرنا اس سے مراد کافر ہے۔ مسلمان کے ہاتھ اسے فروخت کرنا مکروہ ہے جوہرہ' باقانی وغیرہ میں اسی طرح ہے قہستانی خانیہ کی طرف منسوب کرکے یہ اضافہ فرمایا کہ یہ بالاتفاق مکروہ ہے)

و ایضا فی الدر المختار فی صفحة ۲۳۷

کل مکروه ای کراهة تحریم حرام ای کالحرام فی العقوبة بالنار عند محمد و اما المکروه کراهة تنزیه فالی الحل اقرب اتفاقا عندهما وهو الصحیح المختار. و مثله البدعة والشبهة الی الحرام اقرب فالمکروه تحریما نسبته الحرام کنسبته الواجب الی الفرض فیثبت بما یثبت به الواجب یعنی بظنی الثبوت و یاثم بارتکابه کما یاثم بترک الواجب[2]

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۹ صفحہ ۲۷۶' ۲۷۷ مطبوعه احیاء التراث العربی بیروت

[2] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۹ صفحہ ۲۰۹ مطبوعه احیاء التراث العربی بیروت

(ترجمہ: ہر مکروہ یعنی جس میں کراہت تحریمی پائی جائے حرام ہوتا ہے۔ یعنی وہ دوزخ میں سزا کے اعتبار سے حرام کی مانند ہے۔ یہ حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے۔ لیکن وہ مکروہ جس میں کراہت تنزیہی پائی جائے وہ بالاتفاق حلال کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ حضرات شیخین رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک اور یہی صحیح اور پسندیدہ قول ہے اور اس کی مثال بدعت ہے شبہ حرام کے زیادہ قریب ہے۔ مکروہ تحریمی کی نسبت حرام کے ساتھ اس نسبت کی مانند ہے جو واجب کو فرض سے ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ اسی طرح کی دلیل شرعی سے ثابت ہوگا جس سے واجب ثابت ہوتا ہے۔ یعنی ظنی الثبوت دلیل سے ثابت ہوگا۔ اور اس کے ارتکاب سے آدمی اسی طرح گناہ گار ہوگا جس طرح کے واجب کے ترک کرنے سے گناہ گار ہوتا ہے)۔

قال الشامی:

قولہ ای کراھۃ تحریم وھی المرادۃ عند الاطلاق کما فی الشرح و قیدہ بما اذا کان فی باب الحظر والاباحۃ الخ بیری۔[1]

ترجمہ: قولہ: مکروہ تحریمی اور جب مکروہ بولا جائے اور اس کے ساتھ کوئی قید نہ ہو تو پھر یہی مراد ہوتا ہے جیسا کہ شرح میں ہے اور اسی میں ہے یہ حکم اس وقت ہے جب کہ یہ لفظ باب الحظر والاباحہ میں ہو)

اور ظاہر ہے کہ روایتِ مذکورہ میں کراہتِ مطلقہ ہے اور روایتِ مذکورہ روایت باب الحظر والاباحۃ کی بھی ہے۔ لہٰذا روایتِ مذکورہ میں مراد کراہت سے امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک حرمت مراد ہے۔ اور بقول شیخین کراہتِ تحریمہ۔ واللہ اعلم و علمہ احکم

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

[1] رد المحتار: جلد ۹ صفحہ ۴۰۹ مطبوعہ احیاء التراث العربی بیروت

﴿فتویٰ نمبر......107﴾

سوال

گزارش یہ ہے کہ لوکل ایجنٹی کا سرمایہ جو بنک بنگال میں بلا سود جمع ہو رہا ہے اس کا زرسود رائیگان جاتا ہے۔ اب بوجہ اشد ضرورتِ تعلیمِ انگریزی اطفالِ مسلمانان آگرہ یہ درخواست ہے کہ وہ رقمِ سود مسلم ہائی اسکول آگرہ کو دے دی جائے جو بمقابلہ ضائع و بیکار ہونے کے اس طور پر صرف میں آ جانا قرینِ مصلحت ہے۔ یہ بھی التماس ہے کہ اگر فتویٰ لیا جانا ضرور ہو تو ہم سے طلب کیا جائے۔

حسبِ استفسارِ ممبرانِ لوکل کمیٹی خصوصاً بیری خان صاحب وڈپٹی عبدالغفار خان صاحب

سائل: فخر الدین، سید محمد علی ممبران کمیٹی ہائی سکول اسلامیہ آگرہ ۸ جون ۱۹۱۶ء

الجواب

بسم الله الرحمن الرحيم.

اللهم رب زدنی علما

☆ بقولِ مختار ہندوستان دار الحرب نہیں ہے اور نصِ قرآنی صراحتاً ناطق ہے۔

قال الله تعالیٰ:

احل الله البيع و حرم الربوا[1]

یعنی: اللہ نے بیع کو حلال کر دیا اور ربا یعنی بیاج کو حرام کر دیا

اور ربا کی تعریف صاحب ہدایہ اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

ان الربا هو الفضل المستحق لاحد المتعاقدين فى المعاوضة الخالى عن عوض شرط فيه ولا يعتبر الوصف لانه لا يعد تفاوتا عرفا[2].

---

[1] القرآن الحکیم سورہ: البقرہ آیت ۲۷۵

[2] الهدايه جلد ۵ صفحه ۱۸۰ مطبوعه ادارة القرآن والعلوم الاسلاميه کراچی

(ترجمہ: سود وہ زیادتی ہوتی ہے جس کا مستحق معاوضہ میں معاملہ کرنے والوں میں سے ایک ہوتا ہے۔ وہ زیادتی کسی کے عوض میں نہیں ہوتی۔ نیز وہ زیادتی معاملہ میں شرط کی گئی ہوتی ہے۔ اور معاملہ میں بدل قرار دی گئی چیزوں کے وصف کا اعتبار نہیں ہوتا کیونکہ وصف یعنی اعلیٰ ادنیٰ ہونے کا عرف عام میں اعتبار نہیں ہوتا) مگر یہ تعریف وزنی اور کیلی چیزوں میں متحقق ہوتی ہے۔ جیسا چاندی سونے اناج' مثلاً اگر کسی نے ایک روپیہ کی چاندی خریدی اور بغیر بھاؤ پوچھنے کے یا بعد پوچھنے بھاؤ کے بائع کو دس روپیہ دے دیئے۔ اور اس نے بغیر مانگنے مشتری کے بلاشرط کم وبیش گیارہ روپیہ بھر چاندی دیدی تو بھی یہ ایک روپیہ بھر شرعاً حقیقۃً بیاج ہے۔ اس واسطے فقہاء تحریر فرماتے ہیں کہ اگر روپیہ کے ساتھ ایک روپیہ کے پیسہ شریک کر کے خریدی جائے تو بوجہ جنس بدل جانے کے اب گیارہ روپیہ بھر چاندی حلال ہو جائے گی۔

مگر صورتِ مسئولہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ روپیہ بنک میں بلاشرط کمی بیشی امانتاً رکھا جاتا ہے یا بطریقۂ قرض دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں قطع نظر اس امر سے کہ وقف کا روپیہ متولی کہاں کہاں محفوظ رکھ سکتا ہے اور بطورِ قرض دے بھی سکتا ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ بصورتِ امانت بجز اپنی امانت کے زیادت کا ہرگز استحقاق نہیں۔ اور اگر بصورتِ قرضہ دیا جاتا ہے تو اگر بشرطِ نفع قرض دیا جاتا ہے کہ ہم علاوہ اپنے روپیہ کے وقت ادائیگی تم سے روپیہ سینکڑہ مثلاً زائد لیں گے۔ بلاشبہ وہ ایک روپیہ زائد لینا حرام ہے۔

چنانچہ درمختار میں ہے:

☆ و فی الاشباہ ☆ کل قرض جر نفعا فھو حرام[1]

(ترجمہ: الاشباہ میں ہے ہر قرض جو نفع لائے وہ حرام ہے)

قال الشامی رحمۃ اللہ علیہ فی صفحہ ۱۰۴ من الجزء الرابع لرد المحتار

قولہ کل قرض ای اذا کان مشروطا کما علم مما نقلہ عن البحر و عن الخلاصۃ[2]۔

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۷ صفحہ ۲۹۸ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

[2] رد المحتار جلد ۷ صفحہ ۲۹۸ دار احیاء التراث العربی بیروت

(ترجمہ: قولہ: ہر قرض یعنی جب کہ نفع قرض لینے دینے میں شرط ہو جس طرح کہ البحر الرائق اور خلاصہ کی نقل کردہ عبارت سے معلوم ہوا ہے)

اور اگر وقت قرض دینے کے نفع کی شرط نہ لفظاً تھی نہ عرفاً اور وقت ادائیگی قرضدار بطریق جزائے احسان

کے کچھ زائد دیدے اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

کما فی الشامی فی الصفحة المذکورة :

و فی الذخیرة و ان لم تکن النفع مشروطا فی القرض فعلی قول الکرخی لاباس به[1]

(ترجمہ: اور ذخیرہ میں ہے کہ اگر نفع لینے دینے کی شرط قرض میں نہ ہو، تو امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق اس نفع لینے دینے میں کوئی حرج نہیں ہے)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی المجددی
جامع مسجد اکبرآباد

❁❁❁❁❁

[1] رد المحتار جلد ۷ صفحہ ۲۹۸ دار احیاء التراث العربی بیروت

﴿فتوی نمبر......108﴾

سوال

ایک شخص نے ایک روپیہ ایک ماہ کے وعدہ پر قرض لیا اور وعدہ کیا کہ ایک روپیہ اور دس بابا کے سیر گیہوں زائد دوں گا تو جائز ہے یا نہیں۔ اس کو دیہات میں روپ کہتے ہیں۔ جاہل لوگ منسوب بہ سود کرتے ہیں۔ اس کا جواب مشرح معہ حوالہ کتب مرقوم ہو۔

سائل: مولوی علاء الدین
نگلہ پرنگلہ حسن ضلع کھیڑی اودھ
۲۲ فروری ۱۹۱۶ء

الجواب

روپیہ قرض اس شرط پر دیا کہ اس کی واپسی پر اس قدر گیہوں یا پیسے (زوائد) ملیں گے شرعاً جائز نہیں۔ کیوں کہ قرض میں شرط منافع کی کرنا سود میں داخل ہے۔

☆ **کل قرض جر نفعا فهور باما[1]**

(ترجمہ: ہر قرض جو نفع لائے وہ سود ہے)

درمختار میں ہے:

فلو شری عشرة دراهم فضة لعشرةدراهم وزاده دانقا ان وهبه منه انعدم الربا و لم يفسد الشراء[2].

(ترجمہ: اگر دس درہم کے بدلے دس درہم چاندی خریدی اور ایک دانق زائد دیا اگر وہ دانق دینے والے نے

---

[1] الجامع الصغیر مع شرح فیض القدیر جلد ۵ صفحہ ۲۸ مطبوعه دار المعرفه بیروت

[2] الدر المختار علی هامش رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۱۹۶ مطبوعه مکتبه رشیدیه کوئٹه

ہبہ کردیا تو ربا ختم ہوگیا اور وہ بیع فاسد نہ ہوئی)

فلو مشروطا وجب رده[1] .

(ترجمہ: اگر ایک دانق بیع میں بطور شرط شامل ہو تو اس کا واپس کرنا واجب ہے)

جس کا حاصل یہ ہے کہ بغیر شرط' قرض کی واپسی کے وقت کچھ زائد سلوک کر دے تو جائز ہے مگر قرض لیتے وقت یہ شرط نہ کرے ورنہ سود ہوگا۔

کتبہ المفتی السید محمد اعظم غفرلہ

❁❁❁❁❁

---

[1] رد المحتار حاشیہ در مختار جلد ۴ صفحہ ۱۹۶ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر......109﴾

سوال

ایک مسلمان متوفی پر ایک ہندو ساہوکار کا ڈیڑھ صد روپیہ قرض ہے۔ من جملہ اوراس کے (ایک سو روپیہ) اصلی اور ۵۰ روپے سود کا ہے۔ وارث متوفی کے اصل روپیہ دینا چاہیں تو کیا سود کا مواخذہ قرض دار متوفی پر آخرت میں ہوگا یا وہ شرعاً ناجائز سمجھا جائے گا؟ کیوں کہ سود لینا دینا کسی حالت میں جائز نہیں ہے۔

۱۷ رمضان ۱۳۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

حتی المقدور سود کا نہ دینا بہتر بلکہ ضروری ہے اس میں کوئی مواخذہ شرعی نہیں ہے۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ

ابو محمد محمد دیدار علی المفتی فی جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......110﴾

سوال

بیع سلم یعنی لانے کرنا ایک روپیہ دے کر ایک من گیہوں لینا از روئے شرع جائز ہے اور بیع سلم کس طرح شرع میں جائز ہے۔

سائل: مولوی علاء الدین نگلہ
پرگنہ نگہ حسن ضلع کھیڑی اودھ
۲۲ فروری ۱۹۱۶ء

الجواب

بیع سلم جس کو لانے کہتے ہیں اس میں ضرور ہے کہ اول قسم اس چیز کی جس کی قیمت مقرر کرے پھر اس کا نرخ پھر اس کی جگہ پھر اس کا وقت کہ فلاں ماہ۔ پس یہ بیع سلم جائز ہے۔ نرخ کی کمی بیشی بائع مشتری کی رضامندی پر ہے۔ مگر اس قدر زیادتی شرعاً مکروہ ہوگی۔

کتبہ: السید المفتی محمد اعظم غفرلہ

﴿فتوی نمبر...... 111﴾

سوال

بجائے ایک من جونخود کے ایک من غلہ بوعدہ کسی مدت کے لینا درست یا نہیں؟

۱۷ رمضان ۱۳۳۶ھ

الجواب

باب ربا میں قاعدہ کلیہ یہ ہے جب ثمن اور مبیع ایک جنس ہوں جیسے چاندی چاندی کے ساتھ خریدی جائے یا سونا سونے کے ساتھ خریدا جائے خواہ ایک طرف کھوٹا ہو اور دوسری طرف (کھرا) علی ھذا سکہ دار، بے سکہ کے عوض خریدا جائے یا بے سکہ دار (کے)' خواہ دونوں طرف کھرا مال ہو۔ علی ھذا جیسے گیہوں' گیہوں کے ساتھ خریدے جائیں تو اس صورت میں برابر برابر خریدنا جائز ہے اور دست بدست۔ اگر ایک چاول کی بھی زیادتی کمی ہوگی بیع حرام ہو جائے گی اور وہ کمی زیادتی داخل (ربا) ہوگی۔ اور اگر قیمت لے کر چاندی دکان کے اندر سے ہی نکال کر دے گا اتنی دیر کرنا بھی حرام ہوگا۔

اور اگر جنس بدل جائے مثلاً جو کے ساتھ چنے خریدے جائیں مثلِ صورتِ مسئولہ کے تو زیادتی کمی بلاشبہ حلال ہے مثلاً من جو کے عوض دو من چنے خریدنا جائز ہے۔ مگر ادھار خریدنا۔ اگر برابر برابر خریدے مطلقاً حرام ہے۔ اس واسطے کہ دونوں ایک طریق سے تول کر لیے دیئے جاتے ہیں۔ البتہ اگر تول بھی بدل جائے مثلاً چنے کا عرف پائلی وغیرہ کے پیمانہ کے انداز سے بیچنے کا کہیں عرف ہو اور جو ترازو سے تول کر دیئے لیے جائیں تو ایسی جگہ من جو دو من اور تین من بھر چنوں کے عوض ادھار بھی بیچنا جائز ہو جائے گا۔ اور اگر چنے مکئی باجرہ وغیرہ کا انداز تول سے اگر عرف ہوگا وزنی سمجھا جائیں گی اور اگر عرفاً کیل یعنی پائلی وغیرہ میں بھر کر بیچنے کا ہوگا کیلی سمجھے۔ مگر جو گیہوں ہمیشہ خواہ عرفاً کیل سے بکیں یا تول سے ہمیشہ کیلی ہی سمجھی جائے گی۔ لہٰذا اگر کہیں جو تول سے بکتے ہوں اور چنے کیل سے تو چونکہ جو ہمیشہ کیلی ہی سمجھے جاتے ہیں لہٰذا کیلی کا کیلی کے ساتھ اندریں صورت ادھار خریدنا مثلاً چنوں کا ایسی جگہ جو کے ساتھ ادھا خریدنا قطعاً ناجائز ہوگا اور اگر دست

بدست خریدا جائے بوجہ بدل جانے جنس کے من جو کے عوض دو من چنے یا گیہوں لینا مثلا جائز ہوگا۔ چنانچہ ہدایہ مذکور میں ہے۔

و اذا عدم الوصفان الجنس والمعنى المضموم اليه حل التفاضل والنساء لعدم العلة المحرمة والاصل فيه الاباحة واذا وجدا حرم التفاضل و النساء لو جو دا العلة واذا وجد احدهما و عدم الاخر حل التفاضل و حرم النساء[1]

(ترجمہ: اگر دونوں وصف معدوم ہوں یعنی جنس اور قدر تو ان میں باہمی کمی بیشی سے بیچنا بھی جائز ہے اور اگر ادھار ہو تو بھی جائز ہے۔ کیونکہ حرام ٹھہرانے والی علت موجود نہیں اور اصل اس میں اباحت ہے۔ اور جب یہ دونوں وصف یعنی قدر اور جنس پائے جائیں تو زیادتی اور ادھار دونوں حرام ہیں کیونکہ حرمت کی علت موجود ہے۔ اور جب ایک وصف موجود ہو اور دوسرا معدوم ہو تو زیادتی جائز ہے لیکن ادھار حرام ہے)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ
ابو محمد محمد دیدار علی المفتی
فی جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[1] الهدايه : جلد ۳، صفحه ۱۸۲ ادارة القرآن والعلوم الاسلاميه كراچی

حجر

﴿فتوی نمبر......112﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ

(۱) سات یا آٹھ برس کی لڑکی کے معاف کرنے سے مہر معاف ہوسکتا ہے؟

(۲) اگر اس کا باپ مہر معاف کردے معاف ہوسکتا ہے یا باپ کے معاف کرنے سے بھی معاف نہیں ہوسکتا؟

(۳) اگر نابالغہ کا شوہر مرجائے ایامِ عدت اپنے سسرال میں شوہر کے گھر ہی پورے کرے یا اپنے میکے میں بھی ایامِ عدت پورا کرسکتی ہے؟

(۴) اپنے جہیز کی وہ خود مالک ہے یا شوہر متوفی یا اس کے ماں باپ اگر شوہر مرجائے؟

(۵) اس نابالغہ کے نکاح کا ولی اس کا باپ ہے یا اس لڑکی کے سسرال والے؟

عبدالرحمٰن امام مسجد باندی کوئی

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

☆ نابالغہ لڑکی کا مہر معاف کردینا یا اپنی کسی چیز کا ہبہ کردینا قابلِ اعتبار نہیں۔ لہٰذا جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے مہر معاف نہیں کرسکتی۔ اور وہ بھی جب معاف ہوگا جب خوشی سے معاف کرے۔ اور اگر مار کے خوف سے معاف کردے ہرگز معاف نہ ہوگا۔ ☆ اور نابالغہ کی طرف سے اس کا ولی جو باپ ہے اگر وہ معاف کردے جب بھی معاف نہیں ہوسکتا۔ ☆ نابالغہ کے مال سے ولی کو ہبہ کردینے اور معافی وغیرہ کا ہرگز اعتبار نہیں ہوتا۔

چنانچہ صفحہ ۳۶۶ جلد دوم درمختار مصری مطبوعہ مع ردالمختار میں ہے:۔

و صح حطها[1]

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۲ صفحه ۳۶۶ مکتبه رشیدیه کوئٹه

(ترجمہ: عورت کے لیے مہر کا ساقط کرنا درست ہے)

قال الشامی رحمة الله:

(قولہ وصح حطها) الحط الاسقاط کما فی المغرب و قید بحطها لان حط أبیها غیر صحیح لو صغیرة و لو کبیرة توقف علی اجازتها ولا بد من رضاها ففی هبة الخلاصة خوفها بضرب حتی وهبت مهر لم یصح لو قادرا علی الضرب[1] الخ

(ترجمہ: قولہ: عورت کے لیے مہر کو ساقط کرنا درست ہے۔ "حط" کا معنی ساقط کرنا ہے۔ جیسا کہ مغرب میں ہے۔ مہر کے ساقط کرنے کو عورت کے ساتھ خاص رکھا کیوں کہ اس کے باپ کے لیے ساقط کرنا صحیح نہیں ہے۔ اگر وہ کم سن ہو۔ اور اگر عورت بڑی (بالغہ) ہو تو ساقط کرنا عورت کی اجازت پر موقوف ہوگا۔ مہر کے ساقط کرنے میں عورت کی رضامندی ضروری ہے۔ خلاصہ کی کتاب الھبہ میں ہے اگر مار نے دھمکی دی حتی کہ عورت نے مہر ہبہ کر دیا۔ اس صورت میں اگر دھمکی دینے والا مارنے پر قادر ہو تو اس کا ساقط کرنا درست نہیں)

اور دعویٰ مہر 'نابالغہ کی طرف سے 'نابالغہ کا ولیِ اقرب' جو اس کا ولی نکاح ہے وہی کر سکتا ہے۔

نابالغہ پر چار مہینہ دس روز تک کسی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ چار مہینے دس روز عدت بیٹھنا اس پر بھی لازم ہے۔ چنانچہ صفحہ ۶۵۵ درمختار مذکور میں ہے۔

والعدة للموت اربعة اشهر و عشرا بشرط بقاء النکاح صحیحا الی الموت و لو صغیرة[2]

(ترجمہ: خاوند کے مرنے کی صورت میں عدت چار ماہ اور دس روز ہے۔ اس عدت کی شرط یہ ہے کہ موت تک نکاح صحیح رہے۔ اگرچہ عورت کم سن ہو)

مگر صغیرہ پر چار مہینے دس روز کا سوگ کرنا لازم نہیں چنانچہ صفحہ ۱۷ جلد دوم درمختار مذکور میں ہے:

---

[1] رد المحتار: جلد ۲ صفحہ ۳۶۶ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

[2] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۲ صفحہ ۳۶۶، ۳۶۷ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

و لا حداد علی سبعة کافرة و صغيرة ومجنونة[1] الخ

☆(ترجمہ: سات عورتوں پر سوگ منانا لازم نہیں ہے۔(۱) کافرہ (۲) نابالغہ (۳) پاگل الخ)

☆ اس واسطے کہ سوگ عبارت ہے ترک زیب وزینت سے' جو سرمہ لگانا خوشبودار تیل اور مہندی لگانا ہے اور زعفرانی کپڑے پہننا۔اس واسطے کہ بوجہ عدمِ بلوغ' وہ مخاطبہ' حقوق اللہ نہیں ہے۔اور سوگ حق اللہ ہے چنانچہ ہدایہ صفحہ ۴۰۶ مطبوعہ مطبع یوسفی میں ہے:

والحداد ان تترک الطيب والزينة والكحل والدهن المطيب وغير المطيب من عذر و فی جامع الصغير الامن وجع ولا تختضب بالحناء لما روينا ولا تلبس ثوبا مصبوغا بالعصفر ولا بزعفران ولا حداد علی کافرة ولا علی صغيرة لان الخطاب موضوع عنها[2]

☆ترجمہ: سوگ یہ ہے کہ خوشبو' زینت' سرمہ' خوشبودار تیل اور غیر خوشبودار تیل کے استعمال کو ترک کردے۔ ہاں عذر کے باعث استعمال کرسکتی ہے۔ جامع صغیر میں درد کے باعث یہ اشیاء استعمال کرسکتی ہے۔عورت سوگ کی مدت کے دوران مہندی نہ لگائے۔اس کی دلیل وہ حدیث پاک جو ہم نے روایت کردی ہے۔ نیز عصفر اور زعفران کے ساتھ رنگے ہوئے کپڑے بھی نہ پہنے۔کافر عورت کے ذمہ سوگ نہیں ہے اور نہ ہی کم سن عورت پر سوگ لازم ہے کیوں کہ شرعی احکام کا خطاب اس سے اٹھالیا گیا ہے۔)

البتہ بوجہ لازم ہونے عدت کے ایامِ عدت شوہر کے گھر میں پوری کرسکتی ہے چنانچہ صفحہ ۴۰۷ ہدایہ مذکورہ میں ہے:

وعلی المعتدة ان تعتد فی المنزل الذی يضاف اليها بالسكنی حال وقوع الفرقة والموت و ان كان نصيبها من دار الميت لا يكفيها فاخرجها الورثة من نصيبهم انتقلت لان هذا انتقال بعذر توثرفيه الاعذار وصار كما اذا خافت علی متاعها او خافت

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۲ صفحہ ٦۵۵ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

[2] الهدايه :جلد ثانی جزو ثالث ' صفحه ٣٤٦ تا ٣٤٨ مختصرا ادارة القرآن والعلوم الاسلاميه كراچی

سقوط المنزل[1]

☆(ترجمہ: عورت پر لازم ہے کہ وہ اس گھر میں عدت گذارے کہ خاوند سے فرقت اور اس کی موت کی حالت میں جس گھر کی طرف اس کی سکونت کی نسبت تھی۔ اگر مرنے والے خاوند کی وراثت سے اس کے حصہ میں آنے والا مکان اس کی سکونت کے لیے کافی نہ ہو اور ورثہ نے اس کو اپنے حصہ سے نکال دیا تو وہاں سے نکل آئے کیوں کہ یہ منتقل ہونا عذر کے باعث ہے اور عذر اس سلسلہ میں موثر ہیں۔ تو اس کا حکم اس عورت کی مانند ہو گیا جسے اپنے سامان کے ضائع ہونے کا خوف ہو یا مکان کے گر جانے کا خوف ہو)

قال العینی رحمۃ اللہ:(قوله علی متاعها) أی ذالک المنزل من سرقة او نهب[2] فقط

(ترجمہ: قولہ: اسے اپنے سامان کے ضائع ہونے کا خوف ہو یعنی اس مکان میں اسے چوری یا کسی کے چھیننے کے باعث اسے اپنے سامان کے ضائع ہونے کا خوف ہو)

صورتِ مذکورہ میں ولیِ اقرب نکاحِ صغیرہ مذکورہ کا اس کا باپ ہے اس کو بعد انقضائے عدتِ وفات جہاں مناسب سمجھے اس کے نکاح کر دینے کا اختیار ہے۔ صفحہ ۳۳۷ درمختار مذکورہ میں ہے

الولی فی النکاح العصبة بنفسه[3]

(ترجمہ: نکاح میں ولی عصبہ بنفسہ ہوتا ہے)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی

✿✿✿✿✿

---

[1] الهدایه: جلد ثانی جزو ثالث، صفحه ۳۵۰ تا ۳۵۱ مختصر ادارة القرآن والعلوم الاسلامیه کراچی

[2] (۱) حاشیه الهدایه: جلد ثانی جزو ثالث، صفحه ۳۵۱ مختصر ا، ادارة القرآن والعلوم الاسلامیه کراچی

۲ (۲) البنایه شرح الهدایة للعینی جلد ۲، صفحه ۳۳۷، ملک سنز فیصل آباد

[3] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۲ صفحه ۳۳۷ مکتبه رشیدیه کوئٹه

مضاربہ
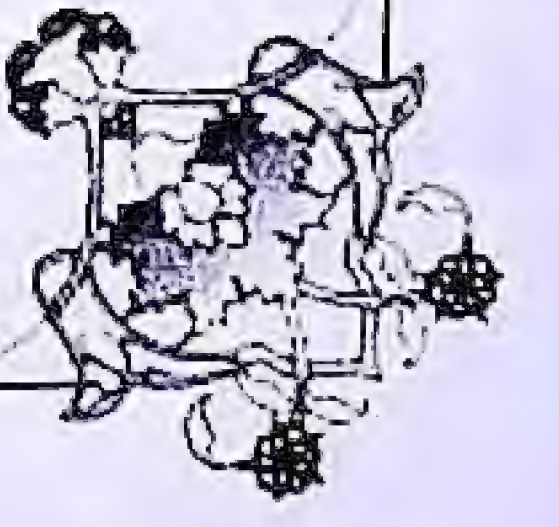
﴿فتویٰ نمبر......113﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید نے عمر کو کچھ روپیہ چند شرائط کے ساتھ دیا جن کی نقل ہم رشتہ سوال ہذا ہے۔ عمر نے اس روپیہ سے تجارت کی۔ روپیہ صرف زید کا اور کاروبارِ تجارت عمر کے متعلق تھا۔ زید نے کچھ عرصہ بعد اپنے روپیہ کی نالش کردی۔ اب یہ مقدمہ پنجاب میں منتقل ہو کر آ گیا ہے اور فریقین شرعی فیصلہ پر راضی ہیں۔

دریافت طلب یہ امر ہے کہ اس شرائط نامہ کے بموجب یہ قرض تھا یا شرکت؟ اور شرکت تھی تو کون سی قسم کی؟ اور تجارت کے نفع نقصان میں دونوں بہ حصہ مساوی شریک ہوں گے یا اس کا بار صرف زید پر یا صرف عمر پر پڑے گا؟ اور مالِ موجودہ یا جو روپیہ قرض میں ہے وہ کس کا خیال کیا جائے گا؟ بدیں صورت اپنے کل روپیہ پانے کا عمر سے مستحق ہے یا بعض کا؟

نقلِ شرائط نامہ دستخطی فریقین مورخہ ۲ جنوری ۱۳ء

جناب من بعد ادائے آداب کے التماس آپ کی خدمت بابرکت میں یہ ہے مجھ کو جناب کے ارشاد کی تعمیل بسر وچشم منظور ہے مگر بشرطِ ذیل

اول یہ کہ بعد ایک سال کے منافعہ لینا ہوگا۔

دوسرے یہ کہ کل اخراجات دوکان کے نفع نقصان میں شریک ہونا ہوگا۔

تیسرے یہ کہ اگر جناب کو علیحدگی منظور ہو تو پیشتر چھ مہینہ کے اطلاع دیجئے گا۔ وہ روپیہ بعد منہائی نفع ونقصان کے جو باقی رہے گا دیا جائے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ مال دے دیا جائے وہ نہیں دیا جائے گا۔ روپیہ بتدریج دیا جائے گا۔

چوتھے یہ کہ میری تجارت میں آپ دست انداز نہ ہوں گے۔ مجھ کو اپنی رائے پر کام کرنا ہوگا۔ فقط دستخط عمر

بینو ا تو جروا
سائل: حکیم سید عرفان علی

الجواب

اللهم رب زدنی علما.

صورت مسئولہ میں حسبِ شروط ہم رشتہء سوال عقدِ مضاربۃ صحیح ہے۔ اس واسطے کہ بموجب عرف شرطِ دوم کا یہی مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ نفع میں شرکت حصہ برابر کے بالنصف رہے گی۔ اور شرطِ شرکتِ نقصان وغیرہ اگرچہ خود باطل ہیں مگر صحتِ مضاربۃ میں ہرگز حارج نہیں۔

کما فی الجزا الخامس فی البحر فی صفحة ۲۶۴

الخامس ان یکون نصیب کل منهما معلوما فکل شرط یودی الی جهالة الربح فهی فاسدة و مالا فلا. مثل ان یشترط ان یکون الوضعیة علی المضارب او علیهما فهی صحیحة و هو باطل[۱]

☆ (ترجمہ: مضاربہ کے صحیح ہونے کی پانچویں شرط یہ ہے کہ مال کے مالک اور کام کرنے والے میں سے ہر ایک کا حصہ نفع سے معلوم ہو۔ ☆ لہٰذا ہر وہ شرط جس سے نفع کا حصہ مجہول ہوجائے اس سے مضاربہ فاسد ہوجائے گی اور جس شرط سے نفع کا حصہ مجہول نہ ہو مضاربہ صحیح رہے گی۔ ☆ مثلا یہ شرط لگائی کہ نقصان مضارب پر ہوگا یا دونوں کے ذمہ ہوگا تو مضاربہ صحیح ہے اور شرط باطل ہے)

و فی العالم گیریة

کل شرط یوجب جهالة الربح او قطع الشرکة فی الربح یوجب فساد المضاربة و ما لا یوجب شیئا من ذلک لا یوجب فسادها. نحو ان یشترط ان یکون الوضیعة علیهما کذا فی الذخیرة.[۲]

(ترجمہ: ہر وہ شرط جس سے نفع کا مجہول ہونا یا نفع میں دونوں کی شراکت کا خاتمہ لازم آئے وہ مضاربہ کے فساد کا

---

[۱] البحر الرائق شرح کنز الدقائق: جلد ۷ صفحہ ۲۶۴ دار المعرفہ بیروت

[۲] الفتاوی العالم گیریہ جلد ۴ صفحہ ۲۸۸ مطبوعہ مصر

باعث ہوتی ہے اور جس شرط سے یہ لازم نہ آئے وہ مضاربہ کے فساد کا باعث نہیں ہوتی مثلاً یوں شرط لگائی کہ نقصان دونوں پر تقسیم ہوگا)

اور جب شرعاً بشروطِ مذکورہ مضاربہ صحیح ہے اور بموجبِ عرفِ عام شرط دوم سے آدھے نفع میں زید وعمر کا شریک ہونا ظاہر ہے اور نیز فتاوی عالمگیریہ میں ہے۔

و لو قال رب المال للمضارب علی ان ما زرق الله من الربح بیننا جاز او یکون الربح بینهما سواء. ؎۱

(ترجمہ: مضاربہ میں مال کے مالک نے مضارب (کام کرنے والے) کو کہا کہ ہماری مضاربہ اس شرط پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ نفع عطا فرمایا وہ ہمارے درمیان ہوگا یا کہا کہ نفع دونوں کے درمیان برابر تقسیم ہوگا۔ تو عقد مضاربہ جائز اور درست ہے)

زید اپنے مال کا مع نفع کے نصف کا مستحق ہے۔ علی ھذا عمر کل نفع سے نصف کا حقدار۔ اور اگر نفع کچھ بھی نہیں ہوا تو عمر کو کچھ نہیں ملے گا **کما فی العالم گیریة**

و لو کانت (الی المضاربة) صحیحة فلم یربح المضارب لا شیء له ؎۲

☆ (ترجمہ: اگر مضاربہ درست ہو اور مضارب کو کوئی نفع حاصل نہ ہو تو اسے کچھ نہیں ملے گا)

اور اگر زمانہ مضاربہ میں اول نفع ہو اور آخر زمانہ راس المال کچھ کم ہو جائے تو اول نفع سے راس المال پورا کر دیا جائے گا۔ بعدہ جو کچھ زائد راس المال سے بچے گا وہ باہم تقسیم ہو جائے گا۔

اور اگر بعد پورا کر دینے کے نفع سے کچھ نہ بچے تو مضارب کو کچھ نہیں ملے گا اور باوصف نفع سے راس المال پورا کرنے کے بھی نقصان راس المال پورا نہ ہو تو مضارب سے کچھ نہ لیا جائے گا۔

کما فی الکنز.

؎۱ الفتاوی العالم گیریه جلد ۴ صفحه ۲۸۸ مطبوعه مصر

؎۲ الفتاوی العالم گیریه جلد ۴ صفحه ۲۸۸ مطبوعه مصر

و ماهلک من المضاربة فمن الربح فان زاد الهالک علی الربح لم یضمن المضارب[1] .

☆(ترجمہ: مضاربہ کے عقد کے بعد جو کچھ مال ضائع ہوگا وہ نفع سے پورا کیا جائے گا۔اور اگر نقصان نفع سے زیادہ ہوتو اس کا ضامن مضارب نہیں بلکہ وہ اصل زر سے پورا کیا جائے گا)

حررہ :العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی

محمد دیدار علی الرضوی مفتی

جامع مسجد اکبرآباد

[1] کنز الدقائق علی ھامش البحر الرائق: جلد ۷ ،صفحہ ۲۶۸ دار المعرفه بیروت

وکالت

﴿فتویٰ نمبر......114﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ میں ملازم حاجی اکرم الٰہی محمد انوار الٰہی صاحب سوداگرانِ جفت کے ہاں تقریباً چار سال سے ہوں۔ اور تمام کاروبار کی خرید وفروخت میرے ہاتھ سے ہے۔ اب مالکان نے حکم کیا کہ تم اطراف سے روپیہ وصول کرلاؤ۔ چنانچہ بحکم ان کے واسطہ روپیہ وصول یابی کے گیا۔ اور چلتے وقت ایک زنجیر دی گئی تھی کہ اس کو لگانا اور جو روپیہ وصول ہو روانہ کرنا۔ چنانچہ جو روپیہ وصول ہوتا گیا یعنی بریلی سے بذریعہ رجسٹری روانہ کردیا اور مرادآباد سے ایک شخص آنے والا تھا ان کو دے دیا۔ اب نگینہ اور نجیب آباد سے قریبا 260 روپیہ کے وصول ہوئے۔ وہاں پر سے وقت نہ ملا روانہ کرنے کا۔ اور نہ نوٹ گاڑی کے وقت سے پہلے دستیاب ہوئے۔ وہاں پر سے سہارن پور پہنچا قریبا 8 بجے شب کے۔ اتفاق سے مالکان کا لڑکا ارشاد الٰہی صاحب وہاں پر مل گئے۔ اب خیال ہوا کہ یہ بھی روپیہ وصول کرنے کو آئے ہیں۔ اگر یہ ہمراہ چلے تو روپیہ کم وصول ہوگا۔ اس وجہ سے اس گاڑی سے چلنا خیال کیا۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ یہ جائے گا تو خود کہنے لگے کہ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ میں نے بہت انکار کیا کہ آپ نہ جائیں۔ اگر آپ جائیں گے تو ہم بھی صبح چلیں گے۔ چونکہ یکہ وغیرہ آگیا تھا اور چلنے کا ارادہ بھی کر چکے تھے اس وجہ سے انہوں نے کہا اب چلو۔ کل مظفر نگر اور میرٹھ ہوکر دہلی پہنچیں گے۔ میں ہمراہ ہوگیا۔ اور ٹکٹ مظفر نگر کا لیا۔ اور ہم دونوں مظفر نگر نہ اتر سکے۔ غنودگی آگئی۔ اور آگے اسٹیشن پر اٹھ کر معلوم کیا تو معلوم ہوا کہ مظفر نگر اسٹیشن پیچھے رہ گیا۔ آپس میں اب رائے (یہ ٹھہری) کہ صبح میرٹھ ہوکر پھر مظفر نگر آجائیں گے۔ گاڑی میں چل دیئے۔ ہم نے بموجب حکم کے زنجیر سے صندوق کو باندھ رکھا تھا۔ اور باحفاظت اوپر سر کے رکھا تھا سیٹ پر۔ اور اچھی طرح بیٹھ گئے کہ ایسا نہ ہو کہ میرٹھ بھی نکل جائے ہم دونوں سوتے رہ جائیں۔ آخرش زیں وجہ پان کھایا اور تمباکو پان میں زائد کھایا کہ غنودگی نہ آئے۔ مگر خدا کی قدرت کہ چھاؤنی میرٹھ پر ہم نے اٹھ کر صندوق کو دیکھا۔ اور بستر لپیٹ لیا کہ آگے اتریں گے۔ کھڑکی پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ اور بھائی ارشاد الٰہی جو کہ ہمراہ تھے وہ بھی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ہم دونوں گفتگو

ہی کر رہے تھے کہ آگے اتریں گے۔ گاڑی چھاؤنی میرٹھ کے چل جانے پر ہم جاگتے رہے۔ اب جب کہ شہر میرٹھ پر گاڑی ٹھہرنے پر میرٹھ شہر کے جب کہ مسافر اترتے تھے ہم غنودگی سے گھبرا کر اٹھے۔ اور بھائی ارشاد الٰہی صاحب کو اٹھایا۔ اور کہا کہ شہر میرٹھ آ گیا۔ اترو۔ اب اترتے وقت سامان اٹھانا چاہا اور ادھر نظر کی تو اسٹیل بکس نہ پایا جن میں مبلغ 260 روپیہ مالک کے اور کپڑے میرے موجود تھے۔ فوراً ٹکٹ کلکٹر کے پاس گیا اور اسے کہا کہ میرا اسٹیل بکس ابھی کوئی لے گیا ہے۔ آپ ٹکٹ نہ لیں جب تک میں نہ دیکھ لوں۔ انہوں نے کہا ایک شخص پلیٹ فارم ٹکٹ دے کر گیا ہے اور خالی ہاتھ آیا تھا اور ایک سٹیل بکس ہاتھ پر رکھ کر لے گیا ہے۔ اور ابھی گیا ہے دوڑ کر۔ بہت تلاش کیا۔ اور ایک داروغہ صاحب کے ہمراہ بھی مگر کسی طرح منہ نہ لگا۔ آخرش رپورٹ پولیس میں کی۔ وہ ہمراہ ہے۔ اس کو ملاحظہ کر کے جو قاعدۂ شرع ہو میرے ذمہ روپیہ ادائیگی ہو تو مطلع کریں یا اگر نا جائز ہو تو مطلع کریں۔

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

صورتِ مسئولہ سے ظاہر ہے کہ مسمی الطاف خان مستفتی امینِ روپیہ وصول شدۂ کرم الٰہی نے بموجب حکم کرم الٰہی کے اسٹیل بکس کو جس میں روپیہ امانتی وصول شدہ کرم الٰہی کا اور مستفتی کے کپڑے بھی تھے، بوقت روانگی ریل زنجیر سے سیٹ کی زنجیر کے ساتھ باندھ دیا تھا اور حکمِ مالک کے موافق حفاظت میں کسی طرح کمی نہیں کی اور بایں ہمہ وہ تلف ہو گیا اور وقتِ قیامِ ریل کوئی اس کو لے گیا۔ لہٰذا اب روپیہ کا تاوان مالکِ مال کو الطاف خاں سے شرعاً لینا درست نہیں۔

كما فى الهداية

الوديعة امانة فى يد المودع اذا هلكت لم يضمنها[1]

---

[1] الهدایہ : جلد ۳ صفحہ ۲۷۳ مکتبہ شرکت علمیہ ملتان

(ترجمہ: جس شخص کو ودیعت سپرد کی جائے اس کے قبضہ میں ودیعت امانت ہوتی ہے۔ جب وہ ضائع ہو جائے تو وہ اس کا ضامن نہ ہوگا)

البتہ اگر الطاف خان اپنے مال کی طرح یا حسبِ حکمِ مالک یعنی کرم الٰہی حفاظتِ مال نہ کرتا ضرور ضامن ہوتا۔

كما هو ظاهر من الكتب الفقهية

(جیسا کہ فقہ کی کتابوں سے ظاہر ہے)

حررہ: ابو محمد محمد دیدار علی
مفتی جامع مسجد اکبر آباد
مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۱۶ء

❁❁❁❁❁

﴿فتوی نمبر......115﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید اپنے ملازم بکر کو بغرض روپیہ وصول یابی مختلف شہروں میں بھیجتا ہے۔ اور چلتے وقت روپیہ تلف ہوجانے کے خوف سے یہ کہہ دیتا ہے کہ ہر شہر میں سے جس قدر روپیہ وصول ہو وہیں سے بھیج دینا۔ اپنے پاس روپیہ رکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ خرچ کا کچھ خیال نہ کرے اور شب کے وقت سفر نہ کرنا۔ ہر شہر میں ایسے وقت ہی روانہ ہونا جو تم دن میں دیگر شہر میں پہنچو اور ایک زنجیر بھی بکر کو دیدیتا ہے کہ اگر کوئی وقت شب کو کہیں سے چلنا ہو یا دن کے وقت تمہارا چلنے کا ارادہ ہو تو اس زنجیر کو ٹرنک اور ریل کی تپائی میں ڈال کر قفل لگا دینا تا کہ ٹرنک تلف ہونے سے محفوظ رہے۔ لیکن بکر نے کسی بات کی پرواہ نہ کی اور ٹرنک راستہ میں کھو دیا۔ چونکہ اس میں کچھ روپیہ بھی تھا وہ بھی تلف ہو گیا۔ لہٰذا اس صورت میں ان روپوں کا کون ذمہ دار ہو سکتا ہے۔

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللہ رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں بکر زید کا چونکہ ملازم ہے اور بغرض وصولیابی روپیہ مختلف شہروں میں زید کا بھیجا ہوا ہے۔ لہٰذا زید کا رسول یعنی قاصد بغرض قبض مالِ زید ہوا اور رسول بغرض وصول وقبض شرعاً امین ہوتا ہے۔

کما ھو ظاھر من روایۃ الھدایۃ

والوکیل بقبض الدین لا یکون وکیلا بالخصومۃ لانہ امین محض والقبض لیس بمبادلۃ فاشبہ الرسول[1]

---

[1] الھدایہ جلد ۳ صفحہ ۱۹۴ مطبوعہ مکتبہ شرکت علمیہ ملتان

☆(ترجمہ: قرض پر قبضہ کے لیے وکیل 'خصومت' کا وکیل نہیں ہوتا کیوں کہ وہ صرف امین ہوتا ہے۔ اور قبضہ میں مال کا مال کے ساتھ مبادلہ نہیں ہوتا تو اس کی مشابہت ایلچی سے ہوئی)

اور جب بکر شرعاً امانت دار زید کا ہے' امانت کا حکم شرعاً یہ ہے کہ اگر وہ تلف ہو جائے' امین اس کا ضامن نہیں ہوتا۔

کما فی الھدایه :

الودیعة امانة فی ید المودع اذاھلکت لم یضمنھا[1]

(ترجمہ: جس کو ودیعت کے طور پر کوئی چیز دی جائے' تو وہ چیز اس کے قبضہ میں امانت ہوتی ہے' اگر ضائع ہو جائے تو وہ اس کا ضامن نہیں ہوتا)

مگر اگر امانت دار بموجبِ حکم صاحبِ مال حفاظت نہ کرے' یا اپنے مال کی طرح اس کی حفاظت نہ کرے' اور اس وجہ سے تلف ہو جائے' جیسا کہ صورتِ مسئولہ سے ظاہر ہے' ضرور ضامن ہوگا۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں بکر ضرور مالِ تلف شدۂ زید کا ضامن ہوگا۔ اس واسطے کہ ہدایہ میں ہے

واذا نھاہ المودع ان یخرج بالودیعة فخرج بھا ضمن لان التقیید مفید اذا لحفظ فی المصر ابلغ فکان صحیحا[2]

(ترجمہ: ودیعت دینے والے نے' وصول کرنے والے' کو اس ودیعت کے ساتھ سفر کرنے سے منع کیا۔ اس نے اس کے ساتھ سفر کیا تو ضائع ہونے کی صورت میں وہ ضامن ہوگا۔ کیوں کہ ایسی قید لگانے کا فائدہ ہوتا ہے ۔اس لیے کہ شہر میں حفاظت بہتر ہو سکتی ہے تو یہ قید لگانا درست ہے)

حررہ : العبدالعاصی

محمد دیدار علی' مفتی مسجد جامع اکبر آباد ۲۲ ستمبر ۱۹۱۶ء

---

[1] الھدایه جلد ۳ صفحه ۲۷۲ مطبوعه شرکت علمیه ملتان

[2] الھدایه جلد ۳ صفحه ۲۷۳ مطبوعه مکتبه شرکت علمیه ملتان

حاشیہ
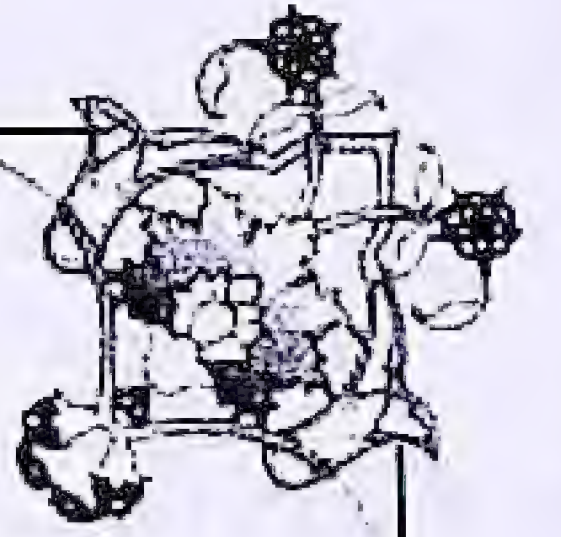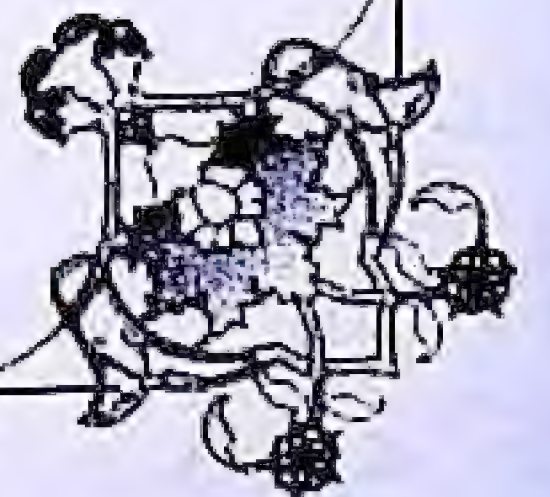
﴿فتویٰ نمبر......116﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نے اپنی جائدادِ مملوکہ جو بذریعہ مہر اور بطریقِ میراث کے اپنی والدہ کی طرف سے حاصل کی تھی، ان کو اپنی دو لڑکیوں پر جو نابالغ تھیں، ھبہ کر دیا اور ھبہ نامہ بھی لکھ دیا۔ مگر باوجود موجودگی ولیِ اقرب کے، جو ان کا باپ ہے اور اب تک موجود ہے جس کی مہدِ تربیت میں وہ دونوں لڑکیاں پرورش پا رہی ہیں۔ اور ان کا کفیلِ نان ونفقہ بجز باپ کے اور کوئی نہ تھا۔ خود ہی ہندہ قابض ومتصرف جائدادِ مذکورہ پر رہی۔ اور اب تک اس جائداد پر قابض ومتصرف ہے۔ اندریں صورت یہ جائداد ملکِ ہندہ ہی رہے گی یا ان لڑکیوں کی مِلک قرار دی جائے گی؟ اور بعد مرنے ان لڑکیوں کے یہ جائداد وارثوں پر تقسیم ہوسکتی ہے یا نہیں؟

سائل: محمد زکریا خان قصبہ فرید نگر ضلع میرٹھ

۱۷ شوال ۱۳۳۴ھ

الجواب

وهو الموفق للصواب

بسم الله الرحمن الرحيم.

الحمد لوليه. والصلوة على رسوله و نبيه و آله و صحبه اجمعين. اللهم رب زدني علما۔

رکنِ ہبہ ایجاب وقبول ہے۔ یعنی ھبہ کرنے والا عاقل بالغ کہے، کہ میں نے یہ مکان یا یہ چیز تم کو بخشی یا ھبہ کی۔ پھر موھوب لہ یعنی جس کو بخشا جائے، کہے کہ میں نے قبول کیا۔ اور شرط صحیح ہونے ھبہ کے یہ ہے، کہ جس چیز کو واہب ہبہ کرے وہ فقط اس کی ملک ہو۔ اس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور جب وہ ھبہ کرے تو اُس میں اپنی شرکت نہ رکھے۔ اور اس چیز سے اپنا قبضہ اٹھا لے۔ بلکہ اگر مکان ہے تو اس میں سے اپنا کل سامان نکال

لے۔ کما فی الدر المختار

و شرائط صحتها فی الموهوب ان یکون مقبوضا غیر مشاع ممیزا غیر مشغول کما سیتضح و رکنها هو الایجاب و القبول[1].

(ترجمہ: ہبہ کے درست ہونے کی شرطوں میں ایک یہ ہے' کہ ہبہ کی جانے والی چیز موہوب لہ کے قبضہ میں آجائے۔ (اگر وہ تقسیم کو قبول کرتی ہوتو) غیر منقسم نہ ہو۔ نیز وہ چیز غیر موہوب چیز سے متمیز اور الگ ہو۔ کسی اور چیز کے ساتھ مشغول نہ ہو جیسا کہ عنقریب واضح ہو جائے گا اور اس کا رکن ایجاب اور قبول ہے)

و هکذا فی العالمگیریه حیث قال:

و منها ای من شرائط الهبة ان یکون الموهوب مقبوضا حتی لا یثبت الملک للموهوب له قبل القبض. و ان یکون الموهوب مقسوما اذا کان مما یحتمل القسمة و ان یکون الموهوب متمیزا عن غیر الموهوب و لا یکون متصلا و لا مشغولا بغیر الموهوب[2]

(ترجمہ: ہبہ کے شرائط میں سے یہ ہے کہ (۱) ہبہ کے جانے والی شی پر موہوب لہ کا قبضہ ہو' حتی کہ اس پر قبضہ کرنے سے پہلے اس کی ملکیت ثابت نہ ہوگی (۲) ہبہ کی جانے والی چیز اگر تقسیم کو قبول کرتی ہوتو' وہ تقسیم شدہ ہو۔ (۳) موہوب چیز غیر موہوب اشیاء سے علیحدہ ہو ان کے ساتھ نہ یہ متصل ہو اور نہ ہی مشغول ہو)

علی هذا جیسے شئے موہوبہ میں امورِ مذکورہ شرطِ صحتِ ہبہ ہیں' موہوب لہ کے شئے موہوبہ کا مالک ہونے کے لئے یہ شرط ہے' کہ موہوب لہ جس جلسہ میں واہب ہبہ کرے' یا ہبہ نامہ لکھ کر دے' اُس جلسہ میں بہ اذن و اجازتِ واہب اس کو خالی کرا کے اس پر قبضہ تام کر لے۔ اور اگر اُس جلسہ میں قبضہ نہ کر سکے تو دوسرے وقت اس سے اجازت لے کر اس پر کامل قبضہ حاصل کر لے۔ اور اگر وہ اجازتِ قبضہ نہ دے اور اپنا ہی قبضہ رکھے تو اس کا مالک واہب ہی رہے گا اور وہ ہبہ نامہ وغیرہ سب لغو و بیکار رہے گا۔

---

[1] الدر المختار مع شرحه رد المحتار جلد ۸ صفحه ۴۲۲' ۴۲۴' ۴۲۴ مطبوعه بیروت لبنان

[2] الفتاوی العالم گیریه جلد ۴ صفحه ۳۷۴ مطبوعه مصر

چنانچہ درمختار میں ہے۔

و تتم الهبة بالقبض الكامل و لو الموهوب شاغلا لملك الواهب لا مشغولا به الاصل ان الموهوب ان مشغولا بملك الواهب منع تمامها[1] .

(ترجمہ: ہبہ موہوب لہ کے کامل قبضہ سے مکمل ہوتا ہے۔ اگر ہبہ کی جانے والی چیز' ہبہ کرنے والے کی کسی چیز کو شاغل ہو (جیسے بوری میں گندم ہے تو بوری کو ہبہ کرے۔ گندم کو اس کے ساتھ ہبہ نہ کرے) لیکن واہب کی کسی چیز سے مشغول نہ ہو (جیسے گندم کو ہبہ کرے لیکن بوری کو ہبہ نہ کرے اس صورت میں ہبہ درست نہ ہوگا) ہبہ کے درست ہونے کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر موہوب سے واہب کی کسی چیز میں مشغول نہ ہو (جیسے گندم بوری کے اندر ہو اور صرف گندم ہبہ کرے) تو یہ صورت ہبہ کے تکمیل میں مانع ہے)

قال الشامی :

قوله منع تمامها اذا القبض شرط فصولين[2]

(ترجمہ: قولہ: یہ صورت ہبہ کی تکمیل کو مانع ہوگی' کیونکہ موہوب لہ کا قبضہ کرنا شرط ہے۔ یہ مسئلہ جامع فصولین میں درج ہے)

اور اگر موھوب لہ نابالغ بے سمجھ ہے' جیسا کہ صورتِ مسئولہ میں دونوں دختر ہیں' تو ایسی صورت میں موھوب لہ کے باپ کا قبضہ ضروری ہے۔ خواہ موھوب لہ کی ماں موھوب لہ کو ھبہ کرے یا بھائی یا کوئی اجنبی 'بشرطیکہ موھوب لہ مہدِ تربیتِ باپ میں ہو۔ اور باپ ہی موھوب لہ کے نان ونفقہ اور ضروریات کا کفیل ہو' جیسا کہ صورتِ مسئولہ سے ظاہر ہے' کہ دونوں لڑکیوں کے نان ونفقہ اور ضروریات کا کفیل عند الھبہ باپ ہی تھا۔ اور باپ ہی تا موت ایک دختر اور تا بلوغ وعقدِ دخترِ ثانی رہا۔ ہاں البتہ اگر ماں واھبہ' موھوب لہ کے نان و نفقہ اور ضروریات کی متکفل باوصف موجودگی باپ کے ہوتی اور باپ ان کا خبر گیر نہ ہوتا تو اندریں صورت ماں کا

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۸ صفحہ ۴۲۷ مطبوعہ بیروت

[2] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۸ صفحہ ۴۲۷ مطبوعہ بیروت

قبضۂ سابقہ ہی بعد ھبہ مثل قبضہ موہوب لہ ہی کے بقول مفتی بہ سمجھا جاتا۔ کما فی العالمگیریة

و لو کان الصغیر فی عیال الجد أو الاخ او الام او العم فوهب له هبة فقبض الهبة من کان الصغیر فی عیاله والاب حاضر اختلف المشایخ فیه و الصحیح الجواز هکذا فی فتاوی قاضی خان و به یفتی هکذا فی الفتاوی الصغری فقط[1]

☆ (ترجمہ: اگر چھوٹا بچہ، دادا، یا بھائی، یا ماں، یا چچا کی کفالت میں ہو، اسے کوئی چیز ہبہ کی گئی، اس پر اس شخص نے قبضہ کیا جس کی کفالت میں وہ نابالغ بچہ ہے اور باپ موجود ہے، علماء کا اس ہبہ کے صحیح ہونے اور غیر صحیح ہونے میں اختلاف ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ ایسا ہبہ جائز ہوتا ہے۔ فتاوی قاضی خان میں اسی طرح ہے۔ اسی پر فتوی ہے یہ فتاوی صغریٰ میں ہے)

و ایضا فیه :

و هبة الاب لطفله تتم بالعقد ولا فرق فی ذلک بینما اذا کان فی یده او فی مودعه.. و کذا لو وهبته امه و هو فی یدها والاب میت و لیس له وصی و کذا کل من یعوله کذا فی التبیین. و هکذا فی الکافی[2]

☆ (ترجمہ: باپ کی جانب سے اپنے نابالغ بچے کو کیا گیا ہبہ عقد سے کامل ہو جاتا ہے۔ ہبہ کی گئی چیز اس کے قبضہ میں ہو یا اس بچے کے قبضہ میں جسے وہ دی گئی دونوں صورتوں میں ہبہ کی صحت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ (کچھ الفاظ کے بعد) اور اسی طرح اگر اس نابالغ کی ماں نے اسے کوئی چیز ہبہ کی وہ چیز ابھی ماں کے قبضہ میں ہے اس نابالغ کا باپ مر چکا ہے اور اس کا وصی بھی کوئی نہیں تو ہبہ کامل اور درست ہے اور یہی حکم ہے اس صورت میں جب کہ نابالغ کا کفیل اسے ہبہ کرے۔ تبیین میں ایسے ہے اور کافی میں بھی ایسے ہی ہے)

☆ اور جب باوصف موجودگی ولی اقرب، یعنی باپ لڑکیوں موہوب لہما کے اور رہنے ان دونوں لڑکیوں

---

[1] الفتاوی العالم گیریة جلد ۴ صفحہ ۳۹۳ مطبوعہ مصر

[2] الفتاوی العالم گیریہ جلد ۴ صفحہ ۳۹۱ مطبوعہ مصر

کے عندالہبہ مہدِ پرورش باپ میں اور نہ ہونے ماں کے کفیل نان ونفقہ ہر دو دختران' ماں نے جائداد مملوکہ اپنی دونوں لڑکیوں کو ھبہ کر کے اور ھبہ نامہ لکھ کر ان کے ولیِ اقرب اور کفیلِ نان ونفقہ یعنی باپ کے قبضہ میں بالکل اپنا قبضہ اٹھا کر صورتِ مسئولہ میں نہیں دی' تو وہ جائداد لڑکیوں کے مِلک میں نہیں آئی۔ بلکہ بدستور ان کی ماں مسماۃ ھندہ ہی کی مملوک رہی۔ اس واسطے کہ بعد الھبہ بموجبِ روایاتِ مذکورہ کے قبضۂ سابقہ یا نیا اس جائدادِ موھوبہ پر ان کی ماں مسماۃ ھندہ کا بقولِ مفتی بہ قائم مقام قبضہ ان لڑکیوں موھوب لہما کے جب ہوتا جب باپ ان کا کفیل نہ ہوتا۔ اور ان کی پرورش کی متکفل ان کی ماں مسماۃ ھندہ واھبہ ہی ہوتی۔ اور جب باپ ولیِ اقرب متکفلِ نان ونفقہ و جملہ ضروریاتِ دختران مذکورہ موجود تھا' تو اب ضرور تھا کہ ماں مسماۃ ھندہ بعد ھبہ' اس جائداد سے اپنا قبضہ اٹھا کر ان لڑکیوں کے باپ کو قبضۂ تام دے دیتی' تاکہ مِلکِ ھندہ سے وہ جائداد نکل کر مِلک دونوں لڑکیوں کی ہو جاتی۔ اور جیسا مسماۃ ہندہ نے بعد ہبہ اب تک اس جائداد سے باوصف موجودگیِ ولیِ اقرب کفیلِ نان ونفقہ و جملہ ضروریاتِ دختران مذکورہ اس پر سے اپنا قبضہ نہیں اٹھایا' وہ جائداد ان لڑکیوں کی مِلک نہیں ہوئی۔ اور جب ان لڑکیوں کی ہی مِلک نہیں ہوئی تو بعد موت ان لڑکیوں کے ورثاء پر کسی طرح تقسیم نہیں ہو سکتی۔

كما هو ظاهر من الروايات المذكورة اور دوسری صورت فتاویٰ عالمگیریہ سے تو یہ بھی امر ظاہر ہے کہ اگر باپ کفیلِ نان نفقہ بھی نہ ہو' جب یعنی بغیر قبضہ باپ کے' خواہ ماں ھبہ کرے یا کوئی اور موھوب لہ کسی کی مہدِ تربیت میں ہو' سوائے باپ کے اس کا قبضہ موجودگی باپ میں' قائم مقام قبضۂ موھوب لہ صغیر نہیں ہو سکتا۔ اور بلا قبضہ باپ کے ھبہ ناتمام رہتا ہے۔ چنانچہ فتاوی عالمگیریہ میں ہے:

و اما غير الاب والجد نحو الاخ والعم والام و سائر القرابات ففي الاستحسان يملكون قبض الهبة اذا كان الصغير في عيالهم و كذلك وصي هؤلاء يملكه استحسانا. اذا كان في عياله و كذا الاجنبي الذي يعول اليتيم و ليس لليتيم احد سواه جاز قبض الهبة استحسانا و يستوي في هذه المسائل اذا كان الصبي يعقل القبض او لا يعقل وهذا كله اذا كان الاب ميتا او حيا غائبا غيبة منقطعة فاما اذا كان حيا حاضراً و الصبي في عيال هؤلاء

هل يصح لم يذكر الفصل في الكتب نصا إلا أنه ذكر في الاجنبي اذا كان يعول اليتيم و ليس لهذا اليتيم احد سواه جاز قبض الهبة عليه و هذا الشرط يقتضي ان لا يصح قبض هولاء اذا كان حاضرا و ذكر في الجد ايضا انه لا يملك القبض على الصغير اذا كان الاب حيا ولم يفصل بينما اذا كان الصغير في عياله او لم يكن فظاهر ما اطلقه يقتضي ان لا يصح كذا في الذخيرة [1]

(ترجمہ: باپ اور دادا کے علاوہ باقی رشتہ داروں' بھائی یا چچا یا ماں کی کفالت میں اگر نابالغ ہو' تو استحسان کی رو سے ان کے قبضہ کی صورت میں ہبہ درست ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح ان کے وصی کو بھی نابالغ کی طرف سے ہبہ کی چیز پر قبضہ کا اختیار ہے' جب کہ وہ اس وصی کی کفالت میں ہو۔ ☆ اور اسی طرح وہ اجنبی جس کی کفالت میں وہ نابالغ رہتا ہو اور اس کے بغیر اس یتیم کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی اور نہ ہو تو اس کا قبضہ بھی درست ہے۔ ان صورتوں میں بچہ کو قبضہ کی سمجھ ہو یا نہ ہو حکم ایک ہی ہے۔ یہ سب کچھ اس صورت میں درست ہو گا جب کہ نابالغ کا باپ مر چکا ہو یا وہ دور دراز علاقہ میں رہتا ہو۔ اور اگر باپ زندہ موجود ہو اور نابالغ بچہ ان لوگوں کی کفالت میں ہو' تو فقہ کی کتابوں میں اس صورت کا حکم مذکور نہیں ہے۔ ہاں اس قدر موجود ہے کہ اجنبی شخص اگر یتیم کی کفالت کرتا ہو اور اس کے سوا یتیم کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی اور نہ ہو تو اس اجنبی کا ہبہ کی ہوئی چیز پر قبضہ درست ہوتا ہے۔ اس شرط کا تقاضا یہ ہے کہ اگر باپ موجود ہو تو ان کا قبضہ درست نہیں۔ دادا کی صورت میں بھی مذکور ہے' کہ نابالغ کی طرف سے اس کا قبضہ باپ کے زندہ ہونے کی صورت میں درست نہیں باپ کے کفیل ہونے یا کفیل نہ ہونے کی صورت میں اس حکم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تو اس اطلاق کے ظاہر کا تقاضا یہ ہے' کہ اس کفیل کے قبضہ سے ہبہ کامل نہ ہو سکے گا جب تک باپ قبضہ نہ کر لے)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

---

[1] الفتاوی العالم گیریہ جلد ۴ صفحہ ۳۹۲' ۳۹۳ مطبوعہ مصر

﴿فتویٰ نمبر......117﴾

سوال

خلاصۂ سوالِ طویل لاطائل زید کی بجز ایک بیٹی کے تمام بیٹیاں آوارہ اور بد چلن ہیں۔ لہٰذا زید اپنی نیک چلن بیٹی کے نام تمام جائیداد کا وصیت نامہ لکھ کر سب ورثہ کو معہ اپنی بیوی کے محروم الارث کرنا چاہتا ہے۔ عندالشرع یہ امر جائز ہے یا ناجائز؟ بینوا وتوجروا.

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صورتِ مسئولہ میں زید اپنی حیات میں جس بیٹی سے خوش ہے علیٰ ہذا علاوہ بیٹی کے جس سے بھی خوش ہو اس کو کل جائیداد یا جس قدر بھی چاہے ہبہ کر کے اگر اپنا قبضہ اٹھا کر اس کو قبضۂ تام دیدے اور نیز اپنی حیات میں تمام جائداد کو وقف کر کے اگر کسی متولی کے سپرد کر دے وقف بھی کر سکتا ہے۔☆ مگر چند ورثہ کو محروم کر کے ایک وارث کو ھبہ کر دینا گو حرام نہیں مگر مکروہ اور ظلم ضرور ہے۔

چنانچہ طیبی سے حاشیہ صفحہ 261 مشکوۃ میں ہے:۔

ولو وھب بعضھم (الی بعض الاولاد) دون بعض فمذھب الشافعی و مالک و ابی حنیفۃ رحمھم اللہ انہ مکروہ ولیس بحرام والھبۃ صحیحۃ[1] .

(ترجمہ: اگر کسی نے اپنی اولاد میں کچھ کو نظر انداز کر کے، کچھ کو ہبہ کیا، تو امام شافعیؒ، امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمھم اللہ کا مذہب ہے، کہ ایسا کرنا مکروہ ہے حرام نہیں ہے اور ہبہ درست ہے)

---

[1] (الف) حاشیہ مشکوۃ المصابیح — صفحہ ۲۰۷ — مطبوعہ المطبع المجتبائی دھلی

(ب) شرح الطیبی — جلد ۷ — صفحہ ۲۲۲۸ — مکتبہ نزار مصطفی الباز مکہ مکرمہ

☆ البتہ اگر ہبہ مرض الموت میں کرے گا جو بالآخر وصیت ہے' یا وصیت نامہ بعض اولاد کے نام لکھ کردے گا' تو وہ ناجائز رہے گا۔ چنانچہ حدیث صحیح میں ہے:

الا لا وصیة لوارث [1]

(ترجمہ: خبردار وارث کے لیے وصیت جائز نہیں ہے)

اور بموجب اسی حدیثِ صحیح تمام کتب فقہ میں ہے۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[1] i جامع الترمذی حدیث رقم ۲۱۲۰' ۲۱۲۱

ii سنن نسائی باب ۵ حدیث رقم ۲۷۱۳' ۲۷۲۷

iii مسند احمد جلد ۴ صفحہ ۱۸۶' ۱۸۷' ۲۳۸

وغیرھا کتب الأحادیث تفصیل کے لیے:

موسوعہ اطراف الحدیث النبوی جلد ۸ صفحہ ۱۴۰ تا ۱۴۳ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

کی طرف رجوع کریں۔

﴿فتویٰ نمبر......118﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص کی پہلی زوجہ سے اولاد ہوئی۔ وہ زوجہ اس کی اولاد چھوڑ کر فوت ہوگئی۔ پھر اس نے دوسرا نکاح کیا اس سے بھی اولاد ہوئی۔ وہ شخص بیمار ہوا۔ حالتِ بیماری میں ایک ہبہ نامہ جائداد وغیرہ کا پچھلی اولاد اور زوجہ موجودہ کے نام لکھ کر رجسٹری کرادی۔ اس وقت پہلی اولاد موجود تھی۔ پھر وہ شخص اسی بیماری میں دس بارہ یوم بعد فوت ہوگیا اب بموجب شرع شریف پہلی اولاد بھی حصہ پانے کی مستحق ہے؟ بینوا توجروا

سائل: محی الدین ساکن جی پور

۵ ذیقعدہ ۱۳۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

الحمد لله رب العالمين. والصلوة والسلام على رسوله ونبيه وعلى آله وذريته. اللهم رب زدني علما.

صورتِ مسئولہ میں شخصِ مذکور نے چونکہ مرض الموت میں ورثہ کو ھبہ کیا ہے' لہٰذا یہ ھبہ شرعاً ناجائز ہے اور جمیع مالِ متروکہ مع مالِ موہوب جمیع ورثہ اولادِ ہر دو زوجہ و زوجہ موجودہ و دیگر ورثہ پر اگر ہوں حسبِ شریعت تقسیم ہوگا' ☆ اس واسطے کہ ھبہ مرض الموت میں اگرچہ ابتداء ھبہ ہوتا ہے مگر بعد موت حکم وصیت کا رکھتا ہے اور وصیت وارث کو ناجائز ہے۔

چنانچہ صفحہ 181 جامع الفصولین میں ہے

وهب قنا لامراته فاعتقته ثم مات المريض نفذ و تضمن القيمة اذا التمليك في

الابتداء صح لكن القلب وصية بعد ذالك و هو المختار[1].

(ترجمہ: اپنی بیوی کو ایک غلام ہبہ کیا۔ اس بیوی نے اسے آزاد کر دیا۔ پھر خاوند مریض مرگیا تو عتق نافذ رہے گا اور عورت اس غلام کی قیمت کی ضامن ہوگی کیوں کہ عورت کو مالک بنانا آغاز میں درست تھا لیکن بعد میں وہ وصیت میں تبدیل ہو گیا۔ یہی مختار ہے)

حررہ:

ابو محمد محمد دیدار علی عفی اللہ عنہ وعن والدیہ مفتی

مسجد جامع اکبرآباد

✿✿✿✿✿

---

[1] جامع الفصولین جلد ۲ صفحہ ۱۸۱ مطبوعہ: دار الاشاعة العربية كوئٹہ

وقف
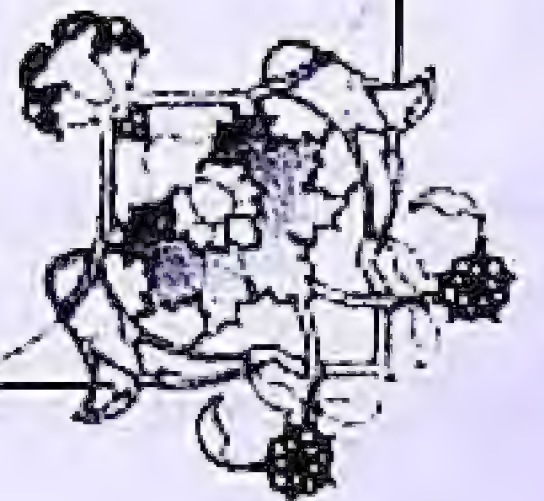
﴿فتویٰ نمبر......119﴾

سوال

ایک زمین زید کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ مالکانہ تصرفات کرتا رہا اور اس کے بعد بھی ورثا کرتے رہے۔ جس کو زائداز چالیس برس سے ہوئے اور کوئی مزاحم نہ ہوا۔

اب اس کے ورثا متصرف ہیں۔ عمر دعویٰ وقف کر کے اس زمین کو لینا چاہتا ہے اور کاغذ وقف رکھتا ہے۔ شرعا کیا حکم ہے؟

الجواب

ھو المصوب

عمر کا دعویٰ دربارۂ وقف، بعض دستاویز وقف سے ناجائز ہے جب کہ مدت دراز تک مالکانہ تصرف رہا۔

فتاویٰ حامدیہ میں ہے:۔

(سئل) فیما اذا کان بید زید عقار معلوم یتصرف فیه هو وابوه من قبله من مدة تزید علی اربعین سنة بلا معارض ثم مات عن ورثة قام عمرو الان یدعی علیهم انه وقف علیه ولم یصدقوه علی ذلک و مضت هذه المدة ولم یدع عمر و بذلک و لا منعه مانع شرعی و الکل فی البلدة فهل لا تسمع دعواه المزبور

(الجواب) نعم قال فی المبسوط ترک الدعوی ثلاثا و ثلاثین سنة و لم یکن له مانع من الدعوی ثم ادعی لا تسمع دعواه لان ترک الدعویٰ مع التمکن یدل علی عدم الحق ظاهرا. وقدافتی بمثل ذلک شیخ الاسلام عبدالله آفندی المفتی بالممالک العثمانیة وسئل فی هذه الصورة عما اذا سمع القاضی تلک الشهادة و حکم بنزع العقار للوقف من ید الورثة و کتب به حجة فهل ینفذ حکمه ام لا و ما یلزم

ذلک القاضی فاجاب لا ینفد حکمه ولا تعتبر حجته و یعزل[۱]

(ترجمہ: سوال: زید کے قبضہ میں ایک معین جائداد ہے جس میں وہ اور اس سے پہلے اس کا باپ چالیس سال سے زائد عرصہ سے بغیر کسی رکاوٹ کے تصرف کرتے آئے ہیں۔ پھر وہ وارث چھوڑ کر مر گیا عمرو اٹھ کھڑا ہوا اور ان کے خلاف دعوی کرتا ہے کہ وہ وقف ہے وہ ورثاء اس کی اس معاملہ میں تصدیق نہں کرتے اتنی مدت گذری لیکن کیا عمرو نے اس کا دعوی نہیں کیا' اور نہ ہی کسی شرعی مانع نے اسے اس سے روکا' یہ سب لوگ شہر میں رہتے ہیں کیا مذکورہ دعوی نہیں سنا جائے گا۔

جواب: ہاں (نہیں سنا جائے گا) مبسوط میں ہے کہ ایک شخص نے تینتیس برس تک دعوی چھوڑے رکھا اور دعوی سے کوئی مانع بھی موجود نہ تھا اس کے بعد اس نے دعوی کیا اب دعوی نہ سنا جائے گا کیونکہ باجود قدرت کے دعوی کو ترک کرنا بظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا حق نہ تھا۔ شیخ الاسلام عبداللہ آفندی مفتی ممالک عثمانیہ نے اسی طرح کا فتوی دیا ہے ان سے اس صورت کے بارے میں پوچھا گیا کہ جب قاضی اس شہادت کی سماعت کرے اور ورثاء کے قبضہ سے جائداد کو وقف کے لیے چھین لینے کا حکم دے اور اس کی حجت تحریر کردے تو کیا اس کا حکم نافذ ہوگا یا نہیں اور اس قاضی پر کیا لازم آتا ہے تو آپ نے جواب دیا کہ اس کا حکم نافذ نہ ہوگا اس کی حجت کا اعتبار نہ کیا جائے گا اور اسے معزول کردیا جائے گا)

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

❁❁❁❁❁

---

[۱] تنقیح الفتاوی الحامدیہ جلد اول صفحہ نمبر ۱۲۲ مطبوعہ مکتبہ حبیبہ کوئٹہ

﴿فتوی نمبر......120﴾

سوال

حضرت میران نمک شاہ کی درگاہ کو سرجان ولیم نے ۱۲۱۵ھ میں زمین وقف کردی۔ متولیان نے کچھ دنوں بعد تقسیم نصف نصف کر کے ایک کی زوجہ نے اراضی کو رہن کردیا۔ ایک نے زوجہ کے نام بیع نامہ لکھ دیا۔ اب اس اراضی کو ایک اس زوجہ کا جس نے اراضی کو رہن کیا ہے بیع نامہ بنام جس ونت رائے اور مسمی بہاری لال کرتی ہے شرعا کیا حکم ہے؟۔ بینوا توجروا

سائل: ولی اللہ محمد شاکر، منڈوی سگ شہر آگرہ

۱۸ مارچ ۱۹۱۶ء

الجواب

هو المصوب

قرینہ سوال اور معاملہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس عطیہ سرجان ولیم پر متولیاں (درگاہ) تصرف کرتے رہے۔ اگرچہ بنام وقف درگاہ کو دی گئی تھی۔ مگر تصرفاتِ مالکانہ متولیاں یکے بعد دیگرے مدتِ دراز تک کرتے رہے اور کوئی مزاحم نہ ہوا۔ لہٰذا اب دعویٰ وقف لائق سماعت نہیں۔ فتاوی حامدیہ میں ہے:

(سئل) فیما إذا کان بید زید ارض معلومة یتصرف فیها بطریق الإرث بلا معارض له ولمورثه قبله من مدة تزید علی ستین سنة والآن قام ناظر وقف اهلی یعارضه فیها مدعیا جریانها فی الوقف المذبور مستندا فی ذلک لمجرد ذکرها فی کتاب وقف بیده منقطع الثبوت ولم یسبق ولا لمن قبل من نظار الوقف وضع ید علیها لجهة الوقف فهل حیث کان الامر کذلک یمنع الناظر من معارضة زید فیها ویعمل بوضع الید والتصرف المذبورین ولا عبرة بمجرد ذکر الأرض فی کتاب الوقف المذبور بدون سبق تصرف شرعی لجهة الوقف المذبور.

(الجواب) نعم لأن حجج الشرع الشريف ثلاثة البينة والإقرار والنكول وكتاب الوقف إنما هو كاغذ به خط وهو لا يعتمد عليه ولا يعمل به كما صرح به كثير من علمائنا ولا ينزع شيء من يد أحد إلا بحق ثابت معروف [1]

(ترجمہ) سوال: زید کے قبضہ میں مقرر زمین ہے جس میں وہ وراثت کے طور پر تصرف کرتا ہے۔ ساٹھ سال سے زائد کا عرصہ ہوا کہ اس اور اس کے مورث کے تصرف میں رہی کوئی مقابل نہیں آیا۔ اب ملکی وقف کا نگران اس سے معارضہ کرتا ہے اور یہ دعوی کرتا ہے کہ مذکورہ زمین وقف ہے اور دلیل صرف یہ دیتا ہے اس کے پاس وقف کی کتاب میں صرف اس کا ذکر موجود ہے۔ اس کا ثبوت اس کے پاس کچھ نہیں۔ وقف کے اعتبار سے نہ اس نگران کا اس زمین پر کبھی قبضہ رہا اور نہ اس سے پہلے نگرانوں کا قبضہ رہا۔ تو کیا اس صورت حال میں وقف کے نگران کو اس زمین کے بارے میں معارضہ سے روکا جائے گا۔ مذکورہ بالا افراد کے اس زمین پر قبضے اور تصرف پر عمل کیا جائے گا اور مذکورہ بالا زمین پر وقف کے اعتبار سے کبھی کسی تصرف کے بغیر صرف اس وقف کی کتاب میں اس کے ذکر کا کچھ اعتبار نہ کیا جائے گا۔

جواب: ہاں (وقف کی کتاب میں صرف اس کے ذکر کا کوئی اعتبار نہیں ہے) شرع شریف میں صرف تین چیزیں، ثبوت کی دلیل ہیں (۱) گواہی (۲) اقرار (۳) انکار۔ وقف کی کتاب صرف کاغذات کا مجموعہ ہے جن پر تحریر ہے۔ اس پر اعتماد نہیں کیا جاتا اور نہ اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس کی تصریح ہمارے کثیر علماء نے فرمائی ہے۔ معروف طریقہ سے ثابت شدہ حق کے بغیر کسی شخص کے قبضہ سے کوئی چیز چھینی نہیں جاسکتی)

پس مالکانہ تصرف بلا مزاحمت مرید وغیرہ کرتے رہے اور انتقالاتِ بیع ورہن نافذ ہوتے رہے۔ لہٰذا اب اس کو وقف قرار دینا صحیح نہیں۔ واللہ أعلم وحکمه أحکم

کتبه المفتی السید محمد اعظم شاہ غفر له

فائدہ:

ایسی صورت میں اگر حاکم وقف بھی قرار دے تو اس کا حکم غلط ہوگا جیسا کہ مسئلہ نمبر ۳۹ میں درج ہے۔

منہ غفر لہ

---

[1] تنقیح فتاوی حامدیه' العلامة محمد امین بن عابدین شامی جلد اول صفحه ۱۲۱ مکتبه حبیبیه کوئٹه

﴿فتویٰ نمبر...... 121﴾

سوال

ایک مکان زرخرید ہے۔ اپنے بھانجے کو ملا۔ اسے فروخت کیا اور بیع نامہ میں (سوائے اصل الدین مکان متعلقہ مسجد فلاں) لکھا لیکن کوئی وقف نامہ نہ شرائط نہ مصارف تحریر کئے۔ مگر ارادہ ہے کہ اگر خدا وسعت دے تو مسجد کی خدمت اپنے پاس سے اور زمین مذکورہ کی آمدنی وغیرہ سے کروں گا اور ولایت خود رکھوں گا۔ اب اہل محلہ اور ممبرانِ مسجد مجبور کرتے ہیں کہ اس کا روپیہ یعنی قیمت موصول ادا کرے تاکہ ہم مسجد میں لگا دیں یا کرایہ نامہ لکھ دے۔ شرعاً ایسے موقع پر کیا حکم ہے جو تعمیل کی جاوے۔

الجواب

هو المصوب

وقف میں ضرورت تکمیل کی ہے خصوصاً جب کہ زمین کسی مسجد کو وقف کی جائے تو حوالۂ متولی جب تک نہ کرے تو کامل نہ ہوگا (صفحہ ۲۱۵ جامع الاحکام جلد اول دیکھو)

قال ابو جعفر و علیه الفتوی.

(ترجمہ: امام ابو جعفر نے فرمایا اور اسی پر فتویٰ ہے)

اور یہاں نہ تو واقف نے وقف نامہ لکھا اور نہ تصریح مصارف اور نہ اقرار کیا ہے☆ بلکہ آئندہ ارادہ ظاہر کیا ہے۔ اور زبردستی وقف نہیں ہوسکتا۔

اگر وقف ہی فرض کیا جائے تو مالک خود کو متولی قرار دیتا ہے بعدہ کسی کو حق نہیں ہے کہ اس سے علیحدہ کرے۔

جب تک اُس سے خرچ وغیرہ کی تفصیل نہ معلوم ہو کہ اس قدر آمدنی مسجد کے فلاں کام میں اور اس قدر اپنے رشتہ داروں کے واسطے مقرر کیا ہے یا سب مسجد میں اپنے آپ جمع کرتا رہوں گا۔ اور کسی محلہ داریا

حاکم کو ہر گز حق نہیں ہے کہ صرف آئندہ ارادہ پر وقف جائز کردیں جب تک کامل نہ ہو جاوے۔

☆ اور محلہ دار سخت لادین ہیں کہ جو وقف بھی قرار دیتے ہیں اور اس کی قیمت واقف سے لے کر مسجد میں حرام مال لگانا چاہتے ہیں۔ ☆ کیونکہ کہ وقف کا بیچنا اور روپیہ لینا حرام ہے۔ اور مسجد میں اس کا لگانا سخت کبیرہ گناہ ہوگا اور محلہ داروں کو کوئی منصب دست اندازی کا نہیں ہے۔ جب تک تکمیلِ وقف واقف کی طرف سے نہ ہو جاوے اور کاغذ پر رجسٹری نہ کراوے۔ اور علاوہ اس کے ابھی اس نے مکانہ وقف کیا اور نہ حدود معین کئے نہ تصریح قبضہ نہ تفصیلِ خرچہ نہ بیان تولیت۔

غرض کہ یہ زمین وقف نہیں۔ اور مطالبہ اہلِ محلہ کا بالکل غلط اور جہالت پر مبنی ہے۔ ہاں مالک کو فہمائش کریں کہ وعدہ پورا کرے۔ تا کہ عند اللہ ماخوذ نہ ہو۔

واللہ اعلم وحکمہ احکم

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

﴿فتویٰ نمبر......122﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں میونسپل بورڈ نے ایک زمین بہ نیت وقف کرنے کے مسلمانوں پر واسطے قبرستان کے خریدی ہے اور ابھی مسلمانوں کے سپرد نہیں کی۔ آیا بلا اجازت اور سپرد کرنے کے مسلمانوں کو اس میں کسی مسلمان کو مردہ دفن کرنا جائز ہے یا نہیں؟

سائل: انوار حسین چڑی مار ٹولہ اکبر آباد

۲۰ شوال ۱۳۳۴ھ

الجواب

الحمد لله العلى الاعلى والصلوة والسلام على رسوله المصطفى وآله المجتبى. اللهم رب زدنى علما.

وقف بلا قبضہ دینے کے پورا نہیں ہوتا۔ کما فی الدر المختار

ولا يتم الوقف حتى يقبض لم يقل للمتولى لان تسليم كل شىء بما يليق به ففى المسجد بالافراز[1]

(ترجمہ: وقف تام نہیں ہوتا' جب تک قبضہ نہ ہو جائے۔ مصنف علیہ الرحمۃ نے یہ نہ فرمایا کہ جب تک متولی قبضہ نہ کرلے' کیوں کہ ہر چیز کی سپردگی اس کے حال کے مناسب ہوتی ہے مسجد میں اس کی زمین کو جدا کر دینے سے وقف تام ہو جاتا ہے)

قال الشامی رحمة الله عليه

قوله ففى المسجد بالا فراز أى والصلوة فيه وسياتى و فى المقبرة بدفن واحد

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۴۱۷، ۴۱۸ مطبوعہ بیروت

فصاعدا باذنه [1]۔

☆(ترجمہ: قولہ: مسجد میں اس کی زمین کو الگ کردینے سے وقف تام ہو جاتا ہے۔☆یعنی اس کے ساتھ ساتھ واقف کی اجازت سے اس میں نماز ادا کرنے سے۔جس کی تفصیل عنقریب آرہی ہے۔ ☆قبرستان میں واقف کی اجازت سے ایک یا ایک سے زائد مردوں کے دفن ہونے (سے) وقف کامل ہو جاتا ہے)

لہٰذا جب تک باجازتِ واقف یا وکیل واقف ایک یا کچھ زائد مردے اس میں دفن نہ کردیے جاویں کسی مسلمان کو بلا اجازت اس میں دفن کرنا جائز نہیں۔فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابومحمد محمد دیدار علی الجد دی
مفتی جامع مسجد اکبرآباد
۱۹ شوال ۱۳۳۴ھ [2]

✿✿✿✿✿

---

[1] رد المحتار جلد ۶ صفحہ ۴۸۱ مطبوعہ بیروت

[2] اصل مسودہ میں اسی طرح سوال پر تاریخ ۲۰ شوال ۱۳۳۴ھ اور جواب پر ۱۹ شوال ۱۳۳۴ھ درج ہے۔ممکن ہے یہ اختلاف سائل یا حضرت مجیب رحمۃ اللہ علیہ کی غلطی فہمی کی بنا پر ہو۔

محمد علیم الدین عفی عنہ

﴿فتویٰ نمبر......123﴾

سوال

ہم مفتیانِ دینِ اسلام اور علمائے کرام سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ عابدہ نے کچھ روپیہ کی وصیت کی اور زید سے کہا کہ اس روپیہ سے ایک مسجد بنوا دینا۔ زید نے اس روپیہ سے حسبِ وصیت مسجد تیار کرائی لیکن ضروریاتِ تعمیر کے لیے وہ روپیہ ناکافی ہوا اور کچھ روپیہ زید نے اپنے پاس سے لگا کر اس کی تعمیر کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ مسجد کے صحن کے ملحق اس نے علیحدہ اپنی زمین پر چند دکانات اپنے ذاتی صرف سے بنوائیں اور ان پر وہ تاحینِ حیات قابض و متصرف رہا۔ کرایہ وغیرہ بھی خود وصول کرتا رہا اور انہیں نقلا و اصلا کسی صورت میں بھی وقف نہیں کیا تو زید کے بعد اس کا لڑکا عمر وراثتا ان دوکانوں کا حقدار و مالک ہوگا یا نہیں۔ اور کیا زید کے انتقال کے بعد بغیر کسی وصیت کے وہ جائدادِ موروثی وقف میں شامل سمجھی جائے گی؟

سائل حاجی الطاف حسین

الجواب

ظاہر ہے کہ بغیر وقف کئے ہوئے کسی کا مال کسی طرح وقف نہیں ہوسکتا تو لامحالہ بعد انتقال زید کے مثل دیگر مال جائداد بعد ما تقدم علی الارث زید کے ورثہ ان دوکانات کے بھی بحسبِ حصصِ متعینِ شریعت مستحق ہوں گے۔ اور اگر بجز ایک بیٹے کی یا چند بیٹوں کے اور کوئی وارث نہیں ہے تو فقط بیٹے ہی کل مال وجائداد اور ان دوکانات کے شرعا وارث ہوں گے۔ مسجد کے پاس مسجد سے ملحق اپنی ذاتی زمین بنانے سے وہ مکان بغیر وقف کئے ہوئے ہرگز وقف نہیں ہوسکتا۔ بلکہ مسجد بھی بعد بنانے کے جب وقف ہوگی جب بانیٔ مسجد اس کو اپنی ملک سے جدا کر کے عموما نماز پڑھنے کی مسلمانوں کو اجازت دیدے اور اس میں نماز پڑھنے لگیں کہ:

فی الدالمختار:

ولا یتم الوقف حتی یقبض لم یقل للمتولی لان تسلیم کل شیء بما یلیق به ففی

المسجد بالافرازوفی غیرہ بنصب المتولی و بتسلیمہ ایاہ ابن کمال [1]

(ترجمہ: وقف کامل نہیں ہوتا جب تک اس پر قبضہ نہ ہوجائے۔ مصنف علیہ الرحمہ نے یہ نہ فرمایا کہ جب تک متولی اس پر قبضہ نہ کرلے کیوں کہ ہر چیز کی سپردگی اس طرح ہوتی ہے جواس کے مناسب ہو۔ مسجد میں سپردگی اس کو اپنی دیگر ملکیت سے علیحدہ کردینے سے اوراس کے علاوہ باقی میں متولی مقرر کرنے اور وقف شدہ چیزاس کے حوالے کرنے سے وقف تام ہوگا)

قال الشامی :

قولہ ففی المسجد بالافراز ای والصلوٰۃ فیہ [2]

(ترجمہ: صاحبِ درمختار نے فرمایا کہ مسجد میں وقف تام اس وقت ہوجاتا ہے جب کہ اس کواپنی دیگر مملوکہ زمین سے علیحدہ کردیا جائے یعنی اس میں نماز بھی ادا کرلی جائے۔)

☆ اورعلاوہ مسجد دیگر مکانات ودکانات میں وقف صحیح جب ہوگا جب واقف وقف کرکے کسی کومتولی مقرر کرکے اس کے سپرد کردے۔ اورتاوقتیکہ دوسروں کومتولی مقرر کے اس کے سپرد نہ کردے اور خود متصرف رہے بموجب عبارتِ مذکورہ درمختار وہ مکان یا دوکان گوتحریرایا زبانی وقف کردی ملک واقف سے نہ نکلے گا۔ اور بوجہ ناتمام رہنے وقف کے مالک مکان ہی اس کا مالک رہے گا۔ البتہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خود واقف ہی متولی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اگر وہ خود متولی رہنا چاہے تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مجرد وقف کرکے اپنی کل جائداد سے جدا کرکے بحیثیتِ تولیت قابض ومتصرف رہنا بھی تکمیل وقف کو کافی ہے۔

کما فی الشامی :

ان من شرط التسلیم و ھو محمد لم یصح تولیۃ الواقف لنفسہ و من صححھا وھو

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۶ ،صفحہ ۴۱۷، ۴۱۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

[2] رد المحتار جلد ۶ صفحہ ۴۱۷، ۴۱۸ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

أبويوسف رحمة الله عليه لم يشترطه تامل ۱؎

(ترجمہ: جس نے سپرد کرنے کو شرط قرار دیا اور وہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ ہیں ان کے نزدیک وقف کرنے والے کا خود متولی بننا درست نہیں۔ اور جس نے وقف کرنے والے کا خود متولی درست قرار دیا ہے اور وہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ہیں انہوں نے اس کی شرط نہیں لگائی)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
جامع مسجد اکبر آباد

۱؎ رد المحتار جلد ٦ صفحہ ۴۱۸ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

﴿فتویٰ نمبر......124﴾

سوال

علماءِ دین ومفتیانِ شرعِ متین مسئلہ ہذا میں کیا فرماتے ہیں ایک پرانا وقف قبرستان ہے۔جس میں اب صرف چند قبریں نظر آتی ہیں۔اور بہت ممکن ہے کہ کچھ ایسی قبریں ہوں جو مٹی میں دب کر ناپید ہوگئی ہوں۔اس میں مدت سے مردے دفن نہیں ہوتے۔چنگی سے وہاں دفن کرنے کی اجازت نہیں۔اس قبرستان میں طلباءِعلومِ دین کے لیے دارالاقامۃ یا مدرسہ بنوانا جائز ہے یا نہیں؟ نمایاں قبروں کو یا تو چاردیواری کے ذریعہ محفوظ کردیا جائے گا یا ان پر چھت قائم کر کے اس پر طلبہ کے درس یا قیام کے لیے جگہ بنوادی جائے گی۔

۸شوال ۱۳۳۶ھ

محمد شریف ساکن ملٹھولہ آگرہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

اس قسم کے قبرستان میں قدیم سے گو اس میں نشان ایک قبر بھی باقی نہ رہے بموجب روایۃ فتاوی عالم گیریہ تو مطلقا انتفاع ناجائز معلوم ہوتا ہے۔چنانچہ صفحہ ۴۵۳ جلد ثانی فتاوی عالم گیریہ میں ہے۔

سئل ھو (ای القاضی الامام شمس الائمہ الاوزجندی رحمہ اللہ) ایضا عن المقبرۃ فی القری اذا اندرست و لم یبق فیھا اثر الموتی ولا العظم ولا غیرہ ھل یجوز زرعھا واستغلا لھا قال لا. و لھا حکم المقبرۃ کذا فی المحیط فلو کان فیھا حشیش یحش و یرسل الی الدواب ولا ترسل الدواب فیھا کذا فی البحر الرائق[1]

(ترجمہ: حضرت قاضی امام شمس الائمہ اوزجندی رحمۃ اللہ علیہ سے دیہات کے ایسے قبرستانوں کے بارے میں پو

---

[1] الفتاوی العالمگیریہ : جلد ۲، صفحہ ۴۷۰، ۴۷۱ مطبوعہ مصر

چھا گیا جب وہ قدیم ہو جائیں ان میں مردوں کی نشانیاں اور ہڈیاں وغیرہ نہ رہیں تو کیا ان میں کھیتی باڑی کرنا اور غلہ اگانا جائز ہے۔ تو آپ نے فرمایا نہیں۔ ان کے لیے قبرستان کا حکم ہے۔ محیط ☆ اگر وہاں گھاس موجود ہو تو اسے کاٹ لیا جائے اور چوپایوں کی طرف بھیج دیا جائے۔ لیکن چوپایوں کو ان میں چرنے کے لیے نہ چھوڑا جائے گا۔ البحر الرائق)

☆ البتہ ایک دو قبر ماضی میں جس کو قبرستانِ دائرہ یا عامہ نہیں کہہ سکتے یہ تعاملِ قدیم پایا جاتا ہے کہ ان کو مثل حجرہ کے چار دیواری یا گنبد میں دے کر اوپر صحنِ مسجد بنوا دیا گیا ہے یا اتنی اونچی جگہ چار دیواری میں دے کر اس کے گرداگرد صحن مسجد بنوا دیا گیا ہے یا مکان قیام گاہِ مسافرین وطلبہ بنوا دی گئی ہیں چنانچہ یہ امر جامع مسجد آگرہ سے اور مسجد وزیر خان واقع لاہور سے اور درگاہ حضرت سلیم چشتی رحمہ اللہ وغیرہ دیگر مقامات سے ظاہر ہے۔ بلکہ غالباً روضہ جناب سرورِ عالم ﷺ بھی اسی صحن مسجد کے اندر ہے جو بعد حضور رسالت مآب ﷺ صحنِ اصلی پر زائد کیا گیا ہے مگر قبرستانِ عامہ کا قیاس اس مقبرہ پر نہیں کر سکتے جس میں ایک دو قبر کے بعد لوگوں نے کسی وجہ سے دفن کرنا چھوڑ دیا ہو اس واسطے کہ اس مقبرہ سے حکم قبرستان ہونے کا اٹھ جاتا ہے۔

چنانچہ صفحہ ۲۷۵ جلد خامس بحر الرائق میں ہے۔

و فی الخانية امراة جعلت قطعة ارض مقبرة و اخرجتها من يدها و دفن فيها ابنها و هذه الارض غير صالحة للقبر لغلبة الماء عليها قال الفقيه ابو جعفر رحمه الله ان كانت الارض بحال يرغب الناس عن دفن الموتى فيها لفسادها لم تصر مقبرة و كان للمراة ان تبيعها و اذا باعت كان للمشترى ان يرفع الميت عنها او يامر برفع الميت عنها[1]

☆ (ترجمہ: فتاوی قاضی خان میں ہے ایک عورت نے زمین کے ایک ٹکڑے کو قبرستان بنا لیا۔ اسے اپنے قبضہ سے خارج کر دیا اور اس میں اپنے بیٹے کو دفن کر دیا۔ لیکن یہ زمین پانی کے غلبہ کے باعث قبر کے لیے مناسب نہیں ہے۔ حضرت فقیہ ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اگر زمین اس طرح کی ہو کہ لوگ اس کی خرابی کے باعث

---

[1] البحر الرائق شرح کنز الدقائق : جلد ۵، صفحہ ۲۷۵، دار المعرفہ بیروت

مردے دفن کرنے سے اعراض کریں تو وہ قبرستان قرار نہ پائے گی۔ عورت کو حق حاصل ہے کہ اسے فروخت کردے اور جب وہ فروخت کردے تو خریدار کو اختیار ہے کہ میت کو وہاں سے اٹھا کر کہیں اور منتقل کردے یا وہاں سے میت کو اٹھا لینے کا حکم دے دے)

حالاں کہ ایک دو میت کے دفن ہو جانے کے بعد وقف مقبرہ تام ہو جاتا ہے۔ اور ملک واقف سے نکل جاتا ہے ﷺ چنانچہ صفحہ ۲۵۳ بحر الرائق میں ہے

و عند ابی یوسف رحمه الله یزول ملکه بالقول کما هو اصله و اذا التسلیم عنده لیس بشرط والوقف لازم و فی فتاوی قاضی خان و ناخذ فی ذلک بقول ابی یوسف و عن محمد رحمه الله اذا استقی الناس من السقایة و سکنوا الخان والرباط و دفنوا فی المقبرة زال الملک لان التسلیم عنده شرط والشرط تسلیم نوعه و ذلک بما ذکرنا و یکتفی بالواحد بتعذر فعل الجنس کله[1]

(ترجمہ: امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف زبان سے وقف کہہ دینے سے مالک کی ملکیت زائل ہو جاتی ہے جس طرح کہ اس کی اصل ہے۔ کیوں کہ سپرداری ان کے نزدیک شرط نہیں' اور وقف لازم ہو جاتا ہے۔ فتاوی قاضی خان میں ہے کہ اس سلسلہ میں حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قول اختیار کرتے ہیں۔ حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب لوگوں نے سبیل سے پانی بھرا' سرائے اور رباط میں ٹھہرے اور قبرستان میں مردوں کو دفن کردیا تو مالک کی ملکیت زائل ہو جائے گی۔ کیوں کہ سپرداری ان کے نزدیک شرط ہے۔ اور شرط اس کی نوع کی سپرداری ہے۔ اور یہ ان امور سے ہوتی ہے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ اور ایک شخص کا فعل یعنی پانی بھرنا' ٹھہرنا اور مردہ دفن کرنا کافی ہے کیوں کہ ساری جنس کا فعل مشکل ہے)

اور مقبرۂ داثرہ کی نسبت روایت فتاوی عالم گیریہ تو جو بہت مفصل ہے گزر ہی چکی۔ مگر صاحب بحر بھی اس روایت مذکورہ کے اوپر اس طرح تحریر فرماتے ہیں:۔

---

[1] البحر الرائق شرح کنز الدقائق : جلد ۵' صفحہ ۲۷۵' دار المعرفه بیروت

ولا يجوز لاهل القرية الانتفاع بالمقبرة الدائرة فلو كان فيها حشيش يحش و يرسل الى الدواب ولا ترسل الدواب فيها[1]

☆(ترجمہ: مٹے ہوئے قبرستان سے گاؤں والوں کو نفع اٹھانا جائز نہیں ہے۔ اگر وہاں گھاس ہو تو اسے کاٹ لیا جائے اور چوپایوں کی طرف بھیج دیا جائے لیکن چوپایوں کو اس میں نہ چھوڑا جائے)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبرآباد

✿✿✿✿✿

---

[1] البحر الرائق شرح کنز الدقائق : جلد ۵، صفحہ ۲۷۵، دار المعرفہ بیروت

﴾فتوی نمبر......125﴿

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ قومِ ہنود کچھ روپیہ مسجد میں دے اور یہ کہہ کر دے کہ میں اپنی نوکری میں سے دیتا ہوں اس کا روپیہ مسجد میں لیا جائے یا نہیں اور وہ شخص ملازم ہو۔

سائل: محمد حسین

پیش امام مسجد راجہ بازار

مادھو گنج باند کوئی سکنہ اور

الجواب

بسم الله الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

☆ ہندو کے روپیہ سے جو مسجد بنائی جائے خواہ وہ تجارت یا کسی پیشہ کے ذریعہ سے حاصل کیا ہو یا بذریعہ نوکری اس کو مسجد کا حکم نہیں ہوتا۔

☆ علاوہ بریں اس کے روپیہ سے جھاڑ' فانوس' پنکھے' مسجد کے کنویں یا قلعی وغیرہ میں خرچ کر دیا جائے کچھ مضائقہ نہیں جائز ہے۔

حررہ:

العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......126﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے مسجدِ محلہ میں ٹائم پیس یعنی گھڑی خورد عنداللہ دی اور سپردِ متولی کر دی۔ اس کا استعمال عرصہ تک رہا۔ مہتمم مسجد نے بوجہ پرانے اور سست ہونے کے اور خوف اس امر کے کبھی سہوا مسجد میں رہ جائے اور چوری چلی جائے اس کو بقیمتِ مناسب فروخت کر کے اس میں مزید رقم شامل کر کے ۱۵ روپیہ کا کلاک یعنی گھڑی کلاں بنا بر استعمالِ مسجدِ متذکرہ خریدی ہے۔ اب وہ شخص جس نے کہ ٹائم پیس مذکور دی تھی واپس چاہتا ہے۔ لہٰذا اندریں صورت وہ شخص گھڑی خورد متذکرہ کی واپسی کا استحقاق بموجب شرع شریف رکھتا ہے یا کیا؟ بینوا توجروا

اولاد حسین

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

بعد صحتِ وقف اور سپرد کر دینے کسی موقوفہ کے متولی کو واقف پھر واپس نہیں لے سکتا۔ اس واسطے کہ وقف بعد التسلیم الی المتولی لازم ہو جاتا ہے۔ اور ملکِ واقف سے خارج ہو جاتا ہے۔

فی الدرالمختار فی صفحة ۳۹۹ من الجزء الثالث

ولایتم الوقف حتی یقبض و لم یقل للمتولی لا تسلیم کل شیٔ بما یلیق به ففی المسجد بالافراز و فی غیره بنصب المتولی وتسلیمه ایاه ابن کمال[۱] .

(ترجمہ: وقف تام اس وقت ہوتا ہے جب واقف قبضہ دے دے۔ صاحب تنویر الابصار نے یہ نہ فرمایا کہ جب متولی کو قبضہ دے دے تو وقف تام تب ہوتا ہے کیونکہ ہر شے کی سپردگی اس طرح ہوتی جو اس کے حال کے لائق

[۱] الدر المختار مع رد المحتار جلد ٦ صفحہ ۴۱۷، ۴۱۸، دار التراث العربی بیروت

ہو۔ مسجد میں سپردگی اپنی جائداد سے الگ کرنے کے ساتھ ہوتی ہے لیکن اس کے علاوہ اور اشیاء کے وقف میں وقف اس وقت تام ہوگا جب وقف کنندہ متولی مقرر کرے اور موقوف شے اس کے سپرد کردے۔ ابنِ کمال)

و فی صفحة ۴۰۲

فاذا تم ولزم لا یملک [1]

☆ (ترجمہ: جب وقف تام ہوجائے اور لازم ہوجائے تو واقف اس کا مالک نہیں ہے)

قال الشامی :

قولہ لا یملک ای لا یکون مملوکا لصاحبه ولا یملک ای لا یقبل التملیک لغیرہ بالبیع و نحوه لاستحالة تملیک الخارج عن ملکه.

(ترجمہ: قولہ: وقف مملوک نہیں ہوتا یعنی نہ تو وہ وقف کنندہ کی ملک میں رہتا ہے اور نہ ہی اسے کسی اور کی ملک میں دیا جاسکتا ہے مثلاً فروخت کر کے یا کسی اور طریقہ سے۔ کیوں کہ جو چیز کسی کی ملکیت سے خارج ہے اس پر کسی اور کو مالک بنانا محال ہے)

☆ مگر عند الضرورت اگر متولی باذنِ واقف یا خود واقف جب وہ شئے موقوفہ پرانی ہوجائے اور خراب یا اس کی حاجت نہ رہے اور اس کو بیچ کر اس کی قیمت سے اس سے عمدہ چیز خرید کر بجائے اس شئے موقوفہ کے رکھ دے تو باتفاق جائز ہے۔ چنانچہ صفحہ ۱۷۷ اسعاف میں ہے۔

و ان بلیت الحصیر کان له (ای للواقف) ان یبیعها و یشتری بثمنها حصیرا آخر وهکذا الحکم لو اشتری قندیلا ونحوه للمسجد واستغنی عنه [2]

(ترجمہ: اگر چٹائی پرانی ہوجائے تو وقف کنندہ کو اسے فروخت کر کے اس کی قیمت سے اور چٹائی خریدنے کا حق ہے۔ یہی حکم اس صورت میں ہے جب کہ مسجد کے لیے قندیل یا اس کی مانند کوئی اور چیز خریدی۔)

اور صفحہ ۲۵۲ جلد خامس بحر میں ہے

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۶ صفحہ ۴۲۱ دار التراث العربی بیروت

[2] الاسعاف فی حکم الاوقاف صفحہ مطبوعه

و فی الخانیة رجل بسط بما له حصیرا للمسجد فخرب المسجد ووقع الاستغناء عنه فان ذلک یکون له ان کان حیا ولورثته ان کان میتا و ان بلی ذلک کان له ان یبیع ویشتری بثمنه حصیرا آخر و کذا لو اشتری حشیشا او قندیلا للمسجد[۱] .

(ترجمہ: کسی شخص نے مسجد کے لیے اپنے مال سے چٹائی خرید کر بچھائی' پھر مسجد ویران ہوگئی اور اس چٹائی کی ضرورت نہ رہی تو یہ چٹائی اس بچھانے والے کی ہوگی اگر وہ زندہ ہے اور اگر وہ مر چکا ہو تو اس کے ورثہ کی ہے۔ اور اگر وہ چٹائی بوسیدہ ہو جائے تو اسے فروخت کر کے دوسری چٹائی خریدنے کا حق حاصل ہے۔ اور اسی طرح حکم ہے اگر اس نے مسجد کے لیے گھاس یا قندیل خریدی ہو)

چنانچہ سوال مذکور میں ایسی ہی صورت ہے کہ گھنٹہ کی ضرورت باقی ہے اور اس سے استغناء نہیں ہے مگر پورانہ ہونے کی وجہ سے اس کو بیچ کر دوسرے کے خریدنے کی ضرورت واقع ہوئی ہے۔ للہذا عند البیع اگر واقف راضی تھا اور اب طلب کرتا ہے۔ باتفاق اس کو بیچ کر نیا خریدنا جائز تھا اور جائز ہے۔ اور واقف کو اب کسی طرح حقِ نزاع حاصل نہیں۔ اور اگر واقف اول سے ناراض تھا اور نہ متولی کو عندالوقف بوقتِ ضرورت صراحتہ نہ عرفا نہ دلالتہ اختیارِ تصرف واقف کی طرف سے حاصل تھا اور نہ پھر متولی نے بوجہِ ضرورت اور خوفِ تلفِ وقف بیچ دیا اس کے ساتھ اور قیمت ملا کر اس سے بہتر خرید کر رکھ دیا تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک تو صحیح یہی ہے کہ متولی کو حق بھی حاصل تھا چنانچہ صفحہ ۲۵۱ جلد خامس بحر میں ہے۔

اما الحصر والقناديل فالصحيح من مذهب ابی یوسف انه لا یعود الی ملک متخذه بل یحول الی مسجد آخر او یبیعه قیم المسجد للمسجد[۲] .

(ترجمہ: چٹائیوں اور قندیلوں کے بارے میں حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ وقف کنندہ کی ملکیت میں واپس نہیں آتے بلکہ کسی اور مسجد میں منتقل کر دیا جائے گا یا مسجد کا متولی انہیں اسی مسجد کے لیے فروخت کر دے گا)

---

[۱] البحر الرائق شرح کنز الدقائق　جلد ۵　صفحہ ۲۷۳　دار المعرفه بیروت

[۲] البحر الرائق شرح کنز الدقائق　جلد ۵　صفحہ ۲۷۲　دار المعرفة بیروت

اور امام محمد رحمہ اللہ سے اگرچہ ایک روایت یہی ہے کہ پرانہ ہو جانے سے بوریہ وغیرہ آلات مسجد ملکِ واقف ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا بدوں اذنِ واقف آلات وسامانِ مسجد کو متولی نہیں بیچ سکتا۔ مگر دوسری روایت امام محمد رحمہ اللہ سے بھی علاوہ اینٹ پتھر سامان بناءِ مسجد کے دوسرے سامان بندھنے بوریہ کی نسبت مثل قول امام ابو یوسف رحمہ اللہ ہے۔

چنانچہ صفحہ ۲۰۳ جلد خامس بحرالرائق میں ہے:

فی الخانية اذا وقف جنازة او نعشا او مغتسلا وهو التور العظيم فی محلة خربت المحلة و لم يبق اهلها قالوا لا ترد الی ورثة الواقف بل تحول الی محلة اخری اقرب الی هذه المحلة فرقوا بين هذا و بين المسجد اذا خرب ما حوله علی قول محمد يصير ميراثا لان المسجد مما لا ينقل الی مكان آخر وهذه الاشياء مما تنقل[1]

☆(ترجمہ: جس نے میت کو اٹھانے کا تابوت یا مردہ کو نہلانے کا تخت یا غسل دینے کا مقام جو کہ بڑا برتن ہوتا ہے کسی محلہ میں وقف کیا۔ محلہ ویران ہو گیا اور وہاں کے رہنے والے باقی نہ رہے تو علمائے کرام نے فرمایا یہ وقف کردہ اشیاء واقف کے ورثاء کو واپس نہ لوٹائی جائیں گی بلکہ اس محلہ کے سب سے قریبی محلہ میں منتقل کردی جائیں گی۔ امام محمدؒ کے نزدیک جب مسجد کے اردگرد آبادی ویران ہو جائے تو مسجد کی وہ جگہ واقف کے ورثاء کے لیے میراث بن جاتی ہے۔ علمائے کرام نے مسجد کی جگہ اور مذکورہ بالا اشیا کے حکم میں فرق کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ مسجد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ اشیاء ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقل کی جاسکتی ہیں)

اور امام ابن ہمام رحمہ اللہ نے فتح القدیر میں بدھنے بوریہ کو بھی اسی حکم میں رکھا ہے اور اس قیاس ابن ہمام کی جو صاحبِ بحر نے مخالفت کی ہے علامہ شامی رحمہ اللہ نے بدلیل اس کو رد کردیا ہے لہٰذا بموجب قول ثانی امام محمد رحمہ اللہ بھی فعلِ متولی صحیح ہے۔ لیکن بنظر روایت اولی امام محمد رحمہ اللہ علیہ متولی کو مناسب ہے کہ جس طرح ہو سکے واقف کو اپنے فعل پر راضی کرے تاکہ محلِ اختلاف مطلقاً باقی نہ رہے۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ
ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی المفتی فی جامع اکبر آباد

---

[1] البحر الرائق شرح كنز الدقائق جلد ۵ صفحه ۲۷۳ دار المعرفه بيروت

﴿فتویٰ نمبر...... 127﴾

سوال

ایک جگہ درخت پیپل تھا اس میں ہندو پرستش کرتے ہیں۔ اس کے نیچے سے مسجد برآمد ہوئی ہم لوگ اس میں نماز پڑھتے ہیں۔ شرعاً کیا حکم ہے؟

سائلین: نمازیاں مسجد رحیم بخش کچہری

۲۲ اپریل: ۱۹۱۶ء

الجواب

هو المصوب

ان مسلمانوں کو بڑا ثواب ہے جنہوں نے اس مسجد قدیم کو مسجد قائم کیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے۔

انما يعمر مساجد الله من امن بالله واليوم الآخر[1] .

(ترجمہ: حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی مسجدیں وہی آباد کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور آخری دن (روز قیامت پر) ایمان رکھتے ہیں)

حررہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

✿✿✿✿✿

---

[1] القرآن الحکیم: سورۃ التوبہ آیت ۱۸
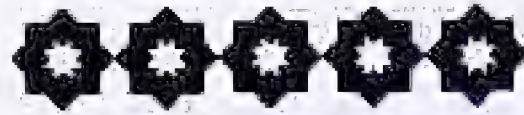
﴿فتویٰ نمبر......128﴾

سوال

کیا زید زیرِ مسجد صحنِ مسجد میں ایسی کوئی کوٹھڑی بنا سکتا ہے کہ جس میں آدمی سکونت کر سکے؟ اگرچہ وہ مسجد کے فائدہ کی غرض سے ہو کہ جس میں یہ احتمال کسی وقت میں ہونا ممکن ہے کہ اوپر نماز ہو رہی ہے اور زیرِ مسجد شراب خواری' خواہ فعلِ زنا وغیرہ ہو۔ پس ایسی دور اندیشی خیال کر کے شرع شریف زیرِ مسجد کسی کو کوٹھڑی وغیرہ بنانے کا حکم دے سکتی ہے یا نہیں؟ مع نام کتاب وصفحہ سے آگاہی ہر سہ سوالات کے فرمایئے۔

الجواب

☆ مسجد یا صحنِ مسجد کے نیچے یا اوپر وقتِ بناءِ مسجد اگر خود مسجد بنا کر وقف کرنے والا کوئی حجرہ یا مکان سامانِ مسجد رکھنے کو یا امام کے رہنے کو بنا دے جائز ہے۔ مگر بعد وقف کر دینے مسجد کے اگر خود واقف بھی مسجد کے یا صحنِ مسجد کے نیچے یا اوپر امام کے رہنے کو بھی اگر مکان یا حجرہ بنا دے جائز نہیں۔

کما فی البحر فی صفحه ۲۵۱

انه لو بنى بيتا على سطح المسجد لسكنى الامام فإنه لا يضر فى كونه مسجدا لانه من المصالح فان قلت لو جعل مسجدا ثم اراد ان يبنى فوقه بيتا للامام او غيره هل له ذلك قلت قال فى التتار خانية اذا بنى مسجدا و بنى غرفة و هو فى يده فله ذلك و ان كان بناه وخلى بينه و بين الناس ثم جاء بعد ذلك يبنى لا يتركه و فى جامع الفتاوى اذا قال عنيت ذالك فإنه لا يصدق فاذا كان هذا فى الواقف فكيف بغيره[۱].

(ترجمہ: بانیِ مسجد نے اگر مسجد کی چھت پر امام کی رہائش کے لیے گھر بنایا' تو اس سے اس کے مسجد ہونے کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ کیونکہ مصالحِ مسجد میں داخل ہے۔ اگر تم پوچھو کہ بانی نے مسجد کو مسجد قرار دے دیا پھر اس نے چاہا کہ امام کے لیے یا کسی اور غرض کے لیے گھر بنائے کیا اسے ایسا کرنے کی اجازت ہے؟ میں کہتا ہوں کہ

---

[۱] البحر الرائق: جلد ۵ صفحه ۲۷۱ دار المعرفة بيروت

فتاوی تا تارخانیہ میں ہے کہ جب بانی نے مسجد بنائی ابھی وہ اس کے قبضہ میں تھی کہ اس نے اس کے اوپر کمرہ بنالیا تو اسے اجازت ہے۔ اور جب وہ مسجد بنا چکا اور اپنا قبضہ چھوڑ کر اسے لوگوں کے سپرد کر دیا پھر آیا تا کہ اوپر مکان تعمیر کرے تو اسے اس کی اجازت نہ دی جائے گی۔ اور جامع الفتاوی میں ہے کہ اگر بانی کہے کہ میرا پہلے سے یہ ارادہ تھا تو اس کی تصدیق نہ کی جائے گی۔ یہ حکم مسجد کو وقف کرنے والے کا ہے اور اوروں کو کیسے اجازت ہو سکتی ہے)

اور اگر خوفِ بے ادبی اور اہانتِ مسجد ہو جیسا کہ صورتِ سوال سے ظاہر ہے ہرگز جائز نہیں۔ اس واسطے کہ مسجد کی زمین تحت الثریٰ سے آسمان تک باعتبارِ ادب و تعظیم حکم مسجد ہی کا رکھتی ہے۔ جو امور مسجد میں جائز نہیں ہیں وہ نہ مسجد کے اوپر جائز نہ مسجد کے نیچے جائز۔

کما فی الدر المختار :

و کرہ تحریما الوطوء فوقه والبول والتغوط لانه مسجد الی عنان السماء[1]

☆(ترجمہ: مسجد کی چھت پر جماع کرنا' پیشاب اور پاخانہ پھرنا مکروہ تحریمی ہے۔ کیونکہ یہ زمین سے لے کر آسمانوں تک مسجد ہے)

قال الشامی رحمة الله فی صفحة ۴۸۵ من الجزء الاول رد المحتار المصری

قوله الی عنان السماء و کذا الی تحت الثری کما فی البیری عن الاسبیحابی[2]

(ترجمہ: قولہ: یہ زمین سے آسمانوں تک مسجد ہے۔ یونہی یہ جگہ تحت الثری تک مسجد ہے۔ البیری میں اسبیجابی سے اسی طرح منقول ہے۔)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

محمد دیدار علی الرضوی' مفتی جامع مسجد اکبر آباد

❁❁❁❁❁

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۲' صفحہ ۳۷۰ دار احیاء العربی بیروت

[2] رد المحتار: جلد ۲' صفحہ ۳۷۰ دار احیاء العربی بیروت

﴿فتویٰ نمبر......129﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ مسجدِ قدیم ازسرِ نوتعمیر کرائی جائے اور بعض حصہ یا کل ازسرِ نوتعمیر ہوسکے نیچے سراسر دوکانات کرایہ چلانے کو بنوائی جائیں جیسا کہ بالفعل مسجد دولہ شاہ متصل کالا محل آگرہ ازسرِ نوتعمیر کرائی جارہی ہے جس کا تعلق ممبر صاحبان لوکل انجنسیوں سے ہے۔ آیا یہ حق متولی مسجد کو ہے یا نہیں؟ اور اگر نئی مسجد اس طرح بنوائی جائے تو اس کا سارا نیچے کا حصہ کرایہ کے مکان یا دوکانوں کا رہے۔ اس کی آمدنی مسجد ہی کے واسطے متعلق کی جائے تو اس مسجد کو مسجد کا حکم ہوگا یا نہیں؟

۲۷ صفر

حاجی الہ دین دولہ شاہ آگرہ

الجواب

بسم الله الرحمن الرحيم۔

اللهم رب زدني علما

فتاویٰ عالمگیریہ صفحہ ۴۴۹ جلد ثانی میں ہے

قيم المسجد لا يجوز له ان يبنى حوانيت فى حد المسجد أو فى فنائه لان المسجد اذا جعل حانوتا اومسكنا تسقط حرمته وهذا لا يجوز والفناء تبع المسجد فيكون حكمه حكم المسجد كذا فى المحيط السرخسى[1]

(ترجمہ: مسجد کے متولی کے لیے مسجد یا اس کے فناء میں دکانیں تعمیر کرنا درست نہیں۔ کیوں کہ مسجد کو جب دکان یا سکونت کا مکان بنالیا جائے تو اس کی عزت وحرمت ختم ہوجاتی ہے۔ اور یہ جائز نہیں ہے۔ اور فنائے مسجد، مسجد کے تابع ہوتی ہے اس کا حکم بھی وہی ہے جو مسجد کا ہے۔ محیط سرخسی)

---

[1] الفتاوى العالم گیریه جلد ثالی صفحه ۴۶۲ مطبوعه مصر

یعنی محیط سرخسی میں ہے کہ منتظم مسجد کو مسجد اور فناءِ مسجد کی حد میں دوکان یا مکانِ سکونت بنوانا ہرگز جائز نہیں اس واسطے کہ اس سے حرمت مسجد ساقط ہو جائے گی۔

اور اس سے زیادہ مصرح صفحہ ۴۴۳ میں مطلقا بلا قید منتظم اور بانی وواقف اس طرح لکھا ہے۔

اذا اراد انسان ان یتخذ تحت المسجد حوانیت غلة لمرمة المسجد او فوقه لیس له ذالک کذا فی الذخیرة[1]

(ترجمہ: اگر کوئی شخص مسجد کے نیچے یا اوپر دکانیں بنائے تا کہ مسجد کی مرمت کے لیے آمدنی کا ذریعہ ہو تو اسے ایسا کرنے کا حق نہیں ہے۔ذخیرہ)

یعنی بغرضِ انتظامِ مرمتِ مسجد آمدنی مسجد کیواسطے اگر کوئی شخص مسجد کے نیچے یا اوپر دوکانیں بنادے یہ حق کسی کو حاصل نہیں ☆ اور بایں ہمہ اگر کوئی بانی مسجد مسجد کے نیچے یا اوپر مکانِ سکونت بغرض کرایہ یا دوکانیں بنوادے (اور اس کے اوپر یا نیچے کے مکان کو اپنی ملکیت میں رکھے) اور وقف کر کے اس کا راستہ بھی جدا کر دے اور اس (مسجد) کو اپنی ملک سے جدا بھی کر دے تو اس مسجد کو حکمِ مسجد نہیں یہاں تک کہ وہ اس کو بیع کر سکتا ہے اور اس کے ورثہ کو بطریقِ وراثت پہنچ سکتی ہے۔

چنانچہ بحوالہ ہدایہ جلد ثانی فتاویٰ عالمگیریہ کے صفحہ ۴۴۳ میں ہے:

و من جعل مسجدا تحته سرداب او فوقه بیت و جعل باب المسجد الی الطریق و عزله فله ان یبیعه و ان مات یورث عنه[2]

(ترجمہ: جس شخص نے مسجد بنائی لیکن اس کے نیچے (اپنی ملکیت برقرار رکھ کر) تہہ خانہ یا اس کے اوپر گھر بنایا اور مسجد کا دروازہ (عام) رستہ کی طرف بنادیا اور اس کو علیحدہ بھی کر دیا تو اس کو حق حاصل ہے کہ اس کو بیچ دے۔اور اگر مر جائے گا تو مسجد کی وہ جگہ اس کی میراث قرار پائے گی)

---

[1] الفتاوی العالم گیریه — جلد ثانی صفحه ۴۵۵ — مطبوعه مصر

[2] الفتاوی العالم گیریه — جلد ثانی صفحه ۴۶۲ — مطبوعه مصر

ہاں اگر سردابہ بغرضِ مصالح مسجد یعنی مسجد کے سامان کے واسطے مثل سردابۂ بیت المقدس کے بنا کر وقف کیا ہے بلاشک جائز ہے۔

چنانچہ اس صفحہ میں ہے:

ولو کان السرداب لمصالح المسجد جاز کما فی مسجد بیت المقدس کذا فی الهداية [1]

(ترجمہ: اگر تہہ خانہ مسجد کی مصلحتوں کے لیے ہو تو جائز ہے جیسا کہ بیت المقدس کی مسجد میں ہے) [2] فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی مفتی

جامع مسجد اکبرآباد

✿✿✿✿✿

---

[1] الفتاوی العالمگیریہ جلد ثانی صفحہ ۴۵۵ مطبوعہ مصر

[2] واضح رہے کہ یہ تہہ خانہ اس جگہ کو مسجد قرار دینے سے پہلے بنایا جاسکتا ہے مسجد قرار دینے کے بعد تہہ خانہ یا اوپر گھر بنانا جائز نہیں۔ اگر چہ مسجد کے مصالح کے لیے ہو لیکن مسجد کے نیچے تہ خانہ بطور مسجد بنایا جاسکتا ہے۔

مرتب عفی عنہ

﴿فتویٰ نمبر......130﴾

سوال

حسبِ استفسار جناب حکیم حیات خان صاحب ممبر لوکل کمیٹی اکبر آباد بہ نسبت وقفِ امکنۂ منہدمہ وقف برائے مسجد ہنڈی ھینگ [1]

۸ جنوری ۱۹۱۷ء

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما

اگر یہ زمین یا مکانِ موقوفہء مسجد ہنڈی ہینگ بعینہ وہی زمین یا مکان ہے، جس کو واقف نے مسجد پر وقف کیا تھا اور یہ وقف امراء وسلاطین سے نہیں ہے، مثل اوقاف جامع مسجد کے، بلکہ اپنے مالِ مملوکہ سے کسی نے وقف کیا تھا تو بلاشبہ اس کا بیچنا ناجائز ہے۔ ☆اور اگر آمدنیِ وقف سے کوئی زمین یا مکان خریدا ہوا ہے، ☆یا وقفی مکانِ موقوفہ منہدم ہو گیا ہے اور اس کو آباد کرنا اور بنانا یا اس کی زمین کو کرایہ پر چلانا متعذر وغیرہ ممکن ہے (تو) بلاشبہ متولین مسجد بحکمِ قاضی اس کو بیچ کر اس سے دوسری زمین یا مکان کارآمدِ مسجد خرید سکتے ہیں۔ چنانچہ صفحہ ۴۱۸ جلد ثالث شامی میں ہے

قال هشام سمعت محمدا يقول الوقف اذا صار بحيث لا ينتفع به المساكين فللقاضى ان يبيعه و يشترى بثمنه غيره و ليس ذلك الا للقاضى [2]

(ترجمہ: امام ہشام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، کہ میں نے حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا، کہ وہ فرمار ہے تھے، کہ جب وقف کی حالت ایسی ہو جائے، کہ مسکین اس سے نفع نہ حاصل کر سکیں، تو قاضی کو اختیار ہے کہ

---

[1] فتاوی کے رجسٹر میں سوال درج نہیں ہے۔

[2] رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۴۱۸ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

اسے فروخت کردے اور اسی کی قیمت سے اس کے علاوہ اور خرید لے۔ قاضی کے سوا کسی اور کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے)

و ایضا فیه فی صفحة ۴۱۹

واعلم ان عدم جواز بیعه (ای بیع الوقف) اذا تعذر الانتفاع به انما هو فیما و ردعلیه وقف الواقف اما اذا اشتراه المتولی من مستغلات الوقف فانه یجوز بیعه بلا هذا الشرط لان فی صیرورته و قفا خلافا والمختار انه لا یکون وقفا فللقیم ان یبیعه متی شاء لمصلحة عرضت و ستاتی المسئلة فی الفصل الاتی متنا[1]۔

(ترجمہ: وقف کی چیز کو فروخت کرنے کا عدم واز جب کہ اس سے نفع حاصل کرنا ممکن نہ رہے صرف اس صورت میں ہے جب کہ وقف کرنے والے نے اسے وقف کیا ہو۔ لیکن اگر وقف کی آمدنیوں سے اسے خریدا تو اس کا فروخت کرنا جائز ہے۔ اس میں قاضی کے ہونے وغیرہ کی کوئی شرط نہیں۔ کیونکہ ایسی خرید کردہ چیز کے وقف ہونے میں اختلاف ہے۔ مختار یہ ہے کہ یہ وقف نہیں ہے۔ لہٰذا متولی جب چاہے مصلحت پیش آنے کی صورت میں فروخت کر سکتا ہے۔ یہ مسئلہ اگلی فصل میں متن کے اندر آ رہا ہے)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبر آباد

❁❁❁❁❁

---

[1] رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۴۱۸ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

﴿فتوی نمبر...... 131﴾

سوال

ایک طوائف کی طرف سے فرانسیسی نے مسجد بنوادی اور وہ اس کے سامنے مدفون ہے۔ اس مسجد میں نماز نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں نے چھوڑ دیا ہے۔ اور فرانسیسی نے بقبضہ مسلمانان دے دی تھی۔ اب تکیہ کی زمین ہندو نے لی ہے مسجد کو بھی وہ کھودے گا لہذا اب حکم شرع شریف کیا ہے۔

سائل: حافظ تکیہ

ہنگ منڈی فروری ۱۹۱۶ء

الجواب

نماز اس مسجد میں ہو جائے گی مگر ثواب مسجد نہ ہوگا اور جب کہ مسجد کو قبضہ مسلمانوں میں دے دی ہے۔ تو پھر اس کو کھودنے کی اجازت نہیں ہے۔ خود مسلمان انتظام کریں۔ اور اپنے روپیہ سے بنوا دیں اور اس کے اثاثہ کو فروخت کر کے قرض ادا کر دیں تا کہ مسجد کا ثواب بھی ہو جائے۔ واللہ اعلم وحکمہ احکم۔

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......132﴾

سوال

مسجد کی تعمیر کے لیے رنڈی کچھ دینا چاہے تو اس کام کے واسطے لیا جائے یا نہیں؟ بینوا توجروا

سائل: ریاست لال گڑھ ضلع بلاس پور

۲۵ نومبر ۱۹۱۵ء

الجواب

وھو الصواب للحق والصواب

رنڈی کا روپیہ مسجد میں لگانا جائز نہیں ہے۔

☆ لأن حلوان الکاھن ومھر البغی لیس بطیب [1]

(ترجمہ: کیوں کہ کاہن کی مزدوری اور بدکار زانی عورت کا مہر پاکیزہ نہیں ہے)

واللہ اعلم بالصواب

عاجز محمد رمضان عفی عنہ

مفتی واعظ جامع مسجد آگرہ

۲۶ نومبر ۱۹۱۵ء

✿✿✿✿✿

---

[1] صحیح البخاری: حدیث رقم: ۲۲۸۲ صفحہ ۴۴۸ مطبوعہ: مکتبہ دار السلام ریاض میں ہے:

☆ ان رسول اللہ ﷺ نھی عن ثمن الکلب ومھر البغی وحلوان الکاھن

یہی الفاظ حدیث رقم: ۲۲۳۷ کے ہیں اور اس کے قریب الفاظ حدیث رقم ۵۳۴۶ اور ۵۷۶۱ کے ہیں۔

﴿فتویٰ نمبر......133﴾

سوال

علمائے دین وفقیہانِ شرعِ متین درجِ ذیل صورت حال کے بارہ میں ازروئے شرع کیاارشادفرماتے ہیں۔ یہ ریاست لال گڑھ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں ہندوراجہ بہادر ہیں۔ کامل الاختیار ہیں۔ پھانسی وغیرہ کااختیار بھی حاصل ہے۔ نہایت خلیق وسخی الصدر ہیں۔ اس بستی میں ہندوزیادہ مسلمان کم ہیں۔ دومسجدیں یہاں ہیں۔ ایک پختہ دوسری خام۔ سنہ حال میں خام مسجد کو پختہ بنانے کا اہلِ اسلام ارادہ کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پورا کرے۔ اس کام کے واسطے مبلغ آٹھ سوروپیہ جمع ہیں۔ قریب بارہ سو کے تخمینہ کیا گیا ہے۔ اس میں چندہ کیا جائے گااس چندہ میں اگرمہاراجہ صاحب کچھ امداد کریں تو مسجد میں خرچ کرسکتے ہیں یا کیا؟ یا کوئی اور ہندوبھی دینا چاہےتواس کولینا چاہیے یانہیں؟ بینوا توجروا

سائل: حاجی عبداللہ سوداگر۔

ریاست لال گڑھ ضلع بلاس پور

۲۵نومبر۱۹۱۵ء

الجواب

وھو الملھم للحق والصواب

چندہ مسجد میں سوائے اہل اسلام اور کسی کا نہ لگائیں گے۔ ہاں اگرکوئی غیرمذہب مسلمانوں کوروپیہ ہبہ کےطور پردے دےاوروہ مسلمان اپنی طرف سے مسجد میں لگادیں تو جائز ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

عاجز محمد رمضان عفی عنہ مفتی واعظ جامع مسجد آگرہ

۲۶نومبر۱۹۱۵ء

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......134﴾

سوال

مسجد کی تعمیر میں جو سامان لگایا جائے اس کو ہندو لوگ نفع یا کفایت سے دینا چاہیں تو خرید سکتے ہیں یا بازار بھاؤ جیسا کہ عام لوگ خرید کرتے ہیں۔ بینوا وتوجروا

سائل: حاجی عبداللہ
سوداگر ریاست لال گڑھ
ضلع بلاس پور
۲۵ نومبر ۱۹۱۵ء

الجواب

وھو الملھم للحق والصوب

ہنود سے خریدنا جائز ہے۔

واللہ اعلم بالصواب
عاجز محمد رمضان عفی عنہ
مفتی واعظ جامع مسجد آگرہ
مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۱۵ء

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......135﴾

سوال

ماقولکم رحمکم اللہ دریں مسئلہ ایک کہنہ مسجد جو بالکل منہدم اور ویران ہے، اس کے اینٹ پتھر وغیرہ سے دوسرے شہر یا قصبہ میں دوسری مسجد بنانا یا پتھر وہاں سے اس دوسری مسجد کے لئے اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟۔ یہ امر بھی واضح رہے کہ مسجد شکستہ کے قریب ایک اور ایسی مسجد ہے اور وہ بھی نمازیوں سے خالی ہے۔

سائل: واجد علی ساکن محلہ ٹیکا پور

۸شوال ۱۳۳۴ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

رب زدنی علما

اگر مسجد خراب شدہ اور اُس دوسری مسجد غیر آباد کے اینٹ پتھر وغیرہ ودیگر سامان کے تلف ہونے کا، اور لوگوں نے اس کو توڑ کر یا اس کے افتادہ سامان اینٹ پتھر وغیرہ کو لے جا کر، اپنے مکانوں میں لگانے کا خوف نہ ہو، جب تو بقولِ مفتی بہ اس کی کسی چیز اینٹ پتھر وغیرہ سے دوسری مسجد میں لگانا اور اُس سے دوسری مسجد بنانا ناجائز نہیں۔

کما فی الدر المختار:

و لو خرب ما حوله و استغنی عنه یبقی عندالامام و الثانی ابدا الی قیام الساعة و به یفتی حاوی قدسی[1] .

(ترجمہ: اگر مسجد کے اردگرد آبادی ویران ہو جائے اور اس کی ضرورت نہ رہے تو بھی وہ جگہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قیامت کے بپا ہونے تک مسجد ہی رہے گی اور فتوی اسی پر ہے "حاوی قدسی")

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ٦ صفحہ ۴۲۹ مطبوعہ بیروت

قال الشامی :

قوله (عند الامام و الثانی) فلا یعود میراثا ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیه أو لا. و هو الفتوی حاوی قدسی. و اکثر المشائخ علیه مجتبیٰ و هو الاوجه فتح[1] .

(ترجمہ: صاحب درِمختار نے فرمایا کہ حضرت امام اعظم اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک وہ جگہ مسجد ہی رہے گی۔ لہٰذا وہ جگہ دوبارہ میراث قرار نہیں پائے گی۔ نہ ہی اس مسجد کو وہاں سے منتقل کرنا جائز ہے اور نہ ہی اس کے مال کو دوسرے مسجد میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ خواہ لوگ اس میں نماز ادا کرتے ہوں یا نہ۔ یہی فتوی ہے ''حاوی قدسی'' اکثر مشائخ کا یہی موقف ہے۔ مجتبیٰ یہی اوجہ ہے فتح القدیر)

☆ اور اگر خوف اس امر کا غالب ہو کہ بعض خدانا ترس اس کے تمام یا بعض پتھروں کو لے کر گھروں میں لگا دیں گے اور تمام سامان یوں ہی ضائع ہو رہا ہے اور ہو جائے گا تو اس سے دوسری مسجد بنانا یا دوسری مسجد میں اس کا بعض سامان مایحتاج لگا دینا جائز ہے۔

کما فی الفتاوی العالم گیریه.

فی فتاوی النسفی سئل شیخ الاسلام عن اهل قریة افترقوا و تداعی مسجد القریة الی الخراب و بعض المتغلبة یستولون علی خشب المسجد و ینقلونه الی دیارهم هل لواحد من أهل القریة ان یبیع الخشب بامر القاضی و یمسک الثمن لیصرفه الی بعض المساجد او الی هذا المسجد قال نعم کذا فی المحیط[2].

(ترجمہ: فتاوی نسفی میں ہے کہ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ سے ایک گاؤں والوں کے بارے میں پوچھا گیا جو تتر بتر ہو گئے اور گاؤں کی مسجد ویران ہو گئی اور کئی زبردستی قبضہ کرنے والے مسجد کی لکڑیوں کے والی بن گئے وہ انہیں اپنے گھروں کی طرف لے جانے لگے۔ کیا گاؤں والوں میں سے کسی کو یہ اجازت ہے کہ قاضی کے حکم

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۶ صفحہ ۴۲۹ مطبوعہ بیروت

[2] الفتاوی العالم گیریه جلد ۲ صفحہ ۴۷۸، ۴۷۹ مطبوعہ مصر

سے لکڑیوں کو فروخت کردے اوران کی رقم اپنے پاس رکھیں تا کہ اسے کسی مسجد یا اسی مسجد پر خرچ کردے؟ تو انہوں نے جواب میں فرمایاہاں۔ اسے اجازت ہے۔ محیط میں اسی طرح ہے۔

و فی ردالمحتار :

و عن الثانی ینقل الی مسجد آخر باذن القاضی جزم به فی الاسعاف حیث قال ولوخرب المسجد و ماحوله و تفرق الناس عنه لا یعود الی ملک الواقف عند ابی یوسف فیباع نقضه باذن القاضی و یصرف ثمنه الی بعض المساجد[1] .

(ترجمہ: اور دوسرے امام یعنی امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ جب مسجد کے اردگرد سے آبادی ویران ہوجائے، تو وہ جگہ بانی کی ملک میں دوبارہ واپس نہیں آتی۔ بلکہ قاضی کے حکم سے اسے دوسری مسجد کی طرف منتقل کردیا جائے اسعاف میں اسی حکم پر جزم فرمایا ہے۔ کیونکہ صاحب اسعاف نے فرمایا' کہ اگر مسجد اور اس کا اردگرد ویران ہوجائیں اور لوگ وہاں سے بکھر جائیں تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ جگہ وقف کرنے والے کی ملکیت کی طرف واپس نہیں آتی۔ لہٰذا اس کا ملبہ قاضی کے حکم سے فروخت کردیا جائے گا اوراس کی قیمت کسی مسجد میں خرچ کردی جائے گی)

اور جو مسجد زیادہ تر اس مسجد خراب شدہ کے قریب ہو'وہ اس سامان کی حقدار ہے' اگر اس کو حاجت ہو۔

کما فی الدرالمختار

حشیش المسجد و حصیره مع الاستغناء عنهما و کذا الرباط والبئر اذا لم ینتفع بهما فیصرف و قف المسجد والرباط والبئر والحوض فی اقرب مسجد او رباط او بئر او حوض الیه[2]

---

[1] رد المحتار — جلد ۴ صفحہ ۳۵۹ — مطبوعہ مصر

[2] الدر المختار مع المحتار — جلد ۴ صفحہ ۳۵۹ — مطبوعہ مصر

☆(ترجمہ: مسجد کا گھاس اور اس کی چٹائیاں' جب ان کی ضرورت نہ رہے☆اور اسی طرح سرائے اور کنواں کا حکم ہے' کہ جب ان سے نفع نہ اٹھایا جاتا ہو' تو مسجد' سرائے' کنوئیں اور حوض کی وقف اشیاء اس کے قریب ترین مسجد یا سرائے یا کنوئیں یا حوض پر صرف کر دی جائیں)

حررہ:

المفتی ابو محمد محمد دیدار علی مفتی

جامع مسجد اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر...... 136﴾

سوال

علمائے دین ومفتیانِ شرع متین درج ذیل سوالات کے بارے میں از روئے شرع شریف کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

1۔ خام مسجد کو شہید کر کے پختہ بنا سکتے ہیں؟

2۔ خام مسجد کی دیواروں کی مٹی لکڑی وغیرہ فروخت کر کے اس کی قیمت کو پختہ مسجد میں لگا سکتے ہیں؟ فروخت کرنے میں کیا ہندو مسلمان کا خیال کیا جائے؟۔ اور سامان مسجد کا خواہ ہندو خریدیں یا مسلمان تو وہ ہر جگہ استعمال میں لا سکتے ہیں۔ جیسا کہ مکان بنوانا یا احاطہ کی دیواروں میں یا کوئی نجس جگہ اس مٹی سے دیوار اٹھوائیں تو جائز ہے یا کیا؟۔ بینوا توجروا

الجواب

هو الملهم للحق والصواب

جدید مسجد بنالینا اور مسجد کو منہدم کر کے اس کی اشیاء بعد فروخت جدید مسجد میں لگانا جائز ہے جیسا کہ نفع المفتی والسائل [1] میں ہے۔ پس ضرورت میں بیع جائز ہے۔ مشتری خواہ ہندو ہو خواہ مسلمان کوئی خاص قوم نہیں ہوسکتا۔ واللہ اعلم بالصواب

عاجز محمد رمضان عفی عنہ مفتی واعظ جامع مسجد آگرہ ۲۶ نومبر ۱۹۱۵ء

---

[1] نفع المفتی والسائل مشموله مجموعة اللكنوی جلد ۴ صفحه ۱۸۴ مطبوعه: ادارة القرآن والعلوم الاسلامیه کراچی میں ہے:

الاستفسار: مسجد غير منهدم هل يجوز الناس أن يهدموه ليبنوه احكم من الأول.

الاستبشار: لا يجوز أن يخاف انهدامه فيجوز لأهل المحلة لا لغيرهم أن يهدموه ويبنوه استحكاما من مال انفسهم لا من مال الوقف كذا فی السراج المنير عن فتاوی ابراهيم شاهی.

ترجمہ: سوال: مسجد غیر منہدم ہے کیا لوگوں کے لیے جائز ہے کہ اس کو منہدم کر کے پہلی مسجد سے زیادہ مضبوط عمارت بنالیں۔

جواب: عام لوگوں کے لیے اس کا ازسرِنو بنانا صرف اس صورت میں جائز ہے کہ اس کے منہدم ہونے کا خوف ہو۔ مضبوط ترتعمیر کے لیے اہلِ محلّہ کو اجازت ہے کہ اس کو منہدم کریں اور محکم تر عمارت بنالیں۔ اہلِ محلّہ کو بھی نئی عمارت اپنے مال سے بنوانے کی اجازت ہے وقف کے مال سے اجازت نہیں۔ سراج منیر۔ فتاویٰ ابراہیم شاہی۔

﴿فتویٰ نمبر...... 137﴾

سوال

علمائے دین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں' کہ ریاست گوالیار میں ایک بیوہ عورت کے دو مکان ہیں۔ اور اس کی ایک مسجد بھی ہے اور ایک مسجد پنچائتی ہے۔ لیکن وہ دونوں مسجدیں ویران ہیں اور وہ محلّہ بھی ویران ہے۔ بسبب روزگار کے وہ بیوہ عورت آگرہ کو چلی آئی ہے' اور اس کا کوئی وارث نہیں ہے۔ ایک شخص گوالیار سے آیا ہے اور اس بیوہ عورت سے کہا کہ تیرے مکان کو سرکار ضبط کرنے لگی ہے یا تو تم چل کر مکان کو آباد کردٗیا مکان کو مسجد کے نام کردوٗ تو تمہارے مکان اس ذریعہ سے بچادیں گے۔ اس بیوہ عورت نے اپنی زبان سے کہدیا کہ مکان میں نے مسجد کے نام کئے۔ اس کو عرصہ چار سال کا ہوا۔ لیکن اب وہ بیوہ عورت بہت مفلس و لاچار ہے۔ لہٰذا وہ چاہتی ہے کہ مکانوں کو فروخت کرکے کچھ روپیہ مسجد کی مرمت میں لگادے۔ اور کچھ روپیہ سے اپنی اوقات بسر کرے۔

الجواب

وهو الموفق للصواب.

بسم الله الرحمن الرحيم.

اللهم رب زدني علما

صورتِ مسئولہ میں فقط اتنا کہہ دینے سے کہ میں نے مکان مسجد کے نام کئے وقف تمام نہیں ہوتا تاوقتیکہ کسی متولی کے سپرد نہ کردیا جائے۔

كما فى الدر المختار:

ولا يتم الوقف حتى يقبض و لم يقل للمتولى لان تسليم كل شئ بما يليق به ففى المسجد بالافراز و فى غيره بنصب المتولى و تسليم اياه ابن كمال[1].

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ٦ صفحه ۱۷، ۴۱۸ ۴ دار احياء التراث العربى بيروت

(ترجمہ: وقف کامل نہیں ہوتا جب کہ واقف قبضہ نہ دے دے۔ یہ نہ فرمایا' کہ جب تک متولی کو قبضہ نہ دے' کیوں کہ ہر شے کی سپردگی اس طرح سے ہوتی ہے جو اسکے مناسب ہو۔ مسجد میں جگہ کو علیحدہ کردینے سے اور اس کے علاوہ باقی چیزوں میں متولی مقرر کرنے اور اس کو سپرد کرنے سے وقف تام ہوتا ہے۔ ابن کمال)

اور جب وقف تمام نہیں ہوا اور واقفہ بہت تنگ دست اور مسجدیں ویران بھی ہیں اور محلّہ بھی ویران ہے اس واقفہ بیوہ کو اس کو بیچ کر اپنے صرف میں لانا جائز ہے اگر فی الواقع سوال مذکور صحیح ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ بعد الوقف کسی کو متولی مقرر کر کے اس کے سپرد نہیں کیا تھا۔ فقط واللہ اعلم

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی

ابومحمد محمد دیدار علی مفتی

جامع مسجد اکبرآباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......138﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ مسجد کس کو کہتے ہیں۔ میرا علم عربی ناکافی ہے اس قدر لیاقت نہیں ہے کہ میں رموز اور نکاتِ زبانِ عربی کو قابلِ اطمینان طور پر سمجھ سکوں لیکن بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ (حد مسجد) کی صحیح تعبیر ہو جانے سے مسئلہ متنازعہ فیہ اس مقدمہ کا حل ہو جائے گا۔ مسجد اس جگہ کو کہتے ہیں کہ جس پر سجدہ کیا جائے اور حد اس سطح ارضی کو کہتے ہیں جو ہمارے مدرکات ظاہری (یعنی بصارت وسماعت وغیرہ) سے محدود ہو سکے۔ میری ناقص رائے میں طبقاتِ تحتِ سطحِ ارض حدِ شرعی میں داخل نہیں ہو سکتی۔ اگر میری یہ رائے صحیح ہے تو سجدہ گاہ کے نیچے اگر دکانیں واسطے مصالحِ مسجد کے بنائی جائیں کہ ان سے آمدنی واسطے مصارفِ ضروری مسجد کے اور واسطے مرمت وقیامِ آئندہ عمارتِ مسجد کے پیدا ہو جائے یعنی وہ مسجد کی حد کے باہر متصور ہوں گی کیونکہ بوقتِ نماز وہ دکانیں ہماری قوت اور حدِ بصارت کے باہر ہوں گی چونکہ مجھ کو اعتراف اپنی ناقابلیت کا ہے لہٰذا میری یہ ناچیز رائے واسطے منظوری یا ترمیم و تنسیخ کے خدمت عالی میں جناب مفتی صاحب زاد اللہ افضالکم بغرض میری ہدایتِ آئندہ کے پیش ہو۔

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

فی الواقع مسجد کے معنی لغوی سجدہ گاہ کے ہی ہیں جیسے صلوۃ کے لغوی معنی تحریک الصلوین یعنی کولھے ہلانے کے ہیں مگر جیسے اصطلاحِ شریعت میں صلوۃ بموجبِ بیانِ شارع علیہ السلام ارکانِ مخصوصہ کو کہتے ہیں علی ہذا مسجد حسبِ بیانِ شارع علیہ السلام اس زمین کو کہتے ہیں جس کو مالکِ زمین اپنے قبضہ سے نکال کر عام مسلمانوں کو ہمیشہ کے واسطے بغیر کسی کی شرکت کے اللہ واسطے وقف کر دے۔

چنانچہ علامہ ابن ہمام صفحہ ۴۴۵ جلد خامس فتح القدیر مطبوعہ مصر میں

ماتحت عبارتِ ھدایہ :

و من اتخذ ارضه مسجدا لم يكن له ان يرجع ولا يبيعه ولا يورث عنه[۱]

☆(ترجمہ: جس شخص نے اپنی زمین کو مسجد بنادیا اس کو یہ حق حاصل نہیں کہ اسے دوبارہ اپنی ملکیت میں لوٹا لے۔نہ ہی وہ اسے فروخت کرسکتا ہے اور نہ ہی یہ اس کی میراث بن سکتی ہے)

تحریر فرماتے ہیں:

يعنى بعد صحته بشرطه و فى فتاوى قاضى خان رجل له ساحة لا بناء فيها امر قوما ان يصلوا فيها بجماعة قالوا ان امرهم بالصلوة فيها ابدا و امرهم بالصلوة بجماعة و لم يذكر الابد إلا أنه أراد الأبد ثم مات لا يكون ميرا ثا عنه[۲]

(ترجمہ: یہ احکام زمین کے شرائط کے ساتھ صحیح طور پر مسجد بننے کے بعد ہیں۔فتاوی قاضی خان میں ہے ایک شخص کے پاس کھلا میدان ہے جس میں کوئی عمارت نہیں مالک نے لوگوں کو اس میں باجماعت نماز ادا کرنے کا حکم دیا تو علماء نے فرمایا اگر مالک نے ان کو اس جگہ ہمیشہ کے لیے نماز ادا کرنے کا حکم دیا یا ان کو باجماعت نماز ادا کرنے کا حکم دیا اس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے نہ کہا لیکن اس کی نیت ہمیشہ کے لیے تھی اس کے بعد وہ مالک مرگیا تو وہ میدان اس کی میراث قرار نہ پائے گا)

اور ماتحت عبارة هداية

و من جعل مسجدا تحته سرداب او فوقه بيت و جعل باب المسجد الى الطريق و عزله عن ملكه فله ان يبيعه و ان مات يورث عنه[۳]

☆(ترجمہ: ہدایہ میں ہے کہ جس شخص نے مسجد یوں بنائی کہ اس کے نیچے (اپنی ملکیت برقرار رکھ کر) تہہ خانہ

۱۔ الهدايه مع الشروح — جلد ۵ صفحه ۶۴ — المطبعة الكبرى مصر
۲۔ فتح القدير — جلد ۵ صفحه ۶۴ — المطبعة الكبرى مصر
۳۔ الهدايه مع الشروح — جلد ۵ صفحه ۶۳ — المطبعة الكبرى مصر

یا اس کے اوپر گھر بنایا اور مسجد کا دروازہ رستے کی طرف بنا دیا نیز اسے اپنی ملکیت سے جدا کر دیا اس کو اختیار ہے کہ اس کو فروخت کر دے اور اگر مر جائے گا تو یہ اس کی میراث قرار پائے گی۔

ہدایہ کی اس عبارت کے تحت صاحب فتح القدیر نے ارشاد فرمایا کہ:

لانه لم يختص لله تعالىٰ لبقاء حق العبد فيه [1]۔

(ترجمہ اس حکم کی وجہ یہ ہے کہ وہ جگہ اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص نہیں ہوئی کیونکہ اس کے اوپر یا نیچے بندے کا حق باقی ہے)

علامہ اکمل الدین رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب عنایہ مصری صفحہ ۴۴۴ جلد خامس ہدایہ مع الشروح میں تحریر فرماتے ہیں:۔

قوله فله ان يبيعه اى لا يكون مسجدا و هوظاهر الراوية لان المسجد ما يكون خالصا له تعالىٰ قال الله تعالىٰ و أن المساجد لله اضاف المسجد الى ذاته مع ان جميع الا ما كن له فاقتضى ذلک خلوص المساجد لله تعالىٰ و مع بقاء حق العباد فى اسفله اوفى علاه لا يتحقق الخلوص [2]

(ترجمہ: صاحب ہدایہ نے فرمایا اس مسجد کے بانی کو اسے فروخت کرنے کا حق حاصل ہے یعنی وہ جگہ مسجد قرار نہ

---

[1] فتح القدیر کی اصل عبارت یوں ہے:

والمسجد خالص لله سبحانه ليس لأحد فيه حق قال الله تعالى وأن المساجد لله مع العلم بأن كل شيء له فكان فائدة هذه الإضافة اختصاصه به وهو بانقطاع حق كل من سواه عنه وهو منتف فيما ذكر
(جلد ۵ صفحه ٦٣ مطبوعه مصر)

ترجمہ: مسجد خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتی ہے۔ اس میں کسی کا حق نہیں ہوتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے مسجدیں اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ باوجود اس کے کہ یہ معلوم ہے کہ ہر شی اسی کی ہے تو اس اضافت کا فائدہ یہ ہوا کہ مساجد اس کے ساتھ مخصوص ہو گئیں۔ اللہ کے ساتھ ان کا اختصاص اس وقت ہوگا جب اس کے سوا ہر کسی کا حق ان سے منقطع ہو جائے اور مذکورہ صورت میں یہ منتفی ہے۔

[2] العناية على الهداية على هامش فتح القدير جلد ۵ صفحه ٦٣ مطبوعه مصر

پائے گی۔ یہی ظاہر روایت ہے کیوں کہ مسجد وہ جگہ ہوتی ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو ارشاد باری تعالیٰ ہے (اور مسجد یں صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتی ہیں) اس میں اللہ تعالیٰ نے مساجد کی نسبت اپنی ذات کی طرف فرمائی جب کہ تمام جگہیں اسی کی ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ مسجد یں خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہوں اور اگر کسی بندے کا حق مسجد کے اوپر یا نیچے باقی ہو تو وہ جگہ خالص اللہ تعالیٰ کے لیے نہ ہوئی)

اور جب یہ ثابت ہو چکا کہ روایت عدمِ جوازِ مکان یا دوکان کرایہ اور سکونت ظاہر الروایۃ ہے اور اس کے مقابلہ میں روایات ضعیفہ کا جن کا امام سے مروی ہونا مشکوک ہے اور پچھلے بعض فقہا کے اقوال مروی ہیں وہ ہرگز قابل اعتماد نہیں ہو سکتے خصوصاً ایسے اقوال جو مخالف ہوں سیاقِ کلامِ مجید کے (سورہ جن) اللہ جل شانہ اپنی مقدس کتاب میں ارشاد فرماتا ہے۔

ان المساجد لله فلا تدعوا مع الله احدا [1].

(ترجمہ: مسجد یں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں لہٰذا اس کے ساتھ کسی اور کی عبادت مت کرو)

علامہ جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں :۔

ان المساجد مواضع الصلوة لله فلا تدعوا مع الله احدا بان تشركوا كما كانت اليهود والنصارى اذا دخلو كنائسهم و بيعهم اشركوا [2]

(ترجمہ: مسجد یں یعنی نماز ادا کرنے کے لیے مقامات اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کی عبادت مت کرو۔ یوں کہ اس کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہراؤ جس طرح کہ یہودی اور عیسائی اپنے گرجا گھروں اور عبادت خانوں میں جاتے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اوروں کو شریک ٹھہرایا کرتے تھے)

علامہ ابن نجیم بحر الرائق مطبوعہ مصر کے صفحہ ۲۰ جلد خامس میں تحریر فرماتے ہیں

و حاصله ان شرط كونه مسجدا ان يكون سفله وعلوه مسجد اينقطع حق العبد

---

[1] القرآن الحکیم سورۃ الجن آیت ۱۸

[2] تفسیر الجلالین علی ہامش الفتوحات الإلهيه جلد ۴ صفحه ۴۲۱، ۴۲۲ مطبوعه مصر

عنـه لقوله تعالي و ان المساجد لله بخلاف ما اذا كان السرداب او العلوموقوفا لمصالح المسجد فانه يجوز اذ لا ملک فيه لاحد بل هو من تتميم مصالح المسجد فهو كسرداب مسجد بيت المقدس هذا هو ظاهر المذهب و هناک روايات ضعيفة مذكورة في الهداية و بمـا ذكرنـا علم ان لو بني بيتا علي سطح المسجد لسكني الامام فانه لا يضر في كونه مسـجدا لانه من المصالح فان قلت لوجعل مسجد اثم ارادان يبني فوقه بيتا للامام او غيره هل له ذلک قلت قال في التتار خانية اذا بني مسجد ا و بني غرفة و هو في يده فله ذلک و ان كـان حيـن بنـاه خـلـي بينـه و بين الناس ثم جاء بعد ذلک يبني لا يتركه و في جامع الفتاوي اذا قال عنيت ذلک فانه لا يصدق فاذا كان هذا في الواقف فكيف لغيره فمن بني بيتـا علي جدار المسجد وجب هدمه ولا يجوز اخذا الاجرة وفي البزازية و لا يجوز للقيم ان يجعل شيئا من المسجد مستغلا ولا مسكنا[1]۔

(ترجمہ: خلاصہ یہ ہے کہ کسی جگہ کے مسجد قرار پانے کی شرط یہ ہے کہ اس کے اوپر اور نیچے والا حصہ مسجد ہی ہوتا کہ بندوں کا حق اس سے منقطع ہو جائے کیوں کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ ''مسجدیں اللہ تعالی کے لیے ہوتی ہیں'' اگر اس کے خلاف مسجد کے نیچے کا تہہ خانہ یا اس کے اوپر کا مقام مسجد کے مصالح کے لیے ہو تو وہ جائز ہے کیوں کہ اس میں کسی بندے کی ملک باقی نہیں ہے۔ بلکہ وہ مسجد کے مصالح کی تکمیل کے لیے ہے وہ بیت المقدس کی مسجد کے تہہ خانہ کی مانند ہو جائے گا۔ یہ ظاہر مذہب ہے۔ اس مقام پر ضعیف روایات بھی ہیں جو ہدایہ میں مذکور ہیں۔ اور جو ہم نے ذکر کیا اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر مسجد کی چھت پر امام کی رہائش کے لیے گھر تعمیر کیا جائے تو اس سے اس کے مسجد ہونے کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا کیوں کہ یہ مسجد کے مصالح میں داخل ہے۔ اگر تم کہو اگر کسی نے مسجد بنادی پھر اس کے اوپر امام یا کسی اور کی رہائش کے لیے مکان بنادیا تو کیا مسجد کے بانی کو اس کا اختیار ہے؟ میں کہتا ہوں فتاوی تاتارخانیہ میں فرمایا کہ جب بانی نے مسجد بنائی اور اس پر کمرہ بنالیا جب کہ وہ ابھی اس

---

[1] البحر الرائق جلد ۵ صفحہ ۲۷۱ دار المعرفہ بیروت

کے قبضہ میں ہے تو اسے اس کی اجازت ہے۔ اور جب اس نے اسے مسجد قرار دے دیا اور اس جگہ کو لوگوں کے لیے چھوڑ دیا پھر اس کے بعد آیا تا کہ اوپر کمرہ بنائے تو اسے اس کی اجازت نہ دی جائے گی۔ جامع الفتاوی میں ہے اگر وہ کہے کہ میرا ایسا کرنے کا پہلے سے ارادہ تھا تو اس کی تصدیق نہ کی جائے گی جب حکم وقف کرنے والے کے لیے یہ ہے تو دوسرے کا کیا حال ہوگا۔ لہٰذا جو شخص مسجد کی دیوار پر گھر بنائے اس کو گرا دینا واجب ہے اور اس کی اجرت لینا درست نہیں۔ فتاوی بزازیہ میں ہے کہ متولی کے لیے مسجد کے کسی حصہ کو نہ آمدنی کا ذریعہ بنانا جائز ہے اور نہ ہی سکونت کا مکان)

حررہ:

العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی

جامع مسجد اکبر آباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......139﴾

سوال

جس امام اور خطیب کی اولاد جاہل اور نا قابلِ امامت ہو اور تحصیل علومِ دین اور ضروریاتِ دین میں کوشش نہ کرے وہ مستحق وظائفِ معینہ کے باوصف عدم اداءِ خدماتِ معینہ ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ فقط

الجواب

صفحه ٢١٠ جلد اول تنقيح الفتاوى الحامدية

قال مولانا العلامة صاحب الخزانة ناقلا عن مبسوط فخر الاسلام بنص و اذا مات من له وظيفة فى بيت المال لحق الشرع واعتزاز الاسلام كاجراء الامامة و التاذين و غير ذلک مما فيه صلاح الاسلام والمسلمين و للميت ابناء يراعون و يقيمون حق الشرع و اعزاز الاسلام كما يراعى او يقيم الاب للامام ان يعطى وظيفة الاب لابناء الميت لا لغيرهم لحصول مقصودا لشرع والجبار كسر قلوبهم[1]

☆ ترجمہ: یعنی علامہ جامع خزانۃ الروایات' مبسوط فخر الاسلام رحمۃ اللہ علیہ سے اس طرح نقل فرماتے ہیں' کہ جس کسی کا وظیفہ بیت المال سے کسی حق شرعی کی وجہ سے مثل اجرا امامت اور اذان وغیرہ کے یعنی اس قسم کے امور کی وجہ سے جس میں اسلام اور مسلمانوں کی بہتری ہو (مقرر ہو) اور وہ شخص مر جائے۔ اور میت ایسی اولاد چھوڑے جو اپنے باپ کی طرح حقوقِ شرع ادا کرتی ہو اور خدماتِ دینی بدستور انجام دیتی ہو' تو حاکم پر لازم ہے کہ باپ کا وظیفہ اس کی اولاد کو بدستور دیتا رہے۔ اور ان سے چھین کر ان کا وظیفہ کسی غیر کو ہر گز نہ مقرر کرے کہ

---

[1] تنقيح الفتاوى الحامديه : جلد اول صفحه ٢١٩ المكتبه الحبيبيه كوئٹه

نوٹ: تنقيح الفتاوى الحامديه میں ''اجراء الامامة'' کے الفاظ ہیں جب کہ رد المحتار میں ''اجر الامامة'' کے الفاظ ہیں یہ ترجمہ رد المحتار کی عبارت کے مطابق ہے۔

فقیر مرتب عفی عنہ

بہ سبب حاصل ہونے مقصودِ شرعی یعنی خطابت وامامت کے اس کی اولاد سے بدستور اور دلداری اس امام کی اولادِ شکستہ دل کی۔

کہ یہ امر بہت ہی کچھ موجبِ اجرِ عظیم ہے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است

از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

☆ ہاں البتہ اگر اولاد اس امامِ متوفی یعنی اپنے باپ کے طریق پر نہ چلے اور مشغول لہو ولعب یا امورِ دنیوی رہ کر جاہل رہ جائے تو وہ ہرگز مستحقِ وظائفِ معینہ نہیں رہتی۔ امامِ دین اور حاکمِ شرع کو چاہئے کہ اس کو موقوف کر کے اس خدمت پر دوسرے شخص کو مقرر کرے اور اس کا وظیفۂ خدمت جو حقدارِ خدمت ہو اس کو دے ورنہ دو گناہوں کا بار بذمۂ حاکم رہے گا۔ ایک غیر حقدارِ وظیفہ ءخدمت کو دے کر بے محل مال بیت المال کا صرف کرنا دوم حقدارِ خدمت سے اس کا حق روکنا۔

چنانچہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ ص ۳۸۰ جلد ثالث ردالمحتار شرح درمختار میں بعد تحریر عبارتِ مذکورہ تنقیح حامدیہ اس طرح فرماتے ہیں۔

قال البیری اقول هذا موید لما هو عرف الحرمین الشریفین و مصر و الروم من غیر نکیر من ابقاء ابناء المیت و لو کانوا صغارا علی وظائف آبائهم مطلقا من امامة و خطابة و غیر ذلک عرفا مرضیا لان فیه احیاء خلف العلماء و مساعدتهم عن بذل الجهد فی الاشتغال بالعلم و قد افتی بجواز ذلک طائفة من اکابر الفضلاء الذین یعول علی افتائهم ۱۰ ھ.

قلت و مقتضاه تخصیص ذلک بالذکور دون الاناث و انت خبیر بان الحکم یدور مع علته فان العلة هی احیاء خلف العلماء و مساعدتهم علی تحصیل العلم فاذا اتبع الابن طریقة والده فی الاشتغال بالعلم فذالک ظاهر وأما اذا اهمل ذلک و اشتغل باللهو واللعب او فی امور الدنیا جاهلا غافلا معطلا للو ظائف المذکورة او ینیب غیره من اهل

العلم بشيء قليل و يصرف باقي ذلک فی شهواته فانه لا يحل لما فيه من اخذ وظائف العلماء و ترکهم بلا شي يستعينون به على العلم کما هو الواقع فی زماننا فان عامة اوقاف المدارس والمساجد والوظائف فی ايدی جهلة اکثرهم لا يعلمون شيًا من فرائض دينهم و ياکلون ذلک بلا مباشرة ولا انابة بسبب تمسکهم بان خبز الاب لابنه فيتوارثون الوظائف ابا عن جد کلهم جهلة کالانعام و يکبرون بذلک فراهم و عمائمهم و يتصدرون فی البلدة حتى أدى الى اندارس المدراس والمساجد و اکثرها صار بيوتا باعوها و بساتين استغلوها فمن اراد ان يطلب العلم لا يجدله ماوی يسکنه ولا شيًا ياکله فيضطر الى ان يترک العلم. و يکتسب ووقع فی زماننا ان رجلا من اکابر دمشق مات عن ولد اجهل منه ولا يقرا ولا يکتب فوجهت من وظائفه تولية مسجد و مدرسة على رجلين من اعلم علماء دمشق فذهب ولده و عزلهما عن ذلک بالرشوة .

و فی اواخر الفن الثالث من الاشباه اذا ولى السلطان مدرسا ليس باهل لم تصح توليته.

و فی البزازية السلطان اذا اعطى غير المستحق فقد ظلم مرتين بمنع المستحق و اعطاء غيره.

ففی توجيه هذه الوظائف لابناء هولاء الجهلة ضياع العلم والدين و اعانتهم على اضرار المسلمين فيجب على ولاة الامور توجيها على اهلها و نزعهامن ايدی غير الاهل واذا مات احدمن اهلها توجه على ولده فان لم يخرج على طريقة والده يعزل عنها و توجه للاهل اذ لاشک ان غرض الواقف احياء وقفه من ذلک فکل ما کان فيه تضييعه فهو مخالف لغرض الشرع والواقف هذا هو الحق الذی لا محيد عنه ولا حول ولا قوة الا بالله العلى العظيم[۱] .

---

[۱] رد المحتار: جلد ٣ صفحه ٣٠٧، ٣٠٨ مکتبه رشيديه کوئته

(ترجمہ: حضرت علامہ بیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس امر کی تائید حرمین شریفین' مصر اور روم کے عرف (رسم ورواج) سے ہوتی ہے جس کا کسی نے انکار نہیں کیا کہ مرحوم علماء کی اولاد کو مطلقاً ان کے آباء واجداد کے وظائف پر بر قرار رکھا جاتا ہے۔ خواہ ان کی ملازمت خطابت ہو یا امامت ہو یا اس کے علاوہ اور کچھ ہو۔ یہ ایک پسندیدہ رواج ہے۔ کیونکہ اس میں علماء کرام کی اولاد کی پرورش اور حصولِ علم میں ان کی مشغولیت کی کوشش پر امداد ہوتی ہے۔ اس کے جواز پر اکابر علماء کی ایک ایسی جماعت نے فتویٰ دیا ہے' جن کے فتویٰ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے)

میں کہتا ہوں اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان وظائف کو صرف مردوں کے حق میں بر قرار رکھا جائے' مستورات کو یہ وظائف سپرد نہ کیے جائیں۔ اور تمہیں علم ہے کہ حکم اپنی علت کے ساتھ ساتھ دائر ہوتا ہے۔ اس حکم کی علت علمائے کرام کی اولادوں کی پرورش اور حصولِ علم میں ان کی معاونت ہے۔ لہٰذا علم کی مشغولیت میں اگر بیٹا باپ کے طریقہ کی اتباع کرے' تو اس صورت کا حکم ظاہر ہے۔ لیکن جب وہ اس کو چھوڑ دے' لہو ولعب اور دنیاوی امور میں مشغول رہے۔ خود جاہل' غافل اور بے کار ہو لیکن اہلِ علم میں کسی اور کو حقیر معاوضہ پر اپنا نائب بنا لے اور باقی آمدنی کو اپنی خواہشات پر صرف کرے تو یہ جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں علماء کے وظائف پر قبضہ اور انہیں بغیر کسی معقول معاوضہ کو چھوڑ دینا ہے جس سے وہ اپنے علمی اضافہ میں مدد حاصل کر سکیں۔ جس طرح کہ ہمارے زمانہ میں یہ واقع ہے۔ مدارس اور مساجد کے عام اوقاف اور ان کے وظائف جاہلوں کے قبضہ میں ہیں۔ وہ اپنے دین کے فرائض بالکل نہیں جانتے اور بغیر کام کاج کیے اور بغیر کسی اور کو نائب مقرر کیے ان اوقاف کو کھا رہے ہیں۔ ان کی دلیل یہ مشہور کہاوت ہے "باپ کی روٹی بیٹے کے لیے ہوتی ہے" وہ ان وظائف کے یکے بعد دیگرے آباء واجداد سے وارث چلے آتے ہیں جو سارے کے سارے حیوانوں کی طرح جاہل ہیں۔ اس کے ذریعہ سے وہ بڑی بڑی پوستینیں اور دستاریں پہنتے ہیں۔ شہروں میں صدارت کے مقام پر براجماں ہوتے ہیں۔ اور اس کی بدولت مدارس اور مساجد مٹ گئے۔ ان میں اکثر گھر بن چکے جن کو انہوں نے فروخت کرایا ہے یا باغات بنا کر ان کو آمدنی کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ جو شخص اب علم حاصل کرنا چاہے اس کے لیے کوئی ٹھکانا نہیں جہاں وہ سکونت اختیار کر سکے اور کوئی چیز کھانے کو نہیں۔

لہٰذا مجبور ہو کر وہ علم کو خیر باد کہنے اور کمانے میں لگ جاتا ہے۔

ہمارے زمانہ کا واقعہ ہے کہ دمشق کے اکابر سے ایک شخص مر گیا۔ اس نے ایک لڑکا چھوڑا جو اس سے زیادہ جاہل تھا۔ نہ لکھنا جانتا تھا نہ پڑھنا۔ لہٰذا مسجد اور مدرسہ کی تولیت کے فرائض دو ایسے آدمیوں کے سپرد کر دیے گئے' جو دمشق کے علماء میں سب سے بڑے عالم تھے۔ اس کا لڑکا گیا رشوت دے کر ان دونوں کو اس عہدہ سے معزول کر دیا۔

الاشباہ کے فن ثالث کے آخر میں ہے کہ اگر بادشاہ کسی شخص کو تدریس کی تولیت عطا کرے جو اس کا اہل نہیں تو اس کا متولی بنانا درست نہیں۔

فتاوی بزازیہ میں ہے کہ بادشاہ جب غیر مستحق کو کوئی چیز دیتا ہے تو وہ دوہرا ظلم کرتا ہے پہلا یہ کہ وہ مستحق کو محروم کرتا ہے دوسرا یہ کہ غیر مستحق کو دیتا ہے۔

ان وظائف کو ان جاہلوں کی اولادوں کے سپرد کرنے میں علم اور دین کا نقصان ہے۔ نیز ان کی اس پر امداد کرتا ہے کہ وہ اہلِ اسلام کو نقصان پہنچائیں۔ لہٰذا معاملات کے نگرانی کرنے والے لوگوں پر واجب ہے کہ ان وظائف کو اہل لوگوں کے سپرد کریں اور نا اہل لوگوں کے ہاتھوں سے ان کو چھین لیں۔ جب ان وظائف کے اہل لوگوں میں کوئی مر جائے تو یہ ذمہ داری اس کے بیٹے کی طرف سپرد کی جائے اگر وہ اپنے والد کے طریقہ پر چلنے والا نہ نکلے تو اسے معزول کر کے کسی اہل شخص کے سپرد کی جائے۔ کیونکہ بلاشبہ واقف کی غرض اس کے وقف کا باقی رہنا ہے۔ اور ہر وہ صورت جس میں وقف کا ضیاع ہو وہ شارع اور واقف کی غرض کے مخالف ہے۔ یہی سچی بات ہے اس سے اعراض نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے بغیر نہ طاقت ہے اور نہ ہی قوت وہ برتر اور با عظمت ہے)

حررہ:

العبد الراجی رحمۃ ربہ الغنی

ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی مفتی

جامع مسجد اکبر آباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر...... 140﴾

سوال

زید ایک مسجد کا متولی تھا اس کے مرنے کے بعد اس کا لڑکا متولی ہوا جو متشرع متدین اور احکامِ اسلام کا سچا حامی اور پورا منتظم ہے وہ تولیت اس کے حصہ میں آئی تو بغیر اس کے کہ اس کی شرعی حالت میں کوئی عینی اختلاف واقع ہوا اس سے تولیت کی واپسی جائز ہے یا نہیں۔

الجواب

اس واقف کی جانب سے جو متولی ہو یا خود واقف متولی ہو اور امانت دار دیندار ہو اس کو تولیت سے معزول کرنا ہرگز جائز نہیں اور اگر اس کو باوجود امین ومتدین ہونے کے معزول کر کے دوسروں کو متولی بنا دے تو شرعا دوسرے کی تولیت صحیح نہ ہوگی۔ کما فی الدر المختار

فلو ما مونا لم تصح تولية غيره اشباه[1].

(ترجمہ: واقف نے خود کسی کو متولی بنایا اس متولی نے کسی دوسرے کو متولی بنایا تو اگر وہ امین ہے تو کسی اور کو متولی بنانا درست نہیں ہے)

قال الشامی

قوله فلو ماموناً لم تصح تولية غيره قال فی شرح الملتقی معزيا الی الاشباه لا يجوز للقاضی عزل الناظر المشروط له النظر بلا خيانة ولو عزله لا يصير الثانی متوليا ويصح عزل الناظر بلا خيانة لو منصوب القاضی ای لا الواقف[2]

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ٦ صفحه ۴۵۴ مطبوعه دار احياء التراث العربی بيروت

[2] رد المحتار جلد ٦ صفحه ۱۸۵۴ مطبوعه دار احياء التراث العربی بيروت

نوٹ محولہ بالا نسخہ میں کچھ الفاظ غلط طبع ہوئے ہیں نقل میں اُن کی تصحیح کر دی گئی ہے

(ترجمہ: اگر وہ امین ہے تو کسی اور کو متولی بنانا درست نہیں۔ شرح الملتقی میں الاشباہ کی طرف منسوب یہ جزیہ درج ہے۔ قاضی کے لیے خیانت کے بغیر اس متولی کو معزول کرنا جائز نہیں جس کی تولیت کی واقف نے شرط لگائی ہو۔ اگر قاضی اسے معزول بھی کرے گا تو دوسرا قاضی کا مقرر کردہ متولی شرعا متولی نہ ہوگا اور اگر قاضی نے کسی کو متولی بنایا تو اسے خیانت کے بغیر بھی معزول کرنا درست ہے۔ واقف کے مقرر کردہ متولی کو معزول کرنا درست نہیں ہے) فقط

حررہ العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابومحمد محمد دیدارعلی الرضوی الحنفی
جامع مسجد اکبرآباد

﴿فتویٰ نمبر...... 141﴾

سوال

ایک مسجد مقدمہ کر کے لی گئی ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ اکثر کی یہ رائے ہے کہ تولیت لوکل ایجنسی کو دی جاوے اور اکثر یہ کہتے ہیں کہ ہم خود انتظام کریں گے۔ غرض کہ باہم جنگ جدل ہے شرعاً کیا حکم ہے؟۔

سائلین: نمازیاں مسجد رحیم بخش کچہری کہاک

۲۲ اپریل ۱۹۱۶ء

الجواب

هو الصواب

جولوگ بانیٔ مسجد یا اہلِ محلّہ ہیں' ان کا حق ہے' کہ مسجد کی خبر گیری کریں۔ غیر محلّہ کو دینا اس وقت جائز ہوگا' جب اسے لیاقت انتظام کی ہوگی۔ اور بوجہ جہالت آپس میں جنگ و جدل کرتے ہوں' تو ان کا حق جاتا رہے گا۔ اور لوکل ایجنسی یا کسی اور محلہ داروں کے سپرد نگرانی کر دی جائے گی اور کثرت رائے پر عمل کیا جائے گا۔ مستملی میں ہے۔

رجل بنى مسجدا وجعله لله فهو احق بمرمته وعمارته و بسط البوارى والحصير و القناديل والأذان والإقامة والإمامة فيه إن كان اهلا لذلك و ان لم يكن فالراى فى ذلك اليه و كذا ولد البانى و عشيرته من بعده اولى من غيرهم و ان تنازع البانى فى نصب الإمام والمؤذن مع اهل المحلة فان كان من اختاره اهل المحلة اولى من الذى اختاره البانى فاختيار اهل المحلة اولى لان ضرره ونفعه عائد إليهم وإن كانا سواء فاختيار البانى اولى كذا فى البزازية والخلاصة [1]

---

[1] غنية المستملى شرح منية المصلى صفحه ٦١٥ مطبوعه سهيل اكيڈمى لاهور

(ترجمہ: جس شخص نے مسجد بنائی اور اسے اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کردیا' تو وہی شخص اس کی مرمت' عمارت' چٹائیوں اور صفوں کے بچھانے' روشنی کے لیے فانوسوں کے مہیا کرنے' اس میں اذان' اقامت پڑھنے اور امامت کرانے کا زیادہ حق دار ہے' بشرطیکہ اس کا اہل ہو۔ اگر وہ ان امور کا اہل نہ ہو اس بارے میں اس کی رائے اور اسی طرح بانی کے بعد اس کی اولاد اور خاندان والے' دوسروں سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔ اگر مسجد کے بانی کا اہل محلہ سے امام اور موذن کے تقرر کے بارے میں جھگڑا ہو تو اگر جو شخص اہل محلہ نے پسند کیا ہو وہ بانی کے پسندیدہ شخص سے بہتر ہو تو اہلِ محلہ کا پسندیدہ شخص اولی ہے کیونکہ اس کا نفع یا نقصان ان کو پہنچے گا۔ اور اگر دونوں برابر ہوں تو بانی کا پسندیدہ شخص بہتر ہے۔ بزازیہ اور خلاصہ میں اسی طرح ہے)

المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......142﴾

سوال

دوکان دار مجبوری کو پانی جامع مسجد سے دوکان پر منگائیں۔ استنجا وضو کریں تو جائز ہے؟۔ لے کر فروخت کرنا جائز ہے؟۔

سوداگران نکوہنہ متصل جامع مسجد آگرہ

۵ مارچ ۱۹۱۶ء

الجواب

هو المصوب

مسجد اور اس کا پانی اور ڈھیلہ اور فرش مخصوص حاضرینِ جماعت مسجد کے واسطے ہے۔ اس کو دوکان یا مکان پر لے جانا مکروہ ہے۔ کتاب کراہیہ عالم گیری میں ہے۔

ویکره رفع الجرة من السقاية و حملها الی منزله لان وضع للشرب لا للحمل کذا فی محیط السرخسی. و حمل ماء السقاية الی اهله ان کان ماذونا للحمل یجوز و الا فلا کذا فی الوجیز الکردری فی المتفرقات[1]

(ترجمہ: پانی کے حوض سے گھڑا اٹھانا اور اسے اپنے گھر لے آنا مکروہ ہے کیوں کہ وہ پانی پینے کے لیے ہے اٹھانے کے لیے نہیں۔ محیط سرخسی میں اسی طرح ہے۔ حوض، ٹینکی کا پانی اٹھانا اگر اسے اٹھالے جانے کی اجازت ہوتو جائز ہے ورنہ نہیں۔ وجیز کردری کے متفرقات کے باب میں یوں یہی مذکور ہے)

واللہ اعلم بالصواب.

کتبہ المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

---

[1] الفتاوی العالم گیریه جلد ۵ صفحه ۳۴۱ مطبوعه مصر

﴿فتویٰ نمبر......143﴾

سوال

جناب مولانا صاحب قبلہ مدظلہ۔السلام علیکم۔مزاج مبارک۔اس مسئلہ میں علماءِ دین وشرع متین کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک درخت پیپل کا مسجد میں گڑا ہے اس سے نقصان مسجد کو فرش کو ہے۔چونکہ تمام جگہ جڑیں پھیل جاتی ہیں۔اور داہنی طرف کے احاطہ کی دیوار پھٹ گئی ہے۔جو عنقریب گرنے کو ہے اور اس کی وجہ سے داہنی طرف کی محراب پھٹ چکی ہے۔مسجد کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔اس کو کٹوانے کے لیے کیا ارشاد ہے؟۔فقط

۲۱ ستمبر ۱۹۱۶ء

وزیر خان واشرف علی۔

الجواب

مسجد میں درخت لگانا مکروہ ہے مگر جائز ہے جب اس کے لگانے سے زمینِ ناقص مسجد کی مضبوطی ہو جائے۔اور اس میں جو سیل اور تری رہتی ہے وہ کم ہو جائے۔ **کما فی الدر المختار**

ویکرہ غرس الاشجار فی المسجد الالنفع کتقلیل نزو تکون للمسجد علی هذا[1].

(ترجمہ: مسجد میں درخت لگانا مکروہ ہے۔ہاں اگر درخت لگانے کا کوئی فائدہ ہو تو کراہت نہیں ہے جیسے کہ مسجد کی نمی کو کم کرنے کے لیے درخت لگائے جائیں)

☆ علی ہذا درخت کو مسجد میں رکھنا بھی جائز نہیں اگر اس سے زمین مسجد کو کچھ نفع نہ ہو خصوصا ایسی صورت میں ہرگز لگا رکھنا جائز ہی نہیں جب اسی مسجد کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

کما فی الشامی عن رسالة ابن حاج :

---

[1] الدر المختار علی هامش رد المحتار جلد ۱ صفحه ۴۸۸، ۴۸۹، مطبوعه مکتبه رشیدیه کوئٹه

ولا یجوز ابقائه ایضا لقوله علیه الصلوة والسلام لیس لعرق ظالم حق لان الظلم وضع الشیء فی غیر محله و هذا کذالک الخ ما أطال به و رایت فی آخر الرسالة بخط بعض العلماء انه وافقه علی ذالک المحقق ابن ابی شریف الشافعی رحمة الله علیه ۱ ۔فقط

(ترجمہ: مسجد میں بغیر ضرورت لگے ہوئے درخت کا باقی رکھنا بھی جائز نہیں ہے کیوں کہ نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے جس نے زیادتی کر کے کسی کی زمین میں پودا لگایا تو اسے اس پودے کو باقی رکھنے کا حق نہیں ہے۔ کیونکہ کسی چیز کو اپنے مقام میں نہ رکھنے کا نام ظلم ہے اور مسجد میں درخت لگانا بھی ویسا ہی ہے۔ اس پر انہوں نے طویل کلام فرمایا ہے پھر رسالہ کے آخر میں میں نے بعض علماء کے قلم سے یہ لکھا ہوا دیکھا کہ محقق ابن ابی شریف شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس معاملہ میں امیر ابن حاج سے موافقت فرمائی ہے)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ

محمد دیدار علی الرضوی، مفتی

شہر اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

۱ رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۴۸۸، ۴۸۹، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر......144﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دینِ متین در بارہ جوازِ نماز کے مسجد کی چھت پر آیا جائز ہے یا ناجائز؟ اور جائز ہے تو بضرورت جائز ہے یا بلاضرورت بھی؟ اور پھر جواز مع الکراہت ہے یا بلاکراہت؟ اور پھر چھت پر بھی ثواب مسجد کے برابر ہوگا یا کم یا مثل دیگر مقامات کے؟ بینوا تو جروا جزاکم اللہ.

سائل: شجاع الدین رشتہ دار ریاست کوٹہ

ومولوی رکن الدین شاہ صاحب مجددی الوری

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین و علی آلہ و صحبہ اجمعین اللھم رب زدنی علما.

مسجد کی چھت جمیع احکام میں حکم مسجد ہی ہے کا رکھتی ہے چنانچہ صفحہ 458 درمختار میں ہے۔

وکرہ تحریما الوطی فوقہ والبول والتغوط لانہ مسجد الی عنان السماء [1]

☆ (ترجمہ: مسجد کی چھت پر جماع کرنا پیشاب کرنا اور پاخانہ پھرنا مکروہ تحریمی ہے کیوں کہ مسجد آسمان تک مسجد ہوتی ہے)

قال الشامی رحمۃ اللہ:

قولہ الوطی فوقہ ای الجماع خزائن اما الوطی فوقہ بالقدم فغیر مکروہ الا فی الکعبہ بغیر عذر لقولھم بکراھۃ الصلوۃ فوقھا [2]

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۷۰ مطبوعہ بیروت

[2] رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۷۰ مطبوعہ بیروت

(ترجمہ: قولہ وطی اس کا معنی ہے جماع' خزائن' لیکن قدموں کے ساتھ مسجد کی چھت پر چلنا مکروہ نہیں ہے۔
☆ہاں کعبہ کی چھت پر بغیر عذر کے چلنا مکروہ ہے کیوں کہ علماء نے فرمایا کہ اس کے اوپر نماز مکروہ ہے)

یعنی چونکہ فقہا کعبہ شریف کی چھت پر نماز پڑھنا مکروہ فرماتے ہیں۔ لہٰذا کعبہ شریف پر چلنا پھرنا منع فرماتے ہیں۔ کہ مکروہ اس واسطے کہ جب بلحاظِ ادب کعبۃ اللہ' کعبہ شریف کی چھت پر نماز جو عبادت ہے وہ بھی مکروہ ہے' تو چلنا پھرنا کب جائز ہوسکتا ہے۔ چنانچہ کبیری میں ہے:

و یکرہ ایضا (ای الصلوٰۃ) علی سطح الکعبۃ للحدیث و المعنی فیہ عدم التعظیم وترک الادب۔[1]

(ترجمہ: کعبہ معظمہ کی چھت پر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ کیوں کہ اس بارے میں حدیث وارد ہے۔ اور وجہ اس کی عدمِ تعظیم اور ترکِ ادب ہے)

اور حدیث یہ ہے جو ترمذی شریف میں بھی ہے اور علامہ ابراھیم حلبی رحمۃ اللہ علیہ بھی باب مکروہاتِ صلوٰۃ کبیری تحریر فرماتے ہیں چنانچہ کبیری میں ہے

و تکرہ الصلوٰۃ فی طریق العامۃ لما روی الترمذی و ابن ماجۃ عن ابی عمر رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ نھی ان یصلی فی سبعۃ مواطن فی المزبلۃ والمجزرۃ والمقبرۃ و قارعۃ الطریق و فی الحمام و فی معاطن الابل و فوق ظھر بیت اللہ۔[2]

☆(ترجمہ: عام لوگوں کے رستہ پر نماز ادا کرنا مکروہ ہے۔ کیونکہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوعمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضور نبی پاک ﷺ نے سات جگہوں میں نماز ادا کرنے سے منع فرمایا۔ (۱) کوڑا کرکٹ کے ڈھیر' (۲) جانوروں کے ذبح کی جگہ (۳) قبرستان (۴) شاہ راہ (۵) حمام (۶) اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ (۷) خانہ کعبہ کے اوپر)

---

[1] غنیۃ المستملی صفحہ ۳۶۳ مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور

[2] غنیۃ المستملی صفحہ ۳۶۲ سہیل اکیڈمی لاہور

لہٰذا اگرچہ کعبہ شریف بھی فرش سے عرش تک حکمِ کعبہ ہی رکھتا ہے۔ مگر بنا بر کعبہ کی تعظیم، تقبیل و استلام وطواف وغیرہ کے ساتھ چونکہ مقصود بالذات اور مہتم بالشان ہے، کعبہ کے اوپر بلا ضرورت چڑھنے بلکہ نماز پڑھنے سے بھی صراحتاً حضور ﷺ نے منع فرما دیا اور داخلی کعبہ کو بھی بصورتِ ازدحام اور ایذا رسانیِ مسلمین یا خود تکلیف پانے کے یا رشوت دے کے بھی اندر جانے کو داخلِ ارکانِ حج بلکہ مستحباتِ حج نہ رکھا۔

کما فی الدر المختار فی صفحة 277

و يندب دخول البيت اذا لم يشتمل على ايذاء نفسه او غيره [1]

☆ (ترجمہ: خانہ کعبہ کے اندر داخل ہونا مستحب ہے جب کہ اپنے اور دوسروں کو اس کے لیے تکلیف اٹھانی نہ پڑے۔)

قال الشامی:

و مثله فيما يظهر دفع الرشوة على دخوله [2]

(ترجمہ: اس کی مثال وہ صورت ہے جس میں غالبا خانہ کعبہ میں داخلہ کے لیے رشوت دینی پڑتی ہو)

☆ اور مسجد کی تعظیم چونکہ بغرض نماز و عبادت ہے۔ مسجد میں اور مسجد کے چھت پر بلا ضرورت ان امور سے مطلقا منع فرما دیا گیا جو مخالفِ عبادت یا اصلاحِ مسجد میں ہیں چنانچہ بلا قصدِ عبادت مسجد کی چھت پر چڑھنے کو بھی بعض فقہا نے مکروہ لکھا ہے چنانچہ عبارتِ مذکورہ عدمِ کراہت چلنے پھرنے کی مسجد کی چھت پر بغایت وثوق علامہ شامی نقل فرما کر اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

ثم رايت القهستانى نقل عن المفيد كراهة الصعود على سطح المسجد [3]

☆ (ترجمہ: پھر میں نے علامہ قہستانی کو دیکھا کہ انہوں نے ''المفید'' سے مسجد کی چھت پر چڑھنے کی کراہت نقل کی ہے)

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۴۵ مطبوعہ بیروت

[2] رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۴۵ مطبوعہ بیروت

[3] رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۷۰ مطبوعہ بیروت

☆ حالانکہ بغرضِ اذان جو من وجہ عبادت ہے اور من وجہ اعلامٔ صحابۂ کرام کا مسجد پر چڑھ کر آذان کہنا ثابت ہے روایتِ معتبر سے۔ چنانچہ باب الاذان شامی میں ہے۔

و قال ابن سعد بالسند الی ام زید بن ثابت رضی الله عنهم کان بیتی اطول بیت حول المسجد فکان بلال یؤذن فوقه من اول ما اذن الی ان بنی رسول الله ﷺ مسجده فکان یؤذن بعد علی ظهر بیت المسجد و قد رفع له شی فوق ظهره[1]

(ترجمہ: امام ابن سعد نے سند کے ساتھ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ سے روایت کی' کہ میرا گھر مسجد نبوی کے اردگرد گھروں میں سب سے اونچا تھا' نبی اکرم ﷺ کے مسجد تعمیر فرمانے سے پہلے' حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس کے اوپر اذان پڑھا کرتے تھے۔ اس کے بعد آپ مسجد کی چھت پر اذان دیا کرتے تھے۔ آپ کے لیے مسجد کی چھت پر کوئی بلند چیز رکھ دی جاتی تھی جس سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ قہستانی اور صاحب مفید کے نزدیک مسجد کی چھت پر چڑھنا جب ہی مکروہ ہے جب بغرضِ عبادت نہ ہو بلکہ محض تفریح یا تماشہ کے واسطے ہو۔ اور اگر بغرضِ اصلاحِ مسجد ہو تو بلاشبہ جائز ہے۔)

کما فی صفحه 25 من البزازیة

وللقیم ان یشتری من مال المسجد سلما یصعد به علی السطح لکنس الثلج وتطیین سطح المسجد[2]

(ترجمہ: مسجد کے متولی کو اجازت ہے کہ مسجد کے مال سے ایک سیڑھی خرید ے تا کہ برف کو اتارنے اور مسجد کی چھت کو مٹی سے لیپنے کے لیے چھت پر چڑھا جا سکے)

علی هذا بلاشبہ جائز ہے' اگر بغرضِ عبادت ہو' جیسے اذان یا تلاوتِ قرآن یا نماز یا درود وظائف کے واسطے' تو مسجد کی چھت پر چلنا پھرنا بھی مکروہ نہیں۔

---

[1] رد المحتار جلد ۲ صفحه ۴۹ مطبوعه بیروت

[2] الفتاوی البزازیه علی هامش الفتاوی الهندیة جلد ۶ صفحه ۲۶۹ مطبوعه مصر

کما فی من الشامی اندریں صورت مجرد عبارتِ مذکورہ قہستانی پر شامی علیہ الرحمۃ کا یہ فرمانا:

و یلزمه کراهة الصلوٰة ایضا فوقه[1]

(اس سے لازم آتا ہے کہ مسجد کے اوپر نماز ادا کرنا بھی مکروہ ہے)

☆ بیشک محلِ تامل ہے چنانچہ خود شامی علیہ الرحمۃ نے اپنی یہ رائے تحریر فرما کر فرما دیا ہے فلیتامل[2]

(ترجمہ: اس پر خوب غور کرو)

یعنی یہ جبری رائے قابل سوچنے کے ہے۔ اس واسطے ہدایہ، شرح دقایہ، فتاویٰ عالمگیریہ، فتاوی بزازیہ، غنیۃ المستملی وغیرھا کسی معتبر کتاب میں باوصف تفحصِ تام پتہ نہیں ملتا کہ کسی نے بھی مسجد کی چھت پر نماز پڑھنے کو مکروہ لکھا ہو۔ بلکہ برخلاف اس کی صحت اقتدا کی مسجد کے چھت پر امامِ مسجد کے ساتھ جب امام سے آگے نہ ہو بوجہ ہونے مسجد کی چھت کے حکمِ مسجد میں باعتبار تمامِ احکام کے فقہا سب تصریح فرما رہے ہیں چنانچہ درمختار میں ہے کہ اس عبارت کے تحت میں علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

قال الزیلعی و لهٰذا یصح اقتداء من علی سطح المسجد بمن فیه اذا لم یتقدم علی الامام ولا یبطل الاعتکاف بالصعود الیه ولا یحل للجنب والحائض والنفساء الوقوف علیه و لو حلف لا ید خل هذه الدار فوقف علی سطحها یحنث[3]

(ترجمہ: علامہ زیلعی علیہ الرحمہ نے فرمایا اسی لئے مسجد کی چھت پر موجود مقتدی کی اقتداء مسجد کے اندر امام سے جائز ہے، جب کہ وہ امام سے آگے نہ ہو۔ اس پر چڑھنے سے اعتکاف باطل نہیں ہوتا۔ جنبی، حیض اور نفاس والی کو چھت پر ٹھہرنا حرام ہے۔ نیز اگر کسی نے قسم اٹھائی اس گھر میں داخل نہ ہوگا پھر اس کی چھت پر جا ٹھہرا تو حانث ہو جائے گا)

---

[1] رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۷۰ مطبوعہ بیروت

[2] ایضا

[3] رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۳۷۰ مطبوعہ بیروت

اور بعینہ یہی مضمون صفحہ 127 ھدایہ[۱] میں ہے و ھکذا فی شرح الوقایۃ و عمدۃ الرعایۃ البتہ بلحاظِ علتِ ادب و تعظیمِ کعبہ شریف کے چھت پر کبیری ؒطحطاوی' مراقی الفلاح' عالمگیریہ' خانیہ' بزازیہ' وغیرھا ساری ہی کتابوں میں چڑھنے اور نماز پڑھنے کو مکروہ لکھا ہے۔

لہٰذا بلا تکلف مسجد کی چھت پر بلا کراہت نماز پڑھنا جائز ہے اور جو ثواب مسجد کے اندر ملتا ہے تمام عباراتِ فقہا سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ وہی ثواب چھت پر ملے گا۔

☆ حق یہ ہے کہ مسجد کے تمام احکام کو کعبہ شریف کے احکام پر قیاس کرنا ہی خطا ہے۔ مسجد میں نمازی کے آگے سے گزرنا حرام اور کعبہ کے حرم میں جائز ہے۔ علی ہذا اور بہت امور (میں اختلاف موجود ہے) شامی مصری کے صفحہ 186 میں ہے:

روی المطلب بن ابی وداعۃ قال رأیت رسول اللہ ﷺ حین فرغ من سعیه جاء حتی اذا حاذی الرکن فصلی رکعتین فی حاشیۃ المطاف و لیس بینه و بین الطائفین أحد رواہ احمد و ابن ماجۃ و ابن حبان و قال فی روایته رایت رسول اللہ ﷺ یصلی حذ والرکن الاسود والرجال والنساء یمرون بین یدیه و مابینهم و بینه سترۃ[۲]

(ترجمہ: حضرت مطلب بن ابی وداعہ رضی اللہ عنہ نے روایت کی کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا' کہ جب آپ سعی سے فارغ ہوئے تو چلے اور حجر اسود کے بالمقابل آئے مطاف کے کنارہ پر آپ نے دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ آپ اور طواف کرنے والے صحابہ کے درمیان کوئی نہ تھا۔ اسے امام احمد بن حنبل' امام ابن ماجہ اور

---

[۱] ہدایہ کی عبارت اس طرح ہے:

ویکرہ المجامعة فوق المسجد والتخلی لأن سطح المسجد له حکم المسجد حتی یصح الاقتداء منه بمن تحته ولا یبطل الاعتکاف بالصعود إلیه ولا یحل للجنب الوقوف علیه . ھدایه جلد اول صفحه ۱۲۴ مطبوعه مکتبه امدادیه ملتان

[۲] رد المحتار جلد ۳ صفحه ۴۵۷ مطبوعه بیروت

امام ابن حبان نے روایت کیا ہے انہوں نے اپنی روایت میں فرمایا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو حجرِ اسود کے بالمقابل نماز ادا فرماتے ہوئے دیکھا۔ مرد اور عورتیں آپ کے سامنے گذر رہے تھے اور ان کے اور آپ کے درمیان سترہ موجود نہ تھا)۔

ثم قال بعد اسطر

ثم رایت فی البحر العمیق حکی عز الدین بن جماعة عن مشکلات الآثار للطحاوی ان المرور بین یدی المصلی بحضرة الکعبة یجوز[۱]

(ترجمہ: پھر میں نے البحر العمیق میں دیکھا کہ اس میں علامہ عزالدین بن جماعہ نے مشکلات الآثار للطحاوی سے نقل فرمایا کہ کعبہ شریف کے سامنے نمازی کے آگے سے گذرنا جائز ہے)

☆ اور ایسا ہی تفسیر ببکة مبارکا[۲] میں صاحبِ تفسیرِ کبیر نے حضرت امام جعفر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آپ کے سامنے حرم میں ایک شخص نے جو نمازی کے آگے سے گزرنے کو منع کیا تو آپ نے فرمایا:

هذا مکة یترک الناس یبک بعضها بعضا[۳]

(ترجمہ: یہ مکہ ہے لوگوں کو ایک دوسرے پر بھیڑ کرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے) فقط

حررہ: العبد الراجی

ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی

✿✿✿✿✿

---

۱ رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۴۵۷ مطبوعہ بیروت

۲ القرآن المجید آل عمران ۹۶

۳ التفسیر الکبیر 'الإمام الرازی، جلد ۸ صفحہ ۱۵ مطبوعہ مصر میں عبارت یوں ہے

فإنها سمیت مکة لأنه یبک بعضهم بعضا

﴿فتویٰ نمبر......145﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین بادشاہ یا کسی امیر نے ایک جائداد مسجد کو وقف چھوڑی اور کوئی شرائط وقف کے مصارف پر نہیں اور آمدنی خرچ سے بدر جہا زائد جمع ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ ضرورتِ سرکار میں سے اس کا روپیہ بطورِ قرض دیا جاتا ہے۔ پس ایسی آمدنی سے علماء کا وظیفہ یا اون کی اولاد کا واسطے پرورش کے مقرر کیا جائے یا مسجد میں غربا امرا روزہ دار وغیرہ کے کھانے کو افطاری تیار کی جائے تو جائز ہے یا نہیں؟۔ امید کہ مفصل جواب عنایت ہو۔

بینوا توجروا

سائل: عبداللہ، مائی مندی

۱۵ فروری ۱۹۱۶ء ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ

الجواب

هو المصوب

☆ شرعاً ایسے اوقاف میں پابندی شرائط کی نہیں۔ بالفرض اگر شرائط ہوں تو بھی منتظمین کو اس پابندی لازم نہیں۔ ☆ بلکہ وہ حق طلباء اور علماء اور فقرا وغیرہ کا ہے اور امام و مفتی و مدرس وغیرہ کی اولاد کا وظیفہ مقرر کرنا لاریب جائز ہے۔ علماء کی پینشن بھی دے سکتے ہیں۔ افطاری اور کھانا بھی منتظم اس سے کر سکتا ہے۔ اس مسئلہ کو دیگر اوقاف پر قیاس کر کے غلطی ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ مفصل فتاویٰ حامدیہ کتاب الوقف صفحہ ۲۱۰ میں ہے۔

افتی علامة الوجود المولی ابو السعود مفتی السلطنة السلیمانیة بان اوقاف الملوک والامراء لا یراعی شرطها لأنها من بیت المال او ترجع الیه. من حاشیة الاشباه قبیل قاعدة ☆اذا اجتمع الحلال و الحرام و ذکر السیوطی فی رسالة النقل المستور فی جواز قبض المعلوم من غیر حضور. بانه افتی جمیع علماء ذلک العصر

کالسبکی و ولدیہ والزملکانی و ابن عدلان و ابن المرجل و ابن جماعۃ والاوزاعی والزرکشی والبلقینی والاسنوی وغیرھم بان ھذہ ارصادات لا اوقاف حقیقۃ فللعلماء المنزلین ان یاکلوا منھا و ان لم یباشروا وظائفھم الخ. و فی شرح الوھانیۃ ما یاخذہ الفقھاء من المدارس لا اجرۃ لعدم شروط الاجارۃ و لا صدقۃ لان الغنی یاخذھا بل اعانۃ لھم علی حبس الفسھم للاشتغال حتی لو لم یحضروا الدرس بسبب اشتغال او تعلیق جاز اخذھم الجامکیۃ معین المفتی من آخر کتاب الوقف و قد ذکر علماء نا ان من لہ حق فی دیوان الخراج کالمقاتلۃ والعلماء و طلبتھم والمفتین والفقھاء یفرض لاولا دھم تبعا ولا یسقط بموت الاصل ترغیبا و ذکر فی مال الفتاوی ان لکل قاری فی کل سنۃ فی بیت المال مائتی درھم او الفی درھم لان اخذھا فی الدنیا والا یاخذ فی الآخرۃ من رسالۃ السید الحموی فیما رتب وارصد باوامر الورزاء المصریین قال مولانا العلامۃ صاحب الخزانۃ ناقلا عن مبسوط فخر الاسلام بنص و اذا مات من لہ وظیفۃ من بیت المال لحق الشرع و اعتزاز الاسلام کا جراء الامامۃ والتاذین وغیر ذلک مما فیہ صلاح الاسلام والمسلمین وللمیت ابناء یراعون و یقیمون حق الشرع واعزاز الاسلام کما یراعی و یقیم الاب فلامام ان یعطی و ظیفۃ الاب لا بناء اللمیت لا لغیرھم لحصول مقصود الشرع و انجبار کسر قلوبھم والامام مربی فخلف الموتی باذن الشرع والشرع امر بابقاء ما کان علی ما کان لابناء المیت لا غیرھم قلت ھذا موید لما ھو عرف الحرمین الشریفین و مصر والروم المعمورۃ من غیر نکیر من ابقاء ابناء المیت و لو کانوا صغارا علی وظائف آباء ھم مطلقا من امامۃ و خطابۃ و غیر ذلک و امضاء و لی التقریر للفراغ لھم بذلک و تقریرھم بعد وفاتھم عرفا مرضیا مقبولا لان فیہ احیاء خلف العلماء و مساعدتھم علی بذل الجھد فی الاشتغال بالتعلم

و قدافتی بجواز ذلک طائفة من اکابر الفضلاء الذین یعول علی افتائهم و الله اعلم . بیری زاده علی الاشباه من کتاب الفرائض ما

☆(ترجمہ: علامۃ الوجود مولانا ابوالسعود مفتی سلطنت سلیمانیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فتوی دیا ہے کہ باشاہوں اور امراء کے اوقاف میں ان کی شرائط کا لحاظ نہ رکھا جائے گا۔ کیوں کہ وہ اوقاف بیت المال سے ہوتے ہیں یا اس کی طرف لوٹ جانے والے ہوتے ہیں۔ ان کا یہ فتوی ☆اذا اجتمع الحلال و الحرام الخ کے قاعدہ سے کچھ پہلے الاشباہ والنظائر کے حاشیہ میں ہے۔

امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ "النقل المستور فی جواز قبض المعلوم بغیر حضور" میں فرمایا کہ اس زمانہ کے تمام علماء جیسے کہ امام سبکی، ان کے دونوں بیٹوں، امام زملکانی، امام ابن عدلان، امام ابن المرجل، امام ابن جماعہ، امام اوزاعی، امام زرکشی، امام بلقینی، امام اسنوی وغیرہم رحمھم اللہ تعالی نے فتوی دیا کہ یہ عطیات رعایا کی دیکھ بھال کے لیے ہوتے ہیں۔ حقیقت میں یہ وقف نہیں ہوتے لہٰذا جو علماء وہاں رہتے ہیں ان کو وہاں سے کھانا جائز ہے اگرچہ اپنا مقررہ کردہ کام نہ کریں۔

شرح وہبانیہ میں ہے فقہاء جو مال (شاہی) مدارس سے لیتے ہیں وہ اجرت نہیں ہوتی کیوں کہ اجارہ کی شرطیں پائی نہیں جاتیں۔ اور نہ ہی وہ صدقہ ہوتا ہے کیوں کہ غنی بھی اسے وصول کرتے ہیں بلکہ کاموں کے لیے اپنے آپ کو پابند کرنے کے لیے وہ مال ان کے لیے بطور اعانت ہوتا ہے۔ حتی کہ کسی مصروفیت یا بندش کے باعث وہ سبق میں حاضر نہ ہوں تو بھی ان کے لیے تنخواہ لینا جائز ہے۔ معین المفتی آخر کتب الوقف۔ ہمارے علماء نے ذکر کیا ہے کہ خراج کے مستحقین کے رجسٹر میں جن لوگوں کے نام درج ہوتے ہیں جیسے جنگ کرنے والی فوج، علماء، ان کے طالب علم، مفتی، فقہاء، ان کی اتباع میں ان کی اولاد کو ان کاموں کی طرف رغبت دلانے کے لیے حصہ مقرر کیا جائے گا۔ اصل آدمی کی موت سے اس کا حصہ ساقط نہ ہوگا۔

مآل الفتاوی میں ہے۔ بیت المال سے ہر قاری کے لیے سالانہ دو سو درہم یا دو ہزار درہم مقرر کیے

ما تنقیح الفتاوی الحامدیہ : جلد اول صفحہ ۲۱۸، ۲۱۹ مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ

جائیں گے اگر وہ اپنا حصہ دنیا میں وصول کرنا چاہے۔ ورنہ وہ آخرت میں اسے وصول کرے گا۔ جزئیہ علامہ حموی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ سے اخذ کیا گیا ہے جو مصری وزراء کے احکام سے مرتب اور جاری کیا گیا تھا۔

مولانا علامہ صاحب ''الخزانہ'' نے ''مبسوط فخر الاسلام'' سے نقل کر کے یوں تحریر کیا۔ جب کوئی ایسا شخص مر جائے جس کا حق شرع یا اعزازِ اسلام کی خاطر بیت المال میں ہے جیسے کہ وہ شخص امامت اور اذان وغیرہ ایسے کاموں کو جاری رکھتا ہو جس میں اسلام اور مسلمانوں کی بہتری ہو اور اس مرنے والے کے بیٹے ہوں جو شریعت کا اور اسلام کا اعزاز اسی طرح قائم رکھیں اور اس کا لحاظ رکھیں جس طرح کہ باپ قائم رکھتا اور لحاظ رکھتا تھا تو حکمران پر لازم ہے کہ باپ کا وظیفہ بیٹوں کو دے۔ اور کسی کو نہ دے۔ کیوں کہ اس طرح کرنے سے شریعت مطہرہ کا مقصود بھی حاصل ہوگا اور ان کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کا باعث بھی ہوگا کیوں کہ حکمران مربی ہوتا ہے۔ اور شریعت کے حکم مطابق مرنے والوں کا جانشین ہوتا ہے۔ اور شریعت مطہرہ حکم دیتی ہے جو چیز جس حالت پر ہے اس کو اس طرح باقی رکھا جائے۔ لہٰذا یہ حق میت کے بیٹوں کا ہوتا ہے ان کے علاوہ اوروں کا نہیں۔

میں کہتا ہوں اس کی تائید حرمینِ شریفین، مصر اور روم کے بغیر کسی انکار کے عرف اور رواج سے بھی ہوتی ہے کہ اولاد کو اگرچہ وہ کم عمر ہیں ہوں، ان کے آباء واجداد کے وظائف پر مطلقاً بحال رکھا جاتا ہے خواہ وہ امام ہوں یا خطیب ہوں یا اس کے علاوہ کوئی اور منصب دار ہوں۔ اور مقرر کرنے والے صاحب اختیار کا ان کو برقرار رکھنا ان کو اس کام کے لیے فارغ رکھنے کے لیے ہوتا ہے۔ اور آباء واجداد کی وفات کے بعد ان کو مقرر کرنا ایک پسندیدہ اور مقبول عرف ہے۔ کیوں کہ اس میں علمائے کرام کی اولاد کو زندہ رکھنے اور علم میں ان کو کوشش جاری رکھنے پر اعانت کا سامان ہے اور ان اکابر فضلاء نے اس کے جواز کا فتوی دیا ہے جن کے فتاوی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ بیری زادہ علی الاشباہ من کتاب الفرائض)

پس عبارتِ بالا سے واضح ہے کہ جس قدر اوقاف شاہی ہیں ان میں علماء، فقراء، غرباء، تمام

مسلمین کو حق ہے کہ حضرات منتظمین موقع سے اوس کو غور کریں اور کامل اختیار ہے کہ افطاری و کھانا، وظیفہ وغیرہ کر سکیں۔

هذا ما سنح لی عند تحقیق المقام و العلم بجمیع المعلومات عند الله الملک العلام

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

۱۰ ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ

تصدیق علمائے دیوبند

اوقاف شاہی میں یہ مصارف درست ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

عزیز الرحمٰن عفی عنہ

مفتی مدرسہ دیوبند۔

۱۴ ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ

۱۹ فروری ۱۹۱۶ء

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر...... 146﴾

سوال

مسجد کے مقدمہ میں روپیہ متولی نے اپنے پاس سے لگایا۔اب وہ آمدنی مسجد سے وہ روپیہ لینا چاہتا ہے شرعاً کیا حکم ہے؟۔بینوا توجروا

سائل:امام بخش حویلی خواجہ

۱۶فروری ۱۹۱۶

الجواب

ایسے موقع پر روپیہ قرض لیکر لگا دینا اور آمدنی مسجد سے مجرا لینا جائز ہے۔حموی لکھتا ہے۔

اذا استقبله امر و لم يجد بدا من الا ستدانة ينبغي له ان يستدين بامر الحاكم ثم يرجع من غلة الوقف لان للقاضي ولاية الاستدانة على الوقف.... و تفسير الا ستدانة بما ذكر انما هو فيما اذا لم يكن في يده شئ من الغلة و اما اذا كان في يده شئ منها اشترى شيئا للوقف و نقد الثمن من ماله جازله ان يرجع بذلك في غلته و ان لم يكن بامر القاضي[1] .

(ترجمہ:اور جب متولی کوئی معاملہ درپیش ہو اور قرض حاصل کرنے کے بغیر چارہ نہ ہو تو اسے چاہئے کہ حاکم کے حکم کے ساتھ قرض حاصل کرے۔پھر وقف کی آمدنی سے وصول کرے۔کیوں کہ قاضی کو وقف پر قرض حاصل کرنے کی ولایت حاصل ہوتی ہے۔۔۔۔قرض حاصل کرنے کی وضاحت جو پہلے بیان ہو چکی صرف اس صورت میں ہے جب کہ وقف کی آمدنی سے اس کے پاس کچھ نہ ہو۔اور اگر اس کے پاس اس سے کچھ رقم موجود ہو تو وقف کے لیے چیز خرید لے اور اپنے مال سے پیسے ادا کردے۔پھر اس کی آمدنی سے وصول کرلے اگرچہ یہ کام اس نے قاضی کے حکم سے نہ کیا ہو)

واللہ اعلم و حکمہ احکم.

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

---

[1] الاشباہ والنظائر مع شرحہ الحموی ،جلد اول ،صفحہ ۳۰۳ مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی

﴿فتوی نمبر...... 147﴾

سوال

مسجد کی اشیائے کہنہ کو بیچ کر اسی مسجد میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟

سائل: امام بخش، حویلی خواجہ آگرہ
۷رفروری/۱۹۱۶ء

الجواب

جائز ہے۔ بزازیہ میں ہے۔

اذا استغنی عنه یباع و یصرف ثمنه فی ذلك المسجد[۱]

(ترجمہ: جب اس سامان کی ضرورت نہ رہے تو اس کو فروخت کر دیا جائے اور اس کی قیمت اسی مسجد میں صرف کی جائے)

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

✿✿✿✿✿

---

[۱] یہ الفاظ جزئیہ کی روایت بالمعنی معلوم ہوتے ہیں۔ایک مقام پر ہے۔

اشتری قندیلاً او حشیشاً للمسجد ثم استغنی عنه یعود إلی الملک ان المالک حیا والی ورثته إن مات وعلی قول الثانی رحمه الله یباع ویصرف ثمنه إلی حوائج المسجد

فتاوی بزازیه علی هامش العالم کیریه جلد ۵ صفحه ۲۸۳، مطبوعہ مصر

(ترجمہ: مسجد میں روشنی کے لیے قندیل یا بچھانے کے لیے گھاس خریدا پھر ان کی ضرورت نہ رہی اگر مالک زندہ ہے تو یہ چیزیں اس کی ملک میں واپس آ جائیں گی اور اگر وہ مر چکا ہے تو اس کے ورثاء کی ملکیت میں آ جائیں گی اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی رو سے ان کو فروخت کر دیا جائے گا اور ان کی قیمت مسجد کی ضرورتوں میں صرف کی جائے گی)

دوسرا مقام پر مسجد کے بے آباد ہونے کی صورت میں یہ حکم تحریر ہے:

یحول إلی مسجد آخر أو یبیعها القیم لأجل المسجد . جلد ۵ صفحه ۲۷۰ مطبوعه مصر

(ترجمہ: ان اشیاء کو کسی دوسری مسجد میں لے جایا جائے گا یا مسجد کا متولی انہیں اسی مسجد کی آبادی کی خاطر فروخت کر دے گا)

محمد علیم الدین نقشبندی عفی عنہ

﴿فتویٰ نمبر...... 148﴾

سوال

وسطِ مسجد میں قبورِ مومنین ہوں ۔ان کو صحن میں برابر کر دینا جائز ہے یا نہیں۔ اور مسجد میں یا دائیں بائیں قبور ہوں تو نماز پڑھنا اس جگہ شرعا کیسا ہے۔

الجواب

اگر صحنِ مسجد میں قبور آ جائیں اور عظام رمیم ہوگئی ہوں تو شرعا ان کو برابر کر دیا جائے۔اور مسجد میں داخل کر لیا جاوے جیسا کہ کھیت وغیرہ میں حکم ہے۔اور جس جگہ قبور ہوں خواہ سامنے، دائیں بائیں وہاں نماز مکروہ ہے۔سامنے اگر ہوں تو کراہت تحریمی ہے اور جانب میں تنزیہی۔

كذافی مجموعة الفتاوی لابی الحسنات رضی الله عنه۔

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......149﴾

سوال

شیعہ مذہب کی مسجد کا حکم کیا ہے۔

الجواب

مسجدِ شیعہ کا اور اہلِ تسنن کا ایک ہی حکم ہے کیوں کہ شیعہ بمطابق مذہب صحیح فاسق ہیں [1]۔

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

✿✿✿✿✿

---
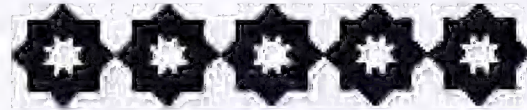
[1] یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ ان کے عقائد کفریہ نہ ہوں۔ اگر ان کے عقائد کفریہ ہوں جیسا کہ دور حاضر کے تبرائی رافضی تو پھر یہ حکم نہ ہوگا۔

محمد علیم الدین عفی عنہ

﴿فتویٰ نمبر...... 150﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ وقفِ جامع مسجد میں جب افطاری شامل مصالحِ مسجد نہیں ہے تو جو شیرینی تقسیم کی جاتی ہے، شامل ہوگی یا نہیں۔

سائل: ڈپٹی صاحب منیجر لوکل کمیٹی

جامع مسجد اکبرآباد

الجواب

اللهم ارنا الحق حقا والباطل باطلا

صورتِ مسئولہ میں اول تحقیق اس امر کی ضرور ہے، کہ وقف کی کیا تعریف ہے؟ اور کے (کتنی) قسم پر منقسم ہے؟ اور ہر قسم کے احکام جداگانہ ہیں یا ایک؟۔

لہٰذا جاننا چاہئے، کہ وقف جو شریعت میں حقیقتاً وقف ہے، وہ مراد ہے کسی شے مملوکہ کی منفعت اور آمدنی سے، جو صدقہ کردی جائے، کسی مدِ خاص پر، مسجد پر، خواہ مدرسہ پر، فقراء پر، خواہ اغنیاء پر، بغرض تحصیل ثوابِ دائمی کے یا اصل شے کو بیع اور رہن وغیرہ تصرفات سے روک دیا جائے، باوصف باقی رہنے اصل شے کے ملکِ واقف پر بقولِ امامِ اعظم رحمہ اللہ یا ملکِ اللہ پر بقولِ صاحبین رحمہما اللہ۔ اور فتویٰ اسی قول پر ہے:

كما فی الدر المختار فی صفحة ۳۹۱

الوقف هو حبس العين على حكم ملك الواقف والتصدق بالمنفعة عنده و عندهما هو حبسها على ملك الله تعالى و صرف منفعتها على من احب و لو غنيا فيلزم فلا يجوز له ابطاله ولا يورث عنه و عليه الفتوى ابن كمال و ابن الشحنة. و سببه ارادة محبوب النفس فی الدنيا ببر الاحباب و فی الآخرة بالثواب يعنی بالنيته من اهلها[1] . الخ

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ٦ : صفحہ ٤٠٦ تا ٤٠٧، ملتقطاً مطبوعہ دار احياء التراث العربی بيروت

(ترجمہ: وقف' کسی چیز کو وقف کنندہ کی ملکیت کی شرط پر روک لینا اور اس کی منفعت کو صدقہ کرنا ہے۔ وقف کہ یہ تعریف حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے۔ اور صاحبین کے نزدیک کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت کی شرط پر روک لینا اور اسی کی منفعت اس شخص پر خرچ کرنا ہے جس کو وقف کنندہ پسند کرے' اگرچہ وہ غنی ہو۔ جب وہ چیز واقف کی ملک سے نکل جائے گی تو وقف لازم ہو جائے گا۔ لہٰذا نہ اس کو باطل کرنا جائز ہے اور نہ ہی وہ واقف کی متروکہ میراث قرار پائے گا اور فتویٰ اسی قول پر ہے۔ ابن کمال ابن شحنہ۔ اس کا سبب دنیا میں دل کو محبوب شے سے دوستوں کے ساتھ نیکی کرنے کی نیت اور ارادہ کرنا اور آخرت میں ثواب کا ارادہ کرنا یعنی آخرت میں حصولِ ثواب کی نیت' اس کے اہل سے ہے)

اس قسم کے وقف کا یہی حکم ہے' کہ ایسے وقف کے متعدد واقف ہوں یا ایک' اگر اس نے کسی جہتِ معین پر وقف کیا ہے' مثلاً ایک مسجد بنوائی اور ایک مدرسہ' یا فقط مسجد اور فقط اس مسجد پر کچھ دوکانوں یا مکانوں یا زمین وغیرہ کو وقف کر دیا' یا فقط مدرسہ پر۔ تو مصارفِ مسجد سے کچھ آمدنی بچے (اسے محفوظ رکھا جائے) تو آمدنی وقفِ مسجد سے مدرسہ پر اور وقفِ مدرسہ سے مسجد پر' مخالفِ شرطِ واقف صرف کرنا ہرگز جائز نہیں۔

كما فى صفحة ٢١٦ من الجزء الخامس من البحر الرائق

اما اذا اختلف الواقف او اتحد الواقف و اختلفت الجهة بان بنى مدرسة و مسجدا و عين لكل وقفًا و فضل من غلة احدهما لا يبدل شرط الواقف[۱]

☆ (ترجمہ: جب وقف کنندہ کئی ایک ہوں' یا وقف کنندہ تو ایک ہی ہو' لیکن وقف کی جہات مختلف ہوں' اس طرح کہ ایک مدرسہ بنایا اور ایک مسجد بنائی' ہر ایک کے لیے علیحدہ وقف معین کر دیا۔ اگر ایک وقف کی آمدنی سے بچ رہا' تو وقف کنندہ کی شرط کو تبدیل نہ کیا جائے گا)

اور صفحہ ۴۱۸ درمختار میں ہے:

اتحد الواقف والجهة وقل مرسوم بعض الموقوف عليه بسبب خراب وقف

---

[۱] البحر الرائق: جلد ۵ صفحہ ۲۳۴ مطبوعہ دار المعرفة بيروت.

احدھما جاز للحاکم ان یصرف من فاضل الوقف الآخر علیه لأنھما کشئ واحد و ان اختلف احدھما بان بنی رجلان مسجدین او رجل مسجد او مدرسة وقف علیھما او قافا لا یجوز له[1]

☆(ترجمہ: وقف کنندہ ایک ہو اور اس نے کئی وقف کیے۔ لیکن ان تمام کی جہت ایک ہی ہو اور ان اوقاف میں سے کسی وقف کے ویران ہو جانے کے باعث کسی موقوف علیہ کے لیے وقف کے محصول میں کمی واقع ہو گئی، تو حاکم کے لیے جائز ہے کہ دوسرے وقف کی فاضل آمدنی سے اس پر خرچ کرے۔ کیوں کہ وہ دونوں وقف ایک چیز کی مانند ہیں۔ اور اگر دونوں یعنی وقف کنندہ اور جہت میں کوئی ایک مختلف ہو مثلاً دو آدمیوں نے دو مسجدیں بنائیں یا ایک آدمی نے ایک مسجد اور ایک نے مدرسہ بنایا اور دونوں کے لیے مختلف وقف کیے تو حاکم کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں ہے)

چنانچہ بعینہ اسی عبارت سے استفادہ کر کے مولانا عبدالحی صاحب بھی صفحہ ۱۵۶ جلد دوم جواب اول استفتا ۶۸ میں تحریر فرماتے ہیں۔

ذلک قال الشامی رحمة الله علیه

قوله اتحد الواقف والجھة بان وقف و قفین علی المسجد احدھما علی العمارة والاخری الی امامه أو موذنه والامام والموذن لا یستقر لقلة المرسوم للحاکم الدین ان یصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة الی الامام والموذن باستصواب اھل الصلاة من اھل المحلة ان کان الوقف متحدا لان غرضه احیاء وقفه و ذلک یحصل بما قلنا بحر عن البزازیة[2]

(ترجمہ: قولہ: وقف کنندہ اور وقف کی جہت ایک ہو۔ جیسا کہ ایک شخص نے دو وقف ایک مسجد کے لیے کئے ایک

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۶ صفحہ ۴۳۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

[2] i. فتاوی مولانا عبد الحی لکھنوی: جلد صفحہ مطبوعہ

ii. رد المحتار: جلد ۶ صفحہ ۴۳۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

مسجد کی آبادی کی خاطر اور دوسرا امام یا مؤذن کے لیے کیا' اور امام اور مؤذن وقف کے محصول میں کمی ہونے کے باعث نہیں ٹھہرتے۔تو دین دار حاکم کے لیے جائز ہے کہ آبادی اور مصالح کے لیے وقف کردہ چیز کی فالتو آمدنی کو محلّہ دار نمازیوں کے مشورہ کے ساتھ امام اور مؤذن کے لیے خرچ کرے' بشرطیکہ وقف متحد ہو۔ کیونکہ وقف کنندہ کی غرض اسے آباد رکھنا ہے اور یہ مقصود اسی طرح حاصل ہوسکتا ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔ بحر۔ بزازیہ)

اور غالباً وقفِ جامع مسجد ہذا اور اکبری مسجد وغیرہ اوقافِ شاہانِ سلف اور ان کے امراءٗ وزراء کو اسی قسم کا وقف سمجھ کر ہمارے مولانا مفتی مرحوم نے رجسٹر مشروعہ ۲۴ اکتوبر کے فتوی ۴۸ میں بموجب سوال ڈپٹی صاحب وسوداگر میر عبدالجلیل صاحب بلاحوالہ کسی کتاب کے تحریر فرمایا ہے[1]۔

☆ مدارس و مکاتب' واقعہء مساجد کے متعلق فقہاء علیہم الرحمۃ میں اختلاف ہے۔بعض کا یہی مسلک ہے کہ آمدنیِ مساجد سے مدارس و مکاتب میں صرف کرنا نہ چاہئے۔اور بعض فقہاء رحمہم اللہ نے مدارس و مکاتب کو تعمیرِ باطن قرار دے کر جائز قرار رکھا ہے۔ چنانچہ غالباً بموجب اس فتوی کے ہمارے ممبروں کو مصارفِ متعلقہء مدرسہء جامع مسجد وغیرہ میں کچھ شبہات ہورہے ہیں۔مگر مجھ کو ایسی روایت باوصف تلاش نہیں ملی اور نہ ملنے کی امید ہے کہ جس میں بہ نسبت صرف کرنے ایسے وقف سے مدراسِ مستقلہ پر یا مدارسِ مسجد پر اختلافِ فقہا ثابت ہو۔ بلکہ بہ نسبت ایسے وقفِ معین کے بالاتفاق جمہور فقہاء یہی تحریر فرماتے ہیں ☆ کہ وقفِ معینِ مسجد کی فاضل آمدنی سے مدرسہ پر' و علی ہذا اوقافِ معینہء مدرسہ کی فاضل آمدنی سے مسجد پر صرف کرنا مطلقاً جائز نہیں۔اور اس تقدیر پر باوصفِ علم اس امر کے یہ اوقاف بالتعیین فقط متعلق عمارت' بدھنے' بوریا مسجد کے ہیں متولیانِ اوقافِ مذکورہ آمدنیِ اوقافِ مسطور سے مدرسہ پر صرف کرنے سے ضرور گنہگار ہوں گے اور عنداللہ دَین دار۔اور ملازمینِ مدرسہ خواہ وہ مفتی ہوں یا مدرس ضرور نزدیک جمہور فقہا کے اور بموجب فتوی مذکورہ مفتی صاحب مرحوم' نزدیک بعض فقہاء کے نہ سہی مگر نزدیک بعض (دوسرے) فقہا کے ضرور حرام خور ٹھہریں گے۔

---

[1] یہ فتوی اس رجسٹر سے پہلے کسی اور رجسٹر میں ہوگا۔نہ معلوم وہ کہاں ہے۔

چنانچہ صفحہ ۴۱۳ ردالمحتار مصری میں ہے:

فان انتهت عمارته و فضل من الغلة شئ يبدا بما هو اقرب للعمارة و هو عمارته المعنوية التى هى قيام شعائره قال فى الحاوى القدسى والذى يبدا من ارتفاع الوقف اى من غلته عمارته شرط الواقف اولا ثم ما هو اقرب الى العمارة و اعم للمصلحة كالامام للمسجد والمدرس للمدرسة يصرف اليهم قدر كفا تيهم ثم السراج والبساط كذلك الى آخر المصالح هذا اذا لم يكن معينا فان كان الوقف معينا على شىء و يصرف اليه بعد عمارة البناء[1].

☆ (ترجمہ: اگر اس کی تعمیر مکمل ہو جائے اور آمدنی سے کچھ بچ رہے تو خرچ کا آغاز اس جہت سے کیا جائے گا جو اس کی تعمیر کے سب سے قریب ہو۔ اور یہ معنوی تعمیر (آبادی) ہے اور معنوی تعمیر اس کے علامات کا قیام ہوتا ہے۔ الحاوی القدسی میں فرمایا' وقف کی آمدنی کا خرچ وقف کی تعمیر پر کیا جائے گا۔ وقف کنندہ نے خواہ اس کی شرط لگائی ہو یا نہ۔ پھر اس جہت پر خرچ کیا جائے گا جو تعمیر کے قریب تر ہو اور اس کی مصلحت کے لیے عام تر ہو جیسے مسجد کے لیے امام' مدرسہ کے لیے استاذان پر اتنا خرچ کیا جائے گا جو ان کے لیے کافی ہو۔ اس کے بعد چراغ اور دری' فرش پر اسی طرح مصالح کے آخر تک خرچ کیا جائے گا۔ یہ اس صورت میں ہے جب کہ وقف معین نہ ہو اگر اسی جہت کے لیے معین ہو تو عمارت بن چکنے کے بعد اس جہت پر خرچ کیا جائے گا)

اور صفحہ ۴۵۷ درمختار میں ہے:

ليس للقاضى ان يقرر وظيفة فى الوقف بغير شرط الواقف ولا يحل للمقرر له الاخذ الا النظر على الوقف باجر مثله[2].

☆ یعنی قاضی کو نا جائز ہے کہ بغیر شرطِ واقف کے وقفِ معین سے کسی کا وظیفہ مقرر کرے۔ اور جس کا وظیفہ

---

[1] رد المحتار: جلد ۳ صفحہ ۴۱۲ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

[2] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۳ صفحہ ۴۵۷ ایضا

مقرر کیا جائے اس کو اس وظیفہ کا لینا حرام ہے ہرگز حلال نہیں۔ البتہ ناظر یعنی محافظ اور نگہبانِ وقف بقدر اپنی محنتِ محافظت کے اجرت لے سکتا ہے نہ کہ بطریق وظیفہ کے‘ کہ خواہ وہ کام کرے یا نہ کرے اور مستحقِ وظیفہ رہے۔

علی ہذا اگر محاسب اور جابی یعنی کرایہء وقف وصول کرنے والا‘ کہ ضرورت پڑے تو بقدرِ ضرورت ہر ایک کی محنت کے اندازہ پر ان کو آمدنیِ اوقافِ مذکورہ سے اجرت اور محنتانہ دے سکتا ہے۔

چنانچہ صفحہ ۴۵۷ شامی میں ہے:

اعلم ان عدم جواز الاحداث مقيد بعدم الضرورة كما فى فتاوى شيخ قاسم اماما ادعت اليه الضرورة واقتضت المصلحة كخدمة الربعة الشريفة وقراءة العشر والجباية وشهادة الديوان فيرفع الى القاضى ويثبت عنده الحاجة فيقرر من يصلح لذلك يقدر له اجر مثله او ياذن للناظر فى ذلك قال الشيخ قاسم والنص فى مثل هذا فى الولوالجية. ابوسعود على الاشباه[1].

(ترجمہ: نیا وظیفہ کے مقرر کرنے کا عدمِ جواز اس صورت سے مقید ہے‘ جب کہ ضرورت نہ ہو‘ جیسا کہ فتاوی شیخ قاسم رحمۃ اللہ علیہ میں ہے لیکن اگر ضرورت ہو اور مصلحت کا تقاضا ہو مثلاً قرآن مجید کے اجزاء کی خدمت‘ کرایہ اور عشر کو جمع کرنا‘ رجسٹر کا معاینہ‘ تو معاملہ قاضی کے سامنے پیش کیا جائے اور ضرورت ثابت کی جائے وہ اس شخص کا تقرر کرے جو اس کام کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور اس کے لیے مثلی اجرت مقرر کرے تو یا متولی کو اس کی اجازت دے دے حضرت شیخ قاسم رحمہ اللہ نے فرمایا اس قسم کی جزئیات کی نص فتاوی ولوالجیہ میں ہے۔ **ابو سعود علی الاشباہ**)

☆ دوسری صورت اس وقف کی‘ جو حقیقتاً وقف ہے یہ ہے‘ کہ واقف کی جانب سے یہ امر ثابت ہو جائے کہ واقف نے کسی مصلحتِ خاصہ پر مثل صورتِ اول کے مثلاً فقط تعمیرِ شکست و ریختِ مسجد پر یا مصارفِ تیل بتی پر یا فقط وظائفِ امام و موذن پر وقف نہیں کیا تھا☆ بلکہ واقف نے آمدنی ان اوقاف کو مطلق مصالحِ مسجد پر

---

[1] رد المحتار: جلد ۴ صفحہ ۴۳۵‘ ۴۳۶ مطبوعہ مطبعہ المصطفی البابی الحلبی مصر

بالتصریح وقف کیا تھا۔ تو اندریں صورت مصلحتوں کا اعتبار بحسبِ عرفِ زمانہ وعادتِ واقف ہوگا۔ اگر عرف وعادتِ زمانۂ واقف معلوم نہ ہو تو عرف وعادتِ زمانۂ حال پر فتویٰ دیا جائے گا۔ اس واسطے کہ بصورتِ عدم مخالفتِ نص جو حکم عرف وعادت سے ثابت ہو وہ مثل اسی حکم کے ہوتا ہے، جو نص صریح سے ثابت ہو۔

کما فی صفحه ۲۱۰ من الجزء الثالث للشامی:

☆ و فی شرح البیری عن المبسوط ☆ان الثابت بالعرف کالثابت بالنص[1]

(ترجمہ: البیری کی شرح میں مبسوط سے ہے، کہ جو چیز عرف سے ثابت ہو وہ ایسے ہی ہوتی ہے، جس طرح کہ کوئی چیز نص سے ثابت ہے)

☆ بلکہ رسالہ نشر العرف شامی علیہ الرحمۃ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر عرفِ زمانہء قدیم معلوم بھی ہو تو بہر صورت عرف وعادتِ زمانہء حال ملحوظ ہوگا۔ خصوصاً ایسے اوقاف میں جن کا حال کچھ بھی معلوم نہیں۔

چنانچہ رسالہ نشر العرف میں علامہ محقق ابن عابدین رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں۔

و قد سمعناک ما فیه الکفایة فی اعتبار العرف والزمان واختلاف الأحکام باختلافه فللمفتی الآن ان یفتی علی عرف اهل زمانه و ان خالف زمان المتقدمین و کذا للحاکم العمل بالقرائن فی أمثال ما ذکرناه حیث کان امرا ظاهرا[2]

یعنی جب بقدر کفایت وکافی طور سے تم کو اعتبارِ عرف اور زمانہ کی کیفیت اور باعتبار اختلافِ زمانہ کے حکموں کے بدلنے کی حالت معلوم ہو چکی۔ تو اب مفتی کو لازم ہے، کہ گو عرفِ حال، متقدمین کے عرف کے مخالف ہو، مگر اپنے زمانہ کے عرف کے موافق فتویٰ دے۔ اور اسی طرح حاکم امورِ ظاہرہ دیکھ کر عمل قرائنِ حال پر کرے۔ بشرطیکہ مخالفِ نصِ صریح شارع علیہ الصلاۃ والسلام نہ ہو۔

☆ لہٰذا چوں کہ اعتبارِ مصالحِ مسجد موقوف عرفِ زمانہء حال پر ہے اور ظاہر ہے جو بھی کوئی وقف مصالحِ

---

[1] رد المحتار: جلد ۳ صفحه ۲۱۰ مطبوعه مکتبه رشیدیه کوئٹه

[2] نشر العرف فی بناء بعض الأحکام علی العرف (مشموله رسائل ابن عابدین) جلد دوم: صفحه ۱۲۸ مطبوعه سهیل اکیڈمی لاهور

مسجد پر کرے گا وہ اعتبار مصالحِ مسجد کا امورِ غیر منصوصہ میں اپنے زمانہ کے عرف کے مواقف کرے گا۔ اگر وہ تمام مصلحتیں شرعا جائز ہوں گی اور ان پر وقف کرنے سے واقف مستحق ثواب ہوگا۔ اور جن امور کو اہلِ زمانہ مخالفِ مصلحتِ مسجد سمجھیں ان کا وہ ہرگز لحاظ نہ کرے گا۔ اور ان کی طرف اس کا خیال بھی نہ ہوگا۔ لہٰذا جس زمانہ میں پنکھے رکھنے کو بھی موجبِ غفلت نمازیان مسجد سمجھتے تھے۔

کما ھو ظاھر من مدخل الشریعة حیث قال

و یکرہ و ضع المرواح فی المسجد[1]

(مسجد میں پنکھے رکھنے کو بھی داخلِ مصالحِ مسجد نہیں رکھا)

بعض نے روشنی قدرِ ضرورت کو مدنظر رکھ کر انتظامِ تیل بتی کو بھی مصالحِ مسجد سے خارج سمجھ لیا۔ کسی نے بلحاظ اس امر کے کہ نماز زمین پر پڑھنا بہ نسبت نماز پڑھنے کے دری وغیرہ پر افضل ہے۔

حیث قال الحلبی رحمہ اللہ فی ۳۴۷ من الکبیری

لکن الصلوة علی الارض بلاحائل و علی ما انبته الارض کالحصیر و البوریا افضل لانہ اقرب الی التواضع[2]

(ترجمہ: لیکن نماز زمین پر بغیر کسی حائل کے اور ایسی چیز پر جو زمین سے اُگی ہو جیسے چٹائی اور بوریا' ادا کرنا افضل ہے۔ کیونکہ یہ تواضع کے زیادہ قریب ہے)

بہ نسبت غائتِ تواضع' فرشِ بوریہ وغیرہ کو بھی مصالحِ مسجد میں شامل نہ رکھا۔

---

[1] المدخل لابن الحاج جلد ۲ صفحہ ۲۱۷ مطبوعہ دار الحدیث

نوٹ: مدخل کی اصل عبارت یوں ہے:۔

وقد منع علمائنا رحمة اللہ علیھم المرادح اذ ان اتخاذھا فی المسجد بدعة

حضرت مصنف علیہ الرحمۃ نے روایت بالمعنی کی ہے۔ محمد علیم الدین عفی عنہ

[2] غنیة المستلمی صفحہ ۳۴۷ کتب خانہ رحیمیہ دیوبند

كما هو ظاهر من قول ابن نجيم رحمه الله فى صفحة ٢١٢ من البحر الرائق الجلد الخامس :

فى القنية رقم لركن الدين الصباغى قال كتبت الى المشائخ ورمز للقاضى عبدالجبار و شهاب الدين الامامى هل للقيم شراء المراو ح من مصالح المسجد فقالا لا ثم رمز للعلاء الترجمانى فقال الدهن والحصير والمرواح ليس من مصالح المسجد و انما مصالحه عمارته ثم رمز لابى حامد و قال الدهن والحصير من مصالحه دون المراوح و قال يعنى مولانا بديع الدين هو اشبه للصواب و اقرب إلى غرض الواقف فقد تحرر ان الراجح كونهما من المصالح[1]

(ترجمہ: قنیہ میں امام رکن الدین صباغی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب یہ قول ہے کہ میں نے مشائخ یعنی قاضی عبدالجبار رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ شہاب الدین امامی رحمۃ اللہ علیہ کی جانب سوال لکھا کہ کیا متولی کے لئے جائز ہے کہ مصالحِ مسجد سے پنکھے خریدے۔ ان دونوں حضرات نے فرمایا نہیں۔ پھر علاء علاء الترجمانی رحمۃ اللہ علیہ کی جانب یہ قول منسوب فرمایا' کہ تیل' چٹائی اور پنکھے مصالحِ مسجد سے نہیں ہیں۔ پھر مولانا بدیع الدین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ قول درستی کے زیادہ مشابہ اور واقف کی غرض کے زیادہ قریب ہے۔ لہٰذا انہوں نے ان دونوں یعنی تیل اور چٹائی کو مصالح سے ہونے کے راجح ہونے کو عمدہ قرار دیا)

یعنی قاضی عبدالجبار وشہاب الدین امامی رحمہا اللہ سے جب مالِ وقف علی مصالحِ المسجد کی نسبت سوال کیا گیا کہ پنکھوں کا خرید کر مسجد میں رکھنا بھی داخل مصالحِ مسجد ہے تو انہوں نے فرمایا کہ نہیں۔ اس واسطے کہ مصالحِ مسجد کی درمختار سے یہ تعریف مفہوم ہوتی ہے' کہ جس کے نہ ہونے سے غرضِ بنائے مسجد' جو آبادیٔ مسجد ہے' ذکر اللہ کے ساتھ اور نماز و تذکیرِ مسائل دینی فوت ہو جائے۔

چنانچہ صفحہ ۴۱۶ درمختار میں ہے علامہ علاء الدین حصکفی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] البحر الرائق شرح كنز الداقائق: جلد ۵ ،صفحه ۲۲۸ ' ۲۲۹ ' مطبوعه دار المعرفه بيروت

انما یکون المدرس من الشعائر لو مدرس المدرسة کما مر اما مدرس الجامع فلا لانه لا یتعطل لغیبته بخلاف المدرسة حیث تقفل اصلا[1]

(ترجمہ: مدرس اس وقت شعائر سے ہوگا' جب وہ مدرسہ کا مدرس ہوگا۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا۔ اگر جامع مسجد کا مدرس ہو'تو وہ شعائر سے نہیں ہے۔ کیونکہ مسجد اس کے موجود نہ ہونے سے معطل نہیں ہوتی بخلاف مدرسہ کے کہ وہ مدرس کے بغیر بالکل مقفل ہو جاتا ہے)

یعنی مدرس کو جو شعائر اور مصالح میں شمار کیا ہے اس سے وہی مدرس مراد ہو سکتے ہیں جو مدرسہ کے مدرس ہوں نہ کہ مدرسِ مصالحِ مسجد۔ اس واسطے کہ مدرسِ مسجدِ جامع کے غائب ہونے سے مسجد معطل نہیں ہو سکتی بخلاف غیبتِ مدرسِ مدرسہ کے کہ ان کے بغیر مدرسہ مقفل ہو جائے گا۔

چنانچہ یہی سمجھ کر پنکھوں کے نہ ہونے سے مسجد معطل نہیں ہو سکتی' قاضی عبدالجبار اور شہاب الدین امامی رحمہما اللہ نے پنکھوں کو مصالح مسجد سے خارج سمجھ لیا۔ پھر جب یہ دیکھا گیا کہ جن مسجدوں میں پنکھوں کا 'خصوصاً زمانہ گرمی میں' انتظام نہیں ہوتا نمازی کم ہو جاتے ہیں۔ اور آبادی کی کمی ہونے لگتی ہے۔ عام طور سے علماء نے اجازت دی دے۔ اور تمام مساجد میں عرفِ عام ہو گیا کہ جن میں آمدنی اوقاف ہے' اس آمدنی سے 'ورنہ نمازی اپنے پاس سے پنکھوں کے انتظام کو عموماً مصالحِ مسجد سے سمجھتے ہیں۔ بلکہ بعض نے تو اکثر مساجد میں آمدنیٔ اوقافِ مسجد سے بجلی کی روشنی اور بجلی کے پنکھے جاری کیے ہیں' اور جو نئی مسجد اب بنی ہیں اور ان کے بانیوں نے ان پر جو وقف کئے ہیں انہیں اوقاف سے بغرضِ تحصیلِ ثواب اور کثرتِ نمازیانِ مسجد بجلی کے پنکھے اور بجلی کی روشنی بھی ساتھ ہی لگاتے ہیں۔ چنانچہ علامہ زین الدین بن نجیم رحمہ اللہ نے بھی اپنے زمانہ کے واقفوں کی عادت وعرف کو دیکھ کر پنکھوں کو بالتصریح مصالحِ مسجد سے شمار کیا ہے۔

چنانچہ کتاب الوقف الاشباہ والنظائر میں تحریر فرماتے ہیں:۔

وقف علی المصالح فهی للامام والخطیب والقیم و شراء الدهن والحصیر

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۳: صفحہ ۴۴۳' دار احیاء التراث العربی بیروت

والمراوح ۱؎

(ترجمہ: اگر کسی نے کوئی چیز مسجد کے مصالح کے لیے وقف کی تو یہ امام، خطیب، متولی، تیل، چٹائیوں اور پنکھوں کی خریداری کے لیے ہے)

علی ھذا جن مسجدوں کی آمدنی اوقاف صحیحہ جو حقیقتاً واقفوں کے مال مملوکہ سے وقف ہیں، بہت زیادہ ہے، اسی آمدنی سے وظیفہ مدرسینِ مسجد وطلبہ، مسجد مذکور کو اور ناظر و جابی یعنی محصل کرایہ اور محاسب اور نگہبانان مسجد اور فراش وغیرہ کو مصالحِ مسجد سے سمجھتے ہیں۔ اور یہ عرف اس قدر شائع ہو گیا کہ عرب سے ہند تک مسلسل ہے۔ اور مذکور کو مصالحِ مسجد سے تحقیقاً ہونا بہت واقفانِ حال سمجھنے لگے اور زمانہ علاء الدین حصکفی رحمہ اللہ صاحب درمختار بلکہ ان کے زمانہ سے بھی پہلے معلوم ہوتا ہے کہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۲؎۔۔۔ حالات واقفین، منتظم مسجد، امام، موذن خطیب، مدرس مسجد، فراش، روشنی کنندہ کو من جملہ مصالحِ مسجد یعنی عمارتِ باطنی مسجد سمجھنے لگے چنانچہ صفحہ ۴۱۰ درمختار میں ہے:۔

و یدخل فی وقف المصالح قیم

امام خطیب و الموذن یعتبر ۳؎

الشعائر التی تقدم شرط ام لم یشرط بعد العمارة هی امام و خطیب ومدرس وو قاد و فراش و موذن و ناظر و ثمن زیت و قنادیل و حصر و ماء و ضو و کلفة نقله للمیضاة ۴؎

۱؎ الاشباہ والنظائر: جلد اول: صفحہ ۳۰۱، ۳۰۲، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی۔

۲؎ رجسٹر فتاوی سے عبارت پڑھی نہیں جا سکی۔ مرتب عفی عنہ

۳؎ یہ شعر علامہ ابن وہبان رحمۃ اللہ علیہ کے منظومہ کا ہے جو انہوں نے علم فقہ میں لکھا اور اس سے آگے اس کی شرح سے منقول عبارت ہے جو علامہ شرنبلالی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمائی۔ جیسا درمختار کی محولہ عبارت سے ماقبل عبارت سے عیاں ہوتا ہے۔

مرتب عفی عنہ

۴؎ الدر المختار مع رد المحتار جلد ٦ صفحہ ۴۴۳ دار احیاء التراث العربی بیروت

قال الشامی رحمه الله:

قوله فی وقف المصالح. أی فیما لو وقف علی مصالح المسجد[1]

(ترجمہ: یعنی اگر وقف مصالحِ مسجد پر ہو تو مصالحِ مسجد میں منتظم اور متولی اور امام اور خطیب اور موذن اور مدرس اور روشنی کنندہ اور فراش اور ناظرِ وقف بھی داخل ہیں۔ اور مصارف تیل اور قندیل اور چٹائی اور آبِ وضو اور وضو کی جگہ تک آبِ وضو لانے کی اجرت بھی داخلِ مصالحِ مسجد ہیں)

اور بعینہ یہی مضمون صفحہ ۲۱۳ بحر الرائق میں ہے۔ علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

والذی یبتدا بہ من ارتفاع الوقف عمارته شرط الواقف اولا ثم ما هو اقرب الی العمارة و اعم للمصلحة کالامام للمسجد و المدرس للمدرسة یصرف الیهم قدر کفایتهم ثم السراج والبساط کذلک إلی آخر المصالح و ظاهره تقدیم الامام والمدرس علی جمیع المستحقین بلا شرط والتسویة بالعمارة یقتضی تقدیمهما عند شرط الواقف انه ذا ضاق ریع الوقف قسم علیهم بالحصة و ان هذا الشرط لایعتبر و لکن تقدیم المدرس انما یکون بشرط ملازمته للمدرسة للتدریس الأیام المشروطة فی کل جمعة ولذا قال للمدرسة لان مدرسها اذا غاب تعطلت بخلاف مدرس الجامع[2]

(ترجمہ: وقف کی آمدنی کے خرچ کا آغاز اس کی تعمیر پر کیا جائے گا۔ واقف نے خواہ اس کی شرط لگائی ہو یا نہ۔ زاں بعد اس مد میں خرچ کیا جائے گا جو عمارت کے سب سے زیادہ قریب ہو۔ اور جس کی مصلحت سب سے زیادہ عام ہو جیسا کہ مسجد کے لیے امام اور مدرسہ کے لیے مدرس۔ ان پر اتنا خرچ کیا جائے گا جو ان کے لیے کفایت کرے۔ اس کے بعد چراغ' دریوں' چٹائیوں سے لے کر مصالح کے آخر تک ترتیب سے خرچ کیا جائے گا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام مستحقین سے مسجد کے امام اور مدرسہ کے مدرس کو بغیر شرط کے مقدم رکھا

---

[1] رد المحتار جلد ۶ صفحہ ۴۴۳ دار احیاء التراث العربی بیروت

[2] البحر الرائق جلد ۵ صفحہ ۲۳۰، ۲۳۱ دار المعرفة بیروت

جائے گا۔اوران کوعمارت کے برابر مستحق قرار دینے کا تقاضا یہ ہے' کہ اگر واقف نے شرط لگائی ہو' کہ ان کو عمارت سے مقدم رکھا جائے' تو مقدم رکھا جائے گا۔اور جب وقف کی پیداوار کم ہوتوان پر حصوں کے لحاظ سے تقسیم کی جائے گی اور مقرر حصہ کی شرط کا اعتبار نہ رہے گا۔لیکن مدرس کواس شرط پر تقدیم حاصل ہوگی جب کہ وہ ہر ہفتہ میں تدریس کے لیے مقرر دنوں میں تدریس کے لیے حاضر رہے۔اوراسی لیے فرمایا''مدرسہ کا مدرس'' کیونکہ جب مدرسہ سے اس کا مدرس غیر حاضر ہوگا تو مدرسہ معطل ہوجائے گا۔جامع مسجد کے مدرس کی یہ کیفیت نہیں ہوتی)

الحاصل خلاصہءتحریرِ علامہ ابن نجیم رحمہما اللہ یہ ہوا کہ وقف علی المصالح میں آمدنیِ وقفِ مسجد سے' خواہ واقف سے تصریح پائی جائے یا نہ پائی جائے' بعد ضروریات تعمیرِ ظاہری مسجد' اول امامِ مسجد کو بقدر کفایت دیا جائے گا۔اور اگر وقف علی مصالح المدرسہ ہے تو بعد تعمیرِ مدرسہ' مدرس کو دیا جائے گا۔پھر مصارف چراغ' بتی' فرش وفروش وغیرہ میں خرچ کیا جائے گا۔اور مدرسِ جامع مسجد داخلِ مصالحِ مسجد نہیں ہوسکتا۔اس واسطے کہ اگر مدرسِ جامع غائب رہے' مسجد کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آسکتا۔بخلاف مدرسِ مدرسہ کہ بغیر حاضریِ مدرس' مدرسہ بند ہی ہوجاتا ہے۔اور تصریح اس امر کی بہت ہی واضح عبارتِ منقولہ صفحہ ۴۱۶ درمختار میں گزر چکی مگر منحۃ الخالق حاشیہ البحر الرائق مصری کے صفحہ ۲۱۴ میں علامہ شامی رحمہ اللہ تردید اس قول مذکور کی کہ مدرسِ جامع داخلِ شعائرِ مسجد نہیں ہوسکتا۔

شرح قول البحرا لرائق بخلاف مدرس الجامع میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

قال المقدسی رحمہ اللہ انت خبیر بان ما ذکر لایشھد لما ادعی من الفرق بین المدرسة والجامع و غایة ما فیه ان الجامع الذی شرط تدریس اذا غاب مدرسه لم یقطع من حیث کونه مسجدا و یتعطل من حیث کونه مدرسة فیجب تقدیمه من ھذه الحیثیة[1] .

---

[1] منحة الخالق حاشیه البحر الرائق: جلد ۵ صفحه ۲۳۱ دار المعرفه بیروت

(ترجمہ: علامہ مقدسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم کو معلوم ہے کہ جو کچھ بیان کیا گیا یہ ان کے اس دعویٰ پر شہادت نہیں دیتا' جو انہوں نے کیا ہے' کہ مدرسہ اور جامع مسجد کے مدرس میں فرق ہے۔ ان کی آخری بات یہ ہوسکتی ہے کہ وہ جامع مسجد جس میں واقف نے تدریس کی شرط لگائی ہو جب اس کا مدرس غیر حاضر ہوگا تو اس کی مسجد ہونے کی حیثیت تو ختم نہ ہوگی۔ لیکن اس کے مدرسہ ہونے کی حیثیت تو معطل ہو جائے گی۔ لہٰذا اس حیثیت کے پیش نظر اس مدرس کو مقدم کرنا ضروری ہے)

یعنی جس جامع مسجد میں تصریحِ واقف یا عرفِ حال سے بحسب کثرت وقلتِ آمدنیءِ وقف مدرسہ کا جاری رکھنا بھی ثابت ہو مدرس مدرسہ اور مدرس جامع میں فرق کرنے کی دلیل قائم نہیں ہوتی۔ اس واسطے کہ مدرسِ جامع کے غائب ہونے سے اگرچہ مسجدِ جامع کی جامعیت اور آبادی میں فرق نہیں آتا۔ مگر آبادیٔ مدرسہء مسجد میں تو ضرور فرق آجائے گا۔ بلکہ مثل دیگر مدارس کے مدرس کے نہ ہونے سے مدرسہء مسجدِ جامع بھی معطل اور بند ہو جائے گا۔ لامحالہ مدرسِ جامع بھی داخلِ مصالحِ مسجد ہوگا۔

بہرنہج اگر تصریحِ واقف یا دلالتِ عرف سے مدرسِ جامع کا مصالح اور آبادیٔ مسجد سے ہونا ثابت ہوگا تو بالاتفاق مدرسِ جامع کو بھی آمدنیءِ وقف سے بقدر کفاف دینا جائز ہوگا۔ اور اگر ثابت نہ ہو جیسا کہ قولِ روایتِ درمختار اور بحر سے ظاہر ہے مگر مدرس کو اس صورت ثانی میں بھی آمدنیءِ وقف علی المصالح سے دینا ناجائز ہوگا۔ اور مدرس کو تنخواہ لینا حرام۔ پھر واعظ اور مفتی کو تو دینا اور واعظ اور مفتی کو مشاہرہ لینا بدیں صورت کسی طرح بھی جائز نہیں ہوسکتا۔ اس واسطے کہ بمبئی' کلکتہ' دہلی' اور' لاہور وغیرہ میں جو مساجدِ جدید وقدیم کم وبیش اوقاف حقیقی رکھنے والی ہیں' بحسب ان کی آمدنی کے اگرچہ یہ عرف میں شائع وذائع ہوگیا ہے کہ وظائف یعنی تنخواہ و مشاہراتِ محاسب وفراش و چوکیدار' امام ومؤذن' خطیب ومدرسینِ مدرسہء مسجد اور نیز مصارف افطاری و شیرینیءِ ختم اور تیل اور بتی بوریہ بنکی اور نیز پاخانہائے متعلقۂ مسجد کو بھی واقفینِ حال مصالحِ مسجد سے سمجھتے ہیں اور بموجب ان سے عرف زمانہءحال کے بموجب روایت مذکورہ شر العرف اوقاف مساجدِ قدیمہ بھی عمل درآمد ہو رہا ہے۔ مگر کسی شہر کی کسی مسجد اوقاف کثیرہ رکھنے والی میں واعظ اور مفتی کو ملازم رکھتے ہوئے دیکھا نہ

سنا۔ اور مصالحِ مسجد سے واعظ اور مفتی کو جہاں تک میری نظر ہے کسی فقیہ کو شمار کرتے ہوئے کسی بھی کتاب میں نہیں دیکھا۔ جو اوقاف متعلقہ مساجد بیت المال سے قرار دیے گئے ہیں ان سے ضروری وظیفہ مفتی اور علما اور طلبہ کے اب تک ضرورت نقل کی گئی ہے جس کا ذکر عنقریب آنے والا ہے۔ اور چوں کہ ملازمین اس قسم کے وقف کے جس کا ذکر ہو رہا ہے اجیر قرار دیئے گئے ہیں عند الفقہا بغیر کام کرنے کے مستحق مشاہرہ و اجرت معینہ نہ ہوں گے۔

چنانچہ صفحہ ۲۰۹ فتاویٰ حامدیہ میں ہے:

فی البحر لا یستحق الامن باشر العمل و فی الاشباہ قد اغتر کثیر من الفقہاء فی زماننا فاستباحوا معالیم الوظائف من غیر مباشرۃ الخ [۱]

☆ (ترجمہ: البحر الرائق میں ہے، کہ جو شخص کام نہ کرے وہ مزدوری کا مستحق نہیں ہے۔ الاشباہ میں ہے، کہ ہمارے زمانہ کے بہت سے فقہاء کو دھوکا ہوا ہے انہوں نے مقررہ وظائف کو حاصل کرنا بغیر کام کیے مباح قرار دیا ہے)

مر النص قید فی صفحہ ۲۰۵

ما یاخذہ الناظر ھو بطریق الاجرۃ ولا اجرۃ بدون العمل بحر عن الخانیۃ. [۲]

(ترجمہ: نگران جو وظیفہ پاتا ہے جو مزدوری ہوتی ہے۔ اور عمل کے بغیر مزدوری نہیں۔ محیط۔ خانیہ)

اگر ناظر و امام وغیرہ ملازمین وقف مذکور سے ایسے بیمار ہو جائیں کہ بالکل خدمت معینہ ادا نہ کر سکیں یا بوجہِ سفرِ حج ادائے خدمتِ معینہ سے بالکل معذور ہیں، مستحق اجرت و مشاہرہ نہ رہیں گے۔

چنانچہ صفحہ ۴۴۷ جلد ثالث شامی میں ہے

ذکر الخصاف انہ لو أصاب القیم خرس أو عمی أو جنون أو فالج أو نحوہ من الأفات فإن أمکنہ الکلام والأمر والنھی والأخذ والإعطاء فلہ اخذ الاجر والا فلا قال

---

[۱] تنقیح الفتاوی الحامدیۃ: جلد اول: صفحہ ۲۱۴ المکتبۃ الحبیبیہ کوئٹہ

[۲] تنقیح الفتاوی الحامدیۃ: جلد اول: صفحہ ۲۱۳ المکتبۃ الحبیبیہ کوئٹہ

الطرطوسی و مقتضاه ان المدرس و نحوه اذا اصابه عذر من مرض او حج بحیث لا یمکنه المباشرة لا یستحق المعلوم لانه ادار الحکم فی المعلوم علی نفس المباشرة فان وجدت استحق المعلوم والا فلا و ھذا ھو الفقه۔[1]

(ترجمہ: امام خصاف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا متولی کو اگر گونگا پن' اندھا پن' پاگل پن' فالج یا ان کی مانند امراض لاحق ہو جائیں' اگر اس کے لیے کلام کرنا' حکم دینا' روکنا' لینا اور دینا ممکن ہو' تو اس کو اجرت حاصل کرنا جائز ہے ورنہ نہیں۔ اور علامہ طرطوسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس کا تقاضا یہ ہے کہ مدرس اور اس کی مانند لوگوں کو جب کسی بیماری یا حج پر روانگی کے باعث عذر لاحق ہو جائے' کہ وہ اپنے فرائض ادا نہ کر سکیں' تو مقررہ وظیفہ کے مستحق نہیں۔ کیونکہ مقررہ وظیفہ کے حصول کا دارومدار عمل کرنے پر ہے۔ اگر عمل پایا گیا تو مقررہ وظیفہ کے مستحق ہیں ورنہ نہیں۔ اور یہی سمجھداری کی بات ہے)

یعنی منتظمِ وقف اور مدرس وغیرہ ملازمین کام کریں گے تو مستحق اجرت ہوں گے ورنہ کچھ نہ ملے گا۔ اور مدرس اور امام وموذن وغیرہ کے متعلق یہ حکم جب صحیح ہوگا جب بموجب مذہبِ متاخرین جوازِ اجرت کا بمعاوضہ قیدِ امامت اور تدریس کے کسی مسجد یا مدرسۂ خاص کے ساتھ جو قول مفتی بہ ہے' فتویٰ دیا جائے۔ اور اندریں صورت ان جملہ ملازمین مسجد' امام و مدرس' وغیرہ کی چھوڑی ہوئی تنخواہ' اگر یہ مر جائیں' اتنے دنوں کی' جن میں انہوں نے کام کیا ہے' ان کے ورثہ کو ضرور دی جائے گی۔ اور ایامِ تعطیل کی وضع کر لی جائے گی۔ اور بموجبِ مذہبِ متقدمین چونکہ وظائفِ امام وموذن و مدرسِ علوم دینیہ بطریق امداد سمجھی جاتی ہیں مثل صلہ کے بیت المال سے' لہٰذا ان کا چھوڑا ہوا وظیفہ بعد موت ان کے ورثا کو نہیں ملتا۔ البتہ ایام کام کرنے کا وظیفہ ان کو ضرور ملے گا' بوجہ ہونے اس وظیفہ کے بطریق امداد اور صلہ کے۔

چنانچہ صفحہ ۴۴۵ درمختار میں ہے:

مات الموذن و الامام و لم یستوفیا و ظیفتهما من الوقف سقط لانه کالصلة کا

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۶ صفحه ۴۹۰' ۴۹۱' ۴۹۲ دار احیاء التراث العربی بیروت

لقاضی و قیل لا یسقط لانہ کالاجرۃ کذا فی الدرر قبیل باب المرتد و غیرھا قال المصنف ثمہ و ظاھرہ ترجیح الاول لحکایۃ الثانی بقیل قلت قد جزم فی البغیۃ تلخیص القنیۃ بانہ یورث بخلاف رزق القاضی کذا فی وقف الاشباہ و مغنم النھر[۱].

(ترجمہ: مؤذن اور امام مرگئے ۔وقف سے انہوں اپنا وظیفہ نہ پایا۔تو وہ وظیفہ ساقط ہوجائے گا۔کیونکہ ان کا وظیفہ عطیہ ہوتا ہے۔جس طرح کہ قاضی کا وظیفہ عطیہ ہوتا ہے۔بعض علماء نے فرمایا کہ مرنے سے وظیفہ ساقط نہیں ہوتا۔کیونکہ یہ مزدوری کی مانند ہوتا ہے۔الدرر کے باب المرتد سے تھوڑا پہلے اور دیگر کتابوں میں اسی طرح ہے۔حضرت منصف رحمۃ اللہ علیہ نے وہاں فرمایا" کہ ترجیح پہلے قول کو ہے۔کیونکہ دوسرا قول "قیل" کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔میں کہتا ہوں کہ "البغیہ تلخیص قنیہ" میں ہے کہ ان کا وظیفہ وراثت میں تقسیم ہوگا بخلاف قاضی کے وظیفہ کے۔الاشباہ کے وقف اور النہر کے کتاب المغنم میں اسی طرح ہے۔)

قال الشامی رحمہ اللہ :

قولہ فی البغیۃ فجزمہ بہ یقتضی ترجیحہ قلت و وجھہ ما سیذکرہ فی مسئلۃ الجامکیۃ ان لھاشبہ الاجرۃ و شبہ الصلۃ ثم ان المتقدمین منعوا اخذ الاجرۃ علی الطاعات و افتی المتاخرون بجوازہ علی التعلیم و الاذان و الامامۃ فالظاھر ان من نظر الی مذھب المتقدمین رجح شبہ الصلۃ فقال بسقوطھا بالموت لان الصلۃ لا تملک قبل القبض و من نظر مذھب المتاخرین و ھو المفتی بہ رجح شبہ الاجرۃ فقال بعدم السقوط و حیث کان مذھب المتاخرین ھو المفتی بہ جزم فی البغیۃ بالثانی بخلاف رزق القاضی فانہ لیس لہ شبہ بالاجرۃ اصلا اذلا قائل باخذ الأجرۃ علی القضاء و علی ھذا مشی الطرطوسی فی انفع الوسائل علی ان المدرس و نحوہ من اصحاب الوظائف اذا مات فی اثناء السنۃ یعطی بقدر ما باشر و یسقط الباقی[۲]

---

[۱] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۶ صفحہ ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲ دار احیاء التراث العربی بیروت

[۲] رد المحتار: جلد ۶: صفحہ ۴۹۱، دار احیاء التراث العربی بیروت

(ترجمہ: قولہ بغیہ میں ہے۔ صاحب در مختار کا اس پر جزم فرمانا' تقاضا کرتا ہے' کہ یہی حکم راجح ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی وجہ وہ ہے جو منصف رحمۃ اللہ علیہ شاہی ملازمین اور لشکر کی تنخواہوں کے مسئلہ میں ذکر کریں گے' کہ ان کی مشابہت مزدوری سے بھی ہے اور عطیہ سے بھی۔ پھر متقدمین نے عبادات پر مزدوری لینے کو منع فرمایا ہے اور متاخرین نے تعلیم' اذان اور امامت پر اجرت کے جواز کا فتوی دیا ہے' تو ظاہر ہے' جس کی نظر متقدمین کے مذہب پر ہے اس نے عطیہ کے ساتھ مشابہت کو راجح قرار دیا۔ اور موت کے ساتھ اس کے سقوط کا قول کیا ہے۔ کیونکہ عطیہ قبضہ سے پہلے ملکیت میں نہیں آتا۔ اور جس نے متاخرین علماء کے مذہب کو دیکھا اور مفتیٰ بہ یہی ہے۔ اس نے اجرت کے ساتھ مشابہت کو راجح کہا اور فرمایا یہ موت سے ساقط نہیں ہوتا۔ اور چونکہ متاخرین کا مذہب مفتی بہ ہے' "بغیہ" میں دوسرے قول پر ہی جزم فرمایا۔ قاضی کا وظیفہ اس سے مختلف ہے کیونکہ اس کی مشابہت اجرت کے ساتھ بالکل نہیں ہے۔ کیونکہ قضا پر اجرت حاصل کرنے کا قائل کوئی بھی نہیں۔ علامہ طرطوسی رحمۃ اللہ علیہ نے "النفع الوسائل" میں اس کو اختیار کیا اور فرمایا مدرس اور اس کی مانند جن لوگوں کے وظائف مقرر ہیں' اگر وہ دوران سال مرجائیں' تو جتنا عرصہ کام کیا اس کی مزدوری دی جائے گی۔ اور باقی مقرر کردہ وظیفہ ساقط ہو جائے گا۔

☆ تیسری قسم وقف کی وہ وقف ہے جو بادشاہانِ سلف نے بیت المال سے اور ان کی اولاد اور ان کے امراء و وزراء نے جاگیروں سے' جو بیت المال سے رکھتے تھے ☆' مسجدیں بنا کر مساجد پر وقف کئے ہیں یا خانقاہوں پر کہ وہ بھی مآلاً بیت المال ہی سے وقف کرنے کا حکم رکھتی ہیں۔ ایسے اوقاف اگر مصلحتِ عامۂ مومنین پر وقف کئے گئے ہیں اور ان کا وقف کرنا صحیح ہے اور اس طرح کے وقف کرنے میں ضرور واقف مستحق اجر ہوں گے۔

چنانچہ صفحہ ۲۸۲ ردالمحتار میں ہے:۔

فی التحفة المرضیة عن العلامة قاسم من ان وقف السلطان لارض بیت المال صحیح [1]

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۳ صفحہ ۲۸۳' مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

(ترجمہ: التحفه المرضیه میں علامہ قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول منقول ہے کہ بیت المال کی زمین سے بادشاہ کا وقف کرنا درست ہے)

اور صفحہ ۴۳۰ درمختار میں ہے

و لو وقف السلطان من بيت ما لنا لمصلحة عمت يجوز[1]

ترجمہ: اگر بادشاہ اہلِ اسلام کے بیت المال سے عمومی مصلحت کی خاطر وقف کرے، تو وہ جائز ہے)

و فی صفحة ۴۳۰ من الجزء الثالث رد المحتار

لان بيت المال معد لمصالح المسلمين فاذا ابده على مصرفه الشرعی يثاب[2].

(ترجمہ: بیت المال مسلمانوں کی مصلحتوں کے لیے ہے۔ جب بادشاہ نے اس کو اس کے شرعی مصرف پر ہمیشہ کے لیے کردیا، تو وہ ثواب پائے گا)

اسی میں ہے۔

لعل مراده ای مراد العلامة القاسم من صحة الوقف انه لازم لا يغير اذا كان على مصلحة عامة كما نقل الطرطوسی رحمه الله عن قاضی خان من ان السلطان لو وقف ارضا من بيت مال المسلمين على مصلحة عامة جاز قال ابن وهبان لانه ابده على مصرفه الشرعی فقد منع من يصرفه من امراء الجور فی غير مصرفه[3].

(ترجمہ: علامہ قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی وقف کے صحیح ہونے سے مراد یہ ہے، کہ وہ وقف لازم ہوجائے گا۔ اور جب وہ عمومی مصلحت کے لیے وقف ہو تو اسے تبدیل نہ کیا جائے گا۔ جیسا کہ علامہ طرطوسی رحمۃ اللہ علیہ نے امام قاضی خان رحمۃ اللہ علیہ سے نقل فرمایا کہ بادشاہ بیت المال کی کوئی زمین عام مصلحت کے لیے وقف کرے تو جائز

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ٦ صفحه ٦٦٧، دار احياء التراث العربی بيروت

[2] رد المحتار: جلد ٣ صفحه ٦٦٧، دار احياء التراث العربی بيروت

[3] رد المحتار: جلد ٣ صفحه ٢٨٣، مكتبه رشيديه كوئٹه

ہے۔ امام ابن وھبان رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اس زمین کو اس کے شرعی مصرف پر ہمیشہ کے لیے وقف کر دیا اور ظالم امراء کو اس کے مصرف کے علاوہ اور کاموں میں صرف کرنے سے روک دیا)

یعنی قاضی خان اور ابن طرطوسی اور علامہ قاسم رحمہم اللہ کی صحتِ وقف بیت المال سے یہی مراد ہے کہ جو وقف بیت المال سے مصلحتِ عامہء اہل اسلام پر کیا جائے وہ لازم ہے۔ اس کو کوئی نہیں بدل سکتا۔

علامہ ابن وھبان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے' کہ واقف کی مراد اس وقف سے یہی ہے کہ مصارفِ شرعیہ متعلقہ' مصلحتِ عامہ پر یہ وقف ہمیشہ جاری رہے۔ اور کوئی ظالم امیر امرائے ستم گر سے علاوہ مصارفِ معینہ شرعیہ اس کو دوسری جگہ صرف نہ کر سکے۔☆ اور ظاہر ہے کہ جب وقفِ بیت المال میں شرطِ واقف تک ملحوظ نہیں ہوتی' پھر علاوہ مصلحتِ عامہ کوئی دوسرا شخص گو وہ امیر الاسلام ہی کیوں نہ ہو' دوسری جگہ اس کو کیوں کر صرف کر سکتا ہے۔ البتہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ شاہانِ سلف یا ان کی اولاد یا ان کے امراء وزراء نے اپنے مالِ مملوکہ سے ان اوقاف کو وقف کیا ہے نہ کہ مالِ بیت المال سے' تو ضرور مصارف ان اوقاف میں شروط ِواقف کا لحاظ ہوگا۔ اور جو احکام قسمِ اول وقف اور قسمِ دوم میں مذکور ہوئے حسبِ ثبوتِ نیت اور شرطِ واقف بالموجب عرفِ زمانہ حال' وہی احکام ان پر بھی جاری ہوں گے۔ اور بصورتِ عدمِ ثبوت اور عدمِ علم اس امر کے یہ اوقاف مالِ مملوکہء سلاطین اور ان کے وزراء امرا یا ان کی اولاد سے ہیں یا نہیں' ان پر وہی احکام جاری ہوں گے' جو اس پر جاری ہوئے ہیں' جن کا وقف کرنا مال بیت المال سے ثابت ہو۔ بلکہ اسی وجہ سے بعض فقہاء نے تو یہی تحریر فرمایا کہ بیت المال سے اگر وقف کیا جائے وہ وقف ہی صحیح نہیں ہوتا۔ مگر حقیقتاً اس قول سے ان کی غرض یہی ہے' کہ اس پر احکامِ وقف باعتبار مصارفِ وقف کے جاری نہیں ہوتے۔ یہ مراد نہیں ہے' کہ وہ فی الواقع صحیح اور لازم ہی نہیں ہوگا۔ کما ظاهر من الروايات المذكورة.

اور میرے فتویٰ مرتبہ جمہور علماء ٹونک وغیرہ میں بھی اس قسم کی بہت سی روایات کے ساتھ موثق کر کے' میں نے جو یہ لکھا ہے کہ اوقافِ شاہانِ سلف حقیقتاً وقف نہیں ہیں بلکہ وظائفِ مرصودہ مخصوصہء علماء وطلبہ مالِ بیت المال سے ہیں میری یہی غرض ہے۔

چنانچہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ رد المحتار مطبوعہ مصر صفحہ ۲۵۲ باب العشرو الخراج میں تحریر فرماتے ہیں:۔

و حيث ملكها بالشراء صح وقفه لها و تراعى شروط وقفه قال فى التحفة المرضية سواء كان سلطانا او اميرا او غيرهما و ما ذكره الجلال السيوطى من انه لا يراعى شروطه ان كان سلطانا او امير ا و انه يستحق ريعه من يستحق فى بيت المال من غير مباشرة للوظائف فمحمول على ما اذا وصلت الى الوقف با قطاع السلطان اياه من بيت المال كما لا يخفى. الخ حاصله ان ما ذكره السيوطى لا يخالف ما قلنا لانه محمول على ما اذا لم يعرف شراء الوقف لها من بيت المال بل و صلت اليه باقطاع السلطان لها اى بان جعل له خراجها مع بقاء عينها لبيت المال فلم يصح وقفه لها و لا تلزم شروطه بخلاف ما اذا ملكها ثم وقفها كما قلنا. قلت لكن بقى ما اذا لم يعرف شراء ه لها لا عدمه فالظاهر انه لا يحكم بصحة و فقها لانه لا تلزم من وقفه لها انه ملكها و لهذا قال السيد الحموى رحمة الله عليه فى حاشية الاشباه قبيل قاعدة اذا اجتمع الحلال والحرام مانصه و قد افتى علامة الوجود المولى ابو السعود مفتى السلطنة السليمانية بان اوقاف الملوك والامراء لا يراعى شرطها لانها من بيت المال او ترجع اليها و اذا كان كذلك يجوز الاحداث "اذا كان المقرر فى الوظيفة او المرتب من مصاريف بيت المال الخ" و لا يخفى ان المولى ابا السعود رحمة الله علية ادرى بحال اوقاف الملوك و مثله ما سيذكر الشارح فى الوقف عن المجية عن المبسوط ان السلطان يجوز له مخالفة الشرط اذا كان غالب جهات الوقف قرى و مزارع لان اصلها لبيت المال الخ. يعنى اذا كالت لبيت المال و لم يعلم ملك الواقف لها فيكون ذلك ارصادا لا وقفا حقيقة أى ان ذلك السلطان الذى وقفه اخرجه من يبت المال و عينه لمستحقيه من العلماء والطلبة و نحوهم

عونالهم علی ما وصولهم الی بعض حقهم من بیت المال[۱].

(ترجمہ: اور چونکہ وہ خریدنے کی وجہ سے مالک ہوگیا ہے لہٰذا اس کا اسے وقف کرنا صحیح ہے۔ اور اس وقف میں واقف کی شرائط کالحاظ کیا جائے گا التحفة المرضية میں فرمایا وہ خریدار خواہ بادشاہ یا امیر ہو یا ان دونوں کے علاوہ کوئی اور ہو۔ اور امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''اگر اسے وقف کرنے والا بادشاہ یا امیر ہو تو اس کی عائد کردہ شرائط کالحاظ نہ کیا جائے گا۔☆ اور اس کی آمدنی کا وہی بغیر کام کیے مستحق ہوگا جو بیت المال سے وظائف کا مستحق ہے'' امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان فرمودہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ وہ جائداد بادشاہ نے بیت المال سے وقف کنندہ کو بطور جاگیر عطا کی ہو جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے جو فرمایا وہ ہمارے قول کے مخالف نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ حکم اس صورت پر ہے جب کہ وقف کنندہ کی خریداری بیت المال سے معلوم نہ ہو۔ بلکہ اس تک وہ جائداد بادشاہ بطور جاگیر عطا کرنے سے پہنچی ہو۔ اس طرح سے کہ اس کی آمدنی بادشاہ اس کو عطا کرے لیکن وہ جائداد بیت المال کی ہی رہے۔ تو اس صورت میں اس کا وقف صحیح نہیں ہے۔ اور نہ ہی وقف کرنے کی صورت میں اس کی مقرر کردہ شرائط لازم ہیں۔ لیکن اس صورت میں حکم مختلف ہوگا جب کہ وقف کنندہ اس کا مالک ہو پھر اس کو وقف کرے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس صورت کا حکم باقی رہ گیا کہ پتہ نہ چلتا ہو کہ وقف کنندہ نے اسے خریدا ہے یا نہیں۔ تو ظاہر ہے اس صورت میں اس کے وقف کی صحت کا حکم نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کے وقف کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس کا مالک بھی ہو۔ اسی لیے علامہ سید حموی رحمۃ اللہ علیہ '' إذا اجتمع الحلال والحرام'' قاعدہ سے پہلے یوں فرمایا ہے کہ علامۃ الوجود میں مولانا ابوالسعود مفتی سلطنت سلیمانیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فتویٰ صادر فرمایا کہ بادشاہوں اور امراء کے اوقاف میں ان کی عاید کردہ شرائط کالحاظ نہ کیا جائے کیونکہ وہ اوقاف بیت المال سے ہوتے ہیں یا اس کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ جب صورتِ حالات یہ ہے تو وظیفہ یا تنخواہ کی مقررہ

---

[۱] الدر المختار رد المحتار: جلد ٦: صفحہ ۴۲۵، دار احیاء التراث العربی بیروت

مقدار؟ اگر بیت المال سے ہوتو اس میں نیا وظیفہ یا تنخواہ مقرر کرنا جائیز ہے یہ امر مخفی نہیں ہے کہ مولانا ابوالسعود رحمۃ اللہ علیہ بادشاہوں کے اوقاف کے حالات کو سب سے بہتر جانتے تھے اور اس کی مانند عنقریب حضرت شارح (صاحبِ درمختار) رحمۃ اللہ علیہ کتاب الوقف میں محسبیہ سے' اور صاحب محسبیہ مبسوط سے یوں نقل کرتے ہیں' کہ جب وقف کی اکثر جہات دیہات اور کھیت ہوں تو بادشاہ کے لیے شرط کی مخالفت درست ہے۔ کیوں کہ اس کی اصل بیت المال سے ہے۔ یعنی جب اوقاف بیت المال کے ہیں اور معلوم نہیں کہ وقف کنندہ ان کا مالک تھا یا نہیں' تو یہ عطیہ ہوگا نہ کہ حقیقی وقف۔ یعنی جس بادشاہ نے اس کو وقف کیا' اس نے اس جائداد کو بیت المال سے نکالا اور اس کے مستحق افراد یعنی علماء' طلباء اور ان کی مانند افراد کے لیے معین کر دیا تا کہ ان کا حق جو بیت المال میں ہے اس سے ان کے کچھ حصہ پر رسائی کی مدد ہو جائے)

اور چونکہ بالاتفاق وقفِ بیت المال جو مصلحتِ عامہ علماء' فضلا' طلبہ' مفتی' واعظ' وغیرہ پر ہوتا ہے' لازم ہو جاتا ہے۔ اور اگر خاص طور پر بادشاہ یا امام اپنی اولاد پر وقف کرے لازم نہیں ہوتا۔ اور اس کو مجازاً بھی وقف نہیں کہا جاتا۔ بلکہ اس پر اطلاق لفظِ ارصاد کیا جاتا ہے۔ اور جو وقف مصلحتِ عامہ پر ہو۔ گو حقیقتاً اس پر بھی اطلاق لفظِ ارصاد کیا جاتا ہے مگر بوجہ لازم ہو جانے ایسے اوقاف کے مجازاً ان پر اطلاقِ لفظِ وقف صحیح ہے۔ اور اکثر علما نے ایسے اوقاف علی مصلحتِ عامہ کو صحیح مانا ہے۔

علامہ شامی صفحہ ۲۸۲ جلد ثالث رد المحتار میں عبارت مذکورہ کے آگے تحریر فرماتے ہیں:

و لذا لما اراد السلطان نظام المملكة برقوق فى عام نيف و ثمانين و سبع ماية ان ينقض هذه الاوقاف لكونها اخذت من بيت المال و عقد لذلک مجلسا حافلا حضره الشيخ سراج الدين البلقينى والبرهان ابن جماعة و شيخ الحنفية الشيخ اكمل الدين شارح الهداية فقال البلقينى ما وقف على العلماء والطلبة لا سبيل الى نقضه لان لهم الخمس اكثر من ذلک و ما وقف على فاطمة و خديجة و عائشة رضى الله تعالىٰ عنهن ينقض وافقه على ذلک الحاضرون كما ذكره السيوطى فى النقل المستور فى جواز

قبض معلوم الوظائف بلا حضور ثم رایت نحوہ فی شرح الملتقی ففی هذا تصریح بان اوقاف السلاطین من بیت المال ارصادات لا أوقاف حقیقة و ان ما کان منها علی مصاریف بیت المال لا ینقض بخلاف ما وقفه السلطان علی اولادہ او عتقائه مثلا و انه حیث کانت ارصادا لا یلزم مراعاة شروطها لعدم کو نها و قفا صحیحا (أی حقیقة) فان شرط صحته ملک الواقف والسلطان بدون الشراء من بیت المال لا یملکه و قد علمت موافقة العلامة الاکمل علی ذلک و هو موافق لما مر عن المبسوط و عن المولی ابی السعود و لما سیذکرہ الشارح فی الوقف عن النهر[1].

(ترجمہ: اور اسی لیے جب سلطان نظام المملکت برقوق نے سن سات سواسی سے کچھ سال بعد ارادہ کیا کہ ان اوقاف کو توڑ دیا جائے کیونکہ وہ بیت المال سے لیے گئے تھے تو اس کے لیے اس نے ایک بیت بڑی مجلس قائم کی۔ شیخ سراج الدین بلقینی شیخ برہان بن جماعہ اور شیخ الحنفیہ شیخ اکمل الدین شارح ہدایہ بھی اس مجلس میں شریک ہوئے۔ حضرت شیخ بلقینی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جو اوقاف علماء اور طالب علموں کے لیے ہیں ان کے توڑنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا حصہ خمس ہے جو اس سے زائد بنتا ہے۔ اور جو حضرت فاطمہ، حضرت خدیجہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہن پر وقف ہیں ان کو توڑ دیا جائے۔ حاضرین نے اس پر ان سے موافقت کی۔ جس طرح کہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "النقل المستو فی جواز بعض معلوم الوظائف بلا حضور" میں ذکر کیا۔ پھر میں نے الملتقی کی شرح میں اسی طرح دیکھا۔ اس میں تصریح ہے کہ بادشاہوں کے بیت المال سے وقف عطیات ہوتے ہیں۔ وہ حقیقی اوقاف نہیں ہوتے۔ اور ان میں جو بیت المال کے مصارف کے پر خرچ کے لیے وقف ہوں، ان کو ختم نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اگر بادشاہ نے اپنی اولاد یا اپنے آزاد کردہ غلاموں اور ان کی طرح اور لوگوں پر وقف کیا تو چوں کہ وہ عطیات ہوتے ہیں لہٰذا ان کی شرائط کا لحاظ کرنا ضروری نہیں۔ کیونکہ یہ اوقاف درحقیقت صحیح وقف نہیں ہوتے اس لیے کہ وقف کے

---

[1] الدر المختار رد المحتار: جلد ۶ صفحہ ۲۲۶، دار احیاء التراث العربی بیروت

صحیح ہونے کے شرط یہ ہے کہ وقف کرنے والا اس کا مالک ہو۔ اور بادشاہ اس وقت تک مالک نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اسے بیت المال سے خرید نہ لے۔ اور تمہیں اس مسئلہ پر علامہ اکمل الدین کی موافقت کا علم ہو چکا اور وہ مبسوط اور مولانا ابوالسعو درحمۃ اللہ علیہ کے بیان کردہ جزئیہ کے موافق ہے۔ اور یہ اس کے بھی موافق ہے جو حضرت شارح (صاحب درمختار) رحمۃ اللہ علیہ کتاب الوقف میں النہر سے نقل فرمائیں گے)

خلاصہ: یعنی شیخ سراج بلقینی اور برہان بن جماعہ اور شیخ الحنفیہ اکمل الدین شارح ہدایہ فرماتے ہیں کہ اوقاف سلاطین جو مصارف بیت المال پر وقف کئے گئے ہوں ان کو کوئی موقوف نہیں کرسکتا۔ البتہ جو انہوں نے اپنی اولاد وغیرہ پر وقف کئے ہیں وہ ٹوٹ سکتے ہیں۔

اسی واسطے علامہ شامی رحمہ اللہ صفحہ ۲۰۹ اور صفحہ ۲۱۰ فتاوی حامدیہ مطبوعہ مصر میں بحوالہ رسالہ ''نقل المستور'' سیوطی رحمہ اللہ اور شرح وہبانیہ اور معین المفتی وغیرہ تحریر فرماتے ہیں:

افتی علامة الوجود المولى ابو السعود رحمه الله مفتی السلطنة السليمانية بان اوقاف الملوک والامراء لا يراعى شروطها لانها من بيت المال و ترجع اليه من حاشية الاشباه قبيل قاعدة اذا اجتمع الحلال والحلال و ذكر السيوطی رحمه الله فی رسالة نقل المستور فی جواز قبض المعلوم من غير حضور بانه افتی جميع علماء ذلک العصر کالسبکی و ولديه والزملکانی و ابن عدلان و ابن المرجل و ابن جماعة والاوزاعی والزرکشی والبلقينی و الاسنوی وغيرهم بان هذه ارصادات لا اوقاف حقيقة فللعلماء المنزلين ان ياكلوا منها و ان لم يباشرو وظائفهم الخ. و فی شرح الوهبانية ما ياخذه الفقهاء من المدارس لا اجرة لعدم شروط الاجارة ولا صدقة لان الغنی يا خذها بل اعانة لهم على حبس انفسهم للاشتغال حتى لو لم يحضروا الدرس بسبب اشتغال او تعليق جاز اخذهم الجامكية معين المفتی من آخر كتاب الوقف[1]

---

[1] تنقیح الفتاوی الحامدیہ: جلد اول صفحہ ۲۱۸، ۲۱۹ المکتبۃ الحبیبیۃ کوئٹہ

خلاصہ ترجمہ: یعنی علامہ عصر مولانا ابو سعود رحمہ اللہ مفتی سلطنت سلیمانیہ اور علامہ تاج الدین سبکی اور ان کے دونوں صاحبزادوں اور علامہ زملکانی اور علامہ ابن عدلان اور علامہ ابن مرجل اور علامہ ابن جماعہ اور امام اوزاعی اور علامہ زرکشی اور علامہ بلقینی اور علامہ اسنوی وغیرہم رحمہم اللہ علماءِ مشاہیر زمانہ کا اس امر پر اتفاق ہے 'کہ اوقافِ سلاطین گو ان کو مجازاً وقف کہا جاتا ہے اور باعتبار لزوم اور صحت کے ان پر حکم وقف کیا جاتا ہے مگر حقیقتاً یہ وظائفِ محفوظۂ مرصودہ ان علماءٗ طلباء واعظین ومفتیانِ دینِ متین ہیں جن کو اوقاف سے تعلق ہو۔ اسی واسطے اگر شرطِ واقف معلوم بھی ہو' اس کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اور اگر عرصہ تک خدمتِ وظیفہ متعلقہءِ وقفِ مذکورہ کی جگہ خالی رہے اور ایک زمانہ تک وہ وظیفہ جمع رہا ہو' علماءِ منزلین یعنی ان علماء کو جو اس وظیفہ پر معین ہوں' بغیر کام کئے ہوئے' اس وظیفہ سے کھانا درست ہے۔

اور جو کچھ وظیفہ اوقاف مذکورہ سے علماء وفقہا کو ملتا ہے بسبب نہ پائے جانے شروطِ اجارہ کے' نہ بطریقِ اجرت ملتا ہے اور نہ بطریق صدقہ' اس واسطے کہ صدقہ حق مساکین کا ہے۔ اور یہ وظیفہ ان علماء وفقہا کو بھی' جو غنی اور مالدار ہوں' اگر اکثر اوقات خدمتِ دین میں صرف کریں' لینا جائز ہے۔ لامحالہ ان کو اس امر کی اعانت اور امداد کی وجہ سے ملتا ہے جو وہ خدمتِ دین میں مشغول رہے ہیں۔ لہٰذا وہ اگر کبھی بہ سبب مشغولیِ امرِ دینی یا تعلقِ ذاتی کے' حاضرِ مدرسہ اور اپنی خدمت معینہ پر نہ ہوں تو ان کو اپنا وظیفہءِ معینہ لینا جائز ہے۔ پھر یہ اوقاف مدرسہ پر ہوں یا مسجد پر سب کا حکم وہی ہے جو وظائفِ معینہ کا ہوتا ہے بیت المال سے۔ چنانچہ علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ مصنف الاشباہ والنظائر صفحہ ۱۱۸ جلد خامس بحر الرائق میں تحریر فرماتے ہیں کہ مالِ بیت المال مصالحِ مسلمین میں صرف کیا جاتا ہے۔ بیانِ مصالح میں تحریر فرماتے ہیں۔

إن المصالح بناء المساجد والنفقة عليها فيدخل فيه الصرف على اقامة شعائرها من وظائف الامامة والاذان و نحوها و فى المحيط ان هذا النوع يصرف الى ازراق الولاة واعوانهم و ازراق القضاة والمفتين والمحتسبين والمسلمين و كل من تقلد شيئا من امور المسلمين و الى مافيه صلاح المسلمين و فى التجنيس ذكر من المصارف

المعلمين والمتعلمين فقال فی فتح القدير وبهذا يدخل طلبة العلم بخلاف المذكورين هنا لانه قبل ان يتاهل عامل لنفسه لكن يعمل بعده للمسلمين و فی فتاوی قاضی خان من الحظر والاباحة سئل الرازی من بيت المال هل للاغنياء فيه نصيب قال لا الا ان يكون عاملا او قاضيا و ليس للفقهاء فيه نصيب الافقيه فرغ نفسه لتعليم الناس الفقه أو القرآن فيحمل ما فی التجنيس علی ما اذا فرغ نفسه لذلک بان صرف غالب اوقاته فی العلم و ليس مراد الرازی الاقتصار علی العامل اوالقاضی بل اشار بهما الی كل من فرغ نفسه لعمل المسلمين فيدخل الجندی والمفتی فيستحقان الكفاية مع الغنی[1]

و فيه بعد اسطر

فی مال الفتاوی لكل قاری فی كل سنة مائتا دينار اوالفا درهم ان اخذها فی الدنيا والااخذها فی الآخرة والمراد بالقاری المفتی لما فی الحاوی القدسی ولم يقدر فی ظاهر الرواية قدر الأرزاق والأعطية سوی قوله ما يكفيهم وذراريهم وسلاحهم وأهاليهم و ما ذكر فی الحديث لحافظ القران وهو المفتی اليوم مائتا دينار[2]

و قال الشامی و هو المفتی اليوم لانهم كانوا يحفظون القرآن و يعلمون الاحكام[3]

(ماحصل ترجمہ عبارت مذکور) یعنی جب اوقاف سلاطین وامراء وغیرہ جن کا کچھ حال معلوم نہیں، وہ باتفاقِ فقہاءِ محققین حکم اسی وقف کا رکھتے ہیں، جو وقفِ بیت المال سے مصلحتِ عامہ پر کیا جائے۔ اوران اوقاف میں شرطِ واقف بھی اگر مصرفِ خاص پر ہو ملحوظ نہیں ہوتی۔ اورداخل مصلحتِ عامۂ اہل اسلام بناءِ مسجد اور شعائر اور مصالحِ مسجد بھی ہیں جن کا ذکر بموجب عرف وروایاتِ کتبِ معتبرہ قسم دوم وقف علی مصالح المسجد

---

[1] البحر الرائق شرح كنز الدقائق : جلد ۵ صفحہ ۱۲۷ دار المعرفة بيروت
[2] البحر الرائق شرح كنز الدقائق : جلد ۵ صفحہ ۱۲۸ دار المعرفة بيروت
[3] ايضا

بلا قید کے مصلحتِ خاصہ میں بتفصیل ہو چکا۔ اور چونکہ مصالح ضروریہء عامہء اہلِ اسلام سے بالاتفاق مفتی اور واعظ اور محتسب اور محاسب وقف بھی ہیں۔ لہٰذا علامہ زین الدین ابن نجیم اور علامہ ابن عابدین شامی علیہما الرحمۃ اپنی کتاب البحر الرائق وردالمحتار میں اور نیز علامہ قاضی خان اپنے فتاوی میں تحریر فرماتے ہیں کہ عالمِ فقہ جو اکثر اوقات مشغولِ علمِ دین میں اور مفتی، واعظ، قاضی، طلباءِ علم، یعنی وقف کے متعلق بحسبِ ضرورت جو کام کرنے والے ہیں، خواہ وہ غنی ہوں اگر وہ مشغولِ خدماتِ دینی اہلِ اسلام رہیں، سب کو بلالحاظ شرطِ واقف ان کو وظیفہ دیا جائے گا۔ اور اگر وہ اکثر اوقات اور بغیر کسی سے کچھ اجرت ٹھہرائے کارِ دینی پر امورِ دینی میں مشغول رہیں اور کسی وقت اپنی خدمت متعلقہء وقف پر حاضر بھی نہ ہوں، حقدار اپنے وظیفہ معینہ کے رہیں گے۔ اور من جملہ متعلقین وقفِ علامہ شامی اور صاحب البحر الرائق تحریر فرماتے ہیں، کہ بتصریح حدیث مفتی کو سالانہ دوسو دینار یا دو ہزار درہم دیا جائے گا۔ اور اگر اس قدر وظیفہ معینہ سے اس کو دنیا میں نہ دیا جائے گا۔ آخرت میں مانعین سے لین دار رہے گا۔

اور چونکہ کہ درہمِ شرعی بموجبِ تحقیق مولانا شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ، مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلوی و مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور نواب قطب الدین صاحب صاحبِ مظاہر حق اور صاحبِ کشف الغطاء وغیرہ محققین علمائے ہند ۳، ماشہ ایک رتی اور رتی کا پانچواں حصہ ہوتا ہے لہٰذا کلدار روپیہ سے خدمتِ افتاء کا وظیفہ مفتی کا تقریباً ۷۲ روپیہ کلدار ماہوار ہوا۔ اور دوسرے کارگزارانِ خدمتِ دینِ متینِ علماء، فضلاء، مدرس واعظ کے متعلق علامہ ابن نجیم صاحب البحر الرائق ومصنف الاشباہ والنظائر ۱۱۸ میں تحریر فرماتے ہیں ☆ کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مستحقین بیت المال علماء، فضلاء، مدرسین وغیرہ کو برابر ان کی کفایت کے اور ضرورت کے موافق دیا کرتے تھے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بقدرِ حاجت اور ان کے علم وفضل کے مطابق دیا کرتے تھے۔ وھذہ نصہ

وفی القنیة من کتاب الوقف کان ابوبکر رضی الله عنه یسوی فی العطاء من بیت المال و کان عمر رضی الله عنه یعطیهم علی قدر الحاجة و الفقه و الفضل [۱] .

---

[۱] البحر الرائق شرح کنز الدقائق : جلد ۵ صفحہ ۱۲۸ دار المعرفہ بیروت

☆(ترجمہ: قنیہ کی کتاب الوقف میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سب کو برابر عطیات دیا کرتے تھے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ضرورت' فقہ اور بزرگی کے اندازے پر دیا کرتے تھے)

پھر فرماتے ہیں ہمارے زمانہ میں عمر رضی اللہ عنہ کا اتباع کرنا اس امر میں بہت بہتر ہے۔

حیث قال رحمه الله:

و الا خذ بما فعله عمر رضی الله عنه فی زماننا احسن.[1]

(ترجمہ: ہمارے زمانہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عملِ مبارک کو اختیار کرنا احسن ہے)

علاوہ بریں بجز تعیین تنخواہِ مفتی کے کسی کی نسبت باوجود تلاشِ تام' تعین مشاہرۂ معینہ کے کوئی روایت نہیں ملتی۔ البتہ روایات مذکورہ صفحہ ۱۱۸ جلد خامس البحر الرائق سے جو ابھی نقل ہو چکی ہے یہ بات ضرور سمجھی جاتی ہے کہ وہی مفتی اور واعظ اور مدرس وغیرہ باوصف غنی ہونے کے مستحق وظائف کے آمدنی اس قسم کے اوقاف سے ہو سکتے ہیں جو اکثر اوقات مشغولِ علومِ دینی رہیں۔ مع ہذا وہ لوگ جو مشغولِ خدماتِ ضروریہ دینی اہل اسلام کے رہتے ہیں نہ وہ لوگ جو اکثر اوقات مشغولِ تعلیم علومِ دنیوی یا دیگر امور دنیوی رہیں۔ چنانچہ وہ علماء' طلبہ جو اکثر اوقات مشغولِ تعلیم و تعلم محض علومِ فلسفہ وریاضی و منطق و ہیأت و ہندسہ و حساب وغیرہ رہیں' بیت المال سے مستحق وظیفہ نہیں ہو سکتے۔ البتہ علمِ صرف و نحو علمِ ادب جن کا سیکھنا تحصیل علوم دینی کے واسطے ضروری ہے' وہ علوم حسبِ ضرورت بالتبع داخلِ علومِ دینی رکھے گئے ہیں اور اس قدر ان علوم کا سیکھنا سکھانا داخلِ علومِ دینیہ اکثر فقہاءِ محققین نے سمجھا۔ چنانچہ بحث مصارف بیت المال میں شرح عبارتِ درمختار'' و كفاية العلماء '' الخ میں علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ صفحہ ۳۹۷ ردالمحتار مطبوعہ مصر میں تحریر فرماتے ہیں۔

هم اصحاب التفسير و الحديث و الظاهر ان المراد بهم من يعلم العلوم الشرعية فيشمل الصرف و النحو و غيرهما حموی عن البرجندی.[2]

(ترجمہ: علماء سے مراد اصحابِ تفسیر و حدیث ہیں۔ ظاہر ہے ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو علومِ شرعیہ سکھاتے

---

[1] البحر الرائق شرح كنز الدقائق : جلد ۵ صفحه ۱۲۸ دار المعرفه بيروت

[2] رد المحتار جلد ۶ صفحه ۲۶۴ دار احياء التراث العربی بيروت

ہیں۔لہٰذا یہ صرف' نحو وغیرہ علوم کو شامل ہے۔حموی' برجندی)

اور جب روایاتِ مذکورہ سے یہ امر ثابت ہو گیا' کہ مستحق وظائف کے آمدنیٔ قسم ثالث وقف سے وہی علماء' طلباء' مفتی' واعظ' مدرسین علومِ دینی وغیرھم ہیں' جو اکثر اوقات مشغول خدمتِ دینی رہیں۔خواہ وہ غنی ہوں یا فقیر۔اوران کو جو دیا جاتا ہے نہ بطریقِ صدقہ کے دیا جاتا ہے اور نہ بطریق اجرت کے۔اسی واسطے اگر وہ کبھی اپنی خدمتِ معینہ دینیہ پر نہ بھی آئیں مستحقِ وظیفہ رہتے ہیں۔اور جس قدران کے وظائف شرعاً مقرر ہیں اور بوجہ اکثر اوقات مشغول رہنے کے امورِ دینیہ میں' جس قدر مستحق ہیں' اگر ان کو نہ دیا جائے تو قیامت تک اس کے لینے کے وہ حق دار ہیں۔اور اسے ان کے حقوق کو زیادہ یا کل کے روکنے والے قیامت تک دین دار۔اور یہ بھی ثابت ہو چکا کہ جس قسم کے مالِ بیت المال سے علماء' طلباء فضلاء مستحق ہیں اس قسم کے مال سے مسجد بھی بنا سکتے ہیں۔اور مسجد کے مصالح اور شعائر پر بھی اس سے خرچ کر سکتے ہیں۔چنانچہ جنہوں نے مال بیت المال سے وقف کرنے کو صحیح لکھا ہے اس کے یہی معنے ہیں کہ مصالحِ مسلمین پر اگر وقف کیا جائے چونکہ وہ مال مصالح مسلمین کے واسطے مخصوص ہے' جائز ہے۔اور جنہوں نے بیت المال سے وقف کرنے کو ناجائز اور وقفِ غیرِ صحیح لکھا ہے' اس کے یہی معنی ہیں' کہ ایسے وقف میں شروطِ واقف اگر معلوم بھی ہوں ان کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔اور آمدنی ایسے اوقاف کو اگر وہ مخصوص کسی مسجد یا خانقاہ کے ساتھ بھی ہوں' مصالحِ مسلمین سے نہیں روکا جاتا۔تو یہ امر اچھی طرح واضح ہو گیا کہ جہاں افطاریٔ صائمینِ رمضان کو اور تقسیمِ شرینی کو ختمِ قرآن کی شب میں علی ھذا اور جن امور کو موجبِ مصلحتِ اہلِ اسلام اور باعثِ ترقیٔ نمازیانِ مسجد یا باعتبار عرفِ عام کے سمجھتے ہوں اور فی الواقع ان امور میں مصلحت و ترقی اہلِ اسلام اور رونقِ اسلام اور اہلِ اسلام شرعاً ہو تو بلاشبہ آمدنی اس قسم کے اوقاف سے ایسے امور میں صرف کرنا بھی جائز ہے۔

☆ اب بعد تکمیلِ جواب بغرضِ توضیح وافادۂ عاملینِ اوقاف مذکورہ چند روایاتِ ضروریہ اور لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔اول یہ کہ وقف بیت المال کی آمدنی اگر کم ہو جائے اور جملہ مستحقوں کو کافی نہ ہو سکے تو اول بقدرِ تعمیر وقف پر اور درستیٔ شکست و ریختِ امکنۂ وقف پر صرف کیا جائے اور اگر وہ وقف وقف علی المسجد

ہوتو بعدہ مصالح ضروریہ مسجد میں کہ وہ امام اور خطیب اور مدرس اور روشنی کرنے والے فراش اور موذن اور ناظر ہیں اور قیمتِ قندیل اور تیل اور فرشِ بوریہ وغیرہ اور وضو کا پانی بھرنے والے ان مصارف میں خرچ کیا جائے چنانچہ صفحہ ۲۱۵ جلد خامس البحر الرائق میں ہے

فتحصل ان الشعائر التی تقدم فی الصرف مطلقا بعد العمارة الامام والخطیب والمدرس والوقاد والفراش والموذن والناظر و ثمن القنادیل والزیت والحصر و یلحق بثمن الزیت والحصر ثمن ماء الوضوء واجرة حمله و کلفة نقله من البئر الی المیضاة[1]

(ترجمہ: ماحصل یہ ہے کہ تعمیرِ وقف کے بعد جن شعائر پر وقف کی آمدنی کے خرچ کرنے کو مقدم کیا جائے گا وہ یہ ہیں (۱) امام (۲) خطیب (۳) مدرس (۴) چراغ جلانے والا (۵) صفیں بچھانے والا خادم (۶) نگران (۷) لالٹینوں کی قیمت (۸) تیل (۹) چٹائیاں (۱۰) تیل اور چٹائیوں کی قیمت کے ساتھ وضو کے پانی کے قیمت (۱۱) اس کے اٹھا کر لانے کی مزدوری اور (۱۲) کنویں سے وضوخانہ تک اس کو لانے کی مزدوری شامل ہے)

اور چونکہ وقفِ بیت المال سے علماء، فضلا خواہ وہ واعظ ہوں یا مفتی یا مدرس ہوں یا امام اور موذن اور سادات کرام بھی حقدار ہیں۔ بعد امام وموذن کے اگر آمدنی سب کو کافی نہ ہو سکے ان سب میں جو زیادہ حاجت مند ہوں ان کا وظیفہ دیا جائے اور اگر حاجت مندی میں سب مساوی ہوں تو باعتبار مرتبہ دینی کے جس کا مرتبہ بڑا ہو ان کو مقدم کیا جائے۔

کما فی صفحه ۱۸۸ من الحموی شرح الاشباه المطبوعة فی مطبع نول کشور حیث قال

و اذا عجز الواقف عن الصرف الی جمیع المستحقین فان کان اصله من بیت المال روعی فیه صفة الاحقیة من بیت المال فان کان فی اهل الوظائف من هو بصفة الاستحقاق من بیت المال و من لیس کذلک فقدم الاولون علی غیرهم من العلماء و طلبة العلم و آل رسول اللهﷺ و ان کانوا کلهم بصفة الاستحقاق منه قدم الاحوج فالا حوج

---

[1] البحر الرائق شرح کنز الدقائق : جلد ۵ صفحه ۲۳۲ دار المعرفة بیروت

فان استووا فی الحاجة قدم الاکبر فالاکبر فیقدم المدرس ثم الموذن ثم الامام ثم القیم[1] الخ.
(ترجمہ: وقف کنندہ جب تمام مستحقین پر خرچ کرنے سے عاجز ہو تو اگر اس وقف کی اصل بیت المال سے ہو تو اس صورت میں بیت المال سے زیادہ استحقاق کی صفت کا لحاظ رکھا جائے گا۔ اگر وظائف پانے والوں میں کچھ زیادہ استحقاق کی صفت سے متصف ہوں اور کچھ ایسے ہوں جو ایسے نہ ہوں تو پہلے اہل وظائف جیسے کہ علماءِ طلباءِ علم اور آلِ رسول اللہ کو دوسروں سے مقدم کیا جائے گا۔ اور اگر سب استحقاق میں برابر ہوں تو زیادہ حاجت مند کو پہلے دیا جائے گا اور اگر وہ ضرورت میں برابر ہوں تو بڑے کو مقدم کیا جائے گا لہٰذا پہلے مدرس پھر مؤذن پھر امام پھر متولی کو اوروں سے مقدم کیا جائے گا۔)

☆ دوم یہ کہ جن کو بطریقِ اعانت اور عزتِ اسلامی کے بیت المال سے وظیفہ دیا جاتا ہے اگر وہ مرجائیں ان کا وظیفہ بعینہ جو مقرر تھا وہ ان کے بیٹوں کو دیا جائے گا۔ گو وہ صغیر السن ہی ہوں۔ اگر وہ باپ کے طریقہ پر چلیں یا مشغولِ تحصیلِ علوم رہیں کما فی صفحه ۲۱۰ من الجزء الاول لفتاوی الحامدیة

قال مولانا العلامة صاحب الخزانة نا قلا عن مبسوط فخر الاسلام بنص و اذا مات من له وظیفة فی بیت المال لحق الشرع و اعتزاز الاسلام کا جراء الامامة و التاذین و غیر ذلک مما فیه صلاح الاسلام والمسلمین و للمیت ابناء یراعون و یقیمون حق الشرع واعزاز الاسلام کما یراعی و یقیم الاب فللامام ان یعطی وظیفة الاب لابناء المیت لا لغیرهم لحصول مقصود الشرع و الجبار کسر قلوبهم والامام مربی فخلف الموتی باذن الشرع والشرع امر بابقاء ما کان علی ما کان لا بناء المیت لا غیرهم. قلت هذا موید لما هو عرف الحرمین الشریفین و مصر و الروم المعمورة من غیر نکیر من ابقاء ابناء المیت و لو کانوا صغارا علی وظائف ابائهم مطلقا من امامة وخطابة و غیر ذلک و امضاء ولی التقریر الفراغ لهم بذلک و تقریرهم بعد وفاته عرفا مرضیا مقبولا لان فیه احیاء خلف

---

[1] الاشباہ والنظائر: جلد اول صفحہ ۳۱۱ مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی

العلماء و مساعدتهم علی بذل الجهد فی الاشتغال بالعلم و قد افتی بجواز ذلک طائفة من اکابر الفضلاء الذین یعول علی افتائهم[1] واللہ اعلم.

(ترجمہ: مولانا علامہ صاحب خزانہ نے مبسوطِ فخر الاسلام سے نقل کر کے یوں لکھا کہ جب وہ شخص مرجائے جس کا وظیفہ حقِ شرع اور اعزازِ اسلام کی خاطر بیت المال سے متعین ہو مثلاً امامت اور اذان اور اس کے علاوہ دیگر مناصب جن میں اسلام اور عام مسلمانوں کی بھلائی ہو اور مرنے والے کے بیٹے ایسے ہوں' جو شریعت مطہرہ کے حق اور اسلام کے اعزاز کو اسی طرح قائم رکھیں اور اس کی رعایت رکھیں' جس طرح کہ باپ کیا کرتا تھا تو امام پر لازم ہے کہ باپ کا وظیفہ میت کے بیٹوں کو دے نہ کہ اوروں کو کیوں کہ ایسا کرنے سے شریعت کا مقصود حاصل ہو جائے گا اور ان کے ٹوٹ ہوئے دلوں کو جوڑنے کا سامان پیدا ہوگا۔ امام اور حکمران مربی ہوتا ہے۔ بیٹا مرنے والوں کا جانشین شریعت کے حکم کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور شریعت نے بیٹوں کے لیے جو پہلے تھا اسے اسی طرح باقی رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اس نے غیروں کو دینے کا حکم نہیں دیا۔ میں کہتا ہوں اس جزئیہ کی تائید حرمینِ شریفین' مصر اور رومِ معمورہ کے عرف سے ہوتی ہے۔ جس سے کسی کو انکار نہیں۔ کہ مرنے والوں کے بیٹوں کو ان کے اباءواجداد کے امامت' خطابت وغیرہ کے وظائف پر برقرار رکھا جائے گا اگر چہ وہ کم عمر ہوں۔ نیز تقرری کا فیصلہ کرنے والا ان کو اس وظیفہ کے لیے فارغ رکھنے کا حکم جاری کرے گا۔ اور والد کے مرنے کے بعد بیٹوں کو اس منصب پر باقی رکھا جائے۔ یہ ایک پسندیدہ اور مقبول عرف ہے۔ کیونکہ اس میں علمائے کرام کی اولاد کے لیے عطیات ہیں۔ اور علم میں مشغول رہنے میں' ان کی کوشش کرنے پر امداد واعانت ہے۔ اکابر فضلاء کی ایک ایسی جماعت نے اس کے جواز کا فتوی صادر فرمایا ہے جن کے فتاوی کی جانب رجوع کیا جاتا ہے)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی' مفتی
جامع مسجد اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[1] تنقیح الفتاوی الحامدیہ: جلد اول صفحہ ۲۱۹ المکتبۃ الحبیبیۃ کوئٹہ

﴿فتوی نمبر 151﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ ریاست الور متصل ریلوے اسٹیشن موضع نگلی کھورہ کے لب سڑک ایک مسجد باغبان کی ہے۔ اب مہاراجہ والیِ الور نے ایک سڑک جدید موتی ڈونگری سے رجمٹ کو نکالی ہے۔ داغ بیل بھی ہوگئی ہے۔ اس سڑک میں یہ مسجد آ گئی ہے اس مسجد کو مہاراجہ صاحب شہید کرانا چاہتے ہیں۔ اور مسجد کے خالی کرنے کو نوٹس بھی لگا دیا ہے کہ یا تو ایک ماہ کے اندر خالی کردو ورنہ سزاوار ہوں گے۔ اور مسجد کا معرفت انجینئری تخمینہ بھی کرالیا ہے کہ تم کو روپیہ خزانہ سے مل جائے گا۔ اس روپیہ سے دیگر مسجد تعمیر کرلو۔ اور جو تخمینہ کیا گیا ہے وہ لاگت مسجد سے کم ہے۔ دیگر مسجد تیار نہیں ہوسکتی۔ اگر اس معاملہ میں کوشش کی جائے کہ راج ہی مسجد بنوادے تو یہ بات شریعت میں جائز ہے یا نہیں۔ یا اس کے معاوضہ میں روپیہ راج سے لے کر دیگر مسجد بنوائی جائے تو یہ بات جائز ہے یا نہیں؟ اور چونکہ راج نے مسجد سڑک میں کرلی ہے اس لئے بچنا ناممکن ہے۔

عبدالرحمٰن، امر خان، لعل خان از الور

الجواب

وهو الموفق للصواب

بسم الله الرحمن الرحيم۔

اللهم رب زدني علما

قول تحقیق اور مفتی بہ تو یہی ہے کہ وقف اپنی جگہ سے نہ بدلا جائے اور اس کا معاوضہ نہ لیا جائے۔ خاص کر مسجد کہ اس کو اپنی جگہ سے کسی طرح نہ ہٹانے دیا جائے گو دوسری جگہ اس سے بہتر اور نافع ہو۔☆ ہاں اس صورت میں مضائقہ نہیں کہ وہ محض بے کار رہ جائے۔ اور لوگ ظالم اس کی لکڑی پتھر اپنے کام میں لانے لگیں۔

چنانچہ صفحہ ۴۲۷ شامی میں ہے:

قال العلامة البيری والحاصل ان الاستبدال اما عن شرط الاستبدال اولا عن شرطه فان كان لخروج الوقف عن انتفاع الموقوف عليهم فينبغی ان لا يختلف فيه و ان

كان لا لذالک بل اتفق انه امكن ان يوخذ بثمنه ما هو خير منه مع كونه منتفعا به فينبغي ان لا يجوز لان الواجب ابقاء الوقف على ماكان عليه دون زيادة لانه لا موجب لتجويزه لان الموجب في الاول الشرط و في الثاني الضرورة ولا ضرورة في هذا اذلا تجب الزيادة بل نبقيه كما كان[1]

(ترجمہ: علامہ بیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا خلاصہ یہ ہے کہ وقف کو تبدیل کرنا یا تو تبدیل کرنے کی شرط کے ساتھ ہوگا یا وقف کو تبدیل کرنے کی شرط کیے بغیر ہوگا۔ اگر یہ تبدیل کرنا شرط کی بنا پر ہو تو وقف کو ان لوگوں کے نفع اٹھانے سے فارغ کرنے کے لیے ہوگا جن پر وہ وقف ہے تو اس صورت میں مناسب یہی ہے کہ اس کے عدم جواز میں اختلاف نہ ہو۔ اور اگر یہ تبدیل کرنا اس لیے نہ ہو بلکہ اتفاقی طور پر پیش آجائے اور یہ ممکن ہو کہ اس کی قیمت سے اس سے بہتر چیز حاصل کی جاسکے اور ساتھ ہی اس فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہو تو مناسب یہی ہے کہ یہ صورت جائز نہ ہو۔ کیوں کہ لازم ہے کہ وقف کو اپنی اصلی حالت پر برقرار رکھا جائے۔ اس میں زیادتی نہ کی جائے۔ کیوں کہ جواز پیدا کرنے کا کوئی سبب موجود نہیں ہے۔ کیونکہ پہلی صورت میں باعث شرط ہے دوسری صورت میں ضرورت ہے اور موجودہ صورت میں ضرورت نہیں ہے کیوں کہ زیادتی واجب نہیں ہے بلکہ ہم اسے اصلی حالت پر باقی رکھیں گے)

☆ مگر اگر کوئی غاصب اور ظالم جبرا چھین کر قیمت دینا چاہے اور بعینہ اس زمینِ مغصوبہ کا لینا کسی طرح ممکن نہ ہو تو اس کی قیمت لے کر متولی کو جائز ہے کہ دوسری جگہ اس کے بدلے خریدے یا اس کے بدلے دوسرا مکان مثلِ مسجد بنا کر اس کی قیمت اگر وہ ظالم غاصب دے تو متولی کو جائز ہے کہ اس مکان کو بعوض اس وقفِ مغصوب لے کر اس کو وقف علی المسلمین ہمیشہ نمازِ پنج گانہ کے واسطے کرے تا کہ اس کو حکم مسجد کا ہو جائے اور نمازیوں کو ثوابِ مسجد ملنے لگے۔

كما هو ظاهر من رواية الشامي المذكورة في صفحه ۴۲۶ حيث قال رحمة الله في شرح رواية الدر: ولا يجوز استبدال العامر الافي الاربع[2]

---

[1] رد المحتار: جلد ۳، صفحه ۴۲۷، مطبوعه مكتبه رشيديه كوئٹه

[2] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۳، صفحه ۴۲۶، مطبوعه مكتبه رشيديه كوئٹه

(ترجمہ: آباد وقف کو صرف چار صورتوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے)

قوله فی اربع بعد ذکر الاثنین الثالثة ان یجحده الغاصب ولا بینة ای وارادها دفع القیمة فللمتولی اخذها لیشتری بها بدلا[1]

(ترجمہ: صرف چار صورتوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے دو صورتوں کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا تیسری صورت یہ ہے کہ غاصب اس کا انکار کردے اور کوئی گواہ بھی موجود نہ ہو نیز وہ اس کی قیمت ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو متولی کے لیے اسے وصول کرنا درست ہے تاکہ اس کے ساتھ اس کا بدل خرید لے)

اور جب مسجد خراب ہو جائے اور لوگ نماز پڑھنے والے وہاں سے اجڑ جائیں تو اندریں صورت اس کا سامان دوسری مسجد میں لگانے کی اجازت صراحۃ موجود ہے چنانچہ صفحہ ۴۰۷ سطر ۲۶ جلد سوم شامی مصر میں ہے

والذی ینبغی متابعة المشائخ المذکورین فی جواز النقل بلا فرق بین مسجد او حوض کما افتی به الامام ابو شجاع والامام الحلوانی و کفی بهما قدوة ولا سیما فی زماننا فان المسجد أو غیره من رباط او حوض اذا لم ینقل یاخذ انقاضه اللصوص والمتغلبون کما هو مشاهد و کذالک اوقافه یاکلها النظار او غیرهم و یلزم من عدم النقل خراب المسجد الآخر المحتاج الی النقل الیه قبله[2]

(ترجمہ: مسجد یا حوض میں فرق کیے بغیر نقل میں مذکورہ بالا مشائخ کی اتباع مناسب ہے۔ جیسا کہ امام ابوشجاع رحمۃ اللہ علیہ اور امام حلوانی رحمۃ اللہ علیہ نے فتوی دیا ہے ان کی سرداری اوروں سے مستغنی کر دینے والی ہے۔ ☆ بالخصوص دورِ حاضر میں کیوں کہ مسجد اور اس کے علاوہ دیگر اوقاف مثلاً سرائے یا حوض کو منتقل نہ کیا جائے تو اس کا ملبہ چور اور زبردستی کرنے والے لوگ لے جائیں گے جیسا کہ مشاہدہ میں آیا ہے۔ یہی حال اوقاف کا ہوتا ہے انہیں متولی اور دیگر افراد کھا جاتے ہیں۔ منتقل نہ کرنے سے دوسری مسجد جس کو اس سامان کے منتقل

---

[1] رد المحتار: جلد ۳ صفحہ ۴۲۶، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

[2] رد المحتار: جلد ۳ صفحہ ۴۲۷ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی ویران ہو جاتی ہے)

و نقل فی الذخیرة عن شمس الائمة الحلوانی انه سئل عن مسجد او حوض خرب ولا یحتاج الیه لتفرق الناس عنه هل للقاضی ان یصرف اوقافه الی مسجد آخر او حوض آخر فقال نعم و مثله فی البحر عن القنیة و للشر بنلالی رسالة فی هذه المسئلة اعترض فیها ما فی المتن تبعا للدر بما مر عن الحاوی و غیره ثم قا ل وبذلک تعلم فتوی بعض مشائخ عصر نابل و من قبلهم کالشیخ الامام امین الدین بن عبد العال والشیخ الامام احمد بن یونس الشبلی والشیخ زین ابن نجیم . والشیخ محمد الوفائی فمنهم من افتی بنقل بناء المسجد و منهم من افتی بنقله ونقل ماله الی مسجد آخر[1]

ترجمہ: ذخیرہ میں ہے کہ حضرت شمس الائمہ حلوانی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک ویران مسجد یا تالاب کے بارے میں پوچھا گیا جس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ لوگ اس کے اردگرد سے متفرق ہو گئے ہیں۔ کیا قاضی کے لیے جائز ہے کہ اس کے اوقاف کو دوسری مسجد یا دوسرے حوض پر صرف کر دے؟ تو انہوں نے جواب دیا ہاں بحر میں قنیہ سے اسی طرح لکھا ہے۔ علامہ شرنبلالی رحمۃ اللہ علیہ کا اس بارے میں ایک رسالہ ہے۔ جس میں الدر کی اتباع میں متن میں مذکور مسئلہ پر اعتراض کیا ہے۔ جیسا کہ حاوی وغیرہ سے مروی ہے۔ پھر فرمایا اس سے تم کو دورِ حاضر کے بعض مشائخ بلکہ ان سے قبل مشائخِ کرام مثلاً شیخ امین الدین بن عبدالعال رحمۃ اللہ علیہ' حضرت شیخ احمد بن یونس شبلی رحمۃ اللہ علیہ' شیخ زین بن نجیم رحمۃ اللہ علیہ' اور شیخ محمد ابو وفائی کی عمارت کو منتقل کرنے کے فتوی کا علم ہو گیا ہے۔ بعض علماء نے مسجد کی عمارت کو منتقل کرنے اور بعض نے اسے اور اس کے مال کو دوسری مسجد کی طرف منتقل کر دینے کا حکم دیا ہے)

حررہ: العبد العاصی

ابو محمد محمد دیدار علی

✿✿✿✿✿

---

[1] رد المحتار : جلد ۳ صفحہ' ۴۲۷ مطبوعة مکتبه رشیدیه کوئٹه

﴿فتویٰ نمبر......152﴾

سوال

کیافرماتے ہیں کہ جومسجداس صورت میں ہوکہ دونوں جانب ایک دوقبریں ہوں نہ کہ مقبرہ۔اس کے کشادہ کرنے کے واسطے قبریں اندر مسجد کے لینابرضاورغبتِ مالک زمین وقبور جائز ہے یا کہ نہیں؟

۱۲فروری ۱۹۱۸ء ۲جمادی الاولی ۱۳۳۶ھ

محمد زمان معمار قصبہ فیروزآباد محلّہ معماراں ضلع آگرہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

قبرستان کا عندالضرورت مسجد بنالینا جائز ہے۔ کما هو ظاهر من رواية البحر حيث قال ابن نجيم رحمه الله فى صفحه ۲۵۵ من الجزء الخامس للبحر الرائق فى آخر كتاب الوقف

مقبرة للمشركين ارادوا ان يتخذوها مقبرة للمسلمين لاباس به ان كانت قد اندرست اثارهم فان بقى شىء من عظامهم تنبش و تقبرثم تجعل مقبرة للمسلمين فان موضع رسول الله ﷺ كان مقبرة للمشركين فنبشه واتخذه مسجدا[1]۔

☆(ترجمہ: مشرکین کے قبرستان کو اہلِ اسلام مسلمانوں کا قبرستان بنانا چاہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے جب کہ ان کے نشانات مٹ چکے ہوں۔ اگر ان کی کچھ ہڈیاں باقی ہوں تو ان کو کھود کر دفن کردیا جائے گا۔ اس کے بعد اسے مسلمانوں کا قبرستان بنالیا جائے گا۔ کیونکہ حضور نبی اکرم ﷺ کا مقام مبارک مشرکوں کا قبرستان

---

[1] البحر الرائق : جلد ۵، صفحہ ۲۷۵، دار المعرفہ بیروت

تھا۔ آپ نے اسے کھود دیا اور اسے مسجد قرار دے دیا)

مگر مسلمانوں کو ایسے قبرستان کی نسبت جس میں لوگوں نے دفن کرنا چھوڑ دیا ہو کوئی صریح روایت نہیں ملتی کہ اس کا مسجد بنانا قبور کو کھود کر یا بغیر کھودے جائز ہے۔ بجز اس روایت کے جس کو علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ آخر باب الوقف فصل احکام المساجد صفحہ ۲۵۴ جلد خامس بحرالرائق میں تحریر فرماتے ہیں:

وفی الخانیة امراة جعلت قطعة ارض مقبرة و اخرجتها من یدها و دفن فیها ابنها وھذہ الارض غیر صالحة للقبر لغلبة الماء علیها قال الفقیه ابو جعفر ان کانت الارض بحال یرغب الناس عن دفن الموتی فیها لفساد ھالم تصر مقبرة و کان للمرأة ان تبیعها واذا باعت کان للمشتری ان یرفع المیت عنها او یامر یرفع المیت عنها[1]

(ترجمہ: فتاوی خانیہ میں ہے ایک عورت نے زمین کے ایک ٹکڑے کو قبرستان بنالیا۔ اسے اپنے قبضہ سے باہر کردیا۔ نیز اس میں اس نے اپنا بیٹا دفن کرلیا۔ لیکن یہ زمین قبر کے لیے مناسب نہیں ہے۔ کیوں کہ اس پر پانی غالب ہے۔ حضرت فقیہ ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر زمین کا یہ حال ہے کہ لوگ اس میں اپنے مردے دفن کرنے کی رغبت نہیں رکھتے کیوں کہ وہ زمین خراب ہے تو وہ جگہ قبرستان قرار نہ پائے گی۔ عورت کو اسے فروخت کرنے کا اختیار ہے۔ اور جب اس نے فروخت کردی تو خریدار کو اجازت ہے کہ مردے کو وہاں سے اٹھادے یا نکال لینے کا حکم دے)

☆ جس سے ظاہر ہے کہ جہاں ایک دو قبر کبھی بہ نیت قبرستان بنانے کی بنا دی جائیں اور لوگ کسی وجہ خاص سے وہاں دفن کرنا چھوڑ دیں تو اس کے مالک کو اس کا فروخت کرنا جائز ہے۔ اور مشتری کو اختیار ہے کہ میت کو وہاں سے نکلوا کر دوسرے جگہ دفن کروادیں۔ لہٰذا اندریں صورت جب خود مالک زمین معہ قبور زمین کو برضا و رغبت مسجد کے واسطے دیتا ہے اور وہ قبرستان بھی نہیں ہے اور نہ وہاں مردے دفن کیے جاتے ہیں زمین مذکورہ کو مسجد میں داخل کرلینا بلاشبہ جائز معلوم ہوتا ہے۔ مگر میت کی لاش اگر تازہ قابل دفن کرنے کے اس کی جگہ میں ہے وہاں سے

---

[1] البحر الرائق: جلد ۵ صفحہ ۲۷۵، دار المعرفہ بیروت

نکال کر دوسری جگہ دفن کردی جائے اور بعد دفن میت مومن کا قبر سے نکالنا اگر چہ ناجائز ہے☆ مگر بعذر جائز ہے۔
چنانچہ صفحہ ۱۸۰ اسعاف فی احکام الاوقاف میں ہے:

و اذا دفن المیت فی مکان لا یجوز لاھلہ اخراجہ منہ طالت المدۃ او قصرت الا بعذر وھو ان تکون الارض مغصوبۃ و نحوہ [1]

☆(ترجمہ: مردہ جب کسی جگہ دفن کردیا گیا تو اس کے اہل وعیال کو اسے وہاں سے نکالنے کی اجازت نہیں ہے۔ مدت خواہ دراز ہو چکی ہو یا کم۔ ہاں عذر کی بناء پر مردہ کو نکال سکتے ہیں کہ زمین غصب شدہ ہو یا اس طرح کا کوئی اور عذر ہو)

☆ یعنی میت پرانی خواہ نئی اس کا قبر سے نکالنا جائز نہیں مگر اس عذر سے کہ جبراً اگر میت کسی غیر کی زمین میں دفن کردی جائے اور صاحب زمین اس کو نکلوائے اور اگر نہ نکلوائے تو صاحب زمین کو قبر برابر کرکے اس پر بونا جوتنا بھی جائز لکھا ہے۔ چنانچہ صفحہ ۱۸۰ اسعاف میں ہے

و لو دفن فی ارض رجل بغیر اذنہ للمالک الامر بالاخراج منھاولہ الترک و تسویۃ الارض و زرعھا [2]۔

(ترجمہ: اگر کسی شخص کی ملکیتی زمین میں بغیر اجازت کے مردے کو دفن کردیا گیا ہو مالک کو حق حاصل ہے کہ اسے وہاں سے نکال لینے کا حکم دے یا اسے وہیں دفن رہنے دے اور زمین ہموار کرکے کھیتی باڑی کرے)

بآنکہ حدیثِ صحیح میں ہے کہ آگ کی چنگاری جو کپڑے کو جلا کر پار نکل جائے پر بیٹھنا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ قبر پر بیٹھے۔

چنانچہ صفحہ ۳۱۲ جلد اول مسلم شریف میں ہے

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ لان یجلس احدکم علی جمرۃ فتحرق

---

[1] اسعاف فی احکام الأوقاف صفحہ

[2] اسعاف فی احکام الأوقاف صفحہ

ثیابه فتخلص الی جلد خیر له من ان یجلس علی قبر [۱]

☆ (ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تم میں کوئی شخص اگر آگ کے انگارے پر بیٹھ جائے وہ اس کے کپڑوں کو جلا کر اس کی جلد تک پہنچ جائے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے اس سے کہ کسی قبر کے اوپر بیٹھے)

لہٰذا اس حدیث کو اس روایۃ مذکورۂ اسعاف کے ساتھ ملا کر دیکھنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ قبر کا نشان بصورتِ عدمِ رعایتِ حقِ مالک یا ایسی قسم کی دوسری ضرورت شرعی پائی جائے جب اس کا نشان مٹا دیا جائے تو اس پر چلنا پھرنا بونا جوتنا تک جائز ہو جاتا ہے۔ اور حدیث مخصوص اسی حالت کے ساتھ ہے کہ جب نشان قبر موجود ہو اور اس کا مٹانا جائز نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ صورتِ مذکورہ میں بوجہ تنگیِ مسجد ایسی سخت ضرورت واقع ہے کہ جس کی وجہ سے جبراً قیمتِ بازاری دے کر نہ کہ وہ قیمت جو بصورتِ جبر مالکِ زمین طلب کرے جس کو ثمن کہتے ہیں دوسرے کی زمین سے مسجد کا فراخ کرنا جائز ہے۔ حالانکہ اولاً بلا تراضیِ طرفین بیع منعقد نہیں ہوتی۔ علاوہ بریں جبراً کسی کی زمین وغیرہ خریدنا اور وہ بھی ایسی قیمت پر جو اس کی قیمت مطلوبہ سے کم ہو بلاشبہ حرام ہے۔ مگر بموجب کلیۂ شریعت کے:

☆ الضرورات تبیح المخظورات [۲]

(ترجمہ: ضرورتیں حرام کو مباح کر دیتی ہیں)

منقولہ الاشباہ والنظائر علامہ ابکسی رحمہ اللہ باب بناء المساجد اسعاف کے آخر صفحہ ۳۷ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

و لو ضاق المسجد علی الناس و بجنبه ارض ملک لرجل توخذ بالقیمة کرها دفعا للضرر العام و یجبر الضرر الخاص بالقیمة [۳] وهکذا فی البحر والشامی

---

[۱] صحیح مسلم : جلد ۱ صفحہ ۳۱۲ نور محمد اصح المطابع کراچی

[۲] الاشباہ والنظائر : جلد اول صفحہ ۱۱۸ مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی

[۳] اسعاف فی احکام الاوقاف صفحہ مطبوعہ

(ترجمہ: مسجد لوگوں پر تنگ ہوگئی۔ اور اس کے ایک طرف زمین ہے۔ جو کسی آدمی کی ملکیت ہے تو وہ زمین عام نقصان کو دور کرنے کے لیے قیمت کے ساتھ جبراً خریدی جائے گی۔ اور خاص مالک کے نقصان کو قیمت سے پورا کیا جائے گا۔ البحر الرائق اور شامی میں اسی طرح ہے)

☆ اور باوجودیکہ مسجد کے نیچے یا اوپر واقف تک کو اپنی سکونت کے واسطے مکان بنانا بالاتفاق قبل بناءِ مسجد یا بعد بناءِ مسجد قطعاً ناجائز ہے اور منع ہے اس مسجد پر حکمِ مسجد نافذ ہونے سے اگر قبل بناءِ مسجد واقف بھی بنا لے۔

کمافی اسعاف صفحة ۷۲

و لو اتخذ مسجدا و تحته سرداب او فوقه بیت او جعل وسط داره مسجدا و اذن للناس بالدخول و الصلوة من غیر ان یفرز له طریق لا یصیر مسجد او یورث عنه[1]

(ترجمہ: کسی شخص نے مسجد بنوائی اس کے نیچے تہ خانہ ہے۔ یا اس کے اوپر کسی کا ذاتی گھر ہے۔ یا رہنے کے گھر کے درمیان مسجد بنوائی۔ اور لوگوں کو اس میں آنے اور نماز ادا کرنے کی لوگوں کو اجازت دے دی لیکن اس کا رستہ علیحدہ نہیں کیا وہ مسجد نہیں بنی بلکہ اس کی وراثت قرار پائے گی)

☆ مگر امام محمد رحمہ اللہ و امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے جب رے اور بغداد میں تنگیِ زمین بے حد دیکھی بموجب اس کلیہ ☆ **الضرورات تبیح المحذورات** کے جواز مکانِ سکونت کا مسجد کے نیچے اور اوپر فتویٰ نافذ فرمایا نہ کہ بلاضرورتِ شاقہ مطلقاً **کما فی صفحة ۷۳ من الاسعاف**

و عن محمد لما دخل الری اجاز ذالک بکل حال و عن ابی یوسف مثله لما دخل بغداد[2]

☆ (ترجمہ: جب امام محمد رحمۃ اللہ علیہ رے میں آئے تو اس کی ہر حال میں اجازت دے دی امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ جب بغداد آئے تو انہوں نے بھی اسی طرح فرمایا)

---

[1] اسعاف فی احکام الاوقاف صفحه مطبوعه

[2] اسعاف فی احکام الاوقاف صفحه مطبوعه

☆ پھر یہاں تو سخت ضرورت واقع ہے اور مالکِ زمین خود زمین کو بخوشی خاطر مسجد میں دے رہا ہے۔ لامحالہ بضرورتِ مذکورہ سوال یہاں بھی نشانِ قبر مٹا کر بغیر لاش نکالنے کے زمینِ قبر مسجد میں لے لینا بہ نسبت لاش نکال کر مسجد میں لینے سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ ☆ اور عمدہ طریقہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ذرا کرسی مسجد کی اتنی اونچی کردی جائے کہ قبریں بدستور کرسی کے نیچے دو کوٹھرے بہت نیچی چھت کے بنا کر چھوڑ دی جائیں تاکہ بوجہ اختلافِ مکان قبروں کے کھودنے اور قبروں پر بیٹھنے کی خرابی سے بھی بچ جائیں اور قبروں کے مٹانے سے بھی بچ جائیں۔ اور قبروں کی زمین مسجد رہے پھر وقفہ کر کے دروازہ ان کوٹھریوں کا قطعاً نہ رکھا جائے یا رکھا جائے تو تیغہ کر دیا جائے اور کسی دوسرے کام میں وہ کوٹھری نہ لائی جائے تاکہ کسی قسم کا بھی محذور نہ لازم آئے۔ اور اس صورت میں یہ اعتراض بھی نہ رہے گا کہ قبر کو مسجد بنانے کی ممانعت حدیث میں وارد ہے۔

چنانچہ جلد دوم بخاری شریف میں ہے:

قال رسول الله ﷺ :

☆ لعنة الله على اليهود والنصارى اتخذوا قبور انبيائهم مساجد يحذر ما صنعوا[1]

ترجمہ: حضرت رسول کریم ﷺ نے فرمایا یہودیوں اور عیسائیوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، انہوں نے اپنے انبیائے کرام علیہم السلام کی قبور کو سجدہ گاہ بنالیا ہے آپ ﷺ ان کے برے اعمال سے امت کو ڈرا رہے تھے)۔

☆ اس واسطے کہ علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ نے بیضاوی سے قسطلانی میں اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ لمعات میں تورپشتی سے نقل فرماتے ہیں ☆ کہ قبر کو مسجد بنانے کے یہ معنے ہیں کہ قبر کو قبلہ بنایا جائے۔ اور قبر کی تعظیم مقصود ہو۔ اور قبر کی طرف بلا حجاب دیوار وغیرہ سجدہ کیا جائے۔ اور صورتِ مذکورہ میں ظاہر ہے کہ کوئی بھی امر امورِ مذکور سے نہیں پایا جاتا ہے۔

چنانچہ استاذی ومولائی مولانا احمد علی صاحب مرحوم ومغفور سہارنپوری شرح حدیثِ مذکور میں حاشیہ

---

[1] صحيح بخاری : جلد ۲ صفحه ۶۳۹ حاشیه ۸ مطبوعه نور محمد اصح المطابع کراچی

بخاری شریف پر قسطلانی اور لمعات سے تحریر فرماتے ہیں۔

قولہ حذرنا ما صنعوا من اتخاذ المساجد علی القبور قال البیضاوی لماکانت الیھود و النصاری یسجدون لقبور الانبیاء تعظیما لشانھم و یجعلونھا قبلۃ یتوجھون فی الصلوۃ نحوھا واتخذوھا اوثانا لعنھم و منعھم عن مثل ذالک فاما من اتخذ مسجدا فی جوار صالح و قصد التبرک بالقرب منہ لاالتعظیم ولا التوجہ نحوہ فلا یدخل فی ذالک الوعید و فی اللمعات قال التورپشتی فاما اذا وجد بقربھا موضع بنی للصلوۃ اومکان یسلم فیہ المصلی عن التوجہ الی القبور فانہ فی فسحۃ من الامر[1]

(ترجمہ: قولہ: ہم کو ان کے برے اعمال سے ڈرا رہے تھے کہ انہوں نے قبروں کے اوپر مسجدیں بنالیں تھیں۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہودی اور عیسائی انبیائے کرام علیہم السلام کی قبور کو ان کی شان کی تعظیم کے لیے سجدہ کیا کرتے تھے۔ انہیں اپنا قبلہ قرار دیتے کہ نماز غیرہ میں ان کی جانب رخ کرتے تھے۔ انہوں نے ان قبور کو قبلہ بنا رکھا تھا۔ آپ نے ان پر لعنت فرمائی۔ اور اہلِ ایمان کو ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ ☆ لیکن اگر کوئی شخص کسی نیک آدمی کی قبر کے قریب مسجد بنائے اور اس کے قرب سے برکت کے حصول کا ارادہ کرے نہ الوہی تعظیم اور نہ ہی اس طرف رخ کرنے کی نیت ہو تو وہ اس وعیدِ نبوی میں داخل نہیں ہے۔ لمعات التنقیح میں ہے کہ علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اگر قبروں کے قریب مسجد کے لیے جگہ بنادی جائے یا ایسی جگہ ہو جہاں نماز ی کا رخ قبور کی جانب ہونے بچت ہوتی ہو وہاں نماز ادا کرنے کی گنجائش ہے) فقط

حررہ:

العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

✿✿✿✿✿

---

[1] صحیح بخاری: جلد ۲ صفحہ ۶۳۹ حاشیہ ۸ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی

﴿فتوی نمبر......153﴾

سوال

اگر چبوترہ موقوفہ علی المسجد مسجد سے اتنی دور ہو کہ بیچ میں رستہ آجائے اور بانی مسجد نے اس کو مسجد اس غرض سے بنوایا ہو کہ گرمیوں میں اس پر نماز پڑھ لیا کریں۔ اس پر ثواب نماز کا اتنا ہی ہوگا جتنا مسجد میں ہوتا ہے یا کم؟

۲۶ رجب ۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

مسجد ہی کے برابر ثواب ہوگا اس واسطے کہ بوجہ نیت مذکورہ کے بانی مسجد سے وہ بھی مسجد ہے۔ چنانچہ صفحہ ۳۵۵ جلد خامس عالمگیریہ میں ہے

وفی صلوۃ الاثر قال سالت محمدا رحمہ اللہ تعالی عن دکان اتخذ للمسجد وبینہ بین المسجدطریق وھوناء عن المسجد لیصلی علیہ فی الحر ایضا غف فیہ الاجر کما یضاعف فی المسجد قال نعم کذا فی الذخیرۃ[1]

(ترجمہ: صلوۃ الاثر میں ہے کہ میں نے حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک چبوترے کے بارے میں پوچھا جسے مسجد کے لیے بنایا تھا مسجد اور اس کے درمیان ایک راستہ ہے اور یہ چبوترہ مسجد سے دور ہے اور اسے اس لیے بنایا تھا کہ وہ وہاں گرمی میں نماز ادا کی جائے کیا اس جگہ نماز پڑھنے سے اتنے گنا زیادہ ثواب ملے گا جتنا کہ ثواب مسجد میں ملتا ہے تو آپ نے فرمایا ہاں یہ ذخیرہ میں ہے)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی مسجد جامع اکبر آباد

---

[1] الفتاوی العالم گیریہ : جلد ۵ صفحہ ۳۸۶ دار احیاء التراث العربی بیروت

غصب
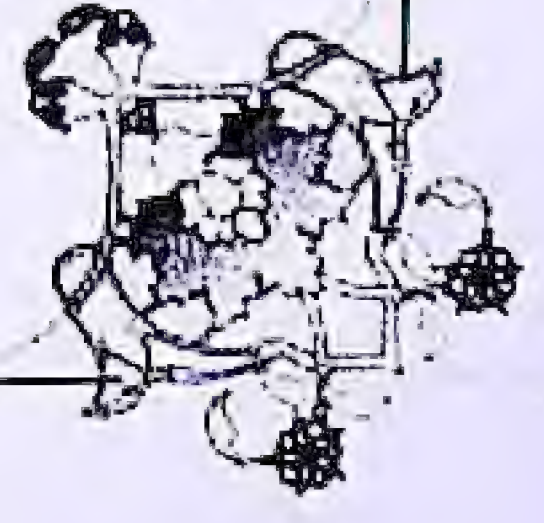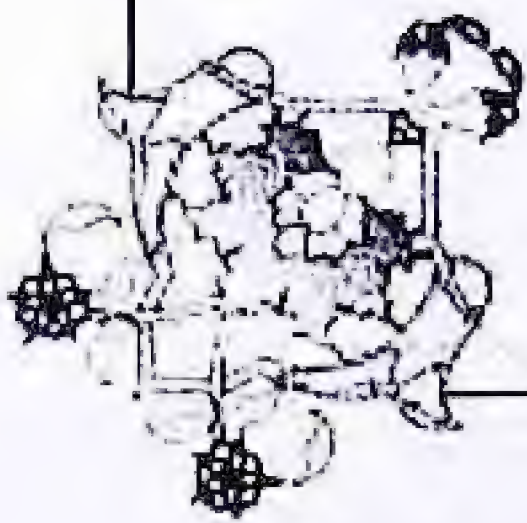
﴿فتویٰ نمبر......154﴾

سوال

جو اشخاص کسی مسلمان کی موروثی ملکیت کو وقف کرانے پر آمادہ ہوں اور جھوٹے سچے واقعات گھڑ گھڑ کر عامۃ الخلائق کے ساتھ عدالت کو بھی مغالطہ میں ڈالنا چاہتے ہوں ان کے لیے کیا حکم ہے؟۔

الجواب

جو کسی کا مال تلف یا حق تلفی کرائے اس کے واسطے وعیدِ نار ہے۔ مشکوۃ شریف میں بروایت مسلم شریف ہے :

☆ **قال رسول الله ﷺ من اقتطع حق امرأ مسلم فقد أوجب الله له النار و حرم عليه الجنة فقال له رجل و ان كان شيئا يسيرا يا رسول الله ﷺ قال ان كان قضيبا من اراك** [1]

(ترجمہ: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے کسی مسلمان کا حق غصب کیا اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے دوزخ کو واجب فرمادیا جنت اس پر حرام فرمادی۔ ایک شخص نے عرض کی یارسول اللہ! اگرچہ وہ تھوڑی سی چیز ہو۔ فرمایا: اگرچہ اراک (پیلو) درخت ایک لکڑی ہی ہو) فقط

حررہ:

العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی

جامع مسجد اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[1] صحیح مسلم : صفحہ ۷۰ حدیث رقم ۳۵۳ مطبوعہ دار السلام الریاض

عاریۃ
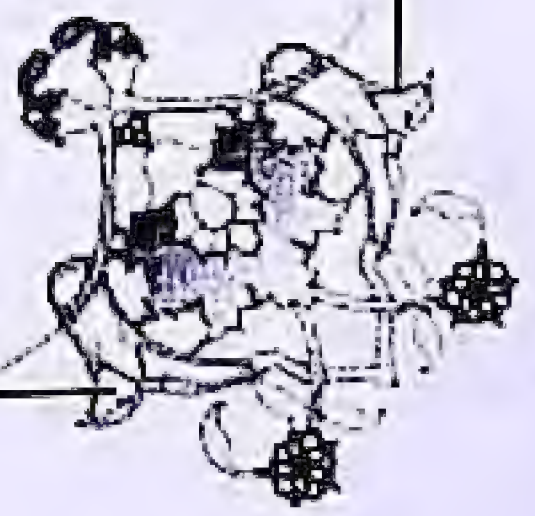
﴿فتویٰ نمبر......155﴾

سوال

(۱) کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ

زیور چڑھاوا شوہر کے باپ نے پہنا دیا تھا۔ اس کو وہ بجنسہ واپس لے سکتا ہے یا اس میں ترکہ جاری ہوگا۔ کیوں وہ مستعار تھا۔

(۲) مسماۃ نے وقتِ وفات شوہر، باپ، ماں، تین بھائی اور ایک بہن چھوڑے ہیں

(۳) دختر کے باپ نے وقتِ نکاح دوسو روپیہ کا زیور دختر کو پہنایا اور اعلان کیا تھا کہ اس کو دیتا ہوں لہٰذا اس زیور کے تعلق شرع شریف کا کیا حکم ہے؟۔ بینوا وتوجروا

سائل وزیر خان صابن کٹرہ آگرہ

الجواب

وهو الموفق للصواب

بسم الله الرحمن الرحيم.

اللهم رب زدني علما

جو زیور چڑھاوا شوہر کے باپ نے پہنا دیا تھا اس عبارت سے امر ظاہر ہے کہ وہ زیور اس قسم کے مہر سے تھا جو عادۃ وعرفا شادی کے دن بوقتِ نکاح شوہر کا باپ یا شوہر کے بزرگ عرفا دولہن کو شادی کے کپڑوں کے ساتھ دولہا کی طرف سے بھیجا کرتے ہیں۔ جس کو ہمارے عرف میں بَری کہتے ہیں۔

☆ علامہ حصکفی رحمہ اللہ درمختار کے صفحہ ۳۹۶ میں تحریر فرماتے ہیں کہ جو کچھ زوج نے زوجہ کو بھیجا تھا اگر زوجہ کہے کہ وہ بطریقِ مہر کے بھیجا تھا اور زوج کہے بطریقِ امانت وعاریت بھیجا تھا اور دونوں اپنے دعوی پر گواہ پیش نہ کرسکیں تو وہ سامان زیور وغیرہ اگر عرفا اس جنس سے ہے کہ وہ بطریق مہر دیا جاتا ہے تو قول عورت کا حسب

شہادتِ ظاہر عرف معتبر ہوگا اور اگر وہ عرفاً جنسِ امانت وعاریت سے ہے تو اس کو عاریہ قرار دیا جائے گا۔ اور زوج علی ھذا اور ثۂ زوج اس کی واپسی کے شرط موجود ہونے پر اس شے کے مستحق ہوں گے۔ وھذہ عبارتہ

و لو ادعت انہ أی المبعوث من المہر و قال ہو ودیعة فان کان من جنس المہر فالقول لہا و ان کان من خلافہ فالقول لہ بشہادۃ الظاہر[1]

(ترجمہ: عورت نے دعوی کیا کہ جو چیز اس کے پاس بھیجی گئی وہ مہر تھی۔ خاوند کہے کہ وہ امانت تھی۔ اگر وہ چیز مہر کی جنس سے ہو تو عورت کے قول کو تسلیم کیا جائے گا اور اگر اس کے خلاف کی جنس سے ہو تو ظاہر کی شہادت کی بناء پر مرد کا قول تسلیم کیا جائے گا)

بہرنہج اس امر کا فیصلہ کہ چڑھاوا عرف میں مہرِ معجّل کو، جس کا نام بری ہے کہتے ہیں یا اس زیور کو بھی جس کو عاریۃً دلہن کو پہنائیں اور دولہن کو ابھی سال دو سال بعد نکاح دولہ اپنے گھر بھی نہ لائے اور دلہن باپ کے گھر سے بتراضی ہر دو فریق رخصت بھی نہ کی جائے علی ہذا باپ کی جانب سے بعدِ نکاح یا قبلِ نکاح جو دلہن کو پہنایا جائے مگر سوالِ سائل میں تعارض ہے اس واسطے کہ سوال میں کہتا ہے کہ دلہن کے باپ نے جو زیور عاریت پہنایا تھا اور سوال دوم وسوم میں کہتا ہے کہ دلہن کے باپ نے اعلان کر دیا تھا کہ دوسو روپیہ کا زیور جو لڑکی کو میں پہنایا ہے لڑکی کو دیتا ہوں لہٰذا بشہادت شہود اگر یہ ثابت ہو جائے کہ فی الواقع باپ نے بطریقِ جہیز لڑکی کو بخش دیا تھا اور دولہ کی جانب سے بھی فی الواقع چڑھاوا ہی تھا تو کل مال لڑکی کا معہ زرِ مہر تقسیم ہوگا ورنہ فقط مہر اور علاوہ مہر کے جو چیز بھی مملوکۂ متوفیہ ہے اس طرح تقسیم ہوگی کہ کل مالِ ہندہ کے چھ حصہ کر کے تین حصہ زوج کو دیئے جائیں گے اور ایک حصہ ام (ماں) اور دو حصہ باپ کو اور بموجودگی عصبۂ قریب یعنی باپ میں بہن بھائی کو کچھ نہیں ملے گا۔

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۲ صفحہ ۳۹۶ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

صورته هكذا

ہندہ مسئلہ ٦

میت

زوج ام اب اخ اخ اخت

۳ ۱ ۲

م م م م

حررہ:

العبد الراجی رحمۃ ربہ الغنی

ابو محمد محمد دیدار علی المفتی

فی جامع اکبر آباد

مقفور

﴿فتویٰ نمبر......156﴾

سوال

دس برس سے خاوند مفقود ہے اور عورت جوان عمر ہے۔ کوئی صورت گزارہ نہیں۔ احتمال زنا بھی ہے۔ لہٰذا شرعاً وہ نکاح کرسکتی ہے؟۔

سائل: پابند شریعت مسماۃ عرب بیگم بنت میر علی
پانی جوکی آگرہ ۱۴ اپریل ۱۹۱۶ء

الجواب

ھو المصوب

ایسی صورت میں جب کہ مجبوری انتہا درجہ کی ہوتو حنفیہ کو بتقلیدِ شافعی و مالکی بعد اس قدر مدت مدید کے نکاح جائز ہے۔ جامع الرموز میں ہے۔

قال مالک والاوزاعی الی اربع سنین فینکح عرسه بعده کما فی النظم فلو افتی به فی موضع الضرورة ینبغی ان لا باس به علی ما نحن[1].

(ترجمہ: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ چار سال تک خاوند کو تلاش کیا جائے اس کے بعد اس کی بیوی نکاح کرے جیسا کہ النظم میں ہے اگر کوئی مفتی ضرورت کے مقام پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر فتویٰ دے تو ہمارے موقف کے مطابق اس میں کوئی حرج نہ ہونا چاہئے)

ردالمحتار میں ہے:۔

لو افتی به فی موضع الضرورة لا بأس به علی ما أظن[2]

(ترجمہ: اگر ضرورت کے موقع پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر فتویٰ دے تو میرا خیال یہ ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے)

مگر بدرجۂ احتیاط حاکم کو بھی اطلاع کردی جائے۔ فقط

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

---

[1] جامع الرموز جلد صفحہ
[2] رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۳۶۲ مطبوعہ رشیدیہ کوئٹہ

﴿فتوی نمبر...... 157﴾

سوال

ایک عورت تیس سالہ عمر ہے۔عرصہ بارہ پندرہ سال سے اس کا خاوند مفقود الخبر ہو گیا۔وہ اب تک انتظار میں ہے۔مگر نہ تو خرچ خبر نہ خط اس عرصہ میں آیا۔لہٰذا بوجہ نہ ہونے کی سرپرست اور نوجوان ہونے کے احتمال فساد ہے۔اس صورت میں شرعاً وہ نکاح اپنا کر سکتی یا نہیں۔

سائل: شیخ حسین بخش ہتاس آگرہ ۱۹/فروری ۱۹۱۶ء

الجواب

هو المصوب

مسئلہ مفقود میں حنفیہ کے نزدیک عند الضرورۃ بتقلید مالکیہ وشافعیہ بعد اس قدر عرصہ کے نکاح ثانی درست ہے۔

جامع الرموز (میں ہے):

قال مالک والاوزاعی الی اربع سنین فتنکح عرسه بعد ها کذا فی النظم فلوافتی به فی موضع الضرورة ینبغی ان لا باس به علی ما اظن۔[1]

(ترجمہ: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بیوی چار سال تک انتظار کرے۔پھر وہ نکاح کرے۔ایسا ہی نظم میں ہے۔اگر ضرورت کے مقام پر اس قول کے مطابق فتوی دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے جیسا کہ میں گمان کرتا ہوں)

وفی رد المحتار :ذکر ابن وهیان فی منظومه لوافتی فی موضع الضرورة لا باس علی ما أظن۔[2]

(امام ابن وہبان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے منظومہ میں فرمایا اگر ضرورت کے مقام پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق فتوی دیا جائے تو میرے گمان کے مطابق اس میں کوئی حرج نہیں ہے)

کتبہ المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

		جلد	صفحه	مطبوعه
۱	جامع الرموز	جلد	صفحه	مطبوعه
۲	رد المحتار	جلد ۳	صفحه ۳۶۲	مکتبه رشیدیه کوئٹه

﴿فتویٰ نمبر......158﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین بیچ اس مسئلہ کے، کہ اگر کوئی شخص باہر چلا گیا ہو اور لا پتہ ہو اس کی زوجہ کتنے دن تک نکاح نہ کرے؟ بینوا توجروا.

اصالت بخش پیپل منڈی رسالدانہ آگرہ۔

۲۵ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

صورتِ مسئولہ میں بروایتِ متون نوے برس تک وہ عورت نکاح نہ کرے اور ظاہر الروایت اور قول مختار یہ ہے، کہ اس کے شوہر کے ہم عمر جب تک نہ مریں اس کو کسی سے نکاح کرنا جائز نہیں۔ کما فی شرح الوقایہ

المفقود غائب لم یدر الرہ حی فی حق نفسه فلا ینکح عرسه الی تسعین سنة و ظاهر الروایة ان تقدر بموت الاقران انتهیٰ مختصرا بقدر الحاجة[1] ۔

(ترجمہ: مفقود وہ غائب ہوتا ہے، جس کا کوئی پتہ نہ چلے۔ وہ اپنے حق میں زندہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی بیوی نوے سال تک نکاح نہ کرے۔ اور ظاہر روایت یہ ہے کہ اس کا اندازہ اس کے ہم عمر لوگوں کے مرجانے سے کیا جائے گا)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ

ابو محمد محمد دیدار علی مفتی

جامع مسجد اکبر آباد

❁❁❁❁❁

---

[1] شرح الوقایہ : جلد ۲ صفحہ ۳۹۱ تا ۳۹۳ (اختصارا التقاطا) مطبوعہ مجتبائی دھلی

﴿فتویٰ نمبر......159﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ میرا شوہر عرصہ آٹھ سال سے مفقود الخبر ہے۔اور یومِ نکاح سے اس وقت تک وہ میرے پاس نہیں آیا ہے۔اور مجھ کو نان ونفقہ کی سخت ضرورت ہے کیوں کہ عاقلہ بالغہ ہوں۔ایسی صورت میں شرعا کیا حکم ہے؟

۲۲ جولائی ۱۹۱۸ء

بشیراں بنت کالی خان قوم پٹھان ساکن گبرہ صفدر خاں علاقہ لوہامنڈی

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

☆ صورتِ مسئولہ میں قاضی یعنی حاکمِ شریعت کو یہ اختیار نہیں کہ میاں بی بی میں حکمِ تفریق نافذ کر کے عورت کو بعد انقطاع عدت دوسری جگہ نکاح کرنے کی اجازت دے دے۔البتہ اگر شوہر کی جائیداد وغیرہ کچھ ہو تو حاکم کو لازم ہے کہ اس جائیداد سے اس کے نان ونفقہ کا انتظام کر دے☆ اور جب تک اس کے ہم عمر نہ مر لیں اس وقت تک اس کی زوجہ کو بعد انقطاع ایامِ عدتِ موت اجازت نکاح کی دوسری جگہ قاضی نہیں دے سکتا۔

چنانچہ کنز الدقائق میں ہے:

المفقود هو غائب لم يدر موضعه فينصب القاضى من ياخذ حقه ويحفظ ماله و يقوم عليه و ينفق على قريبه ولادا وزوجته ولا يفرق بينه و بينها و حكم بموته بعد تسعين سنة و تعتد امراته وورثه منه حينئذ. [1]

(ترجمہ: مفقود وہ غائب آدمی ہوتا ہے جس کے رہنے کی جگہ کا علم نہ ہو سکے۔لہٰذا قاضی ایک شخص کو مقرر کرے گا جو اس کا حق وصول کرے گا' اس کے مال کی حفاظت کرے گا اور اس کی نگرانی کرے گا ولادت کے اعتبار سے

[1] كنز الدقائق مع البحر الرائق : جلد ۵' صفحه ۱۷۶'۱۷۷'۱۷۸' مطبوعه دار المعرفه بيروت

اس کے قریب رشتہ دار پر اور اس کی بیوی پر صرف کرے گا۔ مفقود اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق نہ کی جائے گی۔ ☆ نوے سال کے بعد اس کی موت کا حکم لگایا جائے گا۔ اس کی بیوی عدت گذارے گی اور اس وقت کی وراثت تقسیم ہوگی۔)

قال العلامة زین الدین فی صفحه ۱۶۴ من الجزء الخامس من بحر الرائق

أی و من زوجته لقوله علیه السلام فی امراة المفقود أنها امراته حتی یاتیها البیان و قول علی رضی الله عنه فیها هی امراة ابتلیت فلتصبر حتی یتبین موت او طلاق خرج بیانا للبیان المذکور فی المرفوع ولان النکاح عرف ثبوته والغیبة لا توجب الفرقة والموت فی حیز الاحتمال فلا یزال النکاح بالشک و عمر رضی الله عنه رجع الی قول علی رضی الله عنه[1]

☆ (ترجمہ: یعنی مفقود اور اس کی بیوی کے مابین تفریق نہ کی جائے گی ☆ کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے مفقود کی بیوی کے بارے میں فرمایا وہ اس کی بیوی ہے جب تک کہ اس کے پاس اس کی (موت یا طلاق کی) وضاحت نہ آجائے۔ ☆ نیز حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ عورت آزمائش میں مبتلا ہے لہذا اسے صبر کرنا چاہئے جب تک کہ اس کی موت یا طلاق کی وضاحت نہ ہو جائے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد حدیث مرفوع کی وضاحت کر رہا ہے' نیز نکاح کا ثبوت معروف ہے اور خاوند کا غائب ہونا فرقت کا باعث نہیں ہوسکتا۔ اور موت کا صرف احتمال ہے۔ لہذا نکاح صرف شک کے باعث زائل نہیں ہوگا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کے قول کی جانب رجوع فرمالیا تھا)

واللہ اعلم علمہ احکم

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی مسجد جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[1] البحر الرائق : جلد ۵' صفحه ۱۷۸' مطبوعه دار المعرفه بیروت

احیاء الموات

﴾فتویٰ نمبر...... 160﴿

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حسبِ رواجِ راج و پابندیٔ قانونِ پیداوار گھاس و پالہ و لکڑی و پترِ پہاڑ ملکیتِ معافی دار متصور ہوتا ہے۔ بدین وجہ معافی دار دیگر دیہات ملحقہ کے باشندگان کو کہ وہ اپنے مویشی پہاڑِ معافی دار میں چراتے ہیں' مانع ہے اور نیاز مند ملازم معافی دار ہے۔ پس شرع شریف میں پیداوارِ پہاڑ ملکیتِ معافی دار ہوسکتی ہے یا نہیں اور معافی دار کا مانع ہونا بموجب شرع شریف درست ہے یا نہیں؟ آیا پیداوار خود (رو) پہاڑ کی ملکیتِ عام ہے یا خاص واحد معافی دار؟ امید کہ براہِ کرم جواب سے مشرف فرمایا جائے۔

سعید معین الدین امام مسجد سرائے قصبہ گشنگوھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

گھاس خودرو اور خودرو درخت جو فقط جانوروں کے چرانے کے کام آتے ہیں وہ تین حال سے خالی نہیں یا تو ایسی زمین یا پہاڑ میں ہوں گے جو کسی کا مملوک نہیں۔ اندریں صورت اس چراگاہ کی گھاس پانی وغیرہ سارے مسلمانوں کا برابر کا حق ہے جو چاہے اپنے جانوروں کو چروائے۔ خواہ چرانے کو کاٹ لے جائے۔

☆ یا یہ گھاس وغیرہ خودرو نباتات کسی کی زمین مملوکہ میں ہوں گی۔ اندریں صورت بھی اس گھاس وغیرہ میں تمام مسلمانوں کا حق ہے۔ مگر صاحب زمین کو حق ہے۔ کہ اپنی زمین میں کسی کو نہ آنے دے۔ لہٰذا اگر کسی مسلمان کو دوسری جگہ گھاس نہ ملے اور (جانور) اس کے بھوکے مریں۔ زمین والے پر لازم ہے کہ اگر اپنی زمین میں نہ آنے دے اس کو کاٹ کر گھاس دے دے۔ یا اس کو آنے کی اجازت دے دے اور کہہ دے کہ گھاس لے جا مگر کھیت کی دیوار وغیرہ نہ خراب ہو۔

☆ اور تیسری صورت یہ ہے کہ کسی نے گھاس پالہ وغیرہ کاٹ کر رکھا ہے۔ متفرق خواہ ایک جگہ جمع کر کے
☆ یا گھاس اس کے بونے اور لگانے سے اگ آئے وہ فقط اس کاٹنے والے اور بونے والے کی ملک ہے۔ اس میں کسی کا حق نہیں۔ ☆ بہر نہج پانی اور خودرو گھاس وغیرہ اور آگ تینوں کا ایک حکم ہے۔ چنانچہ کتاب احیاء الموت درمختار اور شامی کے صفحہ ۳۱۲ جلد خامس میں ہے۔

المسلمون شرکاء فی ثلاث فی الماء والکلاء والنار [1]

(ترجمہ: مسلمان تین چیزوں میں شریک ہیں (۱) پانی (۲) گھاس (۳) آگ)

قال الشامی رحمہ اللہ:

قوله المسلمون الخ ای شرکة اباحة لا شرکة ملک فمن سبق الی شیء من ذلک فی وعاء او غیرہ واحرزہ فهو أحق به و هو ملک له دون من سواہ یجوز له تملیکه بجمیع وجوہ التملیک و هو موروث عنه و تجوز فیه وصایاہ و ان اخذہ احد منه بغیر اذنه ضمنه و مالم یسبق الیه احد فهو لجماعة المسلمین مباح لیس لاحد منع من اراد اخذہ لنفسه۔[2] اتقانی عن الکرخی۔[3]

(ترجمہ: قولہ: مسلمان تین چیزوں میں شریک ہیں یعنی ان کی شرکت اباحت کے اعتبار سے ہے نہ کہ ملک کے لحاظ سے' لہٰذا جو شخص ان میں کسی چیز کو پہلے کسی برتن وغیرہ میں ڈال لے یا اکٹھا کر لے وہی اس چیز کا زیادہ حق دار ہے۔ اور وہ چیز اس شخص کی ملک ہوگی۔ کسی دوسرے کی ملکیت میں نہ رہے گی۔ اس کے لیے دوسرے کو ملک بنانے کے تمام طریقوں سے اس کا مالک بنانا جائز ہے۔ مرنے کے بعد وہ چیز اس کی وراثت قرار پائے گی۔ اس میں اس شخص کے لیے وصیت کرنا جائز ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی اجازت کے بغیر اس چیز کو لے گا

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۳۱۲ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

[2] نوٹ: رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۳۱۲ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ میں "لنفسہ" کی بجائے "الشفة" تحریر ہے جو کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

[3] رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۳۱۲ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

تو وہ ضامن ہوگا۔ اور جب تک کسی آدمی نے حاصل کرنے کے لیے اس کی طرف سبقت نہ کہ ہو وہ مسلمانوں کی جماعت کے لیے مباح ہے۔ جو شخص اسے اپنی ذات کے لیے لینا چاہے لے سکتا ہے۔ کسی کو روکنے کا حق نہیں ہے)

اور صفحہ ۳۱۲ شامی جلد خامس میں ہے

ثم الكلام في الكلاء على اوجه أعمها ما نبت في موضع غير مملوک لاحد فالناس مملوكة بلا ابنات صاحبها و هو كذالک الاان لرب الارض المنع من الدخول في ارضه واخص من ذلک كله و هو ان يحتش الكلاء او انبته في ارضه فهو ملک له و ليس لاحد اخذه بوجه لحصوله بكسبه ذخيرة وغيره[1] ملحضا۔

(ترجمہ: پھر گھاس کے بارے میں گفتگو چند طرح سے ہے۔

(۱) گھاس کی سب سے عام صورت یہ ہے کہ یہ ایسی جگہ پیدا ہوئی ہو جو کسی کی ملکیت میں نہ ہو۔ تو اس صورت میں سارے لوگ وہاں مویشی چرانے اور اسے کاٹنے میں شراکت کا حق رکھتے ہیں۔ جس طرح کہ سمندروں کے پانیوں میں سب کا حق مشترکہ طور پر ہے۔

(۲) اس سے خاص تر یہ صورت یہ ہے کہ وہ کسی شخص کی مملوکہ زمین میں مالک کے اگانے کے بغیر خود بخود اگی ہو تو اس کا حکم بھی وہی ہے ہاں مالکِ زمین کو حق حاصل ہے وہ اوروں کو اپنی زمین میں داخل ہونے سے روک سکتا ہے۔

(۳) اور درج بالا دونوں صورتوں سے خاص تر یہ صورت ہے کہ گھاس اس نے اکٹھا کیا ہو یا اس نے اپنی زمین میں اگایا ہو تو یہ گھاس اس کی ملک ہے۔ کسی شخص کو کسی طرح سے اسے حاصل کرنے کا حق نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ اس کے عمل سے حاصل ہوا ہے۔ ذخیرہ وغیرہ۔)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی مسجد جامع اکبر آباد

[1] رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۳۱۲ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ
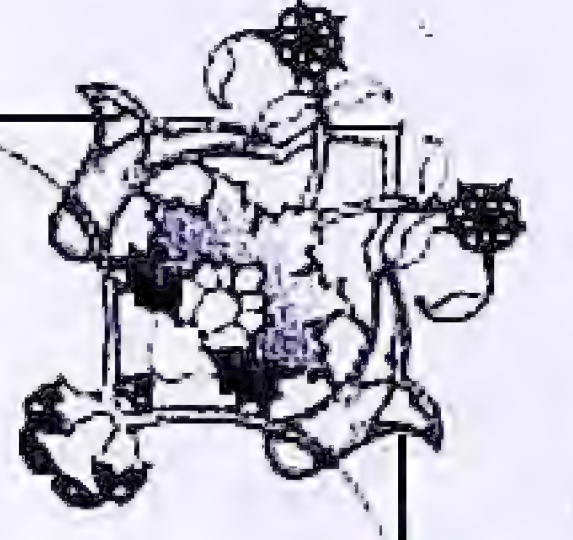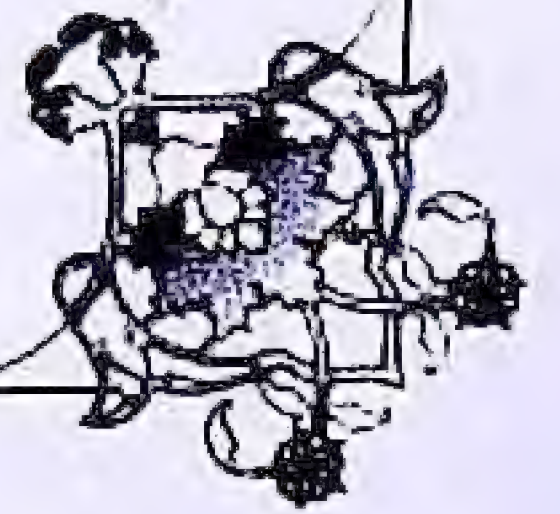
نکاح

﴿فتویٰ نمبر...... 161﴾

سوال

سوال یہ ہے کہ قاضیِ شہر کے علاوہ اگر کوئی دوسرا شخص شرع شریف کے مطابق پابندِ شریعت نکاح پڑھا دے یا دیگر مسلمان پڑھا دے اور اس کا اندارج رجسٹر قاضیِ شہر میں نہ ہو تو کیا وہ ناجائز ہے؟ اس کا جواب بحوالۂ کتاب تحریر کریں۔ پتہ یہ ہے کوٹہ راجپوتاں نئی پورہ میں پہنچ کر جمعدار عبدالعزیز محکمہ انجنیری کو ملے۔

الجواب

رکنِ نکاح ایجاب وقبول اور شرطِ صحتِ نکاح دو گواہوں کا بوقتِ ایجاب وقبول ایک جلسہ میں موجود ہونا ہے۔ ☆ لہٰذا علاوہ قاضیِ شہر جو بھی کوئی نکاح پڑھاوے ☆ یا دو گواہوں کے سامنے خود دولہا دولہن بیٹھے بھی اگر ایجاب وقبول کرلیں، نکاح منعقد ہو جائے گا۔ درجِ رجسٹر ہونا اور قاضی کا نکاح پڑھانا انتظامی امر ہیں۔ صحتِ نکاح میں اس کو کچھ دخل نہیں ہے۔

حررہ:
محمد دیدار علی حنفی مفتی
جامع مسجد اکبرآباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......162﴾

سوال

اگر وکیلِ مسماۃ ایجاب نہ کرے تو قاضیٔ عقد کو ایجاب کر دینے کا حق کس طرح حاصل ہوگا۔

سائل: قاضی جلال الدین ساکن ریاست دھول پور محلہ قاضی پاڑہ

۲۱ھ جمادی الأولی ۱۳۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

اگر عورت وقتِ نکاح مجلس میں موجود نہ ہو نہ کوئی اس کا وکیل اجنبی ہو نہ ولی، تو قاضی خود اس سے اجازت لے کر دولہا کو قبول کرادے۔ ☆ اور قبول کرانے کے وقت اس عورت کا نام معہ نام اس کے باپ کے ضرور لے تاکہ سب پہچان لیں۔ بہرنہج اس طرح اس کا نام لینا یا اس کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ گواہ وغیرہ سب پہچان لیں کہ فلاں عورت کا نکاح ہوا ہے۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ

ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی

مفتی جامع مسجد اکبرآباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......163﴾

سوال

بروقتِ عقد جو کہ حسب رواج ہندوستان من جانب عروسہ وکیل مقرر ہو کر آتا ہے تو تصدیق وکالت گواہان سے کس طرح کی جائے؟ اور اس طرح پر کہنا جائز ہے یا نہیں کہ جو مسماۃ فلاں کی لڑکی اس مکان کے اندر ہے یا جس کی تقریب شادی درپیش ہے۔

۲۱ جمادی الاولی ۳۶ھ

قاضی جلال الدین ساکن ریاست دھول پور محلّہ قاضی پاڑہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

بے شک اسی طرح کہنا چاہئے۔ اس واسطے کہ اصل نکاح میں یہ ہے' کہ کم از کم دو گواہ یا اہلِ مجلس' جس وقت دولہا کو ایجاب وقبول کرایا جائے اور دولہا اپنے عقد میں اس عورت کو قبول کرے پہچان لیں کہ فلاں عورت کو دولہا قبول کر رہا ہے۔ خواہ اس طرح ہو کہ دولہن مجلس میں بیٹھی ہو۔ اور عاقدِ نکاح اس عورت کی طرف اشارہ کر کے کہے' کہ اس عورت کو تمہارے عقدِ نکاح میں دیتا ہوں۔ اور دولہا کہے میں اس کو اپنے عقد میں قبول کرتا ہوں۔ خواہ اس طرح کہ عورت پردہ میں کسی ایسے مکان میں ہو' کہ اس کے ساتھ مکان میں اور عورتیں بھی ہوں' تو عاقدِ نکاح کو لازم ہے' کہ وہ دلہن کا نام اس کے باپ کے نام کے ساتھ اس طرح لے کہ دولہا کو اور گواہوں کو معلوم ہو جائے' کہ فلاں عورت کے ساتھ عقد ہوا ہے۔ علیٰ ہذا یہ ضرور ہے کہ وکیل اور گواہ عورت کو دیکھ کر پہچان لیں کہ فلاں عورت ہے جو اپنے نکاح کی فلاں شخص کے ساتھ اجازت دی رہی ہے۔

اور اگر وکیل اور گواہوں کو مجرد اتنا معلوم ہو کہ ایک عورت اندر سے اجازت دے رہی ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم کہ یہ عورت ان عورتوں میں سے کون سی عورت ہے' تو وہ نکاح جب صحیح ہوگا جب وہ عورت دولہا کے ساتھ

اس کے یہاں چلی جائے۔ اور بعدِ نکاح آثارِ رضامندی ظاہر رہیں۔ اور اگر وہ انکار کردے کہ میں اجازت نہیں دیتی تھی اور گواہ اور وکیل اس کو نہ پہچان سکیں وہ نکاح ہرگز صحیح نہ رہے گا۔

ہاں اگر اس نکاح میں بجز اس عورت کے کوئی اور عورت نہ ہو تو بلاشبہ وہ نکاح صحیح ہوگا۔ اور صحیح رہے گا۔ اور وکیل اور گواہ اس پر گواہی دے سکتے ہیں کہ جو اس مکان میں عورت تھی اور ہمارے علم میں یہی عورت تھی۔ اس نے ہم کو وکیلِ نکاح بنایا تھا۔ اور ہم اس کے گواہ ہیں۔ چنانچہ صفحہ ۲۹۵ شامی مطبوعہ مصر میں ہے۔

و لا بد من تمييز المنكوحة عند الشاهدين لتنتفى الجهالة فان كانت حاضرة منتقبة كفى الاشارة اليها والاحتياط كشف وجهها فان لم يروا شخصها و سمعوا كلامها من البيت ان كانت وحدها فيه جاز و لو معها اخرى فلا لعدم زوال الجهالة و كذا اذا وكلت بالتزويج فهو على هذا اى ان رأوها او كانت وحدها فى البيت يجوز ان يشهدوا عليها بالتوكيل اذا جحدته والافلا لاحتمال ان الموكل المراة الاخرى. و ليس معناه انه لا يصح التوكيل بدون ذلك و انه يصير العقد عقد فضولي[1] فيصح بالاجازة بعده قولا او فعلا لما علمته آنفا[2].

(ترجمہ: گواہوں کے نزدیک منکوحہ کا ممتاز ہونا بھی ضروری ہے تا کہ اس کے مجہول ہونے کا خاتمہ ہو سکے۔ لہٰذا اگر وہ اکیلی ہو اور نقاب اوڑھے ہوئے ہو تو اس کی طرف بوقتِ نکاح اشارہ کافی ہے۔ اور احتیاط یہ ہے کہ اس کے چہرے پر سے پردہ ہٹا دیا جائے (اور گواہ اسے دیکھ لیں۔) اگر گواہ اس کی ذات کو نہ دیکھیں لیکن اس کی گفتگو گھر کے اندر سے سن رہے ہوں، اگر وہ گھر میں اکیلی ہے، تو نکاح جائز ہے۔ اور اگر اس کے ساتھ اور کوئی عورت بھی موجود ہے (اور گواہ اسے دیکھ نہیں رہے) تو نکاح جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ جہالت کا خاتمہ نہیں ہوا۔ اور یہی حکم اس صورت میں ہے جب کہ عورت نے نکاح کے لیے کسی کو وکیل بنایا ہو یعنی اگر وکالت کے گواہوں

---

[1] قولہ "عقد فضولی" مطبوعہ نسخہ میں اسی طرح ہے۔ لیکن درست "عقدا فضوليا" ہے

[2] ردالمحتار: جلد ۴ صفحہ ۷۳، ۷۴، دار التراث العربی بیروت

نے اسے دیکھ لیا ہو یا وہ گھر میں اکیلی ہو تو اس کی طرف سے وکیل بنانے کی گواہی دے سکتے ہیں۔ جب کہ وکیل بنانے کا انکار کرے۔ ورنہ گواہی نہیں دے سکتے۔ کیونکہ یہ احتمال موجود ہے کہ وکیل بنانے والی عورت کوئی اور ہو۔ اس کے معنی یہ نہیں ہے کہ اس کے بغیر وکیل بنانا صحیح نہیں۔ اور عقدِ نکاح، فضولی عقد قرار پا جائے گا۔ لہٰذا اگر وہ بعد میں قول یا فعل کے ساتھ اجازت دے دے، تو نکاح درست ہو جائے گا جیسا کہ تم کو ابھی معلوم ہو چکا ہے)

لہٰذا تصدیقِ وکیلِ وکالت اس طرح ہونی چاہئے، کہ تم اس عورت کو، جس نے تم کو وکیل کیا ہے پہچانتے ہو؟ اور وہ کہیں کہ بے شک، ہم اس کو پہچانتے ہیں۔ اور گواہ بھی کہیں جس نے ان کو وکیل کیا ہے، ہم اس کو پہچانتے ہیں۔

اور عمدہ طریق یہ ہے کہ عورتِ بالغہ کا جو ولیِ اقرب ہو وہ وکیلِ نکاح بنایا جائے اور اس کی اجازت پر کفایت کی جائے اور اگر خوف اس امر کا ہو کہ عورت شاید وکالتِ ولی سے انکار کر جائے تو وقتِ اجازت ایسے دو گواہِ اجازت بنا لئے جائیں جن کے سامنے عورت بلا حجاب آ سکے اور وہ اس کو پہچان سکیں۔

حررہ:

العبد الراجی رحمۃ ربہ

ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی

مفتی جامع مسجد اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر......164﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ ایک عورت کا یعنی رحیمن کا عقد بتاریخ ۱۱ ربیع الاول ۱۳۳۵ ہجری کو مسمی حبیب کے ساتھ ہوا۔ لیکن مسماۃ مذکور کو چار پانچ ماہ کا حمل ہے اور مسماۃ رحیمن کے شوہر کو فوت ہوئے عرصہ تخمیناً ڈیڑھ سال کا ہوا۔ آیا حالتِ حمل میں نکاح جائز ہے یا کہ نہیں۔

۱۵ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ۔ ۱۰ جنوری ۱۹۱۷ء

بندو خان ولد عمر خان قوم پٹھان ساکن نوری دروازہ شہر آگرہ

الجواب

صورتِ مسئولہ میں مسماۃ رحیمن کا نکاح، اگر اس کا حمل علاوہ حبیب کے فی الواقع اس کے شوہر متوفی کا ہے، کسی غیر کا نہ تھا، حبیب کے ساتھ صحیح نہیں ہوا۔ لہٰذا بعد وضع حمل اس کے اختیار ہے جس کے ساتھ چاہے نکاح کرلے۔

چنانچہ شرح وقایہ میں ہے:

بطل نکاح حامل ثبت نسب حملها[۱] ۔فقط

(ترجمہ: جس حاملہ عورت کے حمل کا نسب ثابت ہے اس کا نکاح باطل ہے)

حررہ

العبد الراجی رحمة ربه القوی

محمد دیدار علی مفتی

جامع مسجد اکبرآباد

❁❁❁❁❁

---

[۱] شرح وقایہ جلد دوم صفحہ ۱۹ مطبوعہ مجتبائی دھلی

﴿فتویٰ نمبر......165﴾

سوال

ایک عورت کا نکاح ہوا۔ چند ماہ رہ کر باپ کے گھر چلی گئی۔ پھر پندرہ ماہ بعد خاوند کے گھر گئی تو حمل تھا۔ تین ماہ بعد دختر پیدا ہوئی۔ پھر وہ عورت بھاگ گئی اب اس کو (باپ) نے رخصت کیا ہے۔ شرعا اس کا نکاح رہا یا نہیں۔

عورت نے بھتیجے کا حمل بیان کیا ہے۔

۱۴ اپریل ۱۹۱۶ء

شیخ آگرہ نالی منڈی

الجواب

نکاح جائز رہا۔ اب وہ عورت جس نے زنا کا اقرار کیا ہے گناہ سے توبہ کرے۔ خاوند کی اطاعت کرے۔ نکاح میں خلل نہیں۔

محمد وحی علی ملیح آبادی

مدرس جامع کانپور

جواب صحیح ہے غلام حسین

الجواب

هو المصوب

بے شک نکاح میں کچھ نقصان نہیں۔ عورت کو توبہ چاہئے اور اس کے شوہر کو اختیار ہے اُس کو اپنی زوجیت میں رکھے۔ واللہ اعلم وحکمه احکم

المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنه

﴿فتوی نمبر...... 166﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسماۃ مریم کے والدین کا انتقال ہوگیا اور وہ بغرضِ پرورش اپنے بہنوئی مسمی رحمت کی سپردگی میں رہی۔ رحمت نے اس کا نکاح جبکہ وہ نابالغ تھی مسمی گلاب کے ساتھ کردیا۔ بعدہ وہ صرف اول شب ایک روز اپنے خاوند کے یہاں رہی۔ اس درمیان میں یعنی دو سال تک پھر کہیں نہیں گئی۔ وہ اپنے بہنوئی کے جہاں اس نے پرورش پائی تھی رہ گئی اور بالغ ہوئی۔ جب وہ بالغ ہوگئی تو اس کے خاوند نے طلاق دیدی اب استفتاء طلب امور ذیل ہیں۔

1۔ یہ کہ وہ اپنا نکاح بلا عدت گزارنے کے کسی دوسرے سے کرسکتی ہے یا نہیں؟ مہر واجب الادا ہے یا نہیں اور ہے تو کس قدر؟

2۔ یہ کہ مسماۃ مطلقہ اب بالغ ہوگئی ہے ہمراہ بہنوئی کے رہے یا اپنے حقیقی بھائی کے؟

3۔ یہ کہ مسماۃ اپنے شوہر کے بھائی کے ساتھ نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟

بینوا توجروا. حافظ تاج محمد ۱۲ دسمبر ۱۹۱۵ء

الجواب

هو الملهم للحق والصواب

☆ نابالغہ یعنی جس کو حیض نہ آتا ہو بعد خلوت تین مہینے تک عدت پوری کرے گی۔ اس سے پہلے نکاح نہیں ہوگا۔

قال اللہ تعالیٰ :

واللائی یئسن من المحیض من نساء کم الخ۱ .

---

۱ القرآن الحکیم : سورۃ الطلاق آیت : ۴

☆(ترجمہ: اور تمہاری عورتوں میں جنہیں (بڑھاپے کی وجہ سے) حیض کی امید نہیں رہی ہے' اگر تم کو (اس امر میں) شبہ ہو کہ ان کا کیا حال ہے تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔ اور یہی عدت ان عورتوں کی بھی ہے جن کو ابھی حیض آنا شروع نہیں ہوا)

☆1۔ جن عورتوں کو بوجہ صغر سنی کے یا کبر سنی کے حیض نہیں آتا ان کو تین مہینے عدت بیٹھنا چاہئے اور اگر اس درمیان میں حیض ہو گیا تو یہ میعاد ساقط اور تین حیض شمار کیے جائیں گے۔ قدوری میں ہے

کذلک الصغیرة اذا عدت بالا شهر ثم بلغت فعدتها بالحیض[1] .

(ترجمہ: اور نابالغہ کا بھی یہی حکم ہے جب وہ مہینوں کے ساتھ عدت گزار رہی ہو پھر اسی دوران بالغ ہو گئی ہو تو اس کی عدت حیض سے شمار ہو گی)

اور اس مدت کے قبل نکاح جائز نہیں۔

☆2۔ نکاحِ صغیرہ میں مہرِ مثل سے کم مقرر جائز نہیں۔ اشباہ میں ہے

(یجوز) النکاح باقل من مهر المثل الافی صغیرة یزوجها غیر الاب والجد[2]

(ترجمہ: مہرِ مثل سے کم مہر کے عوض نکاح جائز ہے لیکن نابالغہ عورت کی صورت میں جائز نہیں جب کہ باپ اور دادا کے علاوہ کوئی اور شخص نابالغہ کا نکاح کرے)

☆ اور اگر کم مہرِ مثل سے نکاح ہو گا تو مہرِ مثل شوہر سے دلایا جائے گا۔

---

[1] قدوری میں یہ عبارت نہ مل سکی البتہ جوھرہ نیرہ جلد ۱ صفحہ ۱۵۵ 'مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان کی عبارت یوں ہے:

وان حاضت الصغیرة قبل تمام عدتها استانفت العدة بالحیض سواء کان الطلاق بائنا او رجعیا

(ترجمہ: اگر عورت کے ختم ہونے سے پہلے نابالغ عورت کو حیض شروع ہو گیا وہ از سرِ نو حیض کے ساتھ عدت گذارے گی طلاق خواہ بائن ہو خواہ رجعی)

[2] الاشباہ والنظائر : جلد اول صفحہ ۲۵۲ مطبوعہ ادارة القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی

فإن الظاهر فيه النفوذ مع لزوم مهر المثل اشباه [1]

3۔ اب لڑکی بالغہ ہے وہ بھائی کے پاس رہے خواہ خواہر کے پاس اس کو اختیار ہے۔ بہنوئی غیر شخص ہے۔ اس کے پاس رہنا درست نہیں بلکہ بہنوئی سے پردہ کرے گی۔ اور شوہر کے بھائی سے نکاح درست ہے۔ بعد عدت کرسکتی ہے۔ ھکذا حکم الفقه. والله اعلم بالصواب

عاجز محمد رمضان عفی عنہ،

واعظ جامع مسجد آگرہ،

مورخہ ۱۴/ دسمبر/ ۱۹۱۵ء

✿✿✿✿✿

---

[1] غمز عیون البصائر مع الاشباہ والنظائر : جلد ۱ صفحہ ۲۵۲ ادراۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی

نوٹ: حضرت مولانا مفتی محمد رمضان رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کی نسبت الاشباہ والنظائر کی جانب فرمائی جب کہ یہ جزئیہ اس کی شرح میں ہے۔

﴿فتوی نمبر...... 167﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی اور صرف تین چار روز طلاق دیئے ہوئے گزرے تھے کہ چند لوگوں نے اس عورت کا دوسرا نکاح کسی اور شخص کے ساتھ پڑھا دیا۔ پس ایسا نکاح درست ہے یا نہیں؟ اور اگر درست نہیں ہے تو لوگوں پر جنہوں نے پیروی کر کے اور کوشش کر کے نکاح پڑھا دیا ہے کیا سزا ہے؟

شیر خان ولد احمد خان

۱۴ دسمبر ۱۹۱۵ء

الجواب

عورت مطلقہ کا عدت گزرنے سے پیشتر نکاح ناجائز ہے۔ ☆ اور جن لوگوں نے اس کام میں اعانت کی خواہ گواہ ہو کر یا وکیل ہو کر اگر عدت نہ گزرنے کا ان کو علم تھا تو سب گنہگار ہیں۔ توبہ لازم ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

عاجز محمد رمضان عفی عنہ

واعظ جامع مسجد آگرہ

۱۴ دسمبر ۱۹۱۵ء

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......168﴾

سوال

زوجہ عم نے اپنے شوہر کے لڑکے کو دودھ پلایا اب دختر زوجہ مذکور کی پیدا ہوئی۔ اس کا نکاح اپنے اس ابن الاخ سے جائز ہے یا نہیں؟

سائل: مولانا غلام محی الدین

امام مسجد شاہ جہاں پور

۱۵ مارچ ۱۹۱۶ء

الجواب

جس لڑکے کو دودھ پلایا' اس کا نکاح دودھ پلانے والی کی کسی دختر سے جائز نہیں۔ اور نہ اُس لڑکی کی اولاد سے۔☆ ہاں رضاعی بھائی کی بہن سے نکاح جائز ہے۔ هكذا فى الفقه

کتبہ المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......169﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ماموں کے انتقال کے بعد ممانی اور بھانجے کا نکاح درست ہے یا نہیں؟

سائل: واجد علی ٹپکا پور۔کان پور
۹شوال ۱۳۳۴ھ

الجواب

وھو الموفق للصواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علماء.

درست ہے۔

حررہ:

العبد الراجی رحمۃ ربہ

المفتی ابو محمد محمد دیدار علی مفتی

جامع مسجد اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر 170﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارے میں کے ایک ملاں صاحب نے بلا موجودگی و بلا اجازتِ ولی طفلِ نابالغ کا نکاح ایک لڑکی سے کر دیا۔ اور چونکہ اس نابالغ کا ولی کوئی بھی نہ تھا بعد بلوغ دختر اُن ہی ملاں صاحب نے اس دختر کا نکاح دوسرے شخص سے کر دیا۔ لہٰذا بڑے ملاں صاحب نے ان ملاں صاحب اور ان کے پیرو کی نسبت حکم عام کر دیا کہ ان کے سب کے نکاح ٹوٹ گئے اور ان ملاں صاحب کے پیچھے کوئی نماز نہ پڑھے۔

لہٰذا دریافت طلب یہ امر ہے کہ آیا پہلا نکاح طفلِ نابالغ کے ساتھ صحیح ہوا یا نہیں؟ اور صحیح نہیں ہوا تو دوسرے شخص سے اس دختر کے نکاح میں کیا ہرج رہا؟ اور نہیں رہا تو بڑے ملاں صاحب کا ان ملاں صاحب کی نسبت یہ تشدد کہ ان کے پیچھے نماز نہ ہوگی محض تعصب ہے؟

سائل: بلند خان، سکنہ مٹھیال، ضلع اٹک

حال ملازم پلٹن ۲۹ کمپنی ۴ ڈپو آگرہ

۱۹ ذیقعدہ ۱۳۳۴ھ

الجواب

بسم الله الرحمن الرحيم.

اللهم رب زدني علما.

صورتِ مسئولہ میں چونکہ طفل کا ولی وقتِ نکاح موجود ہی نہ تھا لہٰذا وہ نکاح صحیح نہیں ہوا۔ اس واسطے شرط صحتِ نکاحِ نابالغہ اور نابالغ کی ولی کا عاقد و متکفلِ عقدِ نکاح ہونا ہے۔ کمافی الدار المختار المطبوعہ مصر فی صفحہ 321

الولی شرط صحة نکاح صغیر[1]

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۴، صفحہ ۱۱۵ مطبوعہ بیروت

(ترجمہ: ولی نابالغ کے نکاح کے درست ہونے کے لیے شرط ہے)

قال الشامی رحمہ اللہ :

قولہ صغیر الموصوف محذوف ای شخص صغیر الخ فیشمل الذکر والانثی[1]

(ترجمہ: لفظ صغیر صفت ہے اس کا موصوف محذوف ہے اصل عبارت "شخص صغیر" ہے لہٰذا یہ عبارت لڑکے اور لڑکی دونوں کو شامل ہے)

چنانچہ درمختار ہی میں بعد عبارتِ مذکورہ یہ کلیہ مسطور ہے

☆ **والا صل ان کل من تصرف فی مالہ لہ تصرف فی نفسہ و مالا فلا**[2]

☆ (ترجمہ: قاعدہ یہ ہے کہ جس شخص کو نابالغ کے مال میں تصرف کی اجازت ہے اسے اس کی ذات میں بھی تصرف کی اجازت ہے۔ اور جسے مال میں تصرف کی اجازت نہیں اسے اس کی ذات میں تصرف کی اجازت بھی نہیں ہے)

اور جب نکاح منعقد ہی نہیں ہوا تو اُن ملاں صاحب نے اگر اُس دختر کا دوسری جگہ نکاح کر دیا کوئی حرج نہیں ۔ البتہ بغیر موجودگیِ ولیِ طفلِ نابالغ انہوں نے نکاحِ اول میں غلطی کی ۔ لہٰذا اگر جان بوجھ کر کی تو لوگوں کو دھوکہ میں ڈالنے کے گنہگار رہے ۔ اللہ معاف کرے اور اگر نکاحِ اول بوجہ ناواقفی پڑھا دیا اور پھر بعد معلوم کرنے اس بات کے' کہ بغیر ولی کے نکاح نہیں ہوتا' دوسرا نکاح پڑھا دیا' گنہگار بھی نہیں ہوئے ۔ لہٰذا بڑے ملاں صاحب کا بلاوجہ ان پر اتنا تشدد کرنا ظلم صریح ہے ۔ واللہ اعلم

محمد دیدار علی

مفتی مسجد جامع اکبر آباد

❁❁❁❁❁

---

[1] رد المحتار : جلد ۴ صفحہ ۱۱۵ مطبوعہ بیروت

[2] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۴ ' صفحہ ۱۱۵ ' ۱۱۶ ' مطبوعہ بیروت

﴿فتویٰ نمبر...... 171﴾

سوال

میری والدہ نے جب میں نابالغ تھی نکاح کر دیا۔ اور پانچ برس سے شوہر لاپتہ ہے۔ اب میں بالغہ ہوں اور اس نکاح سے خوش نہیں ہوں۔ دوسرا نکاح کرتی ہوں شرعاً مجھ کو اختیار ہے یا نہیں۔

۱۲ اپریل ۱۶ء حمیدن ساکن چھڑی مارٹولہ

الجواب

هو المصوب

جس نابالغہ کا نکاح ماں نے اپنی ولایت سے کیا ہے اس کو وقت بالغ ہونے کے اختیار ہے کہ اس نکاح کو فسخ کردے اور علاوہ اب شوہر کا حال بھی عرصہ پانچ سال سے نہیں معلوم ہے۔ لہٰذا سخت ضرورت کے وقت حاکم سے اجازت لے کر دوسرا نکاح کرسکتی ہے۔ بزازیہ میں ہے۔

القاضی إذا زوجهما ثم بلغا لهما الخيار فی الصحيح وبه يفتی لقصور الشفقة وكذا فی الأخ والام [1]

(ترجمہ: قاضی نے نابالغ لڑکے لڑکی کا نکاح کیا پھر وہ بالغ ہوئے تو ان دونوں کو صحیح قول کی رو سے نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہے اور فتوی اسی قول پر ہے کیوں کہ اس میں شفقت کم ہوتی ہے اور اسی طرح بھائی اور ماں کے نکاح کرنے کی صورت میں بھی بلوغ کے بعد ان کو فسخ کا اختیار رہوتا ہے)

قال مالك والاوزاعی الی اربع سنين فينكح عرسه بعده كما فی النظم فلو افتی به فی موضع الضرورة ينبغی ان لا باس به علی ما نحن [2]

☆ (ترجمہ: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عورت چار سال تک انتظار کرے۔ اس کے بعد نکاح کرے۔ جیسا کہ النظم میں ہے۔ لہٰذا اگر ضرورت کے مقام پر اس قول کے مطابق فتوی دے تو کوئی تو حرج نہیں ہونا چاہیے)

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

---

[1] الفتاوی البزازیة علی هامش الفتاوی العالم گیریه جلد ۴ ص ۱۵ مطبوع مصر

[2] جامع الرموز: جلد صفحه مطبوعه

﴿فتویٰ نمبر......172﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ ایک لڑکی سنِ بلوغیت کو پہنچ چکی ہے ۔اور اس کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کا باپ پردیس میں ہے اور وہ اپنے بھائی کے پاس رہتی ہے اور بھائی بھی اس کا بالغ ہے اور بھائی اس کا چاہتا ہے کہ کسی نیک مسلمان لڑکے کے ساتھ اپنی ہمشیرہ کا عقد نکاح کر دوں ۔لہٰذا دریافت کیا جاتا ہے کہ عدم موجودگی اس کے باپ کی بہ ولایت اس کے بھائی کے عقدِ نکاح شرعی ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب

لڑکی چونکہ بالغ ہے اس واسطے باپ کی موجودگی کی ضرورت نہیں۔

مولوی منور شاہ

الجواب

شیخین کے نزدیک بلاشبہ عاقلہ بالغہ کا نکاح اس کی رضامندی سے اگر وہ چاہے بغیر ولی ہو سکتا ہے۔

کما فی شرح الوقایة :

اعلم ان الحرة العاقلة البالغة اذا زوجت نفسها فعند ابی حنیفة و ابی یوسف رحمهما الله تعالیٰ ینعقد[1] ۔

(ترجمہ: آزاد عاقل اور بالغ عورت جب اپنا نکاح کر لے' تو حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نکاح منعقد ہو جاتا ہے) فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی مفتی جامع مسجد اکبر آباد

✿✿✿✿✿

[1] شرح الوقایہ: جلد ۲ صفحہ ۲۱، ۲۲، مطبوعہ مطبع مجتبائی دھلی

﴾فتویٰ نمبر......173﴿

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلے میں کہ زید کی لڑکی بالغ کا بعد انتقالِ زید کے اس کے حقیقی بھائی نے اپنے خالہ زاد برادر سے اپنی بھتیجی کی شادی کردی جو کہ لڑکی منکوحہ مذکورہ کا چچا ہے۔ اور لڑکی نکاح سے پہلے اس سے رضامند نہ تھی۔ اس کے تایا اور اس کی ماں نے جبراً نکاح کردیا۔ بعد نکاح کے دو مرتبہ اپنے خاوند کے گھر بھی اپنی خوشی سے گئی۔ لیکن اب اس کو اس کے گھر جانے سے قطعی انکار ہے کیوں کہ منکوحہ کی ہم عمر لڑکیاں طعنہ وتشنیع کرتی ہیں اور ہم لوگوں کو بھی اس کی جان کا خوف واندیشہ ہے۔ اس صورت میں کس طرح فیصلہ ہونا چاہیے؟

الجواب

هو الموفق للصواب

بسم الله الرحمن الرحيم.

اللهم رب زدني علما

☆ صورتِ مسئولہ میں اگر دخترِ بالغہ کے ☆ چچا نے اور تایا اور ماں نے بغیر اذن واجازتِ لڑکی باوصف انکارِ صریحِ دخترِ مذکور یا آ وازروتی ہوئی دخترِ مذکور کے نکاح کردیا' وہ نکاح صحیح نہیں ہوا۔ اس واسطے کہ بعد البلوغ ولی کی ولایت نکاح کی بالجبر باقی نہیں رہتی۔

كما في الدر المختار

و لا تجبر البالغة البكر على النكاح لانقطاع الولاية بالبلوغ [1]

(ترجمہ: بالغ اور باکرہ عورت کو نکاح پر مجبور نہ کیا جائے کیوں کہ بالغ ہونے پر نکاح پر جبر کی ولایت ختم ہوجاتی ہے)

☆ ہاں البتہ اگر اولیاءِ موجودہ سے ولیِ اقرب نے اس سے جب اس شخص کا ذکر کر کے جس کے ساتھ

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۴ صفحہ ۱۱۸' ۱۱۹ مطبوعہ در الاحیاء التراث العربی بیروت

نکاح کرنا چاہتے تھے اذن نکاح طلب کیا ☆ دخترِ مذکورہ ہنس پڑی یا چپ ہو گئی ہے تو بے شک اس کا ہنسنا اور سکوت، چونکہ قائم مقامِ اذن رکھا گیا ہے۔ نکاح صحیح ہو گیا۔

کما فی الهداية :

فاذا استاذ نها الولی فسکتت او ضحکت فهو اذن [1]

(ترجمہ: ولی نے لڑکی سے اجازت طلب کی وہ خاموش رہی یا ہنس پڑی، تو یہ اذن شمار ہو گا)

اس واسطے کہ سکوت اور ضحک رضامندی پر دال ہے اور شرطِ صحتِ نکاحِ بالغہ اس کی رضامندی ہی ہے۔

چنانچہ ہدایہ میں ہے:

و ینقد نکاح الحرة العاقلة البالغة برضائها [2]

(ترجمہ: آزاد اور بالغ عورت کا نکاح اس کی اپنی رضامندی سے منعقد ہو جاتا ہے)

اور صورتِ مذکورہ میں تو شوہر کے گھر پر برضا و رغبت چلا جانا صراحتاً اس کی رضا پر دال ہے اور اب اس کے انکار کی وجہ بجز طعن و تشنیع بے سمجھ عورتوں کی، جو یہ سمجھ کر مطعون کرتی ہیں کہ خالہ زاد بھائی کے ساتھ نکاح ہو گیا اور کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ ☆ لہٰذا اس کا نکاح بلا تکلف صحیح اور اس کو خوفِ خدا کر کے اپنے شوہر کے گھر جانا ضروری ہے۔ اور عورتوں کو لازم ہے کہ وہ ایسے خیالِ باطل سے، یعنی خالہ زاد بھائی کے ساتھ نکاح کے برا سمجھنے سے، توبہ کریں۔ اگر وہ اس نکاح کو جو شرعاً قطعاً جائز اور حلالِ قطعی ہے حرام سمجھیں گی اور اس کو مطعون کریں گی خوف ہے کہ ان کے نکاح ٹوٹ جاویں گے اور بوجہ حرام سمجھنے حلالِ قطعی کے کافر ہو جاویں۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی مفتی جامع مسجد اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[1] الهدايه : جلد ۳ صفحه ۳۴ اداره القرآن والعلوم الاسلاميه كراچی

[2] الهدايه : جلد ۲ صفحه ۳۱۳ مطبوعه : مكتبه شركت علميه، ملتان

﴿فتویٰ نمبر......174﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نابالغہ کا عقد زید سے ہوا اور دو گواہان نے ہندہ سے اجازت نکاح کی لی اور اس کے باپ قدرتی سے کوئی اجازت نہیں لی اور ہندہ کا باپ جلسہ عقد میں موجود تھا ایسی صورت میں نکاح ہوا یا نہیں۔ بینوا وتوجروا

سائل حافظ علی آگرہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما۔

جب تک باپ کی اجازت صراحۃً یا دلالۃً نہ پائی جائے ہندہ کا نکاح صورتِ مسئولہ میں صحیح نہیں ہوگا اگر باپ جائز کہے جائز رہے گا اور اگر باپ جائز نہ رکھے غیر معتبر رہے گا۔ کما فی الدر المختار :

فلو زوج الا بعد حال قیام الاقرب توقف علی اجازته[1]

☆(ترجمہ: اگر ابعد ولی نے ولیِ اقرب کی موجودگی میں نابالغ کا نکاح کردیا تو وہ ولیِ اقرب کی اجازت پر موقوف رہے گا)

قال الشامی :

قوله توقف علی اجازته تقدم ان البالغة لو زوجت نفسها غیر کفؤ فللولی الاعتراض ما لم یرض صریحا او دلا ته کقبض المهر و نحوه فلم یجعلوا سکوته اجازة والظاهر ان سکوته ههنا کذلک فلا یکون سکوته اجازة لنکاح الا بعد و ان کان حاضرا

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۱۱۴ دار احیاء التراث العربی بیروت

فی مجلس العقد ما لم یرض صریحا او دلالة تامل۔ا فقط

(ترجمہ:قولہ:اس کی اجازت پر موقوف رہے گا' پہلے گذر چکا ہے کہ☆اگر بالغ عورت نے اپنا نکاح غیر کفو میں کرلیا تو ولی کو اس وقت تک اعتراض کا حق حاصل ہے جب تک کہ وہ صراحت کے ساتھ یا دلالت کے ساتھ اپنی رضامندی کا اظہار نہ کردے مثلاً مہر موصول کرلے وغیرہ۔فقہاء نے ولی کے سکوت کو اجازت قرار نہیں دیا۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے سکوت کا حکم اس مقام پر ویسے ہی ہے۔☆لہٰذا ولی اقرب کا سکوت ولی اقرب کے نکاح کی اجازت شمار نہ ہوگا اگرچہ وہ نکاح کی مجلس میں موجود ہو۔جب تک صراحت یا دلالت کے ساتھ اس نکاح پر رضامندی کا اظہار نہ کردے)

حررہ:

العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی مفتی وواعظ

جامع مسجد اکبرآباد

❁❁❁❁❁

ا۔ ردالمحتار جلد ۴ صفحہ ۱۱۴ دار احیاء التراث العربی بیروت

﴿فتویٰ نمبر......175﴾

سوال

بغیر صریح رضامندی وکیل نے نکاح بالغہ کو غیر کفو سے کردیا۔اس کی ماں اور ماموں اور ماں کا چچازاد بھائی ہے۔ان میں سے کس کو حق فسخ حاصل ہے؟اور سکوت عورت کا ایسے موقع پر رضامندی سمجھا جائے گا؟

۱۹ اپریل ۱۶ء

نئی بستی

خلاصة الجواب

وکالت صحیح نہیں۔باکرہ بالغہ کا سکوت بغیر نطقِ صریح اجازت نہیں ہے۔

ولا بد من النطق جامع الفصولين[۱]

☆ چچازاد بھائی ماں (کی نسبت) ولی اقرب ہے۔

☆ غیر کفو سے نکاح میں سکوت رضامندی نہیں۔

فسکتت مقالا لا یکون رضا و قیل فی قول ابی حنیفة یکون رضا ان کان الاب او الجد والا لا[۲].

---

[۱] جامع الفصولين : جلد ۲ صفحه ۱۳۸ مطبوعه دار الاشاعة العربية کوئٹه

نوٹ: اصل عبارت یوں ہے۔

السکوت وهو رضا فی مسائل منها سکوت البکر عن استئمار الولی قبل التزویج وبعدها لو زوجها الولی حتی لو زوجها الجد مع قیام الأب لا یکون سکوتها رضا

(ترجمہ: خاموش رہنا کئی ایک مسائل میں رضا شمار ہوتا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ ولی اقرب نکاح کرنے سے پہلے یا نکاح کردینے کے بعد نکاح کے بارے میں مشورہ طلب کرے وہ خاموش رہے تو یہ رضا شمار ہوگی۔اور اگر ولی ابعد مثلاً دادنے باپ کی موجودگی میں باکرہ کا نکاح کیا تو اب خاموش رہنا رضا شمار نہ ہوگا) (اس صورت صراحتاً نطق کے ساتھ اجازت درکار ہے)

[۲]

(ترجمہ: اجنبی نے باکرہ بالغہ کا نکاح کیا وہ خاموش رہی تو یہ خاموشی رضا نہ ہوگی۔ایک قول کی رو سے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق اگر نکاح کرنے والا باپ یا دادا ہو ہوتو پھر اس کی خاموشی رضا ہوتی ہے اور اگر یہ یعنی باپ دادا نہ ہوں تو خاموشی رضا نہیں ہوگی)

ولی اقرب کو نکاح فسخ کردینے کا حق حاصل ہے۔حامدیہ میں ہے

فإذا نحكته بلا رضا وليها فرق القاضي بينهما بطلب الولي[1]

☆(ترجمہ: عورت نے ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفو میں نکاح کرلیا تو ولی کے مطالبہ پر قاضی ان دونوں کے درمیان تفریق کردے گا)

المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

❁❁❁❁❁

---

[1] تنقیح الفتاوی الحامدیہ جلد اول صفحہ ۲۱ مطبوعہ مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر...... 176﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس صورت میں کہ زید نے ہندہ کو جو ایک سال سے بیوہ ہے دھوکہ دے کر اپنے مکان پر بلالیا۔ ہندہ کی عدمِ علمیت میں زید نے قاضی سے اپنا نکاح پڑھوالیا۔ ہندہ کہتی کہ مجھ کو یہ نکاح منظور نہیں۔ اور نہ وقتِ نکاح کے مجھ کو اس کا علم ہوا۔ ایسی صورت میں ہندہ کا نکاح صحیح ہوا یا نہیں؟

۶ مئی ۱۸ اء محمد عبدالہادی مدرس مدرسہ جنگی آگرہ

الجواب

بسم الله الرحمن الرحيم. اللهم رب زدني علما

☆ بلا اطلاع اور اجازتِ عورت کے جو نکاح کرلیا جائے اس نکاح کو نکاحِ فضولی کہتے ہیں۔ ☆ اگر بعد اطلاع کے عورت اس کو جائز رکھے اور اس پر راضی ہو صحیح ہو جائے گا۔ ورنہ کالعدم اور باطل سمجھا جائے گا۔

چنانچہ صفحہ ۵۶ شرح وقایہ مطبوعہ نول کشور میں ہے

ووقف نكاح فضولي اوفضولين على الاجازة اى يجوز ان يكون من جانب الزوج فضولي او من جانب المراة فضولي فيتوقف على اجازتهما[1]

(ترجمہ: فضولی یعنی وہ شخص جس کو نکاح کرنے کا کوئی اختیار نہ ہو اگر وہ ایک طرف سے ہو یا دونوں جانب سے فضولی ہوں تو وہ نکاح اجازت پر موقوف ہوتا ہے۔ یعنی ممکن ہے کہ خاوند کی جانب کی طرف سے فضولی نکاح کرے یا عورت کی طرف فضولی اس کا نکاح کسی سے کردے تو وہ دونوں کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے)

اور چونکہ صورتِ مسئولہ میں رضامندی اور اجازتِ عورت قطعاً مفقود ہے بلکہ دھوکہ بازی عاقد کی ظاہر ہے لہٰذا یہ نکاح بالکل صحیح نہیں ہوا۔ فقط

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی

ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی مسجد جامع اکبرآباد

---

[1] شرح الوقایه: جلد ثانی صفحه ۳۰، مطبوعه مجتبائی دهلی

﴿فتویٰ نمبر...... 177﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس امر میں کہ ایک نابالغہ کا نکاح اس کی ماں کی اجازت سے ہوا۔ باپ اس کا زندہ موجود ہے۔ باپ کی اجازت سے نہیں ہوا۔ لڑکی اب بالغ ہوگئی ہے۔ اس نے بوجہ اس کے کہ شوہر و مادرِ شوہر زمانہ نابالغی میں بدسلوکی بے رحمی سے ظالمانہ طور سے برتاؤ کرتے رہے اور مار پیٹ کرتے تھے وقتِ بلوغ اس نے فوراً نکاح اپنا فسخ کر دیا۔ یہ فعل اس کا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اس کا اختیار شرعاً نکاح توڑنے کا ہے یا نہیں؟

۱۹ ذی قعدہ ۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

موجودگیِ باپ میں جو نکاح ماں کی اجازت سے صغیرہ کا ہو جائے وہ باپ کی رضا مندی پر موقوف رہتا ہے۔ اگر باپ بعد نکاح یا وقتِ نکاح راضی ہو جائے وہ نکاح معتبر ہوگا۔ ورنہ کالعدم سمجھا جائے گا۔ اس واسطے کہ باپ ولیِ اقرب ہے۔ اور صفحہ ۳۴۱ جلد ثانی درمختار مطبوعہ علی ہامش ردالمحتار مصری میں ہے۔

و للولی الابعد التزویج بغیبة الاقرب فلو زوج الابعد حال قیام الاقرب توقف علی اجازته [1]

(ترجمہ: ولیِ اقرب کی عدم موجودگی میں ولیِ ابعد کو نابالغ کا نکاح کرنے کا اختیار رہے۔ اور اگر ولیِ ابعد نے اقرب کے موجود ہونے کے باوجود نکاح کر دیا تو وہ نکاح ولیِ اقرب کی اجازت پر موقوف ہوگا)

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۲ ، صفحہ ۳۴۱ ، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

☆ اور باوجود موجود ہونے کے مجلسِ عقد میں اگر رضامندیٔ ولیِ اقرب یعنی باپ کی صورتِ مذکورہ میں صراحۃً یا دلالۃً نہیں پائی گئی تھی اور نہ اب تک باپ اس نکاح سے راضی ہے۔ مگر کسی وجہ سے ساکت ہے تو مجرد سکوت دلیلِ رضامندی نہیں ہوسکتا۔ اور وہ نکاح ناجائز ہی رہے گا۔ چنانچہ اسی صفحہ مذکورہ درمختار کی شرح ردالمحتار میں ہے:

قوله توقف على اجازته تقدم ان البالغة لوزوجت نفسها غير كفؤ فللولى الاعتراض مالم يرض صريحا او دلالة كقبض المهر و نحوه فلم يجعلوا سكوته اجازة والظاهر ان سكوته ههنا كذالك فلا يكون سكوته اجازة لنكاح الابعد و ان كان حاضرا فى مجلس العقد مالم يرض صريحا او دلالة [1]

(ترجمہ: قولہ: ولیِ ابعد کا کیا ہوا نکاح ولیِ اقرب کی اجازت پر موقوف رہتا ہے۔ پہلے گذر چکا ہے کہ اگر بالغ عورت اپنا نکاح غیر کفو میں کرے تو وہاں تو اعتراض کا اختیار اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک کہ وہ صراحتاً یا دلالتاً راضی نہ ہوجائے۔ دلالتاً رضامندی کی مثال مہر وصول کرنا وغیرہ ہے۔ فقہائے اسلام نے اس کے سکوت کو رضامندی قرار نہیں دیا۔ اور ظاہر ہے کہ اس مقام پر اس کی رضامندی کا حکم بھی یہی ہے۔ لہٰذا اس کا سکوت ولیِ ابعد کے نکاح کی اجازت نہ ہوگا اگرچہ وہ نکاح کی مجلس میں حاضر ہو۔ جب تک وہ صراحت یا دلالت کے اعتبار سے راضی نہ ہوگا نکاح جائز نہ ہوگا)

☆ اور اگر بالفرض نکاح صحیح مان بھی لیا جائے تو علاوہ باپ اور دادا کے دوسرے اولیاءِ نکاح کا کیا ہوا نکاح اگر غیر کفوء میں کیا جائے یا بہت کم مہر کے ساتھ اس مہر سے جو ان کے قبیلہ میں مروج ہے کر دیا جائے تو وہ نکاح بھی صحیح نہیں ہوتا۔ ہاں اگر مہرِ مثل کے ساتھ کفوء میں کر دیا جائے تو صحیح ضرور ہوجائے گا مگر اس صغیرہ کو بالغ ہوتے ہی اگر اس نکاح سے ناراض ہو اختیارِ فسخِ نکاح ہے۔ اور بالغ ہوتے ہی دو مسلمان مرد یا ایک مرد دو مسلمان عورتوں کو گواہ کر کے کہہ دے کہ میں اس نکاح کو توڑتی ہوں اور فسخ کرتی ہوں۔ اور پھر قاضی یعنی حاکمِ

[1] رد المحتار: جلد ۲، صفحہ ۳۴۱، مطبوع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

شریعت سے حکمِ فسخ حاصل کرلے۔ بلاحکمِ قاضی حکمِ فسخ تمام نہیں ہوتا۔

چنانچہ صفحہ ۳۳۱ درمختار میں ہے:

وإن كان المزوج غير ههما لا يصح النكاح من غير كفو او بغبن فاحش اصلا وان كان من كفوء و بمهر المثل صح و لكن لهما خيار الفسخ بالبلوغ او العلم بالنكاح بعده بشرط القضاء للفسخ[1] انتهى مختصرا.

(ترجمہ: اگرنابالغ کا غیر کفو میں نکاح کرنے والا یا غبنِ فاحش سے نکاح کرنے والا باپ اور دادا کے سوا کوئی اور رشتہ دار ہوتو نکاح بالکل درست نہیں۔ اور اگر نکاح کفو میں ہو اور مہرِ مثل کے ساتھ ہوتو نکاح درست ہوتا ہے لیکن بلوغ کے ساتھ یا بلوغ کے بعد نکاح کا علم ہونے کے ساتھ ہی ان کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار رہتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ شرط ہے کہ قاضی ان کے نکاح کو فسخ قرار دے)

حررہ:
العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبرآباد

❁❁❁❁❁

[1] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۲ ، صفحہ ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، مطبوع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر......178﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ ایک دخترِ نابالغہ کا نکاح اس کے نانا نے باوجود ہونے باپ کے بغیر اجازت وبغیر رضامندیِ باپ کے ایک لڑکے سے کردیا۔اور باپ نے جس وقت معلوم کیا نارضامندی ظاہر کر دی۔اور لڑکی نے وقتِ بلوغ اس نکاح کو خود بھی نامنظور کیا۔دختر تاہنوز باکرہ ہے۔بس اس صورت میں شرعا کیا حکم ہے؟

طالب علی قصبہ آوریا ضلع اٹاوہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

چونکہ جدِ فاسد یعنی نانا ابعد ترینِ اولیا ہے باوجود موجود ہونے باپ کے بولایتِ نانا جو نکاح ہوا وہ ہرگز صحیح نہ ہوگا تاوقتیکہ باپ نابالغہ کا اس نکاح کو جائز نہ رکھے اور اس نکاح سے رضامند نہ ہو۔☆اس واسطے کہ باوجود موجود ہونے ولیِ اقرب کے اگر ولیِ ابعد نکاح کردے تو اس نکاح کی صحت ولیِ اقرب کی رضامندی پر موقوف رہتی ہے۔

چنانچہ صفحہ ۳۰۳ جلد اول فتاوی عالمگیریہ میں ہے:

و ان زوج الصغیر أو الصغیرة ابعد الاولیاء فان کان الاقرب حاضرا و هو من اهل الولایة توقف نکاح الابعد علی اجازته[1]

(ترجمہ:اگرچھوٹے یعنی نابالغ لڑکے یا چھوٹی یعنی نابالغ لڑکی کا نکاح ابعد ولی یعنی حقدار ہونے کی ترتیب کی رو سے دور کے ولی نے کردیا تو اس کے متعلق حکم یہ ہے کہ اگر ولیِ اقرب یعنی حقدار ہونے کی ترتیب کی رو سے

---

[1] الفتاوی العالم گیریہ مع ترجمہ اردو جلد ۶ صفحہ ۱۱۰ المکہ پریس شاع فاطمہ لاہور

قریب کا ولی حاضر تھا اور وہ ولی ہونے کا اہل تھا تو ابعد ولی کا نکاح کر دینا ولیِ اقرب کی اجازت پر موقوف ہوگا[1])

☆ ہاں البتہ اگر ولیِ اقرب اہلِ ولایت بوجہ صغیر السن یا مجنون ہونے کے نہ ہو یا اتنی دور پردیس میں چلا گیا کہ اس کے بلانے اور آنے تک کفو کے آدمی جو پیامِ نکاح لایا ہے یا مجرد رائے ولیِ اقرب دریافت کرنے تک فوت ہو جائے اور ہاتھ سے نکل جائے تو بے شک ولیِ ابعد کا کیا ہو صحیح ہو سکتا ہے۔

کما فی الصفحة المذکورة للعالم گیریه

و ان لم یکن من اهل الولایة بان کان صغیرا او کبیرا مجنونا جاز و ان کان الاقرب غائبا غیبة منقطعة جاز نکاح الابعد کذا فی المحیط[2]

(ترجمہ: اور اگر اقرب ولی، ولی قرار پانے کا اہل نہ تھا مثلاً یہ کہ وہ خود نابالغ تھا یا وہ بالغ اور مجنون تھا تو ابعد ولی کا نکاح کر دینا جائز ہے اور اگر اقرب ولی غائب تھا اور اس کی غیبت منقطعہ تھی تو ابعد ولی کا نکاح کر دینا جائز ہے)

اقول و هکذا فی جمیع کتب الفقه

(ترجمہ: میں کہتا ہوں فقہ کی تمام کتابوں میں اسی طرح ہے)

و ایضا فیه

(ترجمہ: اسی فتاوی عالم گیریہ میں ہے)

قال شمس الائمه السرخسی و محمد بن الفضل الاصح انه مقدر بفوات الکفو الحاضر الخاطب الی استطلاع رایه و هذا حسن کذا فی التبیین و علیه الفتوی کذا فی جواهر الاخلاطی[3].

---

[1] ترجمه الفتاوی العالم گیریه جلد ۲ صفحه ۱۱۱ ایضا

[2] الفتاوی العالم گیریه مع اردو ترجمه جلد ۲ صفحه ۱۱۰ المکه پریس شاع فاطمه لاهور

[3] الفتاوی العالم گیریه مع ترجمه اردو جلد ۲ صفحه ۱۱۰ المکه پریس شاع فاطمه لاهور

(ترجمہ: شمس الائمہ السرخسی اور محمد بن الفضل کا قول یہ ہے کہ اصح حکم کے بموجب غیبتِ منقطعہ کی مقدار یہ ہے کہ اس غائب شخص کی رائے حاصل کرنے تک موجود کفو ہے یعنی نکاح کا پیغام دینے والا موجودہ شخص جو کفو قرار پاتا ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور یہ قول زیادہ اچھا ہے تبیین۔ اور اسی مذکورہ حکم پر فتوی ہے جواہر اخلاطی [1])

مگر صورتِ سوال سے ظاہر ہے کہ باپ جو ولیِ اقرب ہے اہلِ ولایت ہے اور نیز غائب بغیبۃ منقطعۃ بھی نہ تھا۔ بوجہ ناجائز رکھنے باپ کے نکاح مذکور قطعاً صحیح نہ ہوا۔ اور اگر بالفرض والتقدیر باپ کا عند العقد غائب بغیبتِ منقطعہ ثابت بھی ہو جائے تو بدیں وجہ نکاحِ ابعد صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تو نابالغہ کو بالغہ ہوتے ہی اختیارِ فسخِ نکاح ہے کہ وہ بالغ ہوئی ہے جب خونِ حیض دیکھے اسی وقت دو عاقل بالغ مسلمانوں کو گواہ کر کے کہہ دے کہ میں ابھی بالغ ہوئی ہوں اور ولیِ ابعد کے نکاح کئے ہوئے کو فسخ کرتی ہوں۔ میں اس نکاح سے راضی نہیں۔ بعدہ قاضی یعنی حاکمِ شریعت سے بغرضِ احتیاطِ ظاہری حاکمِ عدالت سے حکم فسخ نکاح حاصل کر کے پھر دوسری جگہ جہاں چاہے نکاح کر لے۔ لہٰذا بغیر حکمِ قاضی نکاح ہرگز فسخ نہ ہوگا کما فی صفحہ ۳۰۴ من العالم گیریۃ

و ان زوجهما غير الاب والجد فلكل واحد منهما الخيار اذا بلغ ان شاء اقام على النكاح و ان شاء فسخ و هذا عند ابی حنيفة و محمد رحمهما الله تعالىٰ و يشترط فيه القضاء [2].

☆ (ترجمہ: اور اگر ان دونوں کا نکاح باپ یا دادا کے علاوہ کسی ولی نے کیا تو ان میں سے ہر ایک کو بالغ ہونے پر اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اس نکاح کو قائم رکھے اور چاہے تو فسخ کر دے۔ یہ حکم امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے ہاں ہے اور اس میں یعنی خیارِ بلوغ سے نکاح فسخ کرنے میں قضاءِ قاضی یعنی حاکمِ مجاز کا فیصلہ شرط ہے [3])

☆ اگر بعد آنے حیض کے فوراً فسخ نکاح پر دو گواہ نہ کر لے گی اختیارِ فسخ پھر باقی نہیں رہے گا۔ اگر فسخ قبلِ

---

[1] ترجمہ الفتاوی العالم گیریہ جلد ٦ صفحہ ۱۱۱ المکہ پریس شاع فاطمہ لاہور

[2] الفتاوی العالم گیریہ مع ترجمہ اردو جلد ٦ صفحہ ۱۱۴ المکہ پریس شارع فاطمہ لاہور

[3] اردو ترجمہ الفتاوی العالم گیریہ جلد ٦ صفحہ ۱۱۵ المکہ پریس شارع فاطمہ لاہور

خلوتِ صحیحہ ودخول ہوا ہے تو مہر بذمہء زوج واجب نہ رہے گا اور یہ نکاح مثل عدمِ نکاح سمجھا جائے گا۔

کما فی صفحة ۳۰۵ من العالم گیریة

و اذا وقعت الفرقة بخیار البلوغ إن لم یکن الزوج دخل بها فلا مهر لها ووقعت الفرقة باختیار الزوج او باختیار المراة کذا فی المحیط۔[1]

☆(ترجمہ: جب خیارِ بلوغ سے علیحدگی ہوتو اگر اس کے خاوند نے اس عورت سے دخول نہ کیا تھا تو اس عورت کے لیے کوئی مہر نہیں خواہ وہ علیحدگی خاوند کے خیارِ بلوغ سے واقع ہوئی ہو یا عورت کے خیارِ بلوغ سے واقع ہوئی ہو محیط۔[2])

حررہ: العبدالراجی
ابومحمد محمد دیدارعلی الحنفی المفتی
فی جامع اکبرآباد

❁❁❁❁❁

۱۔ الفتاوی العالم گیریہ مع ترجمہ اردو جلد ۶ صفحہ ۱۲۰ المکہ پریس شارع فاطمہ لاہور

۲۔ اردو ترجمہ الفتاوی العالم گیریہ جلد ۶ صفحہ ۱۲۱ المکہ پریس شارع فاطمہ لاہور

﴿فتوی نمبر......179﴾

سوال

مردِفاسق صالحہ کا کفو ہے؟

۱۹اپریل ۱۹۱۶ء نئی بستی

الجواب

مردِفاسق کفو صالحہ کا نہیں۔

المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

﴿فتوی نمبر......180﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مہر کتنے قسم کے ہوتے ہیں؟ اور وہ کن کن صورتوں میں ادا ہونے چاہیں اور کس طرح سے؟

۲۹ جمادی الاولی ۳۶ھ

الجواب

بسم الله الرحمن الرحیم.

اللهم رب زدنی علما. اللهم ارنا الحق حقا و الباطل باطلاً.

مہر کی تین قسمیں ہیں' ایک مہرِ مؤجّل' دوسرا مہرِ معجّل جس کو عرف میں حق مہر عندالطلب کہتے ہیں۔

☆مہرِ مؤجّل اس کو کہتے ہیں جس کے پورا دینے پر زوجہ قبلِ طلاق شوہر کو مجبور نہیں کر سکتی۔ لہٰذا بعد طلاق اگر طلاق بعدِ دخول یا خلوتِ صحیحہ دی ہے' جبراً پورا مہر لے سکتی ہے۔ اور بعد موتِ شوہر کے خواہ وفاتِ شوہر قبلِ دخول یا خلوتِ صحیحہ ہو یا بعدِ دخول یا خلوتِ صحیحہ' مالِ شوہر سے پورا وصول کر سکتی ہے اور اگر طلاق قبلِ دخول واقع ہو تو نصف مہر لے سکتی ہے۔ چنانچہ صفحہ ۲۰۸ جلد ثالث ہدایہ میں ہے:

و من سمی مهرا عشرة فما زاد فعليه المسمى ان دخل بها اومات عنها لانه بالدخول يتحقق تسليم المبدل و به يتا كد البدل و بالموت ينتهى النكاح نهايته والشىء بانتهائه يتقرر ويتاكد فيتقرر بجميع مواجبه و ان طلقها قبل الدخول بها والخلوة فلها نصف المسمى[1]

(ترجمہ: جس نے دس درہم یا اس سے زائد جو مہر مقرر کیا اس پر مقرر حق مہر لازم ہے۔ بشرطیکہ اس نے اس عورت

---

[1] الهدایه جلد ۲ صفحه ۳۲۴ مکتبه شرکت علمیه ملتان

کے ساتھ جماع کیا ہو یا خاوند کی وفات ہو گئی ہو۔ کیوں کہ جماع کے ساتھ مبدل کو سپرد کر دینا ثابت ہو جاتا ہے اور خاوند کی موت سے نکاح اپنی انتہا تک پہنچ جاتا ہے اور جب کوئی چیز انتہا کو پہنچ جائے تو وہ پختہ اور تاکیدی ہو جاتی ہے لہذا وہ اپنے تمام لوازمات کے ساتھ پختہ ہو جائے گا۔ لیکن اگر جماع اور خلوت صحیحہ سے قبل طلاق دے تو مقررہ کردہ مہر کا نصف عورت کو دیا جائے گا)

☆ اور مہرِ معجّل یعنی مہر عند الطلب اس کو کہتے ہیں جس کے دینے پر خواہ کل معجّل ہو یا بعض عورت شوہر کو مجبور کر سکتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر شوہر عند الطلب ادا نہ کرے عورت کو حق حاصل ہے کہ شوہر کو اپنے پاس نہ آنے دے اور جب تک شوہر ادا نہ کرے اس کے گھر رہنے سے اور جانے سے انکار کر سکتی ہے۔ اور قبل وصول جہاں کہیں بھی رہے شوہر سے نان ونفقہ وصول کر سکتی ہے۔ بہ خلاف مہرِ مؤجّل کے کہ اس کو اگر شوہر ادا نہ کرے تو شوہر کے ساتھ جانے سے انکار نہیں کر سکتی اور اپنے پاس آنے سے منع نہیں کر سکتی۔ اور اگر شوہر کے گھر جانے سے انکار کرے گی تو جب تک شوہر کے گھر نہ آئے نان ونفقہ نہیں لے سکتی۔

چنانچہ صفحہ ۲۴۸ ہدایہ مطبوعہ مع الشروح الاربعۃ میں ہے:

و للمرأة ان تمنع نفسها حتى تاخذ المهر و تمنعه ان يخرجها اى يسافر بها ليتعين حقها فى البدل كما تعين حق الزوج فى المبدل فصار كالبيع و ليس للزوج ان يمنعها من السفر والخروج من منزله و زيارة اهلها حتى يوفيها المهر كلها اى المعجل لان حق الحبس لا ستيفاء المستحق وليس له حق الاستيفاء قبل الايفاء و لو كان المهر موجلا ليس لها ان تمنع نفسها لا ستقاطها حقها[1].

(ترجمہ: مہر کے وصول ہو جانے تک عورت کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو خاوند سے روک لے۔ نیز خاوند کو باہر سفر پر لے جانے سے روک سکتی ہے تا کہ بدل یعنی مہر میں کا حق متعین ہو جائے۔ جس طرح کہ مبدل میں خاوند کا حق متعین ہے۔ تو یہ عقد بیع کی مانند ہو گیا۔ مرد کو پورا مہر ادا کر دینے سے پہلے اختیار نہیں ہے کہ عورت کو

---

[1] الهدايه جلد ۲ صفحه ۳۲۴ مکتبه شرکت علميه ملتان

سفر سے، اپنے گھر سے باہر نکلنے سے اور اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کو روک دے۔ اس مہر سے مراد مہر معجّل ہے کیوں کہ مرد کو اپنا حق پورا حاصل کرنے کے لیے روکنے کا حق ہے۔ لیکن عورت کا حق ادا کیے بغیر اسے اپنا حق حاصل کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اور اگر مہر موجّل ہو تو وہ اپنے آپ کو مرد سے روک نہیں سکتی کیوں کہ اس صورت میں خود عورت نے اپنا حق ساقط کر رکھا ہے)

☆ اور تیسری قسم مہر کی مہرِ مثل ہے مہرِ مثل اس کو کہتے ہیں کہ عند العقد مہر کا ذکر نہ کیا جائے یا ذکر کیا جائے مگر مقدار معین نہ کی جائے یا اس شرط پر نکاح کیا جائے کہ مہر نہ دیا جائے گا یا ایسی چیز مہر میں معین کی جائے جو شرعاً مال نہ ہو جیسے شراب یا سور۔ تو اندریں صورت اگر طلاق بعد دخول دی جائے مہرِ مثل لازم ہوگا۔

چنانچہ صفحہ ۳۶۵ شامی مطبوعہ مصر میں ہے:

قال فی البدائع لو تزوجها علی ان لا مهر لها وجب مهر المثل بنفس العقد[1]

(ترجمہ: بدائع میں ہے اگر کسی شخص نے کسی عورت سے اس شرط پر نکاح کیا کہ اس کو مہر نہ ملے گا تو صرف عقدِ نکاح سے مہرِ مثل واجب ہو جاتا ہے)

و فی صفحه ۲۲۰ من الهدایه المطبوع مع الشروخ الاربعة:

و اذا زوج الرجل بنته علی ان یزوجه الآخر بنته او اخته لیکون احد العقدین عوضا عن الآخر فالعقد ان جائزان و لکل واحدة منهما مهر مثلها[2].

(ترجمہ: اگر کسی آدمی نے اپنی بیٹی کا نکاح اس شرط پر کر کے دیا کہ دوسرا شخص اپنی بیٹی یا بہن کا نکاح اس کے ساتھ کرے گا۔ اس طرح کہ دونوں عقد ایک دوسرے کے بدلے میں ہوں گے۔ تو دونوں عقد جائز ہیں اور ان بی بیوں میں سے ہر ایک کے لیے مہرِ مثل ہوگا)

قال صاحب العناية :

---

[1] رد المحتار جلد ۲ صفحه ۳۶۵ مطبوعه مکتبه رشیدیه کوئٹه

[2] الهدایه مع فتح القدیر و غیره جلد ۲ صفحه ۴۴۹ مطبوعه مصر

(ترجمہ: صاحبِ عنایہ نے فرمایا)

لانہ سمی ما لا یصلح صداقا و کل کان کذلک صح العقد فیہ و وجب مہر المثل کما اذا سمی الخمر والخنزیر۔[1]

(ترجمہ: کیوں کہ ان دونوں نے ایسی چیز کو مہر قرار دیا جو مہر بننے کی کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اور ہر وہ صورت جو ایسی ہو اس میں عقد درست ہوتا ہے اور مہرِ مثل واجب ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اگر شراب اور خنزیر کو مہر مقرر کرے)

اور مہرِ مثل کے یہ معنی ہیں کہ عورت کے باپ کے قبیلہ سے جو مہر اس کی بہنوں کا اور پھوپھیوں کا اور چچا کی بیٹیوں کا ہوگا وہی مہر اس کا مقرر کیا جائے گا۔

کما فی صفحہ ۲۴۶ من العنایۃ المطبوعہ علی ہامش الھدایۃ

اعلم ان مہر المثل یعتبر بعشیرتھا التی من قبل ابیھا کالا خوات والعمات و بنات الاعمام۔[2]

(ترجمہ: مہرِ مثل میں عورت کے اس خاندان کا اعتبار ہوگا جو اس کے باپ کی جانب سے ہوگا جیسا کہ بہنیں، پھوپھیاں اور چچازاد بہنیں)

اور اس صورت میں اگر شوہر طلاق بعد الدخول دے یا دونوں میں سے کوئی مرجائے تو شوہر پر ادائیگی پورے مہرِ مثل کی لازم ہوگی اور بعد الموت شوہر کے مال سے پورا مہرِ مثل ادا کیا جائے گا۔

چنانچہ صفحہ ۳۶۳ شامی مطبوعہ مصر میں ہے۔

استفتی الشیخ صالح بن المصنف من الخیر الرملی رحمھما اللہ عما لو طلبت المراۃ مہر مثلھا قبل الوطئ او الموت ھل لھا ذلک ام لا فاجابہ بما فی الزیلعی من ان مہر المثل یجب بالعقد ولھٰذا کان لھا ان تطالبہ بہ قبل الدخول فیتا کدو یتقرر بموت

---

[1] العنایہ علی ہامش فتح القدیر جلد ۲ صفحہ ۴۵۰ مطبوعہ مصر

[2] العنایۃ علی ہامش فتح القدیر جلد ۲ صفحہ ۴۷۰ مطبوعہ مصر

احدهما او بالدخول علی ما مرفی المهر المسمی فی العقد الخ و به جزم الکمال و ابن ملک و غیرهما و قد بسط ذلک فی الخیریة[1]

(ترجمہ: مصنف علیہ الرحمہ کے بیٹے شیخ صالح رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت خیر الدین رملی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ اگر عورت اپنا مہرِ مثل وطی یا خاوند کی موت سے پہلے طلب کرے تو کیا اس کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں؟ تو آپ نے ان کو جواب دیا کہ زیلعی میں ہے کہ مہرِ مثل صرف عقدِ نکاح سے واجب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس عورت کو دخول سے قبل اس کے مطالبہ کا حق حاصل ہے۔ پھر وہ مہرِ مثل زوجین میں سے کسی ایک کی موت یا دخول کے ساتھ موکد اور پختہ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ یہ عقدِ نکاح میں مقرر شدہ مہر کے بارے میں گذر چکا ہے۔ علامہ کمال اور علامہ ابن ملک وغیرہما رحمۃ اللہ علیہم نے اسی پر جزم فرمایا ہے۔ فتاوی خیریہ میں اس پر مبسوط کلام فرمائی ہے۔

اور ایسی صورت میں اگر طلاق قبل الدخول یا قبلِ خلوت صحیحہ دے دی جائے تو مہر بالکل ساقط ہو جاتا ہے اور بجائے نصف مہرِ مثل کے متعہ دینا لازم ہو جاتا ہے۔ کما فی الدر المختار فی صفحہ ۳۶۴

و تجب متعة لمفوضة و هی من زوجت بلا مهر طلقت قبل الوطی وهی درع و خمار و ملحفة لا تزید علی نصفه ای نصف مهر المثل[2]

☆ (ترجمہ: مفوضہ یعنی جس عورت کا نکاح مہر کے بغیر کیا گیا ہو اگر اسے وطی سے قبل طلاق ہو جائے تو اس کے لیے متعہ طلاق واجب ہو جاتا ہے اور متعہ طلاق ایک قمیص، ایک اوڑھنی اور ایک بڑی چادر ہوتی ہے۔ لیکن ان کی قیمت مہرِ مثل کے نصف سے زیادہ نہ ہو)

مگر ہمارے یہاں ہمارے عرف کے موافق متعہ میں ایک جوڑا دیں گے اور صاحب درمختار نے جو متعہ کی تفسیر درع اور خمار اور ملحفہ کے ساتھ کی ہے وہ رواج کے موافق ہے۔

کما هو ظاهر من الشامی حیث قال رحمه الله فی شرحه فی صفحه ۳۶۴ من الشامی

---

[1] رد المحتار — جلد ۳ صفحہ ۳۶۳ — مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

[2] الدر المختار علی هامش رد المحتار — جلد ۳ صفحہ ۳۶۴ — مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

قال فخر الاسلام رحمه الله هذه فی دیارهم امافی دیارنا فیزا د علی هذا ازار و مکعب کذا فی الدرایة[1] .

ترجمہ: امام فخر الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ ان کے علاقہ کا متعۂ طلاق ہے ہمارے علاقہ میں اس پر ایک تہبند اور ایک نقش ونگار والی چادر کا اضافہ کیا جائے گا)

حررہ:

العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

محمد دیدار علی الحنفی الرضوی المجددی

فی جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[1] رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۳۶۴ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر...... 181﴾

سوال

لفظِ مؤجّل کس طرح پر صحیح ہے؟ اور املاو معنے کیا ہوا؟ عام طور پر موجل کو جو باظہار واد بولتے ہیں یہ کیا ہے؟

سائل: قاضی جلال الدین ساکن ریاست دھول پور محلہ قاضی پاڑہ

۲۱ جمادی الأولی ۱۳۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

مہرِ مؤجل ہمزہ کے ساتھ اس مہر کو کہتے ہیں کہ عورت قبل از طلاق یا قبل از موت شوہر اس کی ادائیگی پر مجبور نہیں کر سکتی۔ اور معجّل اس کو کہتے ہیں جس کی ادائیگی پر جب چاہے شوہر کو مجبور کر سکتی ہے۔ موجل کا مصدر تاجیل اور معجّل کا تعجیل ہے۔

حررہ العبد الراجی رحمۃ ربہ

ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی،

مفتی جامع مسجد اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......182﴾

سوال

جب کہ برضامندیٔ جانبین تعدادِ مہر معین ہوچکی ہے تو اب قبل از ایجاب دولہا سے یوں کہنا ضرور ہے یانہیں کہ اس قدر مہر کی رقم تم کو منظور ہے؟

سائل: قاضی جلال الدین

ساکن ریاست دھول پور محلہ قاضی پاڑہ

۲۱/ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

ذکرِ مہر شرطِ جوازِ نکاح نہیں ہے۔ ☆ اگر بوقتِ عقد ذکرِ مہر معین کردیا جائے اور دولہا سے اس کی قبولیت کا اقرار لے لیا جائے تو وہی مہر لازم ہوجائے گا۔ ☆ اور اگر بلا ذکرِ مہر نکاح کردیا جائے جب بھی نکاح ہوجائے گا مگر اندریں صورت مہرِ مثل لازم ہوگا۔ ☆ بہر نہج نکاح تو اگر اس طرح بھی کیا جائے کہ عورت کہے کہ میں بلا مہر اپنے نفس کو تمہاری زوجیت میں دیتی ہوں۔ علیٰ ہذا کم از کم دو گواہوں کے سامنے مرد کہے کہ بلا مہر میں تم کو اپنے نکاح میں قبول کرتا ہوں۔ مہرِ مثل تو جب بھی بذمہ شوہر لازم ہوجائے گا اور نکاح بہر صورت منعقد ہو جائے گا۔ چنانچہ صفحہ ۲۰۴ ہدایہ مع الشروح الاربعۃ مصری کے جلد سوم میں ہے۔

و یصح النکاح و ان لم یسم فیه مهرا لان النکاح عقد الضمام و ازدواج لغة فیتم بالزوجین ثم المهرواجب شرعا ابانة لشرف المحل فلا یحتاج الی ذکره لصحة النکاح و کذا اذا تزوجها بشرط ان لامهر لها لما بینا۔[1]

---

[1] الهدایه مع فتح القدیر والعنایة وغیرهما جلد ۲ صفحه ۴۴ المطبعة الکبری الامیریه مصر

(ترجمہ: نکاح صحیح ہوتا ہے اگرچہ اس میں مہر کا نام تک نہ لیا جائے۔ کیوں کہ لغت کی رو سے نکاح ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا دینے اور جوڑا بنانے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا یہ میاں بیوی کے ساتھ کامل ہو جاتا ہے۔ پھر مہر شرعی واجب ہے تاکہ محلِ عقد کی شرافت کو ظاہر کیا جائے۔ لہٰذا نکاح کی درستی کے لیے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اسی طرح نکاح درست ہوگا جب خاوند نے بیوی سے اس شرط پر نکاح کیا کہ اسے کچھ مہر نہ ملے گا جیسا کہ ہم نے واضح کر دیا ہے)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ

ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی المفتی

فی جامع اکبر آباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......183﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس امر میں کہ ایک لڑکی کا نکاح ہوئے عرصہ سال کا گزرا۔ وقتِ نکاح میاں بیوی دونوں نابالغ تھے۔ حسب رضامندیٔ والدین مہرِ موجل مبلغ پانچ سو روپیہ قرار پایا تھا۔ وہ لڑکی اس وقت یا جب اس کی خواہش ہو اپنا مہرِ مطلوبہ اپنے خاوند سے لے سکتی ہے؟ یا جب لڑکے میں وسعت نہ ہو تو لڑکے کے باپ سے بھی دعوی کرکے مہر مذکور وصول کرسکتی ہے؟

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئلہ میں شوہرِ صغیرہ پر جو خود بھی صغیر تھا اور دونوں کا نکاح اور تعینِ مہر بولایت دونوں کے باپوں کے ہوا بعد البلوغ اور قبل البلوغ تمام احکام نکاح کے اس زوج اور اسی زوجہ کی طرف عائد ہوں گے نہ کہ ان کے باپوں کی طرف۔ لہٰذا مہرِ مذکورِ شوہرِ صغیرہ یعنی صغیر کے باپ پر لازم نہ ہوگا۔ ☆ البتہ باپ یا کوئی اور اگر ضامنِ ادائیگیِ مہر ہو جائے گا بوجہِ ضمانت ضرور ادائیگی اس کے ذمہ لازم ہوگی نہ کہ بوجہِ ولایت اور عاقدِ نکاح ومتولیِ تعینِ مہر ہونے۔

چنانچہ صفحہ ۴۴ جلد اول العقود الدریۃ میں ہے۔

و فی فتاوی شیخ الاسلام یحیی آفندی جمع شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی تحت سوال.

و لو زوج الاب طفله الصغیر امراة بمهر معلوم لا یلزم المهر اباه الا اذا ضمنه و قال مالک رحمه اللہ و الشافعی رحمه اللہ فی القدیم المهر علی الاب لانه ضمن دلالة باقدامه علی النکاح مع علمه انه لا مال له. و لا نکاح بدون المهر و قلنا الصداق علی من

اخذ الساق بالاثر قاله علی رضی اللہ عنه والنکاح لم یدل علی ایفاء المھر فی الحال فلم یکن من ضرورته ضمان المھر. و لان تسلیم المعقود علیه الی الزوج یوجب تسلیم البدل ایضا والعاقد سفیر کذا فی معراج الدرایة عن المبسوط ولا یخدش بالک ما فی شرح الطحاوی من ان الاب اذا زوج الصغیر امراة فللمراة ان تطلب المھر من ابی الزوج فیودی الاب من مال ابنه الصغیر و ان لم یضمن الاب صریحا لانه محمو لا علی الطلب بالاداء من مال الصغیر لکونه فی یده کما ینبئ عنه کلامه لا انه محمول علی ان اقدامه علی النکاح ضمان دلالة کما ذھب الیه الشافعی و مالک الخ اقول المسئلة فی الدر المختار من المھر [1]

(ترجمہ: اگر باپ نے اپنے نابالغ لڑکے کا نکاح مقرر مہر کے عوض کسی عورت سے کر دیا تو مہر کی ادائیگی باپ پر لازم نہ ہوگی۔ مگر اس صورت میں باپ پر مہر کی ادائیگی لازم ہوگی جب کہ وہ مہر کا ضامن بن جائے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قدیم قول میں فرمایا کہ مہر باپ کے ذمہ لازم ہوگا کیوں کہ اس نے باوجود اس علم کے کہ لڑکے کے پاس مال نہیں ہے اس کا نکاح کر دیا ہے۔ لہٰذا وہ دلالتاً اس کا ضامن ہوگا۔ اور مہر کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ ہم حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ارشاد کے مطابق کہتے ہیں کہ مہر اس کے ذمہ ہے جس نے عورت کی پنڈلی پکڑی۔ اور نکاح مہر کی فی الفور ادائیگی پر دلالت نہیں کرتا۔ لہٰذا نکاح کے لوازم سے مہر کی ضمانت ثابت نہ ہوئی۔ کیوں کہ خاوند کو معقود علیہ سپرد کرنے پر اس کے بدل کو سپرد کرنا لازم آ جاتا ہے اور عقد کرنے والا یعنی باپ تو سفیر ہے۔ معراج الدرایہ میں مبسوط سے اسی طرح ہے۔ شرح طحاوی میں مذکور یہ جزئیہ تیرے دل میں نہ کھٹکے کہ جب باپ اپنے نابالغ لڑکے کا نکاح کسی عورت سے کر دے تو عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خاوند کے باپ سے مہر کا مطالبہ کرے اور باپ اپنے نابالغ لڑکے کے مال سے (اگر اس کا مال ہو) مہر کو ادا کرے۔ اگر چہ باپ نے صراحت کے ساتھ مہر کی ضمانت نہ اٹھائی ہو۔ کیوں کہ نکاح کی یہ صورت

---

[1] تنقیح الفتاوی الحامدیه : جلد ۱ صفحه ۲۳، ۲۴، مکتبه الحبیبیه کوئٹه

اس پر محمول ہے کہ عورت کے مطالبہ پر وہ نابالغ کے مال سے ادا کرے گا کیوں کہ مال اس کے قبضہ میں ہے جس طرح کہ اس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اس صورت پر محمول نہیں کہ باپ کا نابالغ کا نکاح کرنا دلالت کے اعتبار سے ضامن بنتا ہے۔ جس طرح کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ درمختار کے باب مہر میں موجود ہے)

و فی صفحہ ۳۸۷ من الدر المختار المطبوعة فی المصر مع الشامی

و لا یطالب الاب مهر ابنه الصغیر الفقیر اما الغنی فیطالب ابوه بالدفع من مال ابنه لا من مال نفسه اذا زوجه امراة إلا اذا ضمنه علی العقد[1]

(ترجمہ: باپ سے اس کے نابالغ فقیر بیٹے کے ذمہ واجب مہر کا مطالبہ نہ کیا جائے گا۔ لیکن اگر لڑکا مالدار ہے تو باپ سے بیٹے کے مال سے ادا کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا نہ کہ باپ کے اپنے مال سے جب کہ وہ اس کا نکاح کسی عورت سے کردے۔ ہاں جب بوقت عقد باپ ضمن بن جائے تو اس سے مطالبہ کیا جائے گا۔)

قال الشامی رحمة الله علیه

قوله اذا زوجه امراة مرتبطة بقوله و لا یطالب الاب الخ لان المهر مال یلزم ذمة الزوج ولا یلزم الاب بالعقد اذ لو لزمه لما افاد الضمان شیًا[2] فقط

(ترجمہ: قولہ: جب باپ نابالغ لڑکا کا نکاح کسی عورت سے کردیں اس کا متعلق اس عبارت سے ہے باپ سے مطالبہ نہ کیا جائے گا۔ کیونکہ مہر وہ مال ہے جو عقد کے ساتھ زوج کے ذمہ واجب ہوتا ہے نہ کہ باپ پر لازم ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ باپ پر لازم ہوتا تو ضامن بننے کا کچھ فائدہ نہ ہوتا)

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی مسجد جامع اکبرآباد

✿✿✿✿✿

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۲ ، صفحہ ۳۸۷ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

[2] رد المحتار : جلد ۲ ، صفحہ ۳۸۷ ، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر......184﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارہ میں کہ جس وقت لڑکی کا عقد ہوا تھا اس وقت لڑکی کی عمر ۷ برس تھی۔ اب اس کے عقد کو چھ برس کا عرصہ ہوگیا ہے۔ لڑکی عقد کے بعد سے چھ برس برابر اپنے شوہر کے یہاں آتی جاتی رہی۔

اب قریب دو برس سے لڑکی کے والدین نے لڑکی کو روک لیا ہے۔ اور لڑکی کے والدین لڑکی کو انگریزی اردو کی تعلیم کے لئے اسکول بھیجتے ہیں۔ لڑکی کا شوہر چاہتا ہے کہ میری زوجہ کو انگریزی اردو کی تعلیم نہ دی جائے۔ سوائے قرآن شریف کے اور ضروری مسائلِ دینیات کے انگریزی، وغیرہ کی تعلیم نہ دلائی جائے۔ میں انگریزی کے سخت خلاف ہوں۔ لڑکا دو برس کے درمیان میں اپنے سسرال برابر آتا جاتا رہا۔ اب جبکہ لڑکے نے اپنی زوجہ واپنے سسرال والوں کو انگریزی اردو تعلیم دینے سے منع کیا تو لڑکی کے والدین نے اس کے شوہر کو اپنے مکان پر آنے سے روک دیا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ لڑکی کی تعلیم وغیرہ کا اختیار اس کے شوہر کو ہے یا لڑکی کے والدین کو؟

۲۷ جون ۱۹۱۸ء

رحیم بخش ساکن وزیرپورہ آگرہ

الجواب

بسم الله الرحمن الرحیم.

بعد ادا کردینے مہرِ معجّل کے جس کو فی زمانہ مہر عند الطلب کہتے ہیں شوہر کو اختیار ہے جہاں خود رہے وہاں اپنی بیوی کو رکھے۔ علیٰ ھذا اگر معجّل نہ ہو بلکہ مہرِ موجل ہو جب بھی شوہر کو اختیار ہے کہ جہاں خود رہے وہاں اپنی منکوحہ کو رکھے۔ البتہ قبل اداءِ مہرِ معجّل یعنی مہر عند الطلب عورت کو اختیار ہے کہ شوہر کے ساتھ نہ جائے۔ اس کو اپنے پاس آنے سے منع کردے۔ چنانچہ صفحہ ۲۴۸۔ صفحہ ۲۵۰ ہدایہ مطبوعہ مصر مع الشروح الاربعۃ میں ہے:

و ليس للزوج ان يمنعها من السفر والخروج من منزله و زيارة اهلها حتى يوفيها المهر كله۔[1]

☆(ترجمہ: خاوند نے جب تک پورا مہر نہ دیا ہو تو اپنی بیوی کو سفر کرنے' گھر سے نکلنے اور اپنے رشتہ داروں کی ملاقات کرنے سے نہیں روک سکتا)

واذا اوفاها مهرها نقلها الى حيث شاء لقوله تعالى اسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم.[2]

(ترجمہ: اور جب اپنی بیوی کو پورا مہر ادا کر دے تو وہ اسے جہاں چاہے لے جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کو وہاں ٹھہراؤ جہاں تم خود ٹھہرے اپنی استطاعت کے مطابق)

لہٰذا بعد اداءِ مہرِ معجّل اور بصورت مہر کے موجل ہونے کے بجز اپنا حق قرض وغیرہ وصول کرنے کے یا دوسرے کا حق قرض وغیرہ ادا کرنے یا ہر جمعہ کو اپنے والدین سے ملنے کے یا سالانہ اپنے محرم بھائی' چچا' ماموں وغیرھم کے ملنے بقدر ضرورت بلا اجازت شوہر کے کہیں نہیں جا سکتی۔ اور علاوہ امورِ مذکورہ اگر نامحرم اجنبیوں کے گھر عیادت یا شادی میں جانے کی شوہر اجازت دے بھی دے اور وہ چلی جائے تو میاں بیوی دونوں گنہگار ہوں گے۔ چنانچہ صفحہ ۳۹۰ درمختار مطبوعہ مصر علی ہامش ردالمحتار میں ہے

فلا تخرج الالحق لها او عليها او لزيارة ابويها كل جمعة مرة او المحارم كل سنة أو لكونها قابلة أوغاسلة لا فيما عدا ذلک و ان اذن كانا عاصيين[3]

(ترجمہ: عورت مہر کامل طور پر وصول کر لینے کے بعد گھر سے' اپنا حق وصول کرنے یا کسی کا حق ادا کرنے یا ماں باپ کی ہر جمعہ کو ملاقات کرنے یا ہر سال اپنے محرم رشتہ داروں کی ملاقات کے بغیر نہیں نکل سکتی ہے۔ اسی طرح

---

[1] الهدايه مع فتح القدير وغيره: جلد ۲' صفحه ۴۷۳ مطبوعه مصر

[2] الهدايه مع فتح القدير وغيره: جلد ۲' صفحه ۴۷۴ مطبوعه مصر

[3] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۲' صفحه ۳۹۰ مكتبه رشيديه كوئٹه

اگر وہ دایہ ہو یا غسل دلانے والی ہو تو بھی اس کے لیے باہر نکلنے کی اجازت ہے۔ ان کے علاوہ باقی امور کے لیے باہر نہیں نکل سکتی اور اگر مرد اسے اور کاموں کے لیے نکلنے کی اجازت دے گا تو دونوں گناہ گار ہوں گے)

قال الشامی

(قولہ فیما عدا ذلک) عبارة فتح و ما عدا ذلک من زیارة الاجانب و عیادتهم والولیمة لایاذن لها ولا تخرج[1]

(ترجمہ: قولہ: عورت دیگر امور کے لیے نہیں نکل سکتی جیسا کہ اجنبی غیر محرموں کی ملاقات ان کی بیمار پرسی اور ولیمہ کے لیے نہیں جا سکتی۔ خاوند اسے ان کی اجازت نہ دے اور نہ ہی وہ ان امور کے لیے گھر سے باہر جائے)

اور علامہ شامی علیہ الرحمۃ علاوہ امور مذکور حج فرض کے واسطے اگر اپنے کسی محرم باپ' بھائی وغیرہ کے ساتھ ہو اور ماں باپ اگر سخت بیمار یا کوئی ان کا خدمت گزار بجز اس بیٹی کے نہ ہو تو ان کی خدمت کے واسطے یا کوئی ایسا ہی سخت حادثہ گھر میں ہی پیدا ہو مثلاً آگ لگ جائے یا چور گھس آئیں اور بے حرمتی یا جان کا خوف ہو جب بھی بلا اجازت شوہر کے گھر سے باہر نکلنے کو شرح قول درمختار فلا تخرج میں جائز تحریر فرماتے ہیں۔

☆ اور صورتِ مسئولہ میں اول تو ظاہر ہے کہ بعد بالغ ہونے لڑکی کے بھی شوہر کو زوجہ کے پاس آمد و رفت سے زوجہ کی جانب سے ممانعت ہے اور اب تک ہے۔ بلکہ لڑکی کے والدین کی جانب سے یہ ظلم بے جا ہے۔ لہٰذا اگر نکاحِ نابالغہ بولایتِ دیگر اولیاء علاوہ باپ کے ہوتا جب بھی حقِ فسخ ساقط ہو چکا۔ مگر یہاں تو بمقتضائے سوال بولایتِ باپ نکاحِ نابالغہ ہوا ہے' جو کسی طرح فسخ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اسکول وغیرہ میں لڑکی نہ اپنی خوشی سے جا سکتی ہے نہ لڑکی کے والدین کو بلا اجازت شوہر اسکول وغیرہ میں بھیجنے کا اختیار۔ اور اگر شوہر بھی تحصیل انگریزی وغیرہ کے واسطے کہ جہاں جانے سے فی زمانہ حال مکرر سہ کرر دیکھا جاتا ہے کہ عورتیں خودسر' بے حیا' بے دین ہو

---

[1] ردالمحتار : جلد ۲' صفحہ ۳۹۰ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

جاتی ہیں۔ اسکول وغیرہ میں جانے کی اجازت دے دے گا اور عورت اسکول میں جائے گی تو میاں بیوی دونوں بموجب روایتِ مذکور درمختار گنہگار ہوں گے۔ لڑکی کے ماں باپ کو تو لڑکی پر ایسی تکلیف پہنچا دینے کا کچھ بھی اختیار نہیں۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

جامع مسجد اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر......185﴾

سوال

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے اپنی دختر جس کو عارضہ سل ودق کا تھا بغیر اطلاع ایک شخص سے نکاح کر دیا اور چڑھاوا زیور وغیرہ جو مستعار دیا جاتا ہے وہ لے لیا۔ اب دختر اس کی اسی مرض میں قبل از رخصت مرگئی۔ ایسی صورت میں شرعا مطالبہ مہر کا رشتہ دارانِ دختر کو پہنچتا ہے یا کیا؟ اور بوجہ اس دھوکہ کے کہ مریضۂ سل کو تندرست کہہ کر نکاح کر دیا نکاح صحیح ہوا یا نہیں؟

وزیر خان صابن کٹرہ آگرہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

سل، دق، جذام، برص، جنوں وغیرہ کوئی مرض بموجب قولِ مختارِ شیخین خصوصا اس حالت میں تو باتفاق موجب فسخ نکاح قرار نہیں دیا جاسکتا تا کہ موجبِ سقوطِ مہر ہو سکے۔ چنانچہ صفحہ ۱۳۲ ہدایہ میں ہے۔

و اذا کان بالزوجة عیب فلا خیار للزوج و قال الشافعی ترد بالعیوب الخمسة و ھی الجذام و البرص و الجنون و الرتق و القرن لانھا تمنع الاستیفاء حسا او طبعا... و لنا ان فوت الاستیفاء أصلا بالموت لا یوجب الفسخ فاختلاله بھذہ العیوب أولی وھذا لأن الاستیفاء من الثمرات والمستحق والتمکن ھو حاصل[1]

(ترجمہ: اگر بیوی میں عیب ہو تو خاوند کو خیارِ عیب حاصل نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پانچ عیوب ایسے ہیں جن کی بدولت بیوی کو واپس کر دیا جائے گا اور وہ عیوب یہ ہیں۔ (۱) جذام (۲) برص (۳) پاگل

---

[1] الھدایہ مع فتح القدیر وغیرہ جلد ۲ صفحہ ۲۶۷ ' ۲۶۸ المطبعہ الکبری الامیریہ مصر

پن۔ (۴) عورت کی شرمگاہ میں رتق ہو یعنی جماع کا مقام موجود نہ ہو صرف پیشاب کرنے کی جگہ موجود ہو۔ (۵) عورت کی شرمگاہ میں قرن ہو یعنی بڑھا ہوا گوشت یا ہڈی وغیرہ ہو جس کے باعث جماع نہ ہو سکے۔ کیوں کہ یہ عیوب عورت سے حق وصول کرنے میں حسی یا طبعی طور پر مانع ہوتے ہیں۔ ہم ان کے جواب میں کہتے ہیں کہ کامل طور پر عورت سے حق کی وصولی موت کے ساتھ منقطع ہو جاتی ہے اور موت سے نکاح فسخ نہیں ہوتا' تو ان عیوب کی موجودگی بدرجہ اولیٰ فسخ نہ ہوگا۔ اور حق کا وصول کرنا نکاح کے ثمرات سے ہے اور جس چیز کا اسے استحقاق ہے اور قدرت حاصل ہے۔

قال فی شرحه الکفایة

(ترجمہ: اس کی شرح کفایہ میں فرمایا:)

قوله: و لنا ان فوات الاستیفاء اصلا بالکلیة بالموت لا یوجب الفسخ حتی لا یسقط شی من مهرها[1].

(ترجمہ: قولہ: ہماری دلیل یہ ہے کہ کامل طور پر عورت سے حق کی وصولی موت کے ساتھ منقطع ہوتی ہے اور اس سے نکاح فسخ نہیں ہوتا حتی کہ مہر کا کوئی حصہ اس سے ساقط نہیں ہوتا)

حالاں کہ جن کے نزدیک اختیارِ فسخ بعیوبِ مذکور ہے ان کے نزدیک بھی سقوطِ مہر بعد ثبوتِ فسخ ہوتا ہے نہ کہ قبلِ فسخ ☆ اور جب قبلِ فسخ زوجہ مذکورہ مرگئی مہرِ کامل لازم ہوگیا۔

کما فی صفحه ۲۰۸ من الهدایه المذکورة:

و من سمی مهرا عشرة فما زاد فعلیه المسمی ان دخل بها او مات عنها لانه بالدخول یتحقق تسلیم المبدل وبه یتاکدا البدل و بالموت ینتهی النکاح نهایته والشئ بالنهایة یتقرر و یتاکد فیتقرر بجمیع مواجبه[2]

---

[1] الکفایه شرح الهدایه علی هامش فتح القدیر جلد ۲ صفحه ۲۶۸ المطبعة الکبری الامیریة مصر

[2] الهدایه : جلد ۲ صفحه ۳۲۴ مکتبه شرکت علمیه ملتان

☆(ترجمہ: جس شخص نے مہر دس درہم یا اس سے زائد مقرر کیا اس کے ذمہ مقرر کردہ مہر واجب ہے بشرطیکہ اس مرد نے عورت سے جماع کیا ہو یا عورت کو چھوڑ کر مر گیا ہو کیوں کہ جماع کے ساتھ مبدل کی سپردگی ثابت ہو جاتی ہے۔ نیز موت سے نکاح اپنی انتہا تک پہنچ جاتا ہے اور شے اپنی انتہا کو پہنچ جانے سے ثابت اور پختہ ہو جاتی ہے لہٰذا وہ اپنے تمام لوازمات کے ساتھ پختہ ہو جاتی ہے)

قال ابن همام رحمه الله فی شرحه المسمی بفتح القدیر

(ترجمہ: امام ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے فتح القدیر میں فرمایا جو کہ اس کی شرح ہے)

قوله (و الشیء بانتهائه یتقرر) لان انتهاء ہ عبارة عن وجوده بتمامه فیستعقب مواجبه الممکن الزامها من المهر و الارث و النسب بخلاف النفقة ویعلم من هذا الدلیل ان موتها ایضا کذلک فالاقتصار علی موته اتفاق و لا خلاف للاربعة فی هذه سواء کانت حرة او امة[1]

(ترجمہ: قولہ: اور شے اپنی انتہا کو پہنچ کر پختہ ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ شے کی انتہا کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے کامل وجود کے ساتھ موجود ہے۔ لہٰذا اس کے بعد تمام لوازمات ثابت ہو جائیں گے جن کا لازم کرنا ممکن ہو۔ مثلاً مہر، وراثت اور نسب بخلاف نفقہ کے۔ اس دلیل سے معلوم ہوا کہ بیوی کے مر جانے کی صورت میں یہی حکم نافذ ہے لہٰذا مرد کی موت کی قید اتفاقی ہے۔ اس بارے میں ائمہ اربعہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ عورت خواہ آزاد ہو خواہ غلام)

و فی صفحة ۳۵۶ من الدر المختار المطبوعة مع الشامی فی المصر

و تجب العشرة ان سماها او دونها و یجب الاکثر منها ان سمی الاکثر ویتا کد عند وطء او خلوة صحت من الزوج او موت احدهما فقط[2]

(ترجمہ: مہر دس درہم واجب ہوگا اگر دس درہم یا ان سے کم مقرر کیا اور اگر زیادہ مقرر کیا تو زیادہ مقرر کردہ واجب ہو جاتا ہے۔ اور یہ جماع یا خاوند کی جانب سے خلوتِ صحیحہ یا میاں بیوی دونوں میں سے کسی ایک کی موت سے پختہ ہو جاتا ہے)

---

[1] فتح القدیر: جلد ۲: صفحہ ۴۳۸ المطبعة الکبری الامیریة مصر

[2] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۱۶۹، ۱۷۰ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

اور صحتِ نکاح میں کسی شرط عند العقد کا بعد النکاح نہ پایا جانا مخل نکاح نہیں ہوتا خصوصاً نہ پایا جانا شرطِ صحت وتندرستی کا عورت میں علی ھذا امرد میں بجز مرض مقطوع الذکر ہونے یا نامرد ہونے یا خصی ہونے کی۔

چنانچہ صفحہ ۲۹۰ سطر ۲۲ جلد دوم فتاوی عالم گیریہ مطبوع مصر میں ہے:

و لا یثبت فی النکاح خیار الرویة و العیب و الشرط سواء جعل الخیار للزوج او المرأة اولهما ثلاثة ایام او اقل او اکثر حتی انه اذا فعل ذلک فالنکاح جائز اذا کان العیب هو الجب و الخصاء و العنة فان المراة بالخیار و هذا عند ابی حنیفة و ابی یوسف رحمهما الله تعالیٰ هکذا فی شرح الطحاوی فاذاشرط احدهما لصاحبه السلامة عن العمی و الشلل و الزمانة او شرط صفة الجمال او شرط الزوج علیها صفة البکارة فوجد بخلاف ذلک لا یثبت له الخیار[1]

(ترجمہ: نکاح میں خیارِ رویت' خیارِ عیب اور خیارِ شرط ثابت نہیں ہوتا۔ خواہ خیار مرد کے لیے ہو یا عورت کے لیے یا دونوں کے لیے رکھا گیا ہو خواہ یہ خیار تین یا ان سے کم یا ان سے زائد دنوں کے لیے سب صورتوں میں یہی حکم ہے۔ اگر کسی نے یہ خیار بوقت نکاح لگایا تو نکاح درست ہے (اور خیار باطل) ☆ اور جب عیب آلۂ تناسل کا کٹا ہوا ہونا' خصی ہونا' نامردی ہونا تو عورت کو اختیار ہے۔ یہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے۔ شرح طحاوی میں اسی طرح ہے۔ جب زوجین میں سے کسی نے دوسرے کے لیے اندھے پن' مفلوج ہونے' اپاہج ہونے سے سلامت کی یا حسین ہونے کی شرط لگائی یا خاوند نے عورت پر باکرہ ہونے کی شرط لگائی پھر ان شرطوں کے خلاف پایا تو دوسرے کے لیے خیار ثابت نہ ہوگا)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ

ابو محمد محمد دیدار علی المفتی فی جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[1] الفتاوی العالم گیریہ جلد ۱ صفحہ ۳۵۰ مطبوعہ دار احیار التراث العربی

﴿فتویٰ نمبر...... 186﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ ھندہ کا نکاح زید کیساتھ بعوض مبلغ تین سو روپیہ مہر کے ہوا تھا اب ھندہ کا قبل رخصت بلا حصولِ خلوتِ صحیحہ زید کے ساتھ انتقال ہوا۔ اندریں صورت بذمہ زید کل مہر واجب ہوگا یا نصف؟ اور جو زیور ہندہ کو شوہر کے باپ نے اور ھندہ کے باپ نے وقتِ نکاح حسبِ دستور پہنا دیا تھا وہ کس کا قرار دیا جائے گا؟ اور بعد موتِ ہندہ ورثہ میں کس طرح تقسیم ہوگا؟ ھندہ نے یہ وارث چھوڑے ہیں۔ زوج' ام' اب' تین بھائی' ایک بہن۔

۱۹ ربیع الثانی ۳۶ھ

الجواب

بسم الله الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں بوجہ مرجانے ھندہ کے بذمۂ زید' شوہرِ ھندہ کے کل مہر واجب ہوگا۔ اس واسطے کہ جیسے بعد خلوتِ صحیحہ کل مہر واجب الادا ہو جاتا ہے۔ زوجین میں سے کسی ایک کے مرنے سے بھی کل مہر بذمۂ شوہر لازم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ صفحہ ۱۳ جلد ثانی الجوھرۃ النیرۃ میں ہے

و ان سمی عشرۃ فما زاد فلها المسمی ان دخل بها او مات عنها و هکذا اذا ماتت هی فلها المسمی[1]

(ترجمہ: مہر اگر دس درہم اور جو اس سے زائد مقرر کیا تو عورت کو مقرر کردہ مہر ملے گا اگر اس نے اس کے ساتھ خلوت اختیار کی یا اس کو چھوڑ کر مر گیا۔ اور اسی طرح اگر عورت مر جائے تو بھی وہ مقرر کردہ مہر کی حق دار ہے۔)

---

[1] الجوھرۃ النیرۃ : جلد ۲ صفحہ ۷۰۹ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان

وھکذا فی صفحہ ۲۰۹ من الجزء الثالث لفتح القدیر [1]

☆ لہٰذا کل مہر مبلغ تین سو اور جوزیور ہندہ کے باپ کا پہنایا ہوا یا شوہر کا یا شوہر کے باپ کا اگر وہ عرف میں ہندہ کی ملک مانا جاتا ہو تو سب ملک ہندہ قرار پا کر اس طرح ورثہ میں تقسیم ہو گا کہ کل مال ہندہ کے چھ (۶) حصہ کر کے تین (۳) حصہ زوج کو ملیں گے اور ایک حصہ ام کو اور باقی دو حصہ باپ کو اور موجودگی باپ میں بہن بھائی کو کچھ نہیں ملتا۔

صورتہ ھکذا

ہندہ مسئلہ ۶

میت

زوج	ام	اب	اخ	اخ	اخت
۳	۱	۲	م	م	م

☆ اور جوزیور عرف میں ہندہ کا نہ ہو گا بلکہ عرف میں وقتِ نکاح عاریۃ پہنا دیا جاتا ہو گا تو وہ جس نے عاریۃ پہنایا تھا اس کو مل جائے گا۔ اور باقی بطریق مذکور تقسیم ہو جائے گا۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ
ابو محمد محمد دیدار علی المفتی فی
جامع اکبر آباد

---

[1] فتح القدیر : جلد ۲ صفحہ ۴۳۸ مطبوعہ مصر

﴿فتویٰ نمبر...... 187﴾

سوال

ایک عورت کی آشنائی کسی مرد سے ہے۔ اور اس کے شوہر کو بھی معلوم ہے پس اس صورت میں شرعاً کیا حکم ہے؟

سائل: از آگرہ

۲۵ مارچ ۱۹۱۶ء

الجواب

ایسی صورت میں شوہر زوجہ کو ہدایت کرے۔ اگر نہ مانے تو طلاق دے دے۔ اور اگر محبت رکھتا ہو اور طلاق نہ دے تو اپنے پاس رکھے۔ اس طرح حدیث شریف میں ہے[1]۔ واللہ اعلم وعلم احکم

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

❁❁❁❁❁

---

[1] حضرت مفتی علامہ رحمۃ اللہ علیہ کا اشارہ شاید درج ذیل حدیث شریف کی طرف ہے:۔

عن لقيط بن صبرة قال قلت يا رسول الله إن لي امرأة في لسانها شيء يعني البذاء قال طلقها قلت إن لي منها ولدا ولها صحبة قال فمرها يقول عظها فإن يک فيها خير فستقبل ولا تضربن ظعينتک ضربک اميتک

(رواه ابو داؤد)

مشکوۃ المصابیح : صفحہ ۱۸۱، ۱۸۲ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ، ملتان

(ترجمہ: حضرت لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کی یارسول اللہ میری ایک بیوی ہے اس کی زبان میں فحش گوئی پائی جاتی ہے آپ نے فرمایا اسے طلاق دے دو۔ میں نے عرض اس کے بطن سے میرا ایک بچہ ہے اور وہ کچھ عرصہ میرے ساتھ رہی ہے۔ تو آپ نے فرمایا اسے حکم دو آپ کا مقصود یہ تھا کہ اسے نصیحت کرو۔ اگر اس میں کچھ بہتری ہو گی تو قبول کر لے گی اپنی بیوی کو اس طرح ہرگز نہ مارو جس طرح تم اپنی نکمی لونڈی کو مارتے ہو)

محمد علیم الدین نقشبندی عفی عنہ

طلاق

﴿فتویٰ نمبر......188﴾

سوال

کیافرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی زوجہ کو چار مردوں کے سامنے طلاق دی۔اب زیدانکارکرتا ہے۔تواب عندالشرع زید کی زوجہ کوطلاق ہوئی یا نہیں؟اس کا جواب جلد عنایت فرمایا جائے اور بحوالہ کتبِ اہلسنت والجماعت دیا جائے۔

۳ذی قعدہ۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

اگرزید کا اپنی بیوی کومخاطب کر کے اس طرح کہنا ثابت ہو جائے کہ میں نے تجھ کوطلاق دی تو ایک طلاق رجعی واقع ہوگی۔جب تک ایامِ عدت (یعنی) تین حیض نہ گزرجائیں مرد کواختیار ہے خواہ عورت راضی ہو یا نہ راضی ہو کہ دو آدمیوں کو گواہ کر کے یہ کہہ دے کہ میں نے اپنی طلاق کے قول سے رجوع کیا یا بہ نیت رجعت اس سے بوس وکنار یا ہم بستر ہو لے۔تو وہ عورت بلا نکاحِ جدید اس کے نکاح میں رہے گی۔

اور اگر بعد طلاق تین حیض گزر جائیں تو پھر طلاق بائن ہو جائے گی۔اندریں صورت برضامندیٔ عورت اس سے نکاحِ جدید کرسکتا ہے چنانچہ صفحہ ۳۷۱ جلداول فتاوی ہندیہ میں ہے

الطلاق الصریح و ھو کانت طالق و مطلقه وطلقتک وتقع واحدة رجعیة و ان نوی الاکثر أوالابانة او لم ینو شیًا کذا فی الکنز[۱]

(ترجمہ: طلاق صریح وہ یوں ہے کہ مرداپنی بیوی کو کہے تجھے طلاق ہے۔یا کہے تجھے طلاق دی گئی ہے یا کہے میں

---

[۱] الفتاوی العالم گیریہ مع ترجمہ اردو ،جلد ۸ ،صفحہ ۶۶، مطبوعہ فضل ربی پریس راولپنڈی

نے تجھے طلاق دی۔ان الفاظ سے ایک رجعی طلاق واقع ہوگی اگرچہ وہ ایک سے زائد کی نیت کرے یا بائن طلاق کی نیت کرے یا کچھ بھی نیت نہ کرے۔کنز)

☆ اگر تین دفعہ اس سے یہ کہہ دیا کہ میں نے تجھ کو طلاق دی۔میں نے تجھ کو طلاق دی۔میں نے تجھ کو طلاق دی۔اور اس کے ساتھ تنہا کسی مکان میں بلا مانع رہ چکا تھا یا وطی کر چکا تھا تو اس پر تین طلاق واقع ہو جائے گی۔اب بعد انقضائے ایامِ عدت تاوقتیکہ وہ دوسرے شخص سے نکاح کر کے اس سے ہمبستر نہ ہو لے اور پھر وہ شوہر اگر طلاق دیدے جب تک اس کے ایامِ عدت نہ گزریں شوہرِ اول سے وہ ہرگز نکاحِ جدید نہیں کر سکتی۔اور شوہرِ اول بدون اس طریق کے بلا
اس کی رضامندی کے اس کو اپنے نکاح میں نہیں لاسکتا چنانچہ آیہ کریمہ:

فان طلقها فلا تحل له مِنۢ بَعۡدُ حتى تنكح زوجا غيره [1]

(ترجمہ: اگر اپنی بیوی کو تیسری طلاق بھی دے دے تو وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں رہتی جب تک کہ دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرلے)

☆ اس امر پر شاہدِ عدل ہے اور اگر بعد طلاق وہ طلاق دینے سے قطعاً انکاری ہے اس کے ثبوت کے لیے ایسے دو گواہ عادل مسلمانوں کے یا ایک عادل مسلمان اور دو عورت عادلہ مسلمہ کی ضرورت ہے کہ وہ مرد عورت دونوں کو پہنچانتے ہوں اور پہچان کر اس طرح گواہی دیں کہ ہم اس مرد کو پہچانتے ہیں اور اس عورت کو پہچانتے ہیں۔ہم گواہی دیتے ہیں کہ ہمارے سامنے اسی نے اس عورت کو طلاق دی تھی۔اگر ایسے گواہ گزر جائیں بلاشبہ طلاق ثابت ہو جائے گی۔اور بغیر گزرنے ایسے دو گواہوں کے دعوی طلاق ثابت نہیں ہو سکتا۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی مسجد جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

[1] القرآن المجید: سورۃ البقرہ آیت ۲۳۰

﴿فتویٰ نمبر......189﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس صورت میں کہ ایک شخص نے ناراض ہو کر اپنی بیوی کو طلاق دی۔ نیز اس خیال سے کہ دوسری عورت سے نکاح کرے۔ جس عورت کو اس نے طلاق دی ہے اس کے شکم سے دو لڑکیاں عورت مذکور کے پاس موجود ہیں ایک نابالغ ایک شیر خوار۔ ایسی حالت میں طلاق ہوتی ہے یا نہیں؟ شخصِ مذکور اب بھی طلاق دینے کا اقراری ہے اور اعلان بھی کر چکا ہے کہ میں نے اپنی عورت کو طلاق دے دی۔ نیز صرف مہر ہی دینا ہوگا یا نان ونفقہ بھی؟

۳ جمادی الاولی ۳۶ھ

سید محمود از بجاور بندیل کھنڈ

متصل ایجنسی چھاؤنی لوگاؤں بر مکان میر صاحب سید احمد

الجواب

وهو الموفق للصواب.

اللهم رب زدني علما

جب کوئی شخص اپنی بیوی سے کسی بھی حالت میں خواہ اس سے اولاد ہو یا نہ ہو، ایک بچہ بھی نہ ہو، خواہ انیس بیس بچے ہوں، خواہ زائد ہوں، ایک بار یہ کہہ دے کہ میں نے تجھ کو طلاق دی یا تو مطلقہ ہے تو قصداً کہے یا خواہ ہنسی سے کہے، خواہ غصہ سے کہے، اس پر ایک طلاق رجعی واقع ہو جائے گی۔

كما في صفحة ٦٠ من الهداية المطبوعة في مطبع نول كشور:

الطلاق على ضربين صريح و كناية فالصريح قوله انت طالق و مطلقة و طلقتك فهذا يقع به الطلاق الرجعي.... و لا يفتقر الى النية.... و كذا اذا نوى الابانة.... و لو نوى الطلاق عن وثاق لم يدين في القضاء .... و لا يقع به الا واحدة و ان نوى اكثر من

ذلک انتھی مختصرا بقدر الحاجۃ[1].

☆ (ترجمہ: طلاق کی دو قسمیں ہیں۔(۱) صریح (۲) کنایہ۔صریح جیسے کہ یوں کہے تو طلاق والی ہے۔طلاق یافتہ ہے۔میں نے تجھے طلاق دی۔ان الفاظ سے طلاق رجعی واقع ہوتی ہے۔ان الفاظ میں نیت کی ضرورت نہیں۔اوراسی طرح اگران الفاظ سے عورت کو بائن کرنے کی نیت کرے تو بھی رجعی واقع ہوگی اور اگر قید سے رہائی دینے کی نیت کرے تو قضاء میں اس کی تصدیق نہ کی جائے گی۔اس سے صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے اگرچہ وہ اس سے زیادہ کی نیت کرے)

حکم اس طلاق کا یہ ہے کہ وہ اگر تین حیض آنے سے پہلے جو ایامِ عدت ہیں' جن میں کسی دوسرے سے نکاح نہیں کرسکتی' خود اپنا نکاح رکھنا چاہے دو گواہ کر کے کہہ دے کہ میں نے اپنے قول سے رجوع کیا یا اس سے ہم بستر ہو یا بوس و کنار ہو لے تو پھر وہ اس کی بیوی رہتی ہے۔دوبارہ نکاح کی حاجت نہیں۔البتہ اگر تین حیض گزر جائیں بلاشبہ وہ جس سے چاہے نکاح کرسکتی ہے۔اور اگر پہلے شوہر سے چاہے اس سے بھی نکاح کر سکتی ہے۔

☆ دو طلاق تک اگر بائن بھی دے دی' اس کی خوشی سے دوبارہ نکاح کرسکتا ہے۔مگر تین طلاق کے بعد پھر جب تک وہ عورت بعد انقضائے عدت دوسرے شخص سے نہ نکاح کر کے اور اس کے ساتھ ہم بستر نہ ہولے اور پھر وہ اگر طلاق دے دے تو اس کی عدت کے بعد اپنے پہلے شوہر سے نکاح کرسکتی ہے۔چنانچہ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

فان طلقھا فلا تحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ[2]

(ترجمہ: دو طلاق دے چکنے کے بعد اگر خاوند مزید ایک اور طلاق اسے دے دے تو وہ بیوی اس خاوند کے لیے حلال نہیں رہتی جب تک کہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرے)

---

[1] الہدایہ مع فتح القدیر وغیرھا : جلد ۳ صفحہ ۴۴ تا ۴۸ مطبوعہ مصر

[2] القرآن الحکیم : سورۃ البقر : آیت : ۲۳۰

اوراگروہ لوگوں سے بار بار یہی کہتا رہا ہے کہ ''میں نے اپنی زوجہ کو طلاق دے دی ہے'' تو وہی ایک طلاق رہے گی۔

اوراگراس نے کئی دفعہ یہ کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی یا طلاق دیتا ہوں تو تین طلاق ہو جائیں گی۔ ☆ پھر دونوں صورتوں میں ایامِ عدت میں شوہر پر نان ونفقہ بھی عورت کا لازم ہے۔ اور ادائیگی مہر بھی بذمہ شوہر لازم ہے۔ بعد گزرنے عدت کے بجز مہر کے کچھ نہیں دیا جاتا۔ پھر عورت کو اختیار ہے جس سے چاہے نکاح کرلے۔ فقط

حررہ: العبدالراجی

ابومحمد محمد دیدارعلی المفتی

فی جامع اکبرآباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......190﴾

نوٹ: سوال دستیاب نہیں ہوسکا۔

الجواب

وهو الموفق للصواب

اللهم رب زدنی علما

جب مرد نے اس عورت سے یہ کہہ دیا کہ میں نے تجھے (تین[1]) طلاق دی یا گواہوں کے سامنے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو (تین[1]) طلاق دی اور اس کے (بعد) پھر الگ ہوئے نہیں اور اس امر کے مسلمان عادل دو گواہ موجود ہیں اور زمانہ عدت کو گزرے ہوئے بھی چھ سات برس ہو گئے یقیناً وہ طلاق جائز ہو گئی۔ اور بلا تکلف بصورتِ ثبوتِ طلاق وانقضاءِ عدت اس کا نکاح دوسرے شخص کے ساتھ صحیح ہو گیا اور دعویٰ زوجِ اول شرعاً بالکل ناجائز اور ناقابلِ سماعت ہے۔ فقط

حررہ العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی المشہدی
المفتی فی جامع اکبرآباد

❁❁❁❁❁

---

[1] قوسین میں اضافہ مرتب کی طرف سے ہے۔ فتوی کے رجسٹر میں نہیں ہے۔

محمد علیم الدین نقشبندی عفی عنہ

﴿فتویٰ نمبر...... 191﴾

سوال

حامدا و مصليا

علماء دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنی بی بی (کو بوجہ) فاحشہ ہونے کے طلاقِ مغلظہ دی۔ اور وہ عورت ایک سال یا دوسال زنا کاری میں مشغول رہی۔ اب وہ عورت توبہ کرتی ہے۔ اور اس کا شوہر پھر اپنے نکاح میں لانا چاہتا ہے اور اس عورت نے کسی کے ساتھ نکاح نہیں کیا مثل حلالہ وغیرہ کے۔ اب نکاح اس طلاق دینے والے کے ساتھ درست ہے یا نہیں؟۔ بموجب قرآن وحدیث کے بیان کیجئے۔

کریم بخش ٹونڈلہ

الجواب

بسم الله الرحمن الرحيم

صورتِ مسئولہ میں اگر اس شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاق مغلظہ اس طرح سے دیدی تھی کہ میں نے تجھ کو طلاق دی' طلاق دی' طلاق دی' اور بعد نکاح وہ اس سے ہم بستر بھی ہو چکا تھا تو اس کے نکاح میں بغیر حلالہ کے نہیں آسکتی۔ اور اگر اس نے ایک یا دو طلاق دی تھی تو اس سے توبہ کرا کر نکاح کر سکتا ہے بلکہ بوجہ توبہ کرانے اور فعل بد چھوڑانے کے مستحق ثواب ہوگا۔ ھکذا ظاهر من كتب الحديث والفقه

ابو محمد محمد دیدار علی

مفتی جامع مسجد اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......192﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں صورت' کہ محمد صدیق نے ایک خط بنام نظیر الدین اپنے خسر کو بھیجا' کہ میں نے اپنی بیوی مسماۃ حفیظن کو تلاق دیا تلاق دیا حفیظن کو تلاق دیا۔ تین مرتبہ۔ اور یہ خط رجسٹری کرا کر بنام اپنے خسر کو بھیج دیا۔ پھر جب خود آیا اور برادری کے لوگوں نے اس سے پنچایت میں پوچھا' کہ کیا یہ خط تو نے ہی بھیجا ہے؟ تو اس نے اقرار کیا کہ ہاں یہ خط بصحتِ ہوش وحواس میں نے ہی لکھوا کر بھیجا ہے۔ آیا اس صورت میں محمد صدیق اپنی بیوی حفیظن کو پھر اپنے نکاح میں لے سکتا ہے یا نہیں؟۔ بینوا توجروا

۱۶ جمادی الاولی ۱۳۳۵ھ

الجواب

بسم الله الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں تین طلاق واقع ہوگئی اب بغیر حلالہ کے محمد صدیق کے نکاح میں نہیں آ سکتی۔

کما فی الهدایة:

و ان کان الطلاق ثلثا فی الحرة أو ثنتین فی الامة لم تحل له حتی تنکح زوجا غیره نکاحا صحیحا و یدخل بها ثم یطلقها او یموت عنها[۱]۔

(ترجمہ: آزاد عورت کی صورت میں تین اور لونڈی ہونے کی صورت میں دو طلاقیں اگر واقع ہو جائیں' تو وہ عورت اپنے خاوند کے لیے اس وقت تک حلال نہیں رہتی' جب کہ دوسرا مرد اس سے صحیح نکاح کر کے وطی نہ کرے اور پھر وہ اس کو طلاق دے لے یا مر جائے) فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ
ابو محمد محمد دیدار علی' مفتی جامع مسجد اکبر آباد
۱۶ جمادی الاولی ۱۳۳۵ھ

---

[۱] الهدایه: جلد ثانی' جزء ۳' صفحه ۲۶۷' ادارة القرآن والعلوم الاسلامیه کراچی

﴿فتویٰ نمبر......193﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ میری بہن کے خاوند نے اس کو طلاق دیدی' اور فارغ خطی بھی لکھ دیا۔ جس کو تقریباً تین ساڑھے تین ماہ ہو چکے۔ اور اس کے تین مرتبہ خون حیض بھی جاری ہو چکا ہے۔ فارغ خطی ہمارے مخالف کے قبضہ میں ہے۔ وہ نہیں دیتا۔ لیکن طلاق کے گواہ بہت آدمی ہیں۔ پھر ایسی صورت میں اس کا نکاح بغیر فارغ خطی قبضہ میں لائے ہو سکتا ہے یا نہیں؟

سائل مہتا دھوبی کٹرہ قاضی حسن

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں طلاق کے واسطے دو گواہ عادل مسلمان کافی ہیں۔ تحریری فارغ خطی کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ بصورتِ طلاقِ صریح' اگر اس نے بلفظ طلاق تین سے کم یا ایک طلاق دی تھی' ایامِ عدت میں بلا نکاح طلاق سے رجوع کر کے اس کو اپنی زوجیت میں لا سکتا تھا' مگر چونکہ بلا رجوع اب تین حیض جو ایامِ عدتِ طلاق ہیں گزر چکے لہٰذا وہ جبراً اس کے ساتھ نکاح بھی نہیں کر سکتا۔ ☆ اور اب اس مطلقہ کو اختیار ہے اگر اس کے ساتھ یعنی شوہرِ مذکور کے ساتھ نکاحِ جدید کرنا چاہے کر سکتی ہے۔ اور اگر کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کرنا چاہے دوسرے کے ساتھ بھی نکاح کر سکتی ہے۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

محمد دیدار علی الرضوی

مفتی جامع مسجد اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر......194﴾

سوال

اگر زید حنفی المذہب نے صحبت کرنے کے بعد کئی مہینے بعد ایسا کیا ہو کہ اپنی منکوحہ کو ایک ہی جلسہ میں صریح لفظوں میں میں نے تجھے طلاق دی، میں نے تجھے طلاق دی، میں نے تجھے طلاق دی، تین طلاق بحالتِ غصہ دیں۔ اور اشد ضرورت اور بے حد مجبوری میں اس نے سنے ہوئے مسئلہ پر عمل کیا کہ ایک جلسہ کے تین طلاقیں ایک ہو جاتی ہیں اور عدت میں رجوع کر لیا۔

تو کیا زید اس فعل سے دائرہ اسلام سے خارج ہوا یا نہیں؟ مسئلہ میں کسی دوسرے امام کے قول پر مجبوری کی حالت میں عمل کرنے سے مذہبِ حنفی سے خارج ہو گیا؟ اور اگر وہ سخت مصائب میں مبتلا ہونے کی وجہ سے آئندہ بھی اس عورت کو جدا نہ کر سکے اور اسی رجعت پر جمارہے تو کیا مرتکب زنا یا کسی گناہِ کبیرہ کا ہوگا؟

۲۱ صفر ۱۳۳۵ھ سائل محمد شفیع محلہ چھتا راجہ کاشی آگرہ

الجواب

صورتِ مسئلہ میں امامِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تین طلاق واقع ہو گئیں۔ لہٰذا رجعت صحیح نہ ہوئی۔ اور اس عرصہ میں وہ اس سے اگر ہم بستر ہوتا رہا تو مرتکب زنا رہا۔ اب اس کو توبہ کرنا چاہئے۔ اور آئندہ اس کی ہم بستری سے پرہیز کرنا لازم ہے جب تک وہ عورت کسی دوسرے کے ساتھ نکاح کر کے ہم بستر نہ ہو لے پھر اگر وہ دوسرا شوہر طلاق دیدے تو بعد انقضاءِ عدت پھر یہ شخص یعنی شوہرِ اول جس نے تین طلاق دیدی ہیں اس سے نکاح کر سکتا ہے۔

اور حنفی المذہب ہرگز ایسی صورت میں دوسرے مذہب پر عمل نہیں کر سکتا۔ اور اگر عمل کرے گا فاسق بگناہِ کبیرہ ہوگا۔ کافر نہیں ہو سکتا۔

حررہ: العبد العاصی ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی
مفتی جامع مسجد اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر......195﴾

سوال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی منکوحہ کو صریحاً برضاءِ خویش تین طلاق دے دیں لیکن پھر عدت کے اندر رجوع کرے۔ ایسی حالت میں دائرہ اسلام میں کوئی صورت بھی ہے جو زید کو حرام سے بچائے یا عمر بھر زید حرام کا مرتکب رہا؟

سائل: سلامت اللہ کمیل کٹرہ آگرہ

الجواب

وھو الموفق للصواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں اگر اس نے اس طرح طلاق دی ہے کہ میں نے تجھ کو تین طلاق دی تو تین مغلظہ واقع ہوگئی۔ خواہ قبل ہم بستری اور خلوتِ صحیحہ کے اس طرح دی تھی یا بعد ہم بستری کے۔

اور اگر اس نے اس طرح طلاق جدا کر کے دی تھی کہ میں نے تجھ کو طلاق دی اور ایک اور ایک اور تو اگر اس کو بعد ہمبستری اور خلوتِ صحیحہ دی تھی جب بھی تینوں واقع ہو جائیں گی۔ اور اگر نکاح کرنے کے بعد قبل خلوتِ صحیحہ وہم بستری اس طرح کہا تھا تو فقط ایک طلاق بائن واقع ہوگی وہ اس سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔

اور پہلی اور دوسری صورت مذکور میں جب تک بعد عدت وہ عورت مطلقہ دوسرے شخص سے نکاح کر کے ہم بستر نہ ہوئے اور پھر دوسرا شوہر کسی طرح سے اس کو طلاق دے کر بائن اور جدا نہ کر دے اور اس کی عدت نہ گزر لے زوجِ اول کو کسی طرح حلال نہیں ہو سکتی۔ ھکذا فی کتب الفقہ اس واسطے کہ قرآن مجید میں اللہ جل شانہ بعد ذکر دو طلاق کے فرماتا ہے۔

فان طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره [1]

یعنی بعد دو طلاق کے اگر اس نے تیسری طلاق دیدی تو وہ اس کو حلال نہیں ہوگی جب تک دوسرے شخص سے نکاح کر کے ہم بستر نہ ہوئے چنانچہ حدیثِ عُسَیْلَہ [2] اس کی پوری مبین ہے۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی

عفی الله عنه وعن أبويه

---

[1] القرآن الحکیم : سورة البقره : آیت نمبر ۲۳۰

[2] حدیث عُسَیْلَہ : قلت رواه الأئمة الستة فی کتبهم من حدیث عائشة. قالت سئل رسول الله ﷺ عن رجل طلق امرأته ثلاثاً فتزوجت زوجا غیره فدخل بها ثم طلقها قبل أن یواقعها اتحل لزوجها الأول قال لا حتی یذوق الآخر من عسیلتها ما ذاق الاول.

(ترجمہ: میں کہتا ہوں اس حدیث کو چھ اماموں نے صحاح ستہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے ایک شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دیں۔ پھر دوسرے خاوند سے نکاح کر لیا۔ اس نے اس کے ساتھ خلوت کی۔ لیکن جماع سے قبل اسے طلاق دے دی کیا وہ اپنے پہلے زوج کے لیے حلال ہو جائے گی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں جب تک دوسرا خاوند اس کی تھوڑی سی شہید نہ چکھ لے جس طرح کہ پہلے خاوند نے چکھی تھی)

i	نصب الرایه : جلد ۳ صفحه ۲۳۷	ناشر المکتبة الاسلامیه
ii	صحیح البخاری : حدیث رقم : ۵۲۶۱	مکتبه دار السلام ریاض
iii	صحیح البخاری : حدیث رقم ۲۶۳۹	مکتبه دار السلام ریاض
iv	صحیح مسلم : حدیث رقم ۳۵۲۶ تا ۳۵۳۲	

محمد علیم الدین نقشبندی عفی عنہ

﴿فتویٰ نمبر...... 196﴾

سوال

ایک شخص نے حسبِ طلبِ خسریوں کہا کہ طلاق میں نے دی۔ میرے اللہ نے دی۔ طلاق، طلاق، تو کس قسم کی طلاق سمجھی جائے گی۔

جناب مولوی غلام محی الدین خاں صاحب

امام مسجد شاہجہاں پور ۱۷ دسمبر ۱۹۱۵ء

الجواب

یہ طلاق بائن ہوگئی۔ اور تکرار واسطے تاکید کے ہے۔ دوبارہ نکاح بغیر حلالہ ہوسکتا ہے۔

کتبہ المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

﴿فتویٰ نمبر...... 197﴾

سوال

ایک شخص بوجہ بخارِ طاعونی مسلوب الحواس تھا۔ زوجہ سے لڑائی ہوئی۔ زوجہ نے کہا کہ تو مجھ کو طلاق دے دے۔ اس نے کہا میں نے طلاق دی۔ پس شرعاً کیا حکم ہے؟

سائل: رحیم بخش، محلہ انٹہ شاہ جہان پور

۱۴ فروری ۱۹۱۶ء

الجواب

ایسی صورت میں اگر مرادِ شوہر طلاق کو واقع کرنا ہے تو طلاق ہو جائے گی ورنہ یہ کلام مشکوک ہے کیونکہ یہ بھی مطلب نکلتا ہے کہ میں (نے) طلاق تیرے ہاتھ دی تو ایسی حالت میں طلاق نہ ہوگی۔ کذا فی العالم گیری

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر...... 198﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماء دین وفقیہانِ شرعِ مبین اس مسئلہ میں کہ شوہر وزن میں کسی وجہ سے نا اتفاقی ہو گئی۔ شوہر نے اپنی بیوی کو حالت تنہائی میں طلاق دے دی۔ اور اس کے والدین کو بلا کر ان کے ہمراہ کر دیا۔ اور کہا کہ اپنی لڑکی کو لے جاؤ ہمارے کام کی نہیں۔ اس کے والدین اپنے مکان پر لے آئے۔ شوہر نے نکاح دوسرا کر لیا۔ لڑکی اپنے والدین کے ہاں موجود ہے جس کو دو برس ہو چکے ہیں۔ اس لڑکی کا نکاح دوسرا کسی اور جگہ کرنا چاہتے ہیں۔ حالت تنہائی میں طلاق درست ہے یا نہیں۔ بینوا و توجروا

سائل: حافظ محمد اسماعیل

۲۱ نومبر ۱۹۱۵ء

الجواب

وهو الملهم للحق والصواب

☆ طلاق کا واقع ہونا اور طلاق کا ثابت ہونا دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ طلاق کے واقع ہونے کے لیے گواہوں کی ضرورت نہیں۔

☆ تنہائی میں بھی اگر زوج زوجہ سے طلاق کے لفظ کہے گا تو طلاق پڑ جائے گی لیکن ایسی طلاق سے اگر زوج منکر ہو جائے تو حاکم گواہوں کے نہ ہونے کی وجہ سے طلاق کا حکم نہ دے گا۔ اس لیے کہ وہ ثبوت کا محتاج ہے۔ ہاں عنداللہ وہ طلاق ہو جائے گی۔

پس صورتِ مسئولہ میں اگر زوج اقراری ہے تو طلاق کا حکم دیا جاوے گا اور عورت کی عدت بعد طلاق سے منقضی ہو چکی ہے تو دوسرا نکاح کر سکتی ہے ورنہ نہیں۔ فقط:

عاجز محمد رمضان عفی عنہ
مفتی واعظ جامع مسجد آگرہ
مورخہ ۲۳ نومبر ۱۹۱۵ء

﴿فتویٰ نمبر......199﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس امر میں کہ زید نے اپنی بیوی کی رخصت کے بارے چند اشخاص معززین پنچان مقرر کے روبرو بحلف بیان کیا کہ میں خدا رسول کو پہچان کر صحیح بیان کرتا ہوں کہ میں اپنی زوجہ کے مکان پر آیا اور میں نے اپنے سالے امام الدین کے روبرو یہ کہا کہ میرا پچاس روپیہ کا زیور دیدو ورنہ میں اپنی زوجہ کو طلاق دیدوں گا۔ پس ایسی حالت میں طلاق ہوگئی یا نہیں؟ اور وہ رجوع کر سکتا ہے یا نہیں؟

سائل: مستری محمد بخش پنشن یافتہ مائی منڈی محلہ ہتائی

۲۳ شوال ۱۳۳۴ھ

الجواب

صورتِ مسئولہ میں طلاق واقع نہیں ہوئی' اس واسطے کہ وہ تو بحلف یہ کہتا ہے کہ میں نے طلاق نہیں دی' بلکہ میں نے یہ کہا تھا کہ طلاق دیدوں گا۔ لہٰذا اگر عورت مدعیہ طلاق ہے کہ اس نے یہ کہا تھا کہ میں تجھ کو طلاق دیتا ہوں یا میں نے تجھ کو طلاق دی ☆ تو اس امر کے دو گواہ عادل پیش کرے۔ اگر گواہ اس کے دعویٰ کے مطابق گواہی دیدیں۔ ☆ ایک طلاق رجعی واقع ہوگی۔ ☆ جس کا حکم یہ ہے کہ ایامِ عدت میں اگر وہ کہہ دے کہ اپنی طلاق سے رجوع کرتا ہوں یا اپنی بیوی سے کوئی معاملہ میاں بی بی کا کرے تو بلا نکاحِ (جدید) وہ نکاح میں رہے گی اور اگر گواہ پیش نہ کر سکے شوہر کا حلف کافی ہے۔ طلاق بالکل واقع نہ ہوگی۔ حدیث صحیح ہے۔

☆ البینة علی المدعی والیمین علی من انکر[1]

(ترجمہ: گواہ پیش کرنا مدعی کے ذمہ ہے اور انکار کرنے والے کے ذمہ قسم اٹھانا ہے)

لہٰذا شوہر کو بغیر حلف یعنی خدا کی قسم کے انکار طلاق پر گواہ پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ منکر کی گواہ مقبول۔

حررہ: العبد الراجی

ابو محمد محمد دیدار علی رمفتی جامع مسجد اکبر آباد

---

[1] الجامع الصغیر مع شرحہ فیض القدیر' جلد ۳ صفحہ ۲۲۵' مطبوعہ در المعرفہ بیروت

﴿فتویٰ نمبر...... 200﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید نے بکر کو بھنگ پلا کر اس کی زوجہ کے ساتھ زنا کیا۔ اور جب بکر کو نشہ سے افاقہ ہوا اس نے ان دونوں کو مشغولِ زنا پایا۔ تب بکر نے اپنی زوجہ کو جھڑک کر نکال دیا۔ آیا بکر کی زوجہ اس کے عقد میں رہی یا نہیں؟ بینوا توجروا

۱۹صفر ۱۳۳۵ھ

رحیم بخش محلہ نوربی دروازہ آگرہ

الجواب

صورتِ مسئولہ میں بوجہِ زنا زید کے بیوی بکر کے نکاح سے نہیں نکلی۔ اگر وہ توبہ کرتی ہے کہ آئندہ کبھی ایسا فعلِ بد نہ کرے گی بلا تکلف جائز ہے کہ بکر اس کو بلا لے اور بیوی سمجھے۔

اور اگر اس نے حالتِ غصہ میں بہ نیتِ طلاق اس طرح بھی کہہ دیا تھا کہ جا میرے گھر سے نکل جا تو لازم ہے کہ دو گواہوں کے سامنے پھر نکاح کرے۔

اور اگر بوقت کہنے ایسے لفظ کے کچھ نیت نہ تھی تو ضرورت نکاح بھی نہیں مگر احتیاطا پھر نکاح کر لینا بہتر ہے۔

حررہ: العبدالراجی

محمد دیدار علی جامع مسجد اکبر آباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر...... 201﴾

سوال

ایک شخص بیمار تھا اور دماغ میں نقص بعارضۂ بخار ہو گیا تھا اس اثنا میں اپنی بی بی سے تکرار کر کے کہا جا میں نے طلاق دی' طلاق دی طلاق دی۔ تو شرعاً کیا حکم ہے؟

سائل: رحیم بخش' محلہ انٹہ شاہ جہان پور

۲۰ فروری ۱۹۱۶ء

الجواب

اس صورت میں طلاق نہ ہوگی۔ فتاوی حامدیہ میں ہے۔

سئل فی رجل مرض مرضا اوصل فیه الی اختلال العقل بحیث اختل کلامه المنظوم و باح بسره المکتوم و صدر منه ما یصدر عن المجانین یطلق زوجته فی هذه الحالة فما الحکم.

الجواب اذا ثبت زوال عقله و عدم وعیه لا یقع علیه طلاق و لا یطالب الصداق اذا کان الحال علی هذا المنوال فانه حینئذ مجنون و للجنون فنون. انتهی.[1]

(ترجمہ: ایک شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو ایسا بیمار ہو گیا کہ اس کی عقل میں خلل واقع ہو گیا۔ اس طرح سے اس کی مرتب کلام میں خرابی پیدا ہو گئی۔ اس نے اپنا پوشیدہ راز ظاہر کر دیا۔ اور اس سے وہ افعال صادر ہوئے جو پاگلوں سے سرزد ہوتے ہیں۔ اس نے اپنے بیوی کو اس حالت میں طلاق دے دی۔ تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ جب اس کی عقل زائل ہونا اور اس کا محفوظ نہ رہنا ثابت ہو گیا تو جب تک یہ حالت ہے اس کی طلاق واقع نہ ہوگی۔ اور نہ ہی اس سے مہر کا مطالبہ کیا جائے گا۔ کیوں کہ وہ پاگل ہے اور پاگل پن کی کئی قسمیں ہیں۔)

کتبہ: المفتی محمد اعظم شاہ غفرلہ

---

[1] تنقیح الفتاوی الحامدیہ جلد اول صفحہ ۴۲ مطبوعہ مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر......202﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس بارے میں کہ بترغیب میری خوش دامن یعنی ساس کے دو شخص رشتہ دار مجھے اپنے مکان پر لے گئے۔ میں اس وقت کسی قدر نشہ میں تھا۔ انہوں نے ایک کاتب کو اپنے مکان پر بلا کر اور اپنے صرف سے کاغذ منگوا کر' میری جانب سے ایک فارغ خطی اس سے تحریر کرائی۔ اور مجھ سے کہا کہ اس پر اپنے انگوٹھے کا نشان کر دو۔ چونکہ اس وقت کسی قدر نشہ میں تھا' میں نے اپنے انگوٹھے کا نشان اس پر کر دیا۔ جب میرے ہوش و حواس درست ہوئے' تو معلوم ہوا کہ تحریر شدہ کاغذ پر میرے انگوٹھے کا نشان مجھ سے کرایا گیا ہے۔ اور میری زوجہ منکوحہ کو وہ کاغذ پڑھ کر سنایا گیا تو اس نے بھی میری اس تحریر فارغ خطی کو مستند نہیں سمجھا کہ میرا شوہر نشہ میں ہے۔ میرے تین بچے اس بی بی کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں' جو موجود ہیں۔ ایسی صورت میں بعد استغفار اور توبہ کے میں اپنی زوجہ منکوحہ کو اپنے عقد میں لے سکتا ہوں یا مجھے کیا کرنا چاہیے؟

سائل: وزیر الدین

آگرہ گھٹیا اعظم خان

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں وزیر الدین کو جائز ہے کہ شراب و ترکِ نماز وغیرہ جملہ افعالِ قبیحہ سے توبہ کر کے اپنی زوجہ کو اپنے گھر لے آئے۔ اس واسطے کہ بحالتِ نشہ نادرستی حواس اگر خود شوہر بھی اگر اپنی زوجہ کے نام طلاق نامہ لکھ دے وہ جب ہی معتبر ہوگا یعنی طلاق واقع ہوگی جب کاتب طلاق نامہ لکھ کر اس شخص کو سارا مضمون سنا دے پھر وہ شخص اس طلاق نامہ کو لیکر اپنی مہر یا دستخط کر کے خود اپنی زوجہ کے پاس بھیج دے یا کسی دوسرے شخص

یا خود کاتب کو حکم کرے کہ اس کو میری زوجہ کے پاس بھیج دو۔

کما فی صفحہ ۴۰۲ من فتاوی العالمگیریہ المطبوعۃ فی المصر:

رجل استکتب من رجل آخر الی امراتہ کتابا بطلاقھا وقرأہ علی الزوج فاخذہ وطواہ وختم و کتب فی عنوانہ و بعث بہ الی امراتہ فاتاھا الکتاب اقر الزوج انہ کتابہ فان الطلاق یقع علیھا و کذالک لو قال لذالک الرجل ابعث بھذ الکتاب الیھا الخ [1]

(ترجمہ: ایک شخص نے کسی دوسرے آدمی سے اپنی بیوی کو طلاق دینے کے لیے خط لکھوایا اس نے وہ خط لکھ کر اس خاوند کے سامنے پڑھا۔ خاوند نے اسے لپیٹا' اس پر مہر لگا کر دی۔ اور پتہ لکھ کر بیوی کی طرف اسے ارسال کر دیا وہ خط اس بیوی کے پاس پہنچا' خاوند نے اقرار کیا یہ اس کا خط ہے تو اس عورت پر طلاق واقع ہو جائے گی اور اسی طرح یہ حکم اس صورت میں بھی ہے جب خاوند نے اس لکھنے والے آدمی سے کہا یہ خط میری بیوی طرف بھیجئے دو)

اور یہاں امورِ مذکور موجبِ طلاق سے کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی ہے بلکہ سرے سے شوہر کو بذات خود طلاق نامہ لکھوانے سے انکار ہے۔ نہ اس نے اپنی بیوی کو دیا۔ نہ خود بھیجا۔ نہ کسی سے بھجوایا۔ بلکہ اس کو تو بحالتِ نشہ نشانِ انگوٹھا ہی کی خبر ہے جو قابلِ اعتبار نہیں۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی مفتی جامع مسجد اکبر آباد

❁❁❁❁❁

---

[1] الفتاوی العالم کیریۃ مع ترجمہ اردو جلد ۸ صفحہ ۳۲۰ مطبوعہ فضل ربی پریس روالپنڈی

﴿فتویٰ نمبر......203﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارہ میں کہ زید نے بحالتِ دیوانگی جس سے تمام شہر واقف ہے اپنی زوجہ کو طلاق لکھ دی تو اندریں صورت طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟۔بینوا توجروا

۱۳ اکتوبر ۱۹۱۶ء

دھوراجی ملک کاٹھیاواڑ عطر فروش موسیٰ علی محمد

الجواب

بسم الله الرحمن الرحيم.

اللهم رب زدني علما.

صورتِ مسئولہ میں اگر فی الواقع بحالتِ دیوانگی و بیہوشی شخصِ مذکور نے طلاق دی تھی یا لکھ دی تھی یا لکھوا دی تھی اور فی الحقیقت اس کے ہوش وحواس اور عقل سالم نہ تھی تو یہ طلاق بالکل واقع نہیں ہوئی۔اور اس کی زوجہ بدستور اس کے نکاح میں ہے۔

چنانچہ ہدایہ میں ہے:۔

ولا يقع طلاق الصبي والمجنون والنائم لقوله عليه الصلوة والسلام كل طلاق جائز الاطلاق الصبي والمجنون الخ[1]

(ترجمہ: نابالغ لڑکے، پاگل اور سوئے ہوئے آدمی کی طلاق واقع نہیں ہوتی کیوں کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے نابالغ اور پاگل الخ کے علاوہ ہر مرد کی طلاق جائز ہے)

اور درمختار میں ہے:۔

---

[1] الهداية جلد ۳ صفحه ۱٦۱ مطبوعه ادارة القرآن والعلوم الاسلاميه كراچى

ولا یقع طلاق المولی علی امراۃ عبدہ والمجنون و الصبی والمعتوہ من العتہ وھو اختلال العقل والمبرسم والمغمی علیہ والمدھوش والنائم انتھی مختصرا[1]۔

(ترجمہ: مالک کی اپنے غلام کی بیوی کو دی ہوئی' مجنون' نابالغ' معتوہ' یعنی جس شخص کی عقل میں خرابی اور خلل ہو یہ لفظ ''عتہ'' سے مشتق ہے جس کا معنی ہے عقل میں خرابی' برسام کے مریض' غشی میں مبتلا' مدہوش (خوف یا حیاء کے باعث جس کی عقل جاتی رہے) اور سوئے ہوئے شخص کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔)

حررہ: العبد العاصی

محمد دیدار علی الرضوی مفتی

جامع مسجد اکبرآباد

✿✿✿✿✿

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۳۳۴ مطبوعہ بیروت

نوٹ: یہ عبارت الدر المختار کے متن تنویر الابصار کی ہے۔ صرف چند الفاظ در مختار کے ہیں۔

﴿فتویٰ نمبر......204﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں ایک شخص نے چلہ کھینچا۔قبل کھینچنے چلہ کے وہ شخص سنی مسلمان تھا۔بعد چلے کھینچنے کے معلوم ہوا کہ وہ اپنی حالت پر نہیں رہا۔بلکہ اس کا دماغ خراب ہوگیا۔سب سے پہلے اس نے یہ کیا کہ شیعہ مذہب اختیار کیا اس کے بعد جس نے اس سے جو کچھ کہا یا جس مذہب کی تعریف کی گئی اس مذہب کو اختیار کر لیتا ہے خلاف اہل سنت و جماعت کے۔کسی نے کچھ سوال کیا تو بے ہودہ جواب دیتا ہے۔ اپنے کمانے کھانے کے کاروبار کو بخوبی انجام دیتا ہے۔کسی عزیز کی اچھی بات کو سنتا نہیں ہے۔کبھی ایسا کرتا ہے کہ ننگے سر ننگے پاؤں بازاروں میں گلیوں میں پھرتا ہے۔اس وجہ سے اس کی زوجہ منکوحہ کو اس کے عزیزوں نے اپنے گھر میں ڈال رکھا ہے۔اور یہ کہتے ہیں کہ اس کی بیوی نکاح سے باہر ہوگئی ہے۔کبھی رخصت نہ کریں گے۔بازاروں میں پھرنے سے یہ غرض نہیں کہ دن رات جیسے دیوانے پھرتے ہیں اس طرح پھرتا ہے۔نہیں کسی وقت وہ ننگے سر و پاؤں چل دیتا ہے۔اپنے قیمتی کپڑوں کو قلیل قیمت میں فروخت کر دیتا ہے۔ایک دن دو دن جنگل میں جا پڑتا ہے۔ایسی حالت میں اس کی زوجہ اس کے عقد سے باہر ہوگئی؟ کیا ایسی حالت میں نکاح اس کا فسخ ہوگیا؟

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

شوہر کے مجنون یا مخبوط ہونے سے عورت نکاح سے نہیں خارج ہوتی۔اس واسطے کہ اگر نکاح سے خارج ہوجائے فقہا اس کی طلاق کے وقوع اور عدمِ وقوع سے کیوں بحث کرتے۔

درمختار میں ہے صفحہ ۴۶۱۔۴۶۲:

ولا یقع طلاق المولی علی امراۃ عبدہ والمجنون والصبی والمعتوہ من العتہ و ھو

اختلال فی العقل والمبرسم من البرسام بالکسر علة کالجنون والمغمٰی علیه مختصرا بقدر الحاجة[1]

(ترجمہ: مالک اگر اپنے غلام کی بیوی کو طلاق دے تو واقع نہ ہوگی۔اسی طرح پاگل' بچے' معتوہ یعنی جس کی عقل میں خلل ہو' برسام کے مریض اور بے ہوش کی طلاق واقع نہیں ہوتی برسام جنون کی مانند ایک بیماری ہے)

☆ بلکہ علامہ شامی علیہ الرحمۃ تو یہاں تک تحریر فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے حالتِ صحت میں کہہ دیا کہ اگر میں فلاں مکان میں قدم رکھوں تجھ پر تین طلاق پھر وہ دیوانہ ہو گیا اور اس مکان میں داخل ہو گیا۔طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر اس نے یوں کہا اگر میں دیوانہ ہو جاؤں تو تجھ پر تین طلاق یا دو طلاق اور وہ دیوانہ ہو گیا۔ اندریں صورت عورت پر طلاق واقع نہ ہوگی۔اس واسطے کہ وقوعِ طلاق مشروط وقتِ شرط کے ہوتا ہے اور وہ بوقت دیوانگی اہلِ طلاق نہیں۔چنانچہ صفحہ ۴۶۲ شامی میں ہے

قوله والمجنون الا اذا علق عاقلا ثم جن فوجد الشرط کقوله ان دخلت الدرا فدخلها مجنونا بخلاف ان جننت فانت طالق فجن لم یقع کذا ذکره الشارح فی باب نکاح الکافر فالمراد اذا علق علی غیر جنونه[2]

(ترجمہ: قولہ: مجنون کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ہاں اس صورت میں اس کی طلاق واقع ہوگی جب اس نے بحالتِ عقل طلاق کو کسی شرط کے ساتھ معلق کیا پھر اسے جنون لاحق ہوا اور شرط پائی گئی۔مثلاً حالتِ صحت میں اس نے کہا اگر میں گھر میں داخل ہوں تو تجھے طلاق پھر وہ جنون کی حالت میں گھر میں داخل ہوا تو طلاق واقع ہوگی بخلاف اس کے اگر خاوند نے کہا اگر میں پاگل ہو جاؤں تو تجھے طلاق پھر وہ پاگل ہو گیا تو طلاق نہ ہوگی۔شارح یعنی صاحب درمختار نے نکاح الکافر کے باب میں ایسے ہی ذکر کیا ہے۔تو مجنون کی بصورتِ تعلیق طلاق واقع

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۴۳۱ تا ۴۳۳ مطبوعہ احیاء التراث العربی بیروت

[2] رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۴۳۲ مطبوعہ احیاء التراث العربی بیروت

ہونے کی صورت یہ ہے جب کہ اس نے اپنے جنون کے علاوہ کسی اور شرط پر طلاق کو معلق کیا ہو۔)

☆ البتہ اگر خدانخواستہ کوئی حالتِ صحت اور درستیء حواس میں کوئی کلمہ کفر کا کہہ بیٹھے مثلا کہہ دے میں نماز نہیں پڑھتا نعوذ باللہ منھا یا خدایا رسول اللہ ﷺ کی شان میں اور عند البعض خلفاءِ راشدین کی شان میں گالی دے بیٹھے یا کلماتِ توہین زبان سے نکال دے نعوذ باللہ من کلھا تو ضرور وہ مرتد ہو جائے گا۔ اور اس کی بیوی اس کے نکاح میں نہ رہے گی۔ ☆ اور حالتِ جنون اور بے ہوشی میں تو ایسے کلمات کا بھی کچھ اعتبار نہیں۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابومحمد محمد دیدار علی المفتی فی جامع اکبر آباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر……205﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ کسی شخص کی زوجہ بلا اجازت اپنے شوہر کے نو دس شب کو اپنی ماں کے ساتھ گھر سے باہر نکل گئی۔ بازار کے دو کانداروں نے دیکھا کہ دو عورتیں جارہی ہیں۔ ایک کوئی مرد بھی ان کے پیچھے تھا۔ جب اس کے شوہر کو خبر ہوئی کہ عورت اس طرح چلی گئی تو اس نے تلاش کیا۔ تو اس عورت کی ماں سے دریافت کیا کہ تمہاری لڑکی کہاں گئی؟ اس نے پہلے تو یہ کہا کہ مجھ کو معلوم نہیں۔ اور پھر یہ کہا وہ اپنے عزیز کے ہاں پڑوس میں ہے۔ اس حالت میں وہ (جس) شخص کی بیوی چلی گئی اجازتِ نکاح میں رہی یا نہیں؟۔ بینوا توجروا

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

☆ بلا اجازت اگر عورت شوہر کے گھر سے نکل جائے نکاح نہیں ٹوٹتا۔ البتہ عورت گناہ گار ہوگی۔ اس کو چاہئے کہ توبہ کرے۔ صفحہ ۳۴۲ کتاب الترغیب والترھیب مطبوعۃ حاشیۃ مشکوۃ میں ہے:

☆ عن ابی امامۃ رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال لتغضن أبصارکم ولتحفظن فروجکم او لیفسکن اللہ وجوھکم [۱] (رواہ الطبرانی)

☆ (ترجمہ: حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اپنی آنکھوں کو حرام امور سے بند رکھو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرو۔ ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کو مسخ فرمادے گا)

و عن عائشۃ رضی اللہ عنھا قالت بینما رسول اللہ ﷺ جالس فی المسجد اذ دخلت امراۃ من مزینۃ ترفل فی زینۃ لھا فی المسجد فقال النبی ﷺ یا ایھاالناس انھوا

---

[۱] الترغیب والترھیب: جلد ۳، صفحہ ۳۷ دار الاحیاء التراث العربی۔

نسائکم عن لبس الزینة والتبختر فی المسجد فان بنی اسرائیل لم یلعنوا حتی لبس نسائهم الزینة و تبختر وا فی المساجد رواه ابن ماجه[1]

☆(ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ اچانک مزینہ قبیلہ کی ایک عورت اپنی زیب وزینت میں بنی ٹھنی مسجد میں داخل ہوئی۔ نبی کرم ﷺ نے فرمایا اے لوگو! اپنی عورتوں کو مسجد میں بناؤ سنگار کا لباس پہننے اور ناز وانداز کے ساتھ چلنے سے منع کرو۔ کیونکہ بنی اسرائیل پر ان کی عورتوں کے مسجدوں میں زینت کا لباس پہننے اور ناز و ادا سے چلنے سے پہلے لعنت نہ ہوئی)

یعنی حضور ﷺ نے عورتوں کو فرمایا کہ اپنی نگاہوں کو غیر مردوں کو دیکھنے سے روکو۔ شرم گاہوں کو محفوظ رکھو۔ اور فرمایا کہ اے لوگو! عورتوں کو لباسِ زینت کے ساتھ مسجدوں میں اترا کر چلنے سے منع کرو۔ بنی اسرائیل ایسے ہی امور سے تو ملعون ہو گئے تھے۔

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی
ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبرآباد

❁❁❁❁❁

---

[1] الترغیب والترہیب : جلد ۳، صفحہ ۸۵ دار الاحیاء التراث العربی۔

﴿فتویٰ نمبر...... 206﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں صورت کہ زیدن نے قبل نکاح زید سے یہ شرط کرلی کہ میں تجھ سے نکاح اس شرط پر کروں گی کہ اگر تو مجھ کو تکلیفِ نان نفقہ دے یا اور کچھ تکلیف دے تو مجھ کو اپنے نفس کا اختیار ہوگا۔ اندریں صورت زیدن عند التکلیف مختارِ طلاق ہوگی یا نہ ہوگی۔؟

۲۴ ربیع الاول ۳۶ھ

حمید حسن اکبر آبادی

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں یہ امر تو ظاہر ہے کہ قبل ایجاب وقبول جو بھی شرط بہ نسبت اختیارِ طلاق درمیان خاطب ومخطوبہ کے قرار پائے جیسا کہ بیانِ عبارت سے ظاہر ہے تو زیدن ہرگز مختارِ طلاق نہ ہوگی۔ اس واسطے کہ قبل ایجاب وقبول زید خود طلاق کا مالک نہیں ہے تو دوسرے شخص کو یا خود اپنی مخطوبہ کو جس کو قبل النکاح بلفظ زوجہ تعبیر کیا ہے اختیارِ طلاق کیا دے سکتا ہے۔

کما ھو ظاھر من عبارۃ الدر المختار المذکورۃ فی صفحۃ ۴۹۹ من الجزء الثانی المطبوعۃ فی مصر مع رد المحتار

قال زوجنی ابنتک علی ان امرھا بیدک لم یکن لہ الامر لانہ تفویض قبل النکاح[1]

(ترجمہ: ایک شخص نے کہا اپنی لڑکی کا نکاح میرے ساتھ اس شرط پر کردے کہ اس کا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہوگا تو اس صورت میں معاملہ اس باپ کے اختیار میں نہ ہوگا کیونکہ یہ نکاح سے پہلے طلاق کی تفویض ہے)

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۸۰ احیاء التراث العربی بیروت

☆ اور اگر مقصودِ سائل یہ ہے کہ ایجاب ہی اس شرط پر واقع ہوا یعنی عورت کے وکیل نے وقتِ عقد دولہا سے یہ کہا کہ میں اپنی موکلہ کو تمہارے عقد نکاح میں اس شرط پر دیتا ہوں کہ اگر تم اس کو نان ونفقہ نہ دو یا تکلیف دو تو مجھے موکلہ کو تین طلاق دے لینے کا اختیار ہے۔ یا خود عورت نے کہا میں اس شرط پر اپنے نفس کو تمہارے عقد میں دیتی ہوں کہ اگر تم مجھ کو نان ونفقہ نہ دو اور تکلیف دو تو مجھ کو تین طلاق دینے کا اختیار ہے اور اس کے جواب میں بکر نے کہا کہ میں قبول کرتا ہوں تو بلاشبہ عورت یعنی زیدن اپنے نفس کو طلاق دینے کی مختار ہوگی۔

صفحہ ۲۹۹ جلد ثانی ردالمحتار مذکورہ میں ہے:

(قوله لم يكن له الامر) ذكر الشارح في آخر باب الامر باليد نكحها على ان امرها بيدها صح[1].

لكن ذكر في البحر هناك ان هذا لو ابتدأت المراة فقالت زوجت نفسي على ان امري بيدي اطلق نفسي كلما اريد او على اني طالق فقال قبلت وقع الطلاق و صار الامر بيدها اما لو بدأ هو لا تطلق ولا تصير الامر بيدها[2].

(ترجمہ: قولہ: اس صورت میں باپ کو اختیار نہ ہوگا۔ شارح یعنی صاحب الدرالمختار نے الأمر بالید کے باب کے آخر میں ذکر فرمایا کہ اگر اس شرط پر نکاح کیا کہ اس منکوحہ کا معاملہ اس کے ہاتھ میں ہوگا تو صحیح ہے۔ لیکن بحرالرائق میں وہاں ذکر فرمایا کہ اگر گفتگو کا آغاز عورت نے کیا اور کہا میں اپنا نکاح اس شرط پر کرتی ہوں کہ میرا معاملہ میرے ہاتھ میں رہے گا میں جب چاہوں اپنے آپ کو طلاق دے دوں یا کہا میں جب چاہوں طلاق یافتہ ہوں گی اس پر مرد نے کہا مجھے قبول ہے تو طلاق واقع ہوگی۔ اور معاملہ منکوحہ کے ہاتھ میں ہو جائے گا۔ اور اگر کلام کا آغاز مرد نے کیا تو طلاق نہ ہوگی اور نہ ہی اس منکوحہ کا معاملہ اس کے ہاتھ میں ہوگا)

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ
محمد دیدار علی الرضوی المفتی فی جامع اکبرآباد

---

[1] الدر المختار جلد ۴ صفحہ ۴۳۱ دار احياء التراث العربي بيروت
[2] رد المحتار جلد ۴ صفحہ ۸۰ دار احياء التراث العربي بيروت

خلع

﴿فتویٰ نمبر...... 207﴾

سوال

از بھرت پور مخدوم ومکرم مولانا دیدار علی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ عرض یہ ہے کہ میری لڑکی کو اس کے شوہر نے عرصہ سے تنگ کر رکھا تھا۔اور عرصہ تین سال سے میرے مکان پر چھوڑ رکھا ہے۔اور تین چار ماہ ہوئے جب اس نے دوسری شادی بھی کرلی۔اس لیے میری لڑکی خلع چاہتی ہے یہاں پر عدالتیں ہندو ہیں وہ خلع کی ڈگری دیں گی تو کیا شرع سے ان کی ڈگری جائز ہوگی؟

۶ رمضان المبارک ۳۶ھ

چودھری شمس الدین معرفت بابو حفیظ اللہ

الجواب

خلع شریعت میں اپنی بیوی کو اپنے نکاح سے جدا کرنے کو کہتے ہیں لفظ خلع یا لفظ طلاق کے ساتھ کم از کم دس درہم یا اس سے زیادہ جس قدر چاہے نقد یا جنس کے عوض میں۔

چنانچہ بحرالرائق مطبوعہ مصر کے صفحہ ۷۰ جلد رابع میں ہے:۔

الخلع هو الفصل من النكاح الواقع به و بالطلاق على مال طلاق بائن و لزمها المال[1]

(ترجمہ: خلع نکاح سے علیحدگی ہوتی ہے جو اس کے ساتھ اور مال کی شرط پر طلاق کے ساتھ ہوتی ہے یہ طلاق بائن ہوتی ہے اور عورت پر مال لازم ہوجاتا ہے)

☆ لہٰذا خلع کے ساتھ ایک طلاق بائن واقع ہوجائے گی اور جس قدر برضامندی طرفین معاوضۂ طلاق ٹھہر جائے عورت پر اس کا ادا کرنا لازم ہوگا۔اس واسطے حاکم سے حکم لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔

---

[1] کنز الدقائق مع البحر الرائق : جلد ۴، صفحہ ۷۷، ۸۰، دار المعرفہ بیروت

☆ البتہ اگر مرد بعوضِ مال یا بعوضِ معافیٔ مہر بھی طلاق نہ دے تو ایسی صورت میں حاکم پر لازم ہے کہ اس کو مجبور کر کے اس سے جبراً یہ کہلوا دے کہ میں نے اپنی بیوی مسماۃ فلان کو طلاق دی۔ اس واسطے کہ طلاق جبرا کہلوا دینے سے بھی ہو جاتی ہے۔ پھر تین حیض گزر جانے کے بعد اس کو اختیار ہے جس سے چاہے نکاح کرے۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبر آباد

ظہار

﴿فتویٰ نمبر...... 208﴾

سوال

مسمی بنواولد گیندا قوم سقہ ساکن موضع نونہائی علاقہ تھانہ شہر آگرہ نے اپنی زوجہ مسماۃ نسو عمر تخمینا ۲۵ سال کو مسمی مٹھو قوم سقہ کے ساتھ زنا کرتے ہوئے گھر میں اپنے دیکھ لیا۔اس بات پر اس نے اپنی زوجہ کو مارا اور ناک کاٹنے پر آمادہ ہوا۔عورت بھاگ گئی۔دو کھیت بھاگی ہوگی کہ بستی نگر نے بیچ بچاؤ کیا تو بنوا مذکور نے اپنی زوجہ کی نسبت یہ کہا کہ یہ عورت میری مثل ماں ہے اور میرے کام کی نہیں ہے۔تمام بستی میں یہی الفاظ کہتا چلا گیا کہ سب نے سنے تھے۔اور اب مسماۃ اپنے شوہر کے گھر ہے۔ایسی حالت میں کیا نکاح درست رہا یا نہیں رہا؟

۱۹صفر ۱۳۳۵ھ

تراب علی۔نونہائی ضلع آگرہ محلّہ تھانہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

زنا کرنے سے تو نکاح نہیں ٹوٹا مگر اس نے جو یہ کہا ہے کہ تو میری مثل ماں یا بہن کے ہے اگر وقت کہنے اس لفظ کے اس کی کچھ نیت نہ تھی یا یہی نیت تھی کو تو مثل ماں بہن کے ہے مجھ پر حرام ہے تو ظہار ہو گیا۔

☆اور بصورتِ ظہار اس کو اپنی بیوی سے ہم بستری جائز نہیں ☆ جب تک دو مہینے برابر بلا فاصلہ روزے نہ رکھ لے۔اور اگر روزے کی طاقت نہیں رکھتا تو ساٹھ غریبوں کو مسکینوں کو خواہ چھٹانک دو سیر (ہر مسکین کو) ایک ہی دن گیہوں دے دے یا دو وقتہ کھانا کھلائے۔خواہ دو مہینہ تک ایک ہی مسکین کو برابر ساٹھ دن تک دو وقتہ کھانا کھلائے۔

چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

والذین یظاھرون من نسائھم ثم یعودون لما قالوا فتحریر رقبۃ من قبل ان یتماسا

ذلکم توعظون به والله بما تعلمون خبیر o فمن له یجد فصیام شهرین متتابعین من قبل ان یتماسا فمن لم یستطع فاطعام ستین مسکیناط۱ .

(ترجمہ: جولوگ ظہار کر بیٹھیں اپنی عورتوں سے، پھر اپنی کہی ہوئی بات سے رجوع کریں تو ان پر لازم ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام کو آزاد کردیں۔اس کے ذریعہ تم کو نصیحت کی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔جس شخص کو غلام دستیاب نہ ہوسکے تو ایک دوسرے کو چھونے سے پہلے اس کے ذمہ لگاتار دو ماہ کے روزے رکھنا لازم ہے۔اور جس کو اس کی استطاعت بھی نہ ہو تو اس پر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے)

اور پہلے روزے رکھنے یا کھانا کھلانے کے بعد اس بات اسے کہنے کے اس نے صحبت کر لی ہے تو استغفار کرے اور توبہ کرے۔اور اب جب تک ساٹھ روزے پے در پے نہ رکھے یا ساٹھ آدمیوں کو کھانا نہ کھلائے اس سے ہم بستر نہ ہو۔فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ

ابو محمد محمد دیدار علی مفتی جامع مسجد اکبرآباد

✿✿✿✿✿

ط۱ القرآن المجید: سورۃ المجادلہ: آیت نمبر ۳، ۴

﴿فتویٰ نمبر...... 209﴾

سوال

بخدمتِ شریف جناب علماءِ دین صاحب بعد سلام علیک کے واضح ہو کہ خاوند اور بیوی میں جھگڑا ہوا ۔ بیوی اپنے خاوند سے الگ ہو کر پردیس چلی گئی ۔ بعد ایک سال کے واپس آئی ۔ لوگوں نے سمجھا کر خاوند اور بیوی کا ملاپ کرا دیا۔ بعد چند روز کے پھر بیوی جھگڑا کر کے اپنے باپ کے ہمراہ چلی گئی ۔ پھر خاوند جا کر بیوی کو اپنے خسر کے ہاں سے لے آیا۔ پھر دو چار روز کے بعد جھگڑا ہوا اور اس بات پر کہ خاوند ذرا دیر سے مکان پر آیا تو بیوی نے تم کہاں تھے خاوند نے کہا کہ میری اب تو ماں بہن کے برابر ہے بیوی نے کہا آج کل کا زمانہ ایسا ہی ہے کہ ماں بہن کہتے جائیں اور گھستے جائیں ۔ تو خاوند نے غصہ میں آ کر یہ کہہ دیا کہ میں تجھ کو بھی ماں بہن کے برابر سمجھتا ہوں ۔ فقط

۱۱شوال ۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صورتِ مسئولہ میں اگر مراد اس کی یہ تھی کہ تجھ کو میں مثل اپنی ماں کے بزرگ سمجھتا ہوں جب تو اس کہنے سے کچھ نہیں ۔ اور اگر مراد یہ تھی کہ تیری پیٹھ پر بغرضِ وطی سوار ہونے کو مثل اپنے ماں کی پیٹھ کی سواری کے بغرضِ فعلِ بد حرام سمجھتا ہوں جس کو ظہار کہتے ہیں ☆ تو اس کو اس بیوی سے جب تک ہم بستری حرام رہے گی جب تک کفارۂ ظہار نہ دے لے ۔ ☆ اور وہ ایک غلام آزاد کرنا ہے ۔ اور اگر اس کی طاقت نہ رکھے تو دو مہینہ کے روزہ رکھنا ہے پے در پے اس طرح کہ بیچ میں ایک دن بھی افطار نہ کرے ۔ ☆ اور اگر بوجہ بڑھاپے یا مرض کے مطلقا روزہ کی طاقت نہ رکھے ساٹھ مسکینوں کو دو دفعہ ترکاری سے پیٹ بھر کر کھانا کھلانا ہے یا ساٹھ مسکینوں کو فی مسکین سوا تین چھٹانک دو سیر گیہوں دے دینا ہے ۔

مگر غالبا جہال اس کہنے سے بحسب عرف یہ دونوں بات مراد نہیں ہوتے بلکہ اکثر اس کہنے سے مراد

طلاق ہوتی ہے۔ بہرنہج اگر اس کی مراد طلاق تھی تو ایک طلاق بائن ہو جائے گی۔ لہٰذا اگر یہی مراد ہے تو اس کو چاہیے کہ کم از کم دو گواہوں کے روبرو پھر سے نکاح یعنی ایجاب وقبول کر لے۔ اور اگر وقت کہنے ان کلمات کے کچھ بھی نیت نہ تھی تو نہ کفارہ کی حاجت نہ جدید نکاح کی ضرورت۔

چنانچہ صفحہ ۵۲۶ سے صفحہ ۵۳۴ در مختار مطبوعہ مصر علی ہامش ردالمحتار میں ہے:

و ان نوى بانت على مثل امى او كامى و كذا لو حذف على خانية برا او ظهارا او طلاق صحت نيته و وقع مانواه لانه كناية والا ينو شيًا او حذف الكاف لغا و تعين الاولى[1]

(ترجمہ: اگر عورت کو یہ کہہ کہ تو مجھ پر میری ماں کی مثل ہے یا مجھ پر ماں کی طرح ہے مراد لی اور اسی طرح "مجھ پر" کے الفاظ کو حذف کر کر کے باقی الفاظ کہے اور مراد اس سے بزرگی یا ظہار یا طلاق کی ہو تو اس کی نیت درست ہے۔ اور جس کی نیت کی وہی واقع ہوگا کیونکہ یہ لفظ کنایہ کا ہے۔ اور اگر کچھ نیت نہ کی یا "طرح" کے لفظ کو حذف کر کے کہا تو یہ کلام لغو ہے۔ اور پہلی صورت یعنی بزرگ مراد ہونا متعین ہو جائے گا) فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبر آباد

❁❁❁❁❁

---

[1] الدر المختار رد المحتار: جلد ۵، صفحہ ۱۰۳، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ

عین

﴿فتویٰ نمبر......210﴾

سوال

بحضور فیض گنجور جناب مولانا مولوی مفتی صاحب جامع مسجد آگرہ۔

علمائے دین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں کہ فدویہ کا نکاح زمانہ نابالغی میں ہوا اور نکاح کو عرصہ قریب پانچ سال کا ہو چکا ہے۔ اور فدویہ اب تین سال خاوند کے مکان پر رہی بالغ ہوئی۔ پھر فدویہ کو معلوم ہوا کہ میرا خاوند بالکل نامرد ہے یعنی عورت کے قابل نہیں ہے۔ مجبوراً میں نے اس سے طلاق چاہی تو اس نے جواب دیا کہ میں تجھ کو طلاق ہرگز نہ دوں گا۔ ناچار میں اپنے بھائی کے گھر آ گئی۔ اور مجھ کو بھائی کے پاس آئے ہوئے دو سال کا زمانہ ہو چکا۔ اور برادر ہی فدویہ کا اب تک کفیل ہے اور بہت قلیل معاش ہے۔ اسوجہ سے عدالت میں چارہ جوئی کرنے سے معذور ہوں۔ میں اب نکاح ثانی کرنا چاہتی ہوں۔ نکاح کے بارے میں مجھ کو کیا حکم ہے؟ مہر موجل مبلغ 200 روپیہ ہے۔

۶ ربیع الاول ۳۵ھ

تمیزن ساکن آگرہ محلہ کڑہ دبکیاں

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں زنِ مدعیہ کی خاوند بھی تصدیق کرے کہ بے شک میں جماع نہیں کر سکتا تو وقتِ دعویٰ سے حاکم اس کو علاج کے واسطے برس دن کی مہلت دے بعد ایک سال اگر وہ جماع پر قادر ہو جائے فبہا ورنہ حاکم یعنی قاضی اگر وہ طلاق نہ دے اور عورت طالبِ تفریق ہو تو قاضی دونوں میں تفریق کرا دے۔ اور یہ تفریق قائم مقام ایک بائن طلاق کے ہو جائے گی۔ پھر یہ بعد انقضاء عدت یعنی تین حیض کے جس سے چاہے

نکاح کرے۔ اور اس کے ساتھ شوہر اگر خلوت صحیحہ کر چکا ہے تو شوہر پر مہر کامل واجب ہوگا۔

کما فی شرح الوقایة:

ان اقر انه لم یصل الیها اجله الحاکم سنة قمریة فی الصحیح فان لم یصل فیها فرق القاضی بینهما ان طلبته ای ان طلبت المراة التفریق و تبین بطلقة ولها کل المهران خلا بها وتجب العدة انتهی مختصرا[1]۔

(ترجمہ: اگر خاوند یہ اقرار کرلے کہ وہ اپنی زوجہ سے جماع نہیں کرسکا تو صحیح قول کی رو سے حاکم اسے ایک قمری سال تک مہلت دے گا۔ اگر اس عرصہ میں بھی وہ اس سے جماع پر قادر نہ ہوا تو بیوی اگر مطالبہ کرے تو قاضی دونوں کے درمیان تفریق کردے گا اور اس تفریق سے ایک طلاق سے وہ بائن ہو جائے گی۔ اور عوت پورے مہر کی مستحق ہے اگر خاوند نے اس سے خلوت کی اور عدت بھی واجب ہوگی مختصرا۔

اگر باہم اختلاف واقع ہو اور عورتیں اس عورت کو دیکھ کر کہہ دیں کہ یہ باکرہ تو نہیں ہے بلکہ مثل اس عورت کے جس کے ساتھ جماع ہوتا ہے یعنی ثیبہ ہے تو مرد کو قسم دلوائی جائے گی کہ میں اس سے جماع کر چکا ہوں اگر وہ قسم سے انکار کرے یا عورتیں کہہ دیں کہ یہ باکرہ ہے اس کو مہلت ایک سال کی علاج کے واسطے دی جائے۔ اگر وہ اس عورت سے جماع کرنے پر قسم کھائے اور عورتیں بھی اس کو ثیبہ بیان کریں تو عورت کا حق تفریق باطل ہو جائے گا اور اسی کی زوجیت میں رہے گی۔

چنانچہ شرح وقایہ میں ہے۔

و ان اختلفا و کانت ثیبا او بکرا فنظرت النساء فقلن ثیب حلف فان حلف بطل حقها و ان نکل او قلن بکرا اجل[2]۔فقط

(ترجمہ: اگر جماع کے بارے میں میاں بیوی اختلاف کریں اور وہ بیوی ثیبہ ہو یا وہ باکرہ ہو لیکن عورتوں نے اس

---

[1] شرح الوقایه جلد ثانی صفحه ۱۴۱، ۱۴۲ مطبوعه مجتبائی دهلی

[2] شرح الوقایه جلد ثانی صفحه ۱۴۲ مطبوعه مجتبائی دهلی

کا معاینہ کیا تو انہوں نے کہا کہ ثیبہ ہے تو خاوند سے قسم لی جائے گی۔ اگر وہ قسم اٹھالے تو بیوی کا تفریق کا حق باطل ہو جائے گا۔ لیکن اگر خاوند قسم اٹھانے سے انکار کر دے یا عورتوں نے معاینہ کے بعد کہا کہ بیوی باکرہ ہے تو خاوند کو مہلت دی جائے گی۔)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

محمد دیدار علی الرضوی

مفتی جامع مسجد اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر...... 211﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ ایک عورت کا نکاح ایک شخص سے ہوا جو دس برس گزر گئے اور شوہر اس کا نامرد ہے لائق صحبت کے نہیں۔ لہٰذا وہ عورت طلاق چاہتی ہے۔

سائل: شیخ حسین بخش ہٹھائیں آگرہ

۲۹ فروری ۱۹۱۶ء

الجواب

اگر شوہر عنین لاعلاج ہے تو فوراً نکاح فسخ ہو جائے گا۔ حاکم خود فسخ کر دے یا عورت فسخ کر دینے کی مجاز ہے۔ یعنی طلاق بائن ہو جائے گی۔ الدر المختار میں ہے

اذا وجدت مجبوبا فرق بینھما فی الحال و لو قصیر لا یمکنه ادخاله داخل الفرج ملخصا. و لو وجدته عنینا او خصیا لا ینتشر ذکره اجل سنة[1]

(ترجمہ: اگر بیوی نے خاوند کا عضوِ تناسل کٹا ہوا پایا تو فوراً ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی۔ اور اگر وہ آلۂ تناسل اتنا چھوٹا ہو کہ فرج میں اس کا داخل کرنا ممکن نہ ہو☆ اور (اسی طرح) اگر اسے نامرد یا خصی پایا کہ اس کے عضو مخصوص میں انتشار نہیں ہوتا تو اسے ایک برس کی مہلت دی جائے گی۔)

بعد اس کے وہ اگر طلاق نہ دے تو عورت کو شرعاً خود طلاق دینے کا اور اپنے نفس کو اختیار کا حق حاصل ہے۔

ردالمحتار میں ہے:۔

فاذا امتنع کان ظالما فناب عنه و اضیف فعله الیه و قیل یکفی اختیار ھا نفسھا ولا

---

[1] الدر المختار علی ھامش رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۶۴۴، ۶۴۵ (ملخصا) مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

یحتاج الی القضاء کخیار العتق قیل وھو الاصح[1]

☆(ترجمہ: سال کی مدت کے بعد اگر مرد عورت کو طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو وہ ظالم ہے۔ قاضی اس کے قائم مقام ہو جائے گا اور اس کا فعل خاوند کی طرف منسوب ہو گا۔ بعض علماء نے فرمایا ایسی صورت میں عورت کا اپنے نفس کو اختیار کر لینا کافی ہے۔ قضا کی ضرورت نہیں ہے جس طرح کہ خیارِ عتق میں ہے اور ایک قول یہ ہے کہ یہی اصح ہے۔)

واللہ اعلم بالصواب

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم غفرلہ

✿✿✿✿✿

---

[1] رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۶۴۷ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر......212﴾

سوال

میرا نکاح نابالغی میں ہوا۔ بعد چار سال میں بالغ ہوئی تو معلوم ہوا کہ شوہر میرا بانجھ ہے یعنی عورت کے لائق نہیں۔ میں نے طلاق چاہی وہ طلاق نہیں دیتا میں اپنے بھائی کے ہاں اسے چھوڑ کر چلی آئی اس کو عرصہ ایک سال ہو چکا ہے۔ میرا کوئی وجہ معاش نہیں۔ بھائی میرا اس وقت تک ٹھیک ہے۔ میرا مہر دوسو روپیہ ہے۔ مجھ کو شرعا نکاح ثانی کی بابت کیا حکم ہے؟

سائل: مسماۃ تمیزن بنت احمد بخش مرحوم

ساکن کیڑہ دیکیاں آگرہ

۲۵ فروری ۱۹۱۶ء

الجواب

اگر شوہر کا عضو کٹا ہوا ہے یا ایسا چھوٹا عضو رکھتا ہے کہ جس سے دخول ناممکن ہے [۱] تو دونوں میں علیحدگی فوراً کردی جائے گی۔ اور مہر شوہر کے ذمہ بوجہ خلوت کے لازم ہوگا اور یہ طلاق بائن ہوگی۔

اور اگر کسی بیماری سے نامرد ہو گیا ہے تو سال بھر میعاد کے بعد عورت دوسرا نکاح کرلے گی۔ الدرالمختار میں ہے۔

اذا وجدت مجبوبا فرق بینهما فی الحال و لو قصیرا لا یمکنه ادخاله داخل الفرج (ملخصا) و لو وجدته عنینا او خصیا لا ینتشر ذکره اجل سنة [۲]

---

[۱] عضو مخصوص کے چھوٹا ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ بہت یہ چھوٹا گھنڈی کی مانند ہو تو عورت کے مطالبہ پر فی الفور تفریق کردی جائے گی۔ دوسرا یہ ہے کہ اس سے ذرا بڑا لیکن مقام معتاد تک نہیں پہنچ سکتا تو فی الفور تفریق نہ کی جائے گی۔
(ماخوذ از بہار شریعت حصہ ہشتم صفحہ ۶۳ فرید بک ڈپو دہلی)

[۲] الدر المختار علی هامش رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶ (ملخصا) مطبوعه مکتبه رشیدیه کوئٹه

(ترجمہ: اگر عورت نے خاوند کے آلہ تناسل کو کٹا ہوا پایا تو فوری طور پر ان کے مابین تفریق کر دی جائے گی اور اسی طرح اگر آلہ تناسل اتنا چھوٹا ہو کہ فرج میں اس کا داخل کرنا ممکن نہ ہو☆ اور اگر اسے نامرد پایا یا خصی پایا کہ اس کے آلہ تناسل میں انتشار نہ ہوتا ہو تو ایک سال کی مہلت دی جائے گی۔)

بعد اس کے اگر طلاق نہ دے تو عورت کو خود طلاق دینے کا اور اپنے نفس کو اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ ردالمحتار میں ہے۔

فاذا امتنع کان ظالما فناب عنه واضیف فعله الیه و قیل یکفی اختیارها نفسها ولا یحتاج الی القضا کخیار العتق قیل و هو الاصح [1]۔

(ترجمہ: اگر خاوند عورت کو طلاق نہ دے تو وہ ظالم ہوگا۔ قاضی اس کا نائب ٹھہرے گا۔ قاضی کے فعل (تفریق) کی نسبت خاوند کی طرف کی جائے گی۔ بعض علماء کا کہنا ہے عورت کا اپنے آپ کو اختیار کرنا ہی کافی ہے۔ قضاء کی حاجت نہیں۔ جس طرح خیارِ عتق میں ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہی اصح ہے)

جامع الاحکام جلد اول اسباب تنسیخ نکاح [1] صفحہ ۲۰۶ میں ہے کہ ناکح عنین محض ہے۔ اور علاج پذیر نہیں ہے تو زوجہ طلاق طلب کر سکتی ہے۔ قانونِ یہود و نصاریٰ و ملکِ انگلستان میں بھی اس طرح لکھا ہے [2] انتهی عبارته (پرسنل لا آف محمڈنس)

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم غفرلہ

❁❁❁❁❁

---

[1] رد المحتار للشامی — جلد ۲ صفحہ ٦۴۷ — مطبوعه مکتبه رشیدیه کوئٹه

[2] جامع الأحکام — جلد اول صفحه

عدت

﴿فتویٰ نمبر......213﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین وحامیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ لڑکی نابالغہ کا عقد ایک شخص نابالغ مسمی غفور خان سے ہوگیا۔ عرصہ چار یوم کا ہوا کہ اصغری نابالغہ کی مادر نے غفور خان سے جواب ۲۲ برس کی ہے طلاق تحریری وزبانی حاصل کرلی ہے۔اب اس کی والدہ اصغری نابالغہ دختر اپنی کا عقد ثانی کرنا چاہتی ہے ۔اس حالت میں نابالغہ لڑکی کو آیا ایامِ عدت پورا کرنے کی شرعاً ضرورت ہے یا نہیں؟ اور بلا ایامِ عدت پورا کیے بولایتِ مادر نابالغہ کا عقد دیگر ہوسکتا ہے یا نہیں؟۔

سائل: امیر شاہ
۲۴ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ

الجواب

بسم الله الرحمن الرحیم.

اللهم رب زدنی علما.

نابالغہ کی عدت تین مہینہ ہے۔بعد تین ماہ کے علاوہ ماں کے اور کوئی ولیِ اقرب اس کا نکاح کرسکتا ہے۔

کما فی الکنز:

و عدة الحرة للطلاق او الفسخ ثلاثة اقراء و ثلاثة اشهر ان لم تحض[1]۔

(ترجمہ: طلاق ہوجانے یا نکاح کے فسخ ہوجانے پر عورت کی عدت تین حیض ہے اور اگر اسے حیض نہ آتا ہوتو تین ماہ ہے) فقط

حررہ العبد الراجی رحمة ربہ القوی
ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مفتی جامع مسجد اکبرآباد

---

[1] کنز الدقائق علی ھامش البحر الرائق: جلد ۴ صفحہ ۱۳۹، ۱۴۱ مطبوعہ دار المعرفة بیروت

﴿فتوی نمبر......214﴾

سوال

ایک عورت کو نان نفقہ کی تکلیف ہے۔ وہ باپ کے گھر رہی۔ اس اثنا میں اس کا خاوند پردیس میں نوکر تھا مر گیا اب عدت وہ اپنے باپ کے گھر پوری کرے یا وہاں جائے۔؟

سائل: محمد خان معرفت بہادر خان، پنی گلی آگرہ

۱۷ مارچ ۱۹۱۶ء

الجواب

هو المصوب

ایسی صورت میں زوجہ کو ایام عدت اپنے باپ کے گھر پورے کرنا چاہئیں۔ فتاوی حامدیہ میں ہے

إلا أن تخرج أو تهدم المنزل او تخاف الهدامه او تلف مالها أو لا تجد كراء البيت ونحو ذلک من الضرورات فتخرج لا قرب موضع إليه وفی الطلاق إلی حیث شاء الزوج[۱۰] . انتهی

(ترجمہ: خاوند کی موت کے باعث عدت گذارنے والی عورت اسی گھر میں عدت گذارے گی جس میں عدت اس پر واجب ہوئی۔ وہ وہاں سے نہ نکلے گی۔ ☆ ہاں ان صورتوں میں وہاں سے نکل سکتی ہے (۱) اس کو وہاں سے نکال دیا جائے۔ (۲) گھر گر پڑے (۳) گھر کے گرنے کا خوف ہو (۴) مال کے ضائع ہونے کا خوف ہو (۵) اس مکان کا کرایہ نہ ملتا ہو۔ اور اسی طرح کی دیگر ضروریات کی بنا پر نکل سکتی ہے۔ ایسی صورت میں اس کے قریب ترین مکان کی طرف چلی جائے جہاں وہ عدت گذار سکے۔ اور طلاق کی صورت میں مرد جہاں چاہے وہ منتقل ہو جائے)

کتبہ: المفتی محمد اعظم شاہ عفی عنہ

✿✿✿✿✿

۱۰۔ تنقیح الفتاوی الحامدیہ : جلد ۱ صفحہ ۵۷ مطبوعہ: مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر......215﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ عورت کے خاوند کا انتقال ہو گیا ۔عورت کو شادی میں جانا چاہیے یا نہیں؟ کیونکہ شادی بھائی کی لڑکیوں کی ہے۔ شریک ہونا چاہیے یا نہیں؟ گھر بھی قریب ہے۔ خاوند کو انتقال کئے ہوئے ڈیڑھ ماہ کا عرصہ ہو جائے گا۔

سائل: محمد علی چھیجاٹولہ'

١٦ ربیع الثانی ١٣٣٥ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما

چار مہینہ دس دن تک جو عدتِ وفات اور زمانہء سوگ ہے' عورتِ مذکورہ معتدۂ وفات کو بجز ضرورتوں کے شوہر متوفی کے گھر سے دن رات نکلنا جائز نہیں۔ خواہ وہ گھر شوہر کا مملوک ہو' خواہ کرایہ کا' اس کے رہنے کی مقدار اس کے حصہ میں آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ ☆ ایک تو جب اس کے پاس اس قدر مال نہیں' کہ جس سے اپنی بسر اوقات اور گزران کر سکے۔ اس صورت میں دن کو بغرضِ محنت و مزدوری' پردہ کے ساتھ اس کو نکلنا جائز ہے۔ مگر نصف سے زائد حصہ رات میں ضرور اسی گھر میں شب باشی کرے۔ دوم اس صورت میں کہ جب اس کو ورثہ یا صاحبِ مکان گھر میں نہ رہنے دیں اور وہاں رہنے سے خوفِ اذیتِ یقینی ہو بوجہ گرنے مکان یا خوف کرنے مکان کے یا خوف تلف ہونے اپنے مال کے۔

کما فی الدر المختار :

و تعتدان معتدة طلاق و موت فی بیت وجبت فیه و لا تخرجان منه الا ان تخرج او ینهدم المنزل او تخاف انهدامه او تلف ما لها او لا تجد کراء البیت و نحو ذالک من

الضرورات فتخرج لاقرب موضع اليه [1]

ترجمہ: طلاق اور خاوند کی وفات کے باعث عدت گذارنے والی عورت' اسی گھر میں عدت گذارے جس میں اس پر عدت واجب ہوئی ہو۔ اور وہ اس گھر سے نہ نکلے۔ ہاں اگر اسے وہاں سے نکال دیا جائے یا گھر منہدم ہو جائے یا اسے خوف ہو کہ مکان گر پڑے گا یا اسے اپنے مال کے ضائع ہونے کا خوف ہو یا اسے گھر کا کرایہ نہ مل سکے یا ان کے علاوہ اور ضرورتیں درپیش ہوں تو اس مکان سے قریب ترین کسی جگہ پر چلی جائے)

و قال الشامی فی صفحة ۶۷۴ من رد المحتار

والحاصل ان مدار حل خروجها بسبب قيام شغل المعيشة فيقدر بقدره فمتى انقضت حاجتها لا يحل لها بعد ذلک صرف الزمان خارج بيتها [2]

(ترجمہ: خلاصہ یہ ہے کہ عدت کے گھر سے نکلنے کا جواز اس کی کھانے پینے کی چیزوں کے لیے کام کاج میں مشغولیت کے باعث ہے۔ لہٰذا اس کا اندازہ اسی کے مطابق ہوگا۔ جب اس کی ضرورت پوری ہو جائے تو اس کے لیے اس کے بعد گھر سے باہر وقت صرف کرنا جائز نہیں)

اور صورتِ مسئولہ میں امورِ مذکورہ سے کوئی بھی امر نہیں پایا جاتا لہٰذا اس کو شادی میں جانا ہرگز جائز نہیں۔ فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی مفتی جامع مسجد اکبر آباد

❁❁❁❁❁

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۱۸۰' ۱۸۱ مطبوعہ دار التراث العربی بیروت

[2] رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۱۸۰' مطبوعہ دار التراث العربی بیروت

﴿فتویٰ نمبر......216﴾

سوال

زید کا نکاح ہندہ کے ساتھ ہو گیا اور دونوں ایک تنہا مکان بخلوتِ صحیحہ ایک جگہ رہے سہے مگر ہم بستر نہیں ہوئے۔ بعدہ زید نے طلاق دے دی۔ اندریں صورت ہندہ پر عدت واجب ہو گی یا نہیں؟ اور اگر ایامِ عدت میں کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ نکاح کرے تو وہ نکاح صحیح ہو گا یا نہیں؟

۱۴ ربیع الثانی ۳۶ھ حامد حسن تحصیل دار ریاست الور

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اللھم رب زدنی علما

ہندہ کو چونکہ بعد خلوتِ صحیحہ طلاق دی گئی ہے لہٰذا اس پر عدت ضرور واجب ہے۔ اور ایامِ عدت میں اگر علاوہ اسی شوہر کے جس نے طلاقِ بائن دی اور کوئی اس سے نکاح کرے گا وہ نکاح ہرگز صحیح نہ ہو گا۔

چنانچہ صفحہ ۳۱ جلد اول عقود الدریہ میں ہے:

سئل مولانا المحقق شیخ الاسلام عبدالرحمن آفندی العمادی فیما اذا دخل الزوج بالزوجة و لم یصل الیھا ثم طلقھا فھل تلزمھا العدة ولا یصح نکاحھا قبل تمامھا. فاجاب تلزمھا العدة ولا یصح نکاحھا لغیر الاول قبل تمام عدتھا[1].

☆ (ترجمہ: مولانا شیخ الاسلام عبدالرحمٰن آفندی عمادی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا کہ خاوند بیوی کے پاس گیا لیکن دخول نہ کیا پھر اسے طلاق دے دی تو کیا اس عورت پر عدت لازم ہو گی اور کیا عدت گذرنے سے پہلے اس سے نکاح کرنا جائز ہو گا؟ ☆ تو آپ نے جواب دیا کہ اس عورت پر عدت لازم ہے اور عدت ختم ہونے سے قبل پہلے خاوند کے سوا کسی اور مرد سے اس کا نکاح درست نہیں۔) فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی مفتی جامع مسجد اکبر آباد

---

[1] تنقیح الفتاوی الحامدیہ جلد اول صفحہ المکتبۃ الحبیبیہ کوئٹہ

حضانہ

﴿فتویٰ نمبر...... 217﴾

سوال

ایک لڑکی ڈھائی برس کی ہے جس کے ماں' باپ' دادا' دادی' نانا' نانی' بہن' خالہ سب کا انتقال ہو گیا ہے۔ فقط اس کے قرابتیوں میں سے یہ رشتہ دار باقی ہیں۔ اس کی ماں کا ماموں اور تین چچا تایا اور تین پھوپھی اندریں صورت ان قرابتیوں میں سے حق پرورش کس کا ہے۔

۱۶ فروری ۱۹۱۸ء

الجواب

صورتِ مسئولہ میں مستحقِ پرورشِ دختر مذکورہ پھوپھیوں میں سے وہ پھوپھی ہے جس کا شوہر بھی لڑکی نابالغہ کا ذی رحم محرم یعنی رشتہ دار قریب ہو یا وہ پھوپھی جو بیوہ ہو۔ چنانچہ صفحہ ۴۱۳ ہدایہ مطبع یوسفی میں ہے

فان لم تكن له ام فام الام اولى من ام الاب.... فان لم تكن له ام الام فام الاب اولى من الاخوات...... فان لم تكن جدة فالاخوات اولى من العمات والخالات..... ثم الخالات اولى من العمات..... ثم العمات[1]

☆(ترجمہ: اگر نابالغ کی ماں موجود نہ ہو تو نانی' دادی کی نسبت پرورش کی زیادہ حقدار ہے۔ اگر نانی موجود نہ ہو تو دادی بہنوں کی نسبت زیادہ حق دار ہے۔ اگر نانی دادی نہ ہو تو پھوپھیوں اور خالاؤں سے بہنیں زیادہ حق رکھتی ہیں۔ ان کے بعد پھوپھیوں سے خالائیں زیادہ حق دار ہیں اور خالاؤں کے بعد پھوپھیاں پرورش کرنے کی مستحق ہیں۔)

اور اگر نہ کوئی پھوپھی بیوہ ہے اور نہ ایسی ہے کہ اس کا شوہر بھی لڑکی نابالغہ مذکورہ کا ذی رحم محرم ہو تو پھر پھوپھی کا بھی حق پرورش نہ رہے گا۔ کما فی الهدایه المذکور:

---

[1] الهدايه المجلد الثانى جز ۳ صفحه ۳۶۷' ۳۶۸ مطبوعه ادارة القرآن والعلوم الاسلاميه كراچى

و کل من تزوجت من ھؤلاء سقط حقھا الا الجدة اذا کان زوجھا الجد و کذلک کل زوج ھو ذو رحم محرم منه......[1]

☆(ترجمہ: پرورش کرنے کی حقداران عورتوں میں سے جو بھی نکاح کرلے تو اس کا حق پرورش ساقط ہو جاتا ہے مگر جدہ (نانی یا دادی) اگر اس کے ساتھ جد (نانا یا دادا) نکاح کرلے تو اس یہ حق ساقط نہ ہوگا اور اسی طرح ہر اس زوج کے باعث یہ حق ساقط نہ ہوگا جو بچہ کا ذی رحم محرم ہو)

اور بصورت نہ ہونے ایسی پھوپھیوں کے حق پرورش تینوں چچا تایوں سے اس کا ہے جو زیادہ نمازی پرہیزگار ہو اور اگر تقوی میں تینوں برابر ہوں تو حق پرورش اس کا ہے جو ان میں زیادہ عمر رسیدہ ہو کما فی صفحة ۲۹۳ من الجزء الثانی للدرالمختار المطبوع مع الشامی فی المصر

ثم العصبات بترتیب الارث فیقدم الاب ثم الجد ثم الاخ الشقیق ثم الأب ثم بنوه کذلک ثم العم ثم بنوه و اذا اجتمعوا فالاورع ثم الاسن[2]

(ترجمہ: ان کے بعد پرورش کرنے کا حق میراث کی ترتیب کے ساتھ عصبات کا ہے۔لہذا باپ' دادا کی نسبت مقدم ہے۔ان کے بعد سگا بھائی' اس کے بعد باپ کی جانب سے بھائی' پھر بھائی بیٹے کے اسی ترتیب کے ساتھ' اس کے بعد چچا' اس کے بعد اس کے بیٹے۔اگر ایک درجہ کے کئی حقدار جمع ہو جائیں تو زیادہ پرہیزگار مقدم ہوگا۔اگر پرہیزگاری میں برابر ہوں تو زیادہ عمر والا مستحق ہے)

اور اگر چچا تایا سے بھی خوف لڑکی نابالغہ کی جان یا مال کا ہو تو حاکم کو لازم ہے کہ کوئی ثقہ امانت دار نیک بخت عورت سے پرورش کرائے۔کما فی صفحة ۶۹۳ من الشامی

و فی البدائع حتی لو کانت الاخوة والاعمام غیر ما مومین علی نفسھا أو مالھا

---

[1] الھدایه المجلد الثانی جز ۳ صفحه ۳۶۸' ۳۶۹ مطبوعه ادارة القرآن والعلوم الاسلامیه کراچی

[2] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۵ صفحه ۲۱۳ دار التراث العربی بیروت

لاتسلم الیهم وینظر القاضی امراة ثقة عدلة امینة فیسلمها الیها الی ان تبلغ[1].

(ترجمہ: بدائع میں ہے اگر نابالغ لڑکی کے بھائیوں اور چچاؤں پر اس کی ذات یا اس کے مال کے سلسلہ میں اعتماد نہ ہو تو اس نابالغ لڑکی کو ان کے سپرد نہ کیا جائے گا۔ اور قاضی ایک عادل ثقہ اور امانت دار عورت کو تلاش کرے۔ پھر بالغ ہونے تک اسے اس عورت کے سپرد کرے) **فقط و اللہ اعلم و علمه احکم**

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی

المفتی جامع مسجد شہر آگرہ

۱۶ فروری ۱۹۱۸ء

✿✿✿✿✿

[1] رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۲۱۳ دار التراث العربی بیروت

﴿فتویٰ نمبر......218﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دینِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ مسمی رحیم بخش کی شادی بموجب شرع شریف کے مسماۃ اللہ رکھی بنت امیر بخش سے ہوئی۔ بعد چند سال ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جس کی عمر قریب اب تین سال ہے اور دودھ چھوڑے ہوئے عرصہ نو دس ماہ کا ہوگیا۔ اب وہ دودھ ہنستے پیتا ہے۔ چنانچہ رحیم بخش مذکور نے مسماۃ اللہ رکھی زوجہ اپنی کو بموجب شرع بذریعہ تحریر کے طلاق دے دی ہے جس کو عرصہ دس یوم کا گزر گیا۔ اور لڑکا پاس اللہ رکھی والدہ اپنی کے جووہ لے گئی موجود ہے۔ اور لڑکا بازار وغیرہ کی ہر ایک چیز بخوبی خوشی خورد نوش کرتا ہے۔ اور مجھ کو لڑکے سے غایت درجہ کی محبت ہے اور میں اس کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں اور میں ان کی پرورش بخوبی کر سکتا ہوں۔

لہٰذا اب یہ امر دریافت طلب ہے کہ جب لڑکا دودھ کو ہنستے پیتا ہے اور دودھ چھوڑے ہوئے نو دس ماہ گزر گیا اور لڑکا چلتا پھرتا ہے اور ہر ایک چیز بخوبی بازار وغیرہ کی خورد نوش کرتا ہے تو ایسی حالت میں بموجب شرع کے لڑکا منجملہ زن وشوہر کس کے پاس رہنا چاہئے؟ اور ایسی حالت میں نان ونفقہ کس کے ذمہ ہے اور کب تک؟ دوسرے یہ کہ ایامِ عدت میں خرچہ پارچہ مسماۃ کو دینے کی ضرورت ہے یا نہیں؟

الجواب

اللهم رب زدنی علما.

صورتِ مسئولہ میں اگر ماں چاہے' کہ لڑکے کی پرورش خود کرے اور باپ کو پرورش کرنے کو نہ دینا چاہے' تو اس زمانہ تک ماں اس بچہ کی پرورش کی مستحق ہے' جب تک وہ تنہا خود کھانے پینے لگے اور خود بلا اعانت کسی کے استنجا کر لے۔ اور ابو بکر خصاف رحمۃ اللہ علیہ نے باعتبار غالب حالت بچوں کے اس مدت کا اندازہ سات برس کا کیا ہے۔ کما فی الهداية:

والام والجدة احق بالغلام حتى ياكل وحده و يشرب وحده و يلبس وحده

یستنجی وحده وفی الجامع الصغیر حتی یستغنی بأن یاکل وحده ویشرب وحده ویلبس وحده[1] لان تمام الاستغناء بالقدرة علی الاستنجاء والخصاف قدر الاستغناء بسبع سنین اعتبارا للغالب انتهی مختصرا بقدر الحاجة[2]

(ترجمہ: ماں، دادی اور نانی کو نابالغ بچے کی پرورش کا بڑھ کر حق ہے۔ جب تک وہ اکیلا کھائے، اکیلا پی لے اور خود استنجاء کر لے۔ جامع صغیر میں ہے کہ ان کو بڑھ کر حق ہے جب تک وہ مستغنی ہو جائے اس طرح سے کہ خود اکیلا کھائے اکیلا پی لے اور اکیلا اپنے کپڑے پہن لے۔ دونوں عبارتوں کا معنی ایک ہی ہے، کیوں کہ پورا استغناء اسی وقت ہوتا ہے، جب اسے استنجاء پر قدرت حاصل ہو جائے۔ امام خصاف رحمۃ اللہ علیہ نے غالب حالات کا اعتبار کرتے ہوئے سات سال کی عمر مقرر فرمائی)

☆ اور نان نفقہ لڑکے کا جب تک ماں کی پرورش میں رہے، باپ کے اوپر لازم ہے چنانچہ ہدایہ میں ہے

والنفقة (ای نفقة الولد) علی الأب[3]

(ترجمہ: اور اولاد کا نفقہ باپ کے ذمہ ہوتا ہے)

☆ علی ہذا نان ونفقہ ایامِ عدت زوجۂ مطلقہ کا اور مکانِ سکونت تا انقضائے ایامِ عدت شوہر پر واجب ہے۔

کما صرح به فی الهدایة

و اذا طلق الرجل امرأته فلها النفقة والسکنی فی عدتها رجعیا کان أو بائن[4]

---

[1] ہدایہ کے متن میں جامع صغیر کی عبارت اسی طرح درج ہے لیکن الجامع الصغیر صفحہ ۱۹۵ مطبوعہ ادارة القرآن والعلوم الاسلامیه کراچی میں عبارت یوں ہے کہ حتی یستغنی بأن یاکل ویشرب ویلبس وحده۔
محمد علیم الدین عفی عنہ

[2] الهدایه: جلد ثانی صفحه ۴۱۵ مکتبه امدادیه ملتان

[3] الجامع الصغیر جلد ثانی صفحه ۴۱۵ مطبوعه مکتبه امدادیه ملتان

[4] الهدایه جلد ۲ صفحه ۴۱۴ مطبوعه مکتبه امدادیه ملتان

(ترجمہ: اور جب مرد اپنی بیوی کو طلاق دے دے' تو اس کا نان ونفقہ اور سکونت کا بندوبست مرد کے ذمہ ہے۔طلاق رجعی ہو یا بائن)

اور ایامِ عدتِ مطلقہ کے عندالحنفیہ تین حیض کامل ہیں۔

کما قال اللہ تعالیٰ:

والمطلقات یتربصن بانفسھن ثلاثۃ قروء .

☆(ترجمہ: طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض گزرنے تک روکے رکھیں۔) فقط

حررہ :العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی
ابومحمد محمد دیدار علی الحنفی المجددی مفتی
جامع مسجد اکبرآباد

نفقہ

﴿فتویٰ نمبر......219﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسائلِ مندرجہ ذیل میں، مطلقہ عورت بعد طلاق دینے خاوند کے کون کون سے حقوق اپنے شرعی خاوند سے لے سکتی ہے؟ یعنی اول مہر، دوم ایک عدد جوڑہ، سوم خوراکِ عدت، چہارم اپنا جہیز، جو کہ ہندہ کے باپ نے بوقت شادی اپنی لڑکی کو دیا۔ اور وہ جہیز کچھ تو بحالتِ اتفاق خرچ ہو گیا ہے اور کچھ موجود ہو۔ اور پنجم وہ زیور جو ہندہ کو ہندہ کے شوہر اور خسر نے دیا ہو؟

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

رب زدنی علما.

صورتِ مسئولہ میں اگر طلاق بعد دخول یا خلوتِ صحیحہ ہونے کے بعد دی گئی ہے، تو مکان سکونت ونان و نفقۂ ایامِ عدت بلکہ ایامِ عدت میں جس قدر کپڑوں کی ضرورت ہو بحسبِ ضرورت ☆ اور مہر جو واجب الطلب ہے شوہر پر اس کا (دینا) واجب اور ایک جوڑہ بحسبِ عرف شوہر پر اپنی زوجۂ مطلقہ کو دینا مستحب ہے۔

کما فی الفتاوی الهندیة المطبوعة فی مصر فی صفحة 334.

المتعة عندنا علی ثلاثة اوجه متعة واجبة و هی للمطلقة قبل الدخول و لم یسم لها مهر و مستحبة و هی للمطلقة بعد الدخول. ولا واجبة ولا مستحبة و هی للمطلقة قبل الدخول و قد سمی لها مهرا کذا فی السراج الوهاج [1]

☆ (ترجمہ: ہمارے نزدیک متعہ طلاق کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) واجب: یہ دخول سے قبل طلاق پانے والی ایسی عورت کے لیے ہوتا ہے، جس کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو۔ (۲) مستحب: یہ دخول کے بعد طلاق پانے والی عورت کے

---

[1] الفتاوی الهندیه: جلد اول صفحه ۳۸۸ مطبوعه دار احیاء التراث العربی بیروت

لیے ہوتا ہے (۳) نہ واجب نہ مستحب: یہ دخول سے قبل طلاق یافتہ عورت کے لیے ہوتا ہے جس کا مہر مقرر ہو۔السراج الوہاج)

و ایضا فیه فی صفحة ۵۷۷ من الجزو الاول

المعتدة عن الطلاق تستحق النفقة و دار السکنی کان الطلاق رجعیا او بائنا حاملا کانت المراة او لم تکن کذا فی فتاوی قاضی خان. [۱]

(ترجمہ: طلاق کے بعد عدت گذارنے والی عورت' نان ونفقہ اور رہائش کے لیے مکان کی مستحق ہے۔طلاق خواہ رجعی ہو خواہ بائن ہو اور عورت حاملہ ہو یا حاملہ نہ ہو۔فتاوی قاضی خان)

و ایضا فیه فی صفحة 578

کما تستحق المعتدة نفقة العدة تستحق الکسوة کذا فی فتاوی خان [۲]

(ترجمہ: عدت گزارنے والی عورت جس طرح عدت کے دوران نان ونفقہ کی مستحق ہے اسی طرح وہ لباس کی بھی حق دار ہے۔فتاوی قاضی خان)

اور مہر کا واجب الادا ہونا تو ظاہر ہی ہے۔☆ رہا جہیز وہ بحسبِ عرف لڑکی کو دیا جاتا ہے اور لڑکی کی ملک ہوتا ہے۔لہٰذا بحالتِ اتفاق اگر لڑکی نے اپنے گھر میں خرچ کیا یا شوہر یا خسر کو بطیبِ خاطر دے دیا اور خرچ کرنے سے منع نہ کیا اس کو شوہر سے بعد میں طلب نہیں کرسکتی۔البتہ جو موجود ہے اس کو لے سکتی ہے۔اور اگر جہیز شوہر یا خسر نے باوصف اس کی مخالفت یا ناراضگی کے خرچ کرڈالا تو بلاشبہ بعد ثبوت جہیز خرچ کردینے کے اس کی قیمت بھی لے سکتی ہے۔

اور شوہر یا خسر نے بحالتِ اتفاق جو کچھ زیور وغیرہ اس کو پہنا دیا تھا' اگر اس کو دے بھی دیا تھا یا عرفاً وہ ملک اس لڑکی کی اس کی برادری میں سمجھا جاتا ہے' وہ سب کچھ ملک اس مطلقہ کا ہے۔اور اگر عرفاً عاریتاً دیا جاتا

---

[۱] الفتاوی الهندیه مع ترجمه اردو: جلد ۸ صفحه ۷۸ — مطبع فضل ربی پریس روالپنڈی

[۲] الفتاوی الهندیه مع ترجمه اردو: جلد ۸ صفحه ۸۶ — مطبع فضل ربی پریس روالپنڈی

ہے اور شوہر اور خسر کو جب چاہیں اس کے واپس لینے کا اختیار رہتا ہے' تو بلاشبہ وہ ملک پہنانے والے کی ہے۔

كما فی الشامی فی صفحة ۴۱۰ الجزء الثالث

و فی شرح البيری عن المبسوط:

☆ **ان الثابت بالعرف كالثابت بالنص** ؎۱

(ترجمہ: المبسوط سے شرح البیری میں ہے کہ جو عرف (رسم ورواج) سے ثابت ہو وہ ایسے ہی ہے جیسے کہ نص سے ثابت ہے)

☆ اور جو روپیہ لڑکی کے باپ نے اپنی دختر کی شادی میں برادری کے کھانا کھلانے میں' یا سقہ دھوبی وغیرہ کے دینے میں خرچ کیا ہے' وہ اپنے نام یا ثواب کو خرچ کیا ہے۔ اس کا مطالبہ بذمہ شوہر کسی طرح نہیں ہوتا۔ برات کو جو کھلانے میں صرف ہوا ہے' یہ مصارف سب اپنی خوشی سے اپنے نام کے واسطے کئے جاتے ہیں۔ جو کرے گا وہ اس کا بوجھ اٹھائے گا۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
محمد دیدار علی الرضوی الحنفی مفتی
مسجد جامع اکبرآباد

❁❁❁❁❁

؎۱ رد المحتار: جلد ۳ صفحہ ۴۱۰ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر......220﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین اس بارے میں کہ زید کی زوجہ منکوحہ بلا اجازت میکے میں چلی گئی اور وہیں جاگزین ہے۔ زید نے چند بار بلایا نہیں آتی ہے۔ لہٰذا اس صورت میں نان ونفقہ زوجہ مذکور کا زید پر واجب ہے یا نہیں؟۔

۲۶ ذی الحجہ

الجواب

بسم الله الرحمن الرحيم۔

جو عورت بلا حقِ شرعی بلا اجازت شوہر کے گھر سے چلی جائے اور باوصف بار بار بلانے کے اس کے گھر آنے سے انکار کرے وہ شرعاً ناشزہ ہے۔ جب تک شوہر کے گھر نہ آئے اس کا نان ونفقہ شوہر پر واجب نہیں رہتا۔ کما فی الدر المختار

و لا نفقة لخارجة من بيته بغير حق و هی الناشزة حتى تعود [1]۔

(ترجمہ: خاوند کے گھر سے ناحق نکل جانے والی کا نفقہ خاوند کے ذمہ نہیں ہوتا۔ وہ نافرمان ہے جب تک واپس لوٹ کر نہ آ جائے)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی مفتی وواعظ

جامع مسجد اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۵ صفحہ ۲۲۷ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

﴿فتویٰ نمبر......221﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ ایک عورت کا خاوند نہایت بدسلوکی سے پیش آتا ہے اور زدوکوب کرتا ہے۔ نان نفقہ بھی نہیں دیتا۔اور مہر معجّل جو ایک سو روپیہ ہے نہیں ادا کرتا۔ پس اس صورت میں عورت اس کے ساتھ رہنے سے انکار کرسکتی ہے یا نہیں؟ اور مہر معجّل کا مطالبہ اس کے ذمہ شرعاً یا قانوناً رہے گا اور وہ بغیر ادائے دین مہر معجّل اور بغیر ضمانت کافی کے زوجہ کا مستحق ہے یا نہیں؟ مفصل جواب دیا جائے۔

سائل: حمیدن دختر شیخ رحیم اللہ محلہ ہتھائیں آگرہ
یکم مارچ ۱۹۱۶ء

الجواب

اگر شوہر بدسلوکی کرتا ہے اور نان نفقہ میں تنگی اور مدت سے خبر گیری نہیں کرتا تو وہ زوجہ سے نالش نہیں کرسکتا۔اور نہ حاکم زوجہ کو حکم دے گا کہ وہ اس کے ساتھ رہے۔ دیکھو جامع الاحکام جلد اول شوہر کا مسکن دفعہ 6 پرسنل لا آف محمڈنس۔اور قانوناً بھی یہ امر مطابق رائے حضرت امام اعظم رحمہ اللہ ہو چکا ہے کہ بغیر ادائے دینِ معجّل شوہر نالشِ زوجہ نہیں کرسکتا۔ ہائی کورٹ بمقدمہ عیدن بنام مظہر حسین

اور کتب فقہ میں اسی طرح ہے۔فتاویٰ بزازیہ میں ہے

شکت عند القاضی انه یضر بها و طلبت الاسکان عند قوم صالحین ان علم به زجره وإلا فإن کان الجیران صلحاء أقرها عندهم وإلا أمره بالأسکان عند الصلحاء ؎۱ ۔

(ترجمہ: بیوی نے قاضی کے سامنے شکایت کی کہ خاوند اسے مارتا ہے اور نیک لوگوں کے پاس رہنے کا مطالبہ کیا۔اگر قاضی کو یہ یقین ہوجائے تو اس کو زجر کرے۔ ورنہ اگر پڑوسی نیک لوگ ہوں تو عورت کو ان کے ہاں ٹھہرادے۔ورنہ اسے حکم دے کہ اسے نیک لوگوں کے ہاں ٹھہرائے)

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم غفرلہ

؎۱ الفتاوی البزازیه علی هامش الفتاوی العالم گیریه جلد ۴ صفحه ۱۵۹ مطبوعه مصر

﴿فتویٰ نمبر......222﴾

سوال

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس بارہ میں کہ زید کی دو زوجہ ہیں اور زوجۂ اول کا زید نے نان ونفقہ مقرر کر کے اس سے علیحدہ ہمراہِ زوجۂ ثانی رہنا اختیار کیا ہے۔ پس زوجہ ءاول اس وقت سے' جبکہ زید نے نکاحِ ثانی کیا' علیحدہ رہتی ہے۔ اب ایک عرصہ کے بعد زید کہتا ہے زوجہ ءاول سے کہ اب میں نان ونفقہ تیرا مقررہ نہیں دیتا۔ تو بھی ہمراہ شریک زوجہ ءثانیہ کے رہ کر شاملات میں نان و پارچہ لے ورنہ علیحدہ میں نہیں دیتا۔ اور نہ یہ حکمِ شرع ہے کہ اس صورت میں جداگانہ نان ونفقہ دوں۔ اور حالت زوجہ ءثانیہ کی یہ ہے کہ وہ پارسا اور نیک چلن نہیں ہے۔ جس کا زید بھی خود قائل ہے اور کہتا ہے کہ زوجہ ءثانیہ میری کا تعلق ناجائز فلاں شخص سے ہے۔ اور وقتِ نکاحِ ثانی زوجہ ءاول کے ساتھ بھی عہد و پیمان کیا تھا کہ جو نان ونفقہ تیرا مقرر کرتا ہوں یہ تجھ کو دوام علیحدہ رکھ کر دیئے جاؤں گا۔ اور اب یہ حیلہ کر کے زوجہ ءاول کا نان ونفقہ بند کر دیا۔ بس اس بارے میں کیا حکمِ شرع شریف یہی ہے کہ زید زوجہ ءاول کو جو نیک چلن ہے شریکِ حال رہنے سے ہمراہ زوجہ ءثانیہ کے جو بد چلن ہے مجبور کرے؟ اور اپنے عہد و پیمان کے خلاف اس حیلہ سے نان ونفقہ مقررہ زوجہ ءاول بند کر دے؟۔ جو کچھ حکمِ شرع شریف اس باب میں ہو نافذ تحریر فرمایا جائے۔

سائل: محمد ابراہیم'
بیرون لال دروازہ الور۔
۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں اگر دستر خوانِ زید اتنا فراخ ہے کہ اس پر بہت لوگ کھانا کھاتے ہیں اور زوجہءزید بقدر اپنی ضرورت کے بآسائش نان ونفقہ لے سکتی ہے' پھر تو وہ اپنا نفقہ جدا مقرر کرانے کی مستحق نہیں۔ اور اگر یہ بات نہیں اور زید کی شرکت میں کھانے پینے پر راضی ہے' بہت ہی خوب اور اچھی بات ہے۔ اور اگر وہ علیحدہ مقرر کرانا چاہے تو ضرور بقدرِ نان ونفقہءمعروف زید پر اپنی زوجہ کو علیحدہ دینا لازم ہوگا۔

کما فی البحر الرائق:

طریق ایصال النفقة الیها (ای الزوجة) وهو نوعان تمکین و تملیک فالتمکین متعین فیما اذا کان له طعام کثیر و هو صاحب مائده فتمکن المراة من تناول مقدار کفایتها فلیس لها ان تطالبه بفرض النفقة و ان لم یکن بهذه الصفة فان رضیت ان تاکل معه فبها و نعمت و ان خاصمته فی فرض النفقة یفرض لها بالمعروف و هو التملیک کذا فی غایة البیان[1]۔

(ترجمہ: بیوی تک نان ونفقہ پہنچانے کے دو طریقے ہیں (۱) تمکین (۲) تملیک۔ تمکین کی صورت اس وقت متعین ہے جب کہ خاوند کے پاس کثرت سے کھانا ہو۔ وہ دستر خوان والا ہو۔ تو اس صورت میں عورت کو قدرت ہوگی' کہ اپنی کفایت کے برابر کھالے۔ لہٰذا اسے نان ونفقہ مقرر کرانے کے مطالبہ کا اختیار نہ ہوگا۔ اور اگر مرد کی یہ حالت نہ ہو' تو اگر وہ مرد کے ساتھ کھانا کھانے پر رضا مند ہو جائے' تو یہی طریقہ اپنائے اور یہ بہت اچھا ہے۔ اور گر وہ نان ونفقہ کے تقرر کے لیے مخاصمت کرے' تو دستور کے مطابق اس کے لیے مقرر کر دیا جائے اور یہ صورت تملیک کی ہے۔ غایۃ البیان میں اسی طرح ہے)

---

[1] البحر الرائق شرح کنز الدقائق: جلد ۴ صفحہ ۱۸۸' ۱۸۹ ' مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت

☆ اور تعینِ مدت ادائے نفقہ مختلف ہے۔ زمین دار کو چاہیے کہ سالانہ فصل پر بقدرِ ضرورت یک سال کا زوجہ کو دے کر فارغ البال ہو۔ اور سوداگر ماہوار دیا کرے۔ اور پیشہ ور روزانہ مقرر کر دے۔

کما فی مبسوط شمس الائمۃ السرخسی رحمۃ اللہ علیہ

فان کان محترفا تفرض علیہ النفقۃ یو ما یو ما لانہ یتعذر علیہ اداء النفقۃ شھرا دفعۃ واحدۃ و ان کان من التجار یفرض الاداء شھرا شھرا و ان کان من الدھاقین تفرض علیہ النفقۃ سنۃ سنۃ لان تیسیر الاداء علیہ عند ادراک الغلات فی کل سنۃ وتیسر الاداء علی التاجر عند اتخاذ اجر غلات الحوانیت و غیرھا فی کل شھر و تیسر الاداء علی المحترف بالاکتساب فی کل یوم [۱]

(ترجمہ: خاوند اگر پیشہ ور ہے تو روزانہ کا نان ونفقہ اس کے مقرر کیا جائے کیوں کہ اس کے لیے ایک مہینہ کا یک مشت ادا کرنا مشکل ہے۔ اور اگر وہ تاجر ہے تو ماہوار طریقہ سے مقرر کیا جائے اور اگر وہ کسان ہے تو سالانہ کے اعتبار سے مقرر کیا جائے۔ کیونکہ آمدنیوں کے حصول پر سال کے بعد اس کے لیے ادائیگی (میں) آسانی ہے۔ اور تاجروں کے لیے دکانوں وغیرہ کی آمدنیوں کی وجہ سے ماہانہ ادا کرنا آسان ہے۔ اور پیشہ وروں کے لیے ہر روز کی کمائی پر روزانہ ادا کرنا آسان ہے)

اور جب زید کی شرکت میں اگر زوجہ رہنا نہ چاہے تو نان ونفقہ شرعاً علیحدہ مقرر کرا سکتی ہے۔ تو بصورتِ ناراضگی شرکتِ زوجہ ثانیہ کے کہ جس میں رنجشِ باہمی ومخاصمت حسبِ عادت ہر وقت یقینی ہے۔ خصوصاً ایسی زوجہ کے ساتھ کہ حسبِ اقرارِ زید جس کا چال چلن خراب ہے، بلا تکلف اپنا نان ونفقہ بقدر اپنی ضرورت کے بحسبِ عرف بطریقِ معروف جدا لے سکتی ہے۔ ☆ بلکہ اگر اس کو سودا وغیرہ منگوانے کے لئے، علیٰ ھذا کھانا پکانے کے لئے خادمہ کی اگر ضرورت ہو، اور شوہر امورِ مذکورہ کا متکفل نہ ہو تو بقدرِ ضرورتِ خادمہ اس خادمہ کا بھی نان ونفقہ شرعاً زید سے بحسبِ عرف لے سکتی ہے۔

---

[۱] المبسوط للسرخسی: جلد ۵ صفحہ ۱۸۳ مطبوعہ دار المعرفہ بیروت

چنانچہ مبسوط شرح کافی حاکم میں ہے:

و عن زفر رحمه الله تعالی انه یفرض لخادم واحد لان علی الزوج ان یقوم بمصالح طعامها و حوائجها فاذا لم یفعل ذالک اعطاها نفقة خادم ثم تقوم هی بذالک بنفسها او تتخذ خادما فأما فی ظاهر الروایة استحقاقها نفقة الخادم باعتبار ملک الخادم[1]۔

(ترجمہ: امام زفر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے' کہ ایک نوکر کی تنخواہ نان ونفقہ میں مقرر کی جائے گی۔ کیونکہ خاوند کے ذمہ اس کے کھانے تیار کرانے کا بندوبست اور ضروریات مہیا کرنا لازم ہے جب اس نے کھانے وغیرہ کا بندوبست نہ کیا تو اسے ایک نوکر کی تنخواہ ادا کرے۔ پھر یہ خود اپنا کھانا تیار کرے یا کسی کو ملازم رکھ لے ہر دوصورت میں ظاہر روایت کی رو سے ملازم کی تنخواہ وصول کرنے کی وہ مستحق ہے۔ کیونکہ وہ خادم کی مالک ہے) فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ
ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی الجد دی مفتی
جامع مسجد اکبرآباد

✿✿✿✿✿

[1] البسوط للسرخسی: جلد ۵ صفحہ ۱۸۲ مطبوعہ دار المعرفہ بیروت

﴿فتویٰ نمبر......223﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اور مفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی عورت کو طلاق دیدی۔ اوراس کے پاس ایک بچہ اڑھائی سال کا ہے۔ اگر وہ لڑکا اپنی والدہ کے پاس رہے گا تو مرد کو اس کی پرورش کے واسطے دینا ہوگا یا نہیں؟ اور مرد جس وقت یا اس وقت اپنا لڑکا لینا چاہے گا تو ملنا چاہئے یا نہیں؟۔ بینوا توجروا

سائل: حبیب بخش محلہ ککو گلی واہی سار

۲۲ شوال ۱۳۳۴ھ

الجواب

نحمده و نستعينه و نصلى على حبيبه و آله و صحبه.

اللهم رب زدني علما۔

صورتِ مسئولہ میں بچہ کا نفقہ جب تک وہ اپنی ماں مطلقہ کی مہدِ پرورش میں ہے' باپ پر لازم ہے اور نیز اجرت پرورش کی حسبِ عرف وعادت جو کچھ باہم ٹھہر جائے' ایامِ عدت گزر جانے کے بعد سے' اس واسطے کہ ایامِ عدت کا تو نان ونفقہ بلا پرورش بھی بچہ کے باپ پر لازم ہے' اور سات برس تک جب تک بچہ تنہا بغیر کسی کی مدد کے خود کھانے' پینے' پہننے' استنجا کرنے' پر قادر نہ ہو جائے اور خود استنجا تک نہ کرنے لگے' ماں کا حق پرورش ہے۔ ماں سے چھین کر دوسری جگہ باپ پرورش نہیں کرواسکتا۔ کما فی الھدایة:

واذا وقعت الفرقة بين الزوجين فالام احق بالولد والنفقة على الاب انتهى مختصرا [۱]

(ترجمہ: میاں بیوی کے درمیان اگر جدائی ہو جائے' تو ماں بچہ کی پرورش کی زیادہ حق دار ہے اور نفقہ باپ کے ذمہ ہوگا)

---

[۱] الهدايه جلد ۲ صفحه ۴۱۴ مطبوعه مكتبه امداديه ملتان .

ایضا فیه:

والام والجدة احق بالغلام حتی یاکل وحده و یشرب وحده و یلبس وحده و یستنجی وحده و فی الجامع الصغیر حتی یستغنی فیاکل وحده و یشرب وحده و یلبس وحده والمعنی واحد لان تمام الاستغناء بالقدرة علی الاستنجاء والخصاف قدره بسبع سنین اعتبارا للغالب [1]

☆(ترجمہ: ماں' نانی اور دادی دیگر رشتہ داروں سے لڑکے کی پرورش کرنے کا زیادہ حق رکھتی ہیں۔ لڑکا ان کی پرورش میں رہے گا جب تک وہ اکیلا کھالے' اکیلا پی لے' اکیلا خود اپنا لباس پہن لے اور خود اکیلے استنجاء کر سکے۔
☆جامع صغیر میں ہے کہ لڑکا ماں اور دادی کی پرورش میں رہے گا یہاں تک کہ اس کو احتیاج باقی نہ رہے۔ وہ اکیلا کھا' پی اور پہن سکے اور دونوں عبارتوں کا معنی ایک ہی ہے کیوں کہ احتیاج پوری طرح سے اس وقت ختم ہوتی ہے جب وہ خود اکیلے استنجاء کر سکے۔ امام ابوبکر خصاف رحمۃ اللہ علیہ نے غالب کا اعتبار کرتے ہوئے یہ مدت سات سال مقرر کی ہے)

اور درمختار میں ہے:

و تستحق الحاضنة اجرة الحضانة اذا لم تكن منكوحة ولا معتدة لابیه [2]

(ترجمہ: پرورش کرنے والی عورت اجرت کی حق دار ہے' بشرطیکہ وہ بچے کے والد کی منکوحہ یا اس کی عدت میں نہ ہو)

قال الشامی رحمه الله:

و لعل وجهه ان نفقة الصغیر لما وجبت علی ابیه لو غنیا والا فمن مال الصغیر کان من جملتها الانفاق علی حاضنته التی حبست نفسها لاجله عن التزوج [3] انتهی مختصرا بقدر الحاجة.

---

[1] الهدایه جلد ۲ صفحه ۴۱۵ مطبوعه مکتبه امدادیه ملتان.

[2] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۵ صفحه ۲۰۹ مطبوعه بیروت

[3] رد المحتار جلد ۵ صفحه ۲۱۰ مطبوعه بیروت

(ترجمہ: اس کی وجہ شاید یہ ہے' کہ نابالغ بچے کا نان ونفقہ جب اِس کے باپ پر واجب ہے' بشرطیکہ وہ مال دار ہو ورنہ نابالغ بچے کے مال سے خرچ کیا جائے گا۔ اور پرورش کرنے والی عورت کی اجرت میں خرچ کرنا' نان ونفقہ میں داخل ہے' جس نے اپنے آپ کو نکاح سے اس بچے کی خاطر روک رکھا ہو۔ ضرورت کے مطابق عبارت کو مختصر کیا گیا ہے)

☆ ہاں البتہ اگر مابعد ایامِ عدت وہ ماں مطلقہ کسی سے نکاح کر لے تو حق پرورش ماں کا ساقط ہو جائے گا۔ بشرطیکہ جس سے نکاح کرے وہ اس بچہ کا رشتہ دار قریب ذی رحم محرم نہ ہو۔

چنانچہ ہدایہ میں ہے:

و کل من تزوجت من هؤلاء يسقط حقها لما روينا ولان زوج الام اذا كان اجنبيا يعطيه نزرا و ينظر اليه شزرا فلا نظر الا الجدة اذا كان زوجها الجد لانه قام مقام ابيه فينظر له و كذالك كل زوج هوذ و رحم منه لقيام الشفقة نظرا الى القرابة القريبة[1]

☆ (ترجمہ: مذکور بالا عورتوں میں سے جو نکاح کر لےٗ اس کا حق ساقط ہو جاتا ہے۔ اس کی دلیل حدیث پاک کو ہم پہلے درج کر چکے ہیں۔ کیونکہ والدہ کا خاوند جب اجنبی ہو تو اس بچے کو بہت تھوڑا دے گا اور اسے کن انکھیوں سے دیکھے گا۔ سوائے دادی نانی کے جس کے ساتھ دادا یا نانا نے نکاح کیا ہو تو اسے پرورش کا حق باقی رہے گا کیونکہ وہ اس بچے کے باپ کے قائم (مقام) ہوتا ہے۔ تو وہ اس کی نگہداشت کرے گا اور اسی طرح جب کہ خاوند اس بچے کا ذی رحم محرم ہو کیونکہ وہ قریبی رشتہ داری کے باعث اس بچے پر شفقت رکھے گا۔) فقط

حررہ : العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی' مفتی جامع مسجد اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[1] الهداية جلد ۲ صفحه ۴۱۵ مطبوعه مكتبه امداديه ملتان

﴿فتویٰ نمبر......224﴾

سوال

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

1 کیا فرماتے ہیں علمائے دین شرع متین۔

2۔ زینب کا عقد زید کے ساتھ بارہ سال کی عمر میں ہوا۔ جب کہ زید کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ ڈھائی سال تک زینب زید کے مکان میں ہمراہ زید رہی۔ زید کی سکونت دیگر شہر میں رہی اور ہے۔

3۔ امِ زید اور زید نے زینب کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائیں کہ جو باعث نا اتفاقی ہوئیں۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ زید نے یہ ارادہ ظاہر کر کے کہ میں تجھ کو طلاق دے دوں گا اس کے عزیزوں میں بھیج دیا جو کہ دوسرے شہر میں تھے اور ہیں۔

4۔ بعد گزرنے کچھ عرصہ کے کہ جو محض زید کا انتظار تھا۔ بذریعہ تحریر زید سے کہا کہ یا تو اس وقت اپنی زوجہ کو لے جاؤ یا ہم بھیج دیں یا جو کچھ تم کو عذر ہے ہم کو مطلع کرو ہم بسبب تنگ دستی زینب کے اخراجات کے کفیل نہیں ہو سکتے۔

5۔ زید نے جواب دیا کہ زینب سے مجھ کو کچھ مطلب وسروکار نہیں ہے۔ مجھ کو لے جانے یا تمہارے پہنچا دینے سے کیا غرض ہے۔ نہ نان ونفقہ دے سکتا ہوں۔ بلکہ اگر تم لوگ مجھ کو زیادہ پریشان کرو گے تو اس شرط پر کہ مسماۃ مہر معاف کر دے اور قانونی اسٹامپ پر باضابطہ اقبال معاف کر دینے مہر کا تحریر کر دے۔

6۔ یہ کہ میں طلاق دے کر فارغ خطی باضابطہ لکھ دوں گا۔

7۔ یہ کہ ہر شخص نے دور اندیشہ کی غرض سے جہاں تک ممکن ہوا سمجھایا۔ اور اس ارادہ سے باز رکھنے کی ہدایت کی مگر زید نے کسی بات کا خیال نہ کیا۔ زینب کے عزیزوں نے مجبور ہو کر اس خیال سے کہ یہ جھگڑا طول نہ پکڑے کہ جو باعث رسوائی کا ہو ہر دو جانب سے مہر اور طلاق لیکر اور معاف کرا کر

باضابطہ تحریر بھی ہوگئی یہ طلاق وہ ہے جو قوامہ سے منصوب ہے۔ جس کا آواز زید نے زبانی اور تحریر ہر طرح سے چند اشخاص کے روبرو کر دیا۔

8۔ زید نے کوئی حبہ بغرض گزارنے ایامِ عدت نہیں دیا۔ اور نہ زینب کے ماں باپ یا کوئی عزیز اس کی امداد رسی کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ اور نہ زینب کوئی کام اس قسم کا جانتی ہے جس سے اپنی بسر کر سکے۔

9۔ زینب کا بیان یہ تھا کہ زید نے بسبب نامرد ہونے اور مبتلائے آزادگی کے مجھ سے کوئی کلام نہیں کیا اور میں نے اس کی طرف سے ۔۔۔۔۔۔ ۱؎ اور نہ آج تک جیسا کہ میں عورتوں کی زبانی ایام ہونے سنتی ہوں مجھ کو ایام ہوا۔

10 زینب کو اپنے ماں باپ میں رہتے عرصہ ۱۰ ماہ ہوا اور طلاق طے ہوئے عرصہ ایک ماہ کا ہوا ہے۔ ان سب صورتوں میں عدت رکھے یا نہ رکھے؟ اب عمر اس کی ۱۶ سال ہے یا اس سے ایک دو ماہ کم۔ اگر اس میں عدت کا حساب نہ کر کے نکاح ثانی کر لیا وہ نکاح صحیح ہے یا باطل؟ لڑکی کے عزیزوں نے جو کسی قسم کی سرپرستی اور مالی امداد کرنے سے ہر طرح مجبور ہیں اور یہ خیال کر کے کہ مبادا اس سے کوئی فعل بوجہ جاہل ہونے سرزد ہو جائے جو باعث بدنامی کا ہو عقد ثانی کرایا۔ بینوا وتوجروا

سائل اللہ بخش ۲۲ دسمبر ۱۹۱۵ء

الجواب

ھو الموفق للحق والصواب

اگر کسی وقت خلوت ہوگئی ہے اور اس کے بعد طلاق دی ہے تو زوجہ پر عدت ہے۔ وہ عدت میں نفقہ و سکنی کی مستحق ہے۔☆ نکاحِ ثانی بعد انقضائے عدت ہونا چاہیے۔ قبل انقضائے عدت باطل ہے۔

ہدایہ میں بعد ذکر خلوت مجبوب وغیرہ ہے:

۱؎ الفاظ پڑھے نہیں جا سکے۔

وعلیه العدة فی جمیع المسائل[۱]

(ترجمہ: ان تمام مسائل میں اس کے ذمہ عدت ہے)

نیز اسی میں ہے:

و اذا طلق الرجل امراته فلها النفقة والسکنی فی عدتها رجعیا کان او بائنا[۲]

(ترجمہ: خاوند جب اپنی بیوی کو طلاق دے تو عدت کے اندر نفقہ اور سکونت حاصل کرنا عورت کا حق ہے طلاق خواہ رجعی ہو یا بائن)

☆اگر عورت کو حیض نہ آیا ہو تو عدت تین ماہ ہے ہدایہ میں ہے)

و ان کانت ممن لا تحیض من صغر و کبر فعدتها ثلاثة اشهر و کذا اذا بلغت بالسن و لم تحض[۳]

☆(ترجمہ: اگر عورت ایسی ہو جس کو کم عمری یا بڑھاپے کے باعث حیض نہ آتا ہو اس کی عدت تین ماہ ہے۔ اور اسی طرح اس عورت کا حکم ہے جو عمر کے اعتبار سے بالغ ہو لیکن اسے حیض نہ آتا ہو)

واللہ اعلم بالصواب.

عاجز محمد رمضان عفی عنہ

مفتی واعظ جامع مسجد آگرہ

۲۲ دسمبر ۱۹۱۵ء

✿✿✿✿✿

---

[۱] الهدایه ج ۲ ص ۳۲۶ شرکت علمیه ملتان

[۲] الهدایه ج ۲ ص ۴۴۳ شرکت علمیه ملتان

[۳] الهدایه ج ۲ ص ۴۲۳ شرکت علمیه ملتان

﴿فتویٰ نمبر......225﴾

مدعیان۔ صدرالدین ومسماۃ ریاضی ساکن حلقہ مالی مندی۔

۱۳دسمبر ۱۹۱۵ء مطابق ۵صفر۳۲ھ

خلاصہ فیصلہ شرعی

بمواجہ حسین بخش' اللہ بخش' امداد حسین' سعد اللہ لاہو' قاضی علی بخش' چودہری محمد بخش' شیخ خیراتی' حافظ حسام الدین' محمد بخش' رحیم بخش' عبدالرحیم' حافظ عنایت حسین صاحبان

مسمی صدرالدین شوہر پر ریاضی بنت اللہ بخش نے بہ دعویٰ شرعی رجوع کیا کہ اس نے مجھ کو زبانی اور تحریری طلاق مغلظہ دے دی۔ مہر میرا اور اسبابِ جہیز اس کے پاس ہے۔ اور جو کچھ حقوق اور دختر میری کا فیصلہ شرعی ہونا چاہئے۔

مفتی نے موقع پر بیان صدرالدین پسر نصیرالدین شوہرِ مسماۃ ریاضی کا لیا۔ بیان کیا کہ ۷ دسمبر ۱۵ء بروز منگل میں نے تین طلاقیں دے دیں۔ کیوں کہ میری ہمیشہ عدول حکمی کرتی رہی اس کی اشیا میرے پاس حسب ذیل ہیں۔

ظروف' دیگچی' ڈھکنا' لوٹہ' کٹورہ' کف گیر' پلنگ شکستہ بان' زیور' نقرئی' بالیاں آٹھ عدد' جگنوں ایک' چوڑیاں دست چار عدد' جوشن دو عدد' چھلہ پیر دس عدد' اور میرا مہر شرعی مبلغ ۱۰من کا ہوا ہے وہ بھی میرے ذمہ زر ہے۔

میرا نکاح قاضی قمر الاسلام نے پڑھایا تھا۔ اس کے پاس مہر لکھا ہوا ہے۔

بیان مسماۃ ریاضی بنت اللہ بخش

میرا نکاح صدرالدین پسر نصیرالدین سے دس برس کا عرصہ ہوا کہ ہوا تھا۔ اس نے مجھ کو بلا قصور طلاق دے دی۔ میرا اسباب جو صدرالدین نے لکھا ہے میں دو بالی اور دو انگوٹھیاں چاندی کی قیمتی ایک روپیہ اور

توشک رضائی تکیہ جواستعمال سے ختم ہوگئی۔

مجھ کو کوئی کپڑا شوہر نے نہ دیا۔ کھانا کچھ دنوں اپنا اور کچھ دنوں اس کا کھایا۔ میرا مہر شرع محمدی تھا۔ حاضرین نے کہا کہ مہر شرعی یہاں بتیس ۳۲ روپیہ آٹھ آنے ہوا کرتا ہے۔ ریاضی بیگم نے اس کا اقرار کیا کہ اسی قدر تھا۔

مگر صدرالدین کے والد نے مجھ کو آٹھ بالیاں طلائی اور گلے میں تورا اور بٹن اور بانہوں میں چاندی کی اور بارہ چوڑیاں ہاتھوں میں۔ بڑی آٹھ چاندی کی۔ پیر میں چھاگل۔ جھانجھر دو عدد۔ چوڑیاں چار۔ یہ سب زیور مجھ کو پہنایا تھا۔ یہ سب دلایا جائے۔

مسمی صدرالدین شوہر سے دریافت کیا اس نے کہا میرے باپ سے دریافت کیا جائے مجھ کو اس کا حال معلوم نہیں۔ نصیرالدین اس کے باپ نے کہا کہ یہ چیزیں مستعار میں نے پہنا دیں تھیں۔ پھر اتار لیں۔ اس کو ہبہ نہیں کی تھیں۔ حاضرین نے کہا کہ دلہن کو جو اشیاء پہناتے ہیں وہ ملکیت اس کی سمجھتے ہیں۔ اور مسماۃ ریاضی نے جہیز کا سامان' چار تہوار کا روپیہ' سال جوڑا عید برات کا بھی مطالبہ بذمہ' شوہر بیان کیا۔

ضمیمہ بیان نصیر الدین و صدر الدین

ہم نے یہ زیور مستعار پہنایا تھا اور رسم یہ ہی ہے' کہ مستعار پہناتے ہیں دو بالی اور انگوٹھیاں اس کی ہیں۔ وہ ہم دے دیں گے۔ اور تمام حاضرین نے بعد بیان کے بالاتفاق کہا کہ اب جو حکم شرع شریف کا ہوگا اس پر عمل درآمد کریں گے۔

الجواب

خلاصہ

بعد استماعِ بیاناتِ فریقین و حاضرینِ جلسہ حسبِ حکمِ شریعت ہر سہ طلاق کا واقع ہونا بیانِ شوہر اور اقرارِ مدعیہ سے اور تحریرِ شوہر سے ثابت ہے۔

فریقین مہرِ شرعی کے مقر ہیں۔اور شوہر نے علاوہ اشیاء کے خود اقرار کیا تھا۔حسب بیان مدعیہ دو بالی اور دو انگوٹھیاں بھی اپنے پاس ہونا بیان کیا۔اور جو اشیاء بطور تحفہ زوجہ کے پاس آئیں ان کا استعمال اس نے کیا۔کھانے پینے کی اشیاء اس کے استعمال میں ہیں۔اس کا کوئی حصہ شوہر کے پاس نہیں اور نہ ممکن ہے کہ دس برس تک باقی رہیں۔اب بمقابلہ صدرالدین ونصیرالدین زیور مستعار کا جھگڑا رہا۔جس میں صدرالدین ونصیر الدین مستعار کہتے ہیں۔اور مدعیہ ملکیت کا اظہار کرتی ہے۔اور رسم یہ ہے کہ بروز برات جو زیور یا نیوتہ دیا جاتا ہے وہ زوجہ کا ہوتا ہے۔اور یہ واقعہ بعد کئی سال ہوا ہے کہ مسماۃ کو زیور پہنایا تھا اور پھر واپس لے لیا۔لہٰذا بوجہ انکار مطابق حکم

☆ البينة على المدعى واليمين على من انكر[1]

(ترجمہ: گواہی پیش کرنا مدعی کے ذمہ ہے اور قسم انکار کرنے والے کے ذمہ ہے)

صدرالدین ونصیرالدین سے حلف لیا گیا ہر دو نے حلف سے انکار کیا۔پس

الطلاق مرتان فامساك بمعروف او تسريح باحسان[2]

(ترجمہ: طلاق رجعی جس کے بعد رجوع ہوسکتا ہے دو دفعہ ہے۔پھر روک لینا ہے بیوی کو نیکی کے ساتھ یا چھوڑ دینا ہے نیکی کے ساتھ)

کے مطابق شوہر پر مہر ادا کرنا واجب ہے اور جو اشیاء نقرئی وظروف و پلنگ وغیرہ اس کے پاس ہے اس کو واپس مسماۃ ریاضی کو دے دے۔

☆ اور دوبارہ دختر' جب تک اس کی ماں نکاح ثانی نہ کرے سات برس دختر کی پرورش کرسکتی ہے۔ بمطابق حکم حدیث:

---

[1] الجامع الصغير مع شرح فيض القدير ج ۳ ص ۲۲۵ مطبوعه دار المعرفت بيروت

[2] القرآن الحكيم : سورة البقرة: آيت ۲۲۸

مالم تنزوجی ۱؎ ۔

☆ صرفہ اس کا ذمۂ والد یعنی صدر الدین رہے گا۔ بعد سات برس کے دختر جبراً باپ کو دلائی جائی گی۔ وعلیہ الفتوی۔

☆ بعد تین حیض پورے ہونے کے مسماۃ کو اختیار ہے کہ عقدِ ثانی اپنا کرے یا نہ کرے۔ مسمی صدر الدین شوہر نے یہ کہا کہ ایامِ عدت کے صرفہ کو بھی میں دے دوں گا۔ اگر چہ اس کا لزوم شرعاً نہیں مگر تبرعا واستحبابا جائز ہے۔ لہٰذا بذمۂ شوہر علاوہ صرفۂ دختر کے ایام عدت کا بھی عائد ہو گیا۔ مہر واسباب ونفقہ ادا کرے یا ضمانت دے دے تا کہ آئندہ کوئی فساد نہ ہو۔

فیصلہ شرعی تمام حاضرین کو اور فریقین کو سنا دیا گیا۔ جلسہ برخاست ہوا اب فریقین کو اختیار ہے خواہ فیصلۂ شرعی پر پابندی کریں خواہ دروازۂ عدالت کھلا ہوا ہے وہاں باضابطہ رجوع کریں۔ اصل پر نشان (انگوٹھا) ہر دو لئے گئے۔ واللہ اعلم بالصواب و عندہ ام الکتاب

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

✿✿✿✿✿

۱؎ یہ حدیث پاک کا ایک حصہ ہے پوری حدیث یوں ہے:

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده عبد الله بن عمر أن امرأة قالت يا رسول الله ان ابنی هذا كان بطنی له وعاء وثديی له سقاء وحجری له حواء وان أباه طلقنی وأراد أن ينزعه منی فقال رسول الله ﷺ انت احق به ما لم تنكحی .

(ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب رحمۃ اللہ علیہما اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں کہ ایک عورت نے دربارِ نبوی میں عرض کی یہ میرا بیٹا ہے میرا پیٹ اس کی حفاظت کا برتن' میرے پستان اس کو سیراب کرنے والی مشک اور میری گود اسے اپنے اندر سمیٹ کر رکھنے والی تھی۔ اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے اور وہ اسے مجھ سے چھیننا چاہتا ہے اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم اس کی زیادہ حق دار ہو جب تک تم نکاح نہ کرلو)

i	زجاجة المصابيح جلد ۲ صفحه ۵۵۲' ۵۵۳	مطبوعه حيدر آباد دكن
ii	مشكوة المصابيح صفحه ۲۹۳	مكتبه امداديه ملتان
iii	سنن أبی داؤد جلد ۱ صفحه ۳۷۱	مكتبه امداديه ملتان

شکار و ذبح

﴿فتویٰ نمبر......226﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر ایک شخص مسلمان تکبیر پڑھ کر بندوق سے کسی حلال جانور کا شکار کرے اور وہ جانور زمین پر پہنچنے سے یا اس شخص کے ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی بضرب بندوق مر جائے تو کیا وہ جانور حلال ہوا یا حرام؟

سائل: عطاء اللہ تھانہ کرھل ضلع مین پوری

الجواب

اللھم رب زدنی علما

جو شکار حلال تیر یا برچھی کے ساتھ اس طرح کیا جائے کہ بسم اللہ کہہ کر تیر یا برچھا یا ایسی چیز جو شکار کو زخمی کر دے اور شکار کے پاس پہنچنے تک وہ شکار مر جائے تو اس کا کھانا بلا تکلف حلال ہے۔

☆ اور اگر کسی ایسی چیز سے بسم اللہ کہہ کر شکار کی جائے جو بوجہ اپنے ثقل کے کھال کو پھاڑ دے اور اس کے صدمہ سے شکار مر جائے۔ نہ کہ اس کی دھار اور تیزی سے زخمی ہو۔ تو اس کا کھانا بموجب ظاہر الروایۃ وقول مفتی بہ قطعاً حرام ہے۔ ☆علی ہذا اگر دھار دار چیز سے زخمی ہوا اور شکار کے پاس پہنچنے تک شکار نہ مرے پر زخمی کر دینے سے شکار اس وقت حلال ہوتا ہے' جب باقاعدہ ذبح کر لینے سے عجز تام ہو۔

کما فی الدرالمختار المطبوعة (مع) الشامی فی المصر فی صفحة ٣٣٣ من الجز الخامس

و اذا ادرک المرسل أو الرامی الصید حیا بحیاة فوق ما فی المذبوح ذکاه وجوبا و شرط لحله بالرمی التسمیة و لو حکما کما مرو شرط الجرح لیتحقق معنی الزکاة[1]

(ترجمہ: اگر شکاری جانور کو چھوڑنے والے یا تیر پھینکنے والے نے زندہ پالیا اور اس میں اس سے زیادہ زندگی پائی جاتی ہے جو ذبح شدہ جانور میں پائی جاتی ہے' تو واجب ہے کہ اس کو ذبح کرے۔ اور اس کے حلال ہونے کی

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ١٠: صفحه ٥٢' ٥٣' مطبوعه دار احياء التراث العربی بیروت

شرط یہ ہے کہ تیر بسم اللہ پڑھ کر چلایا گیا ہو اگرچہ وہ حکماً ہی پڑھی ہو۔ جس طرح پہلے گذر چکا ہے۔ اور زخمی ہونا شرط ہے تا کہ ذبح ہونے کی حقیقت ثابت ہو جائے)

قال الشامی رحمه الله

قوله شرط الجرح فلو دقه السهم لم یو کل لفقد الزکاة[1]

(ترجمہ: اگر تیر اسے عرض میں لگا اور تیر نے اسے ضرب پہنچائی یا ہڈی توڑ دی تو شکار کھایا نہیں جائے گا کیوں کہ ذبح کرنا نہیں پایا گیا)

وفیه فی صفحة ۳۳۵

فان ترکها ای الزکاة مع القدرة علیها فمات حرم و کذا یحرم لو عجز عن التذکیة فی ظاهر الروایة[2]

یعنی اگر باوجود قدرت کے باقاعدہ ذبح کرنے پر شکار کے پاس پہنچ کر اگر شکار کو ذبح نہیں کیا اور شکار مرگئی یا زندہ شکار کو پالیا مگر بوجہ نہ ملنے چھری وغیرہ کے باقاعدہ ذبح کرنے سے عاجز رہ گیا اور شکار مرگئی تو بقولِ مختار اور روایتِ ظاہر اس کا کھانا حرام ہو گیا۔

☆ علی ہذا اگر بھاری گولی سے کہ جس میں دھات بھی تھی اس کی دھار سے نہ مرے بلکہ صدمہ سے شکار گو کھال پھٹ کر مر بھی جائے شکار حلال نہ ہوگی اور چھوٹی گولی دھار دار سے زخمی ہو کر مر جائے گی تو بلاشبہ حلال ہو جائے گی۔

کما فی الدر المذکور فی صفحہ ۳۳۵

او بندقة ثقیلة ذات حدة لقتلها بالثقل لا بالحد (ای لو مات لا یحل له) و ان کانت خفیفة بهاحدة حل لقتلها بالجرح و لو لم یجرحه لا یو کل مطلقا[3]۔

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۱۰ : صفحه ۵۲، ۵۳، مطبوعه دار احیاء التراث العربی بیروت

[2] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۱۰ : صفحه ۵۶ مطبوعه دار احیاء التراث العربی بیروت

[3] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۱۰ : صفحه ۵۷ مطبوعه دار احیاء التراث العربی بیروت

(ترجمہ: یا بھاری گولی جس میں دھار بھی ہو اس سے کیا ہوا شکار حرام ہے کیوں کہ اس گولی نے شکار کو اپنے بوجھ سے مارا ہے نہ کہ دھار سے۔ اور اگر گولی ہلکی ہو اس پر دھار بھی ہو تو اس سے کیا ہوا شکار حلال ہے کیوں کہ اس نے اسے زخم سے قتل کیا ہے اور اگر گولی نے اسے زخمی نہ کیا ہو اور وہ مر جائے تو بہر حال نہ کھایا جائے گا)

اور زخم میں یہ شرط ہے کہ خون بہہ نکلے۔

کما فی تلک الصفحۃ:

و شرط فی الجرح الدماء[1]

(ترجمہ: زخمی کرنے میں شرط یہ ہے کہ وہ خون بھی نکالے)

بناء علیہ علامہ شامی صفحہ ۳۳۵ سطر ۳ درمختار مذکور میں تحریر فرماتے ہیں

و لا یخفی ان الجرح بالرصاص انما ھو باحراق و الثقل بواسطۃ اندفاعہ العنیف اذ لیس لہ حد فلا یحل وبہ افتی ابن نجیم (مصنف البحر الرائق و الاشباہ)[2]

(ترجمہ: اور یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ سیسہ کی گولی سے زخم جلنے یا اس کے بوجھ کے باعث ہوتا ہے اس لیے کہ شدت کی تیزی سے چلتی ہے کیوں کہ اس میں دھار نہیں ہوتی لہٰذا اس سے کیا گیا شکار حلال نہیں۔ البحر الرائق اور الاشباہ والنظائر کے مصنف علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ نے یہی فتوی دیا ہے)

یعنی چونکہ بندوق کی گولی کا زخم بوجہ قوت ضرب (اور) جلانے کھال کے بلاشبہ ہوتا ہے لہٰذا گولی اور چھرہ کا شکار اگر مر جائے اور باقاعدہ ذبح نہ کیا جائے ہرگز حلال نہیں ہوتا اور بلاشبہ اس کا کھانا حرام ہے۔

حررہ: العبد الراجی

محمد دیدار علی الرضوی مفتی جامع مسجد اکبر آباد

❁❁❁❁❁

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۱۰: صفحہ ۵۷ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

[2] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۱۰: صفحہ ۵۷ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

﴿فتویٰ نمبر......227﴾

سوال

اگر ایک غیر مسلم یا ہندو جو تکبیر مجوزۂ شرع محمدی پڑھ کر بندوق سے شکار کرے حلال جانور کا اور وہ جانور مرجائے اور حلال کسی مسلمان کی چھری سے نہ ہو سکے تو جانور حلال ہوا یا حرام؟

الجواب

اللھم رب زدنی علما

مشرک کا کیا ہوا شکار خواہ بسم اللہ کہہ کر تیر یا برچھا یا بغیر بسم اللہ کے ہرگز حلال نہیں ہوتا ☆ اس واسطے شکار حلال ہونے کی شرط شکاری کا مسلمان ہونا شرط ہے کما ھو ظاھر من تتبع الکتب الفقھیة

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مفتی جامع مسجد اکبرآباد

﴿فتویٰ نمبر......228﴾

سوال

بکرا وغیرہ بنام غیر اللہ دے اور بوقت ذبح اللہ اکبر کہے تو کیا حکم ہے؟ اور تفسیر ما اھل لغیر اللہ بہ کیا ہے؟۔ اور اگر پہلے نیت کچھ ہو اور پھر نیت بدل گی اور ذبح کیا تو کیا حکم ہے؟۔ خلاصہ جواب شافی دیا جائے۔

سائل: ملا احمد خان فیروز پور۔ ملا حسین ابو اتجار

۲۱ اپریل ۱۹۱۶ء

الجواب

ھو المصوب

(ذبح کرنے[1]) والے کی یہ نیت ہے کہ اس کو ذبح فلاں پر ہم کریں گے تو یہ حرام ہو گیا خواہ اس پر اللہ اکبر کہا جائے۔☆ اور اگر یہ نیت ہے کہ اس کے گوشت، پوست کا ثواب یا دعوت فلاں کے نام پر ہو گی تو یہ حلال ہے۔

تفسیر ما اھل لغیر اللہ نیشا پوری میں ہے۔ **قال العلماء لو ان مسلما ذبح ذبیحة و قصد بذبحها التقرب الی غیر اللہ صار مرتدا و ذبیحة مرتد**[2]

(ترجمہ: علماء نے فرمایا اگر کسی مسلمان نے کسی ذبیحہ کو ذبح کیا اور ذبح کے وقت اللہ تعالی کے سوا کسی اور کے تقرب کی نیت کی تو وہ شخص مرتد ہو گیا اور اس کے ذبیحہ کا حکم مرتد کے ذبیحہ کا ہے)

☆ یعنی مسلمان ذبح اس نیت پر کرے کہ خون بہائے گا ثواب فلاں کو ایصال کرے گا اور محتاجوں کو دوں

---

[1] اصل نسخے سے یہ لفظ پڑھے نہیں جا سکے لہٰذا اندازہ سے لکھے ہیں۔

[2] تفسیر نیشاپوری جلد صفحہ مطبوعہ

گا اور خون بہانا خالص اللہ کے واسطے ہے تو مضائقہ نہیں حلال ہے۔ اور خون بہانا فلاں کے نام پر ہے تو یہ حرام ہے خواہ بسم اللہ کہہ کر ذبح کرے۔

☆ اور اگر اول نیت لغیر اللہ ہے اور پھر نیت کو بدلا تو آخر میں نیت کا اعتبار ہوگا اور ذبیحہ حلال ہوگا۔

چنانچہ حاشیہ زبدۃ النصائح میں ہے۔ لیکن اگر کسے جانور را الخ ط۔

اور مثال یہ ہے کہ کوئی ہندو ہولی کا بکرا مسلمان سے ذبح کرائے تو وہ اگرچہ بسم اللہ کہہ کر ذبح کرے مگر وہ حرام ہے۔ کیوں کہ دراصل اس کی نیت ہولی کی نذر ہے۔ اسی طرح شیخ سدو اور میاں دین کے بکرے کا حکم ہے۔ بوجہ نیت لغیر اللہ حرام ہے۔ هذا خلاصة التحقيق فى هذا المقام

المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

❁❁❁❁❁

ط زبدة النصائح صفحه

قربانی

﴿فتویٰ نمبر......229﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ایک شخص گائے یا بچھڑا قربانی کرنا چاہتا ہے۔آیا جائز ہے یا نا جائز ہے ؟اور ایک گائے میں کے (کتنے) شریک ہو سکتے ہیں۔

سائل: ولایت خان از اعتماد پور ضلع آگرہ

۲۱ دسمبر ۱۹۳۶ء

الجواب

اللهم رب زدنی علما.

قربانی' اونٹ' گائے' بیل' بکری' سب کی ہو سکتی ہے۔مگر اونٹ پانچ سال سے کم نہ ہو اور گائے یا بیل یا بھینس خواہ بھینسا دو برس کی عمر سے کم نہ ہو اور بکرا' بکری' بھیڑ' مینڈھا' دنبہ' ایک سال سے کم نہ ہو۔

کمافی الھدایۃ

والا ضحية من الابل والبقر والغنم .... و يجزى من ذالک كله الثنى الاالضان فان الجذع منه تجزى [۱]

(ترجمہ: قربانی اونٹ' گائے' اور بکری سے دی جاتی ہے۔ان تمام جانوروں سے ثنی (جس جانور کے سامنے کے دو دانت گر گئے ہوں) قربانی کے لیے کفایت کرتے ہیں مگر بھیڑ اور دنبہ سے چھ ماہ کا بھی کافی ہے)

☆ یعنی اونٹ وغیرہ بحسب عمر مذکورہ قربانی ہو سکتی ہیں۔مگر دنبہ شش ماہہ اگر سال بھر کے دنبہ کے برابر ہو تو وہ بھی جائز ہے۔

چنانچہ ہدایہ میں ہے:

---

[۱] الهدايه : جلد ۷ صفحه ۱۶۱ مطبوعه ادارة القرآن والعلوم الاسلاميه كراچی

والجذع من الضان ما تمت له ستة اشهر ... والثنی منها ومن المعز ابن سنة و من البقر ابن سنتين و من الابل ابن خمس سنين [1]

(ترجمہ: بھیڑ اور دنبہ سے جذع وہ جانور ہے جس کی عمر چھ ماہ پوری ہو چکی ہو اور ثنی' بھیڑ' دنبے' اور بکری سے وہ ہوتا ہے' جو سال کا ہو۔ اور گائے سے ثنی وہ ہوتا ہے' جو دو سال کا ہو۔ اور اونٹ سے ثنی وہ ہوتا ہے' جو پانچ سال کا ہو۔)

اور بکری' بھیڑ' بکرا' مینڈھا' فقط ایک آدمی کی طرف سے ہو سکتا ہے۔

☆ اور گائے' بیل' اونٹ' اونٹنی' میں ایک سے سات آدمی تک بہ نیت قربانی شریک ہو سکتے ہیں۔ ہدایہ میں ہے:

ویذبح عن کل واحد منهم شاة او یذبح بقرة او بدنة عن سبعة [2]

(ترجمہ: اور ذبح کرے ہر قربانی کرنے والے کی طرف سے ایک بکری اور اونٹ یا گائے سات آدمیوں کی طرف سے ذبح کرے)

☆ اور بلا نیتِ قربانی' کھانے کھلانے کی نیت سے اگر ایک بھی حصہ دار شریک ہو گا کسی کی بھی قربانی درست نہ ہو گی۔ اور مستحب ہے' قربانی کا گوشت ہر ایک حصہ دار تول سے بانٹ کر لے اور اپنے اپنے حصہ سے' ہر حصہ دار ایک حصہ غریبوں کو دے۔ ایک دوست احباب کو اور ایک خود کھائے۔

☆ اور قربانی والے کو اپنے خرچ کے واسطے کھال بیچنا مکروہ ہے۔ صدقہ کرنے کی نیت سے بیچے تو جائز ہے۔ البتہ رنگوا کر اپنے واسطے مصلی وغیرہ بنا سکتا ہے۔

حررہ : العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی

مفتی جامع مسجد اکبر آباد

---

[1] الهدایه : جلد ۷ صفحه ۱۶۲ مطبوعه ادارة القرآن والعلوم الاسلامیه کراچی

[2] الهدایه : جلد ۷ صفحه ۱۵۰ مطبوعه ادارة القرآن والعلوم الاسلامیه کراچی

﴾فتویٰ نمبر......230﴿

سوال

قربانی کی دعا تحریر فرمائیں۔

محمد اسلام خان
قبصہ شمس آباد ضلع آگرہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔

اللھم رب زدنی علماً

قبل قربانی

إنی وجھت وجھی للذی فطر السموات والأرض حنیفا وما أنا من المشرکین [1]

(ترجمہ: میں نے اپنا رخ اس ذات پاک کی طرف پھیر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا۔ میں ہر باطل سے جدا ہوں اور نہ میں مشرک لوگوں سے ہوں)

ان صلاتی ونسکی محیای ومماتی للہ رب العالمین لا شریک لہ وبذلک أمرت وأنا أول من المسلمین [2]

(ترجمہ: بلاشبہ میری نماز، قربانی، زندگی اور مرنا اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس کوئی شریک نہیں ہے۔ مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اطاعت کرنے والا ہوں)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی، الرضوی، الحنفی
مسجد جامع اکبر آباد

---

[1] القرآن المجید : سورۃ الانعام ۔ آیت : ۷۹

[2] القرآن المجید : سورۃ الانعام ۔ آیت : ۱۶۲، ۱۶۳

﴿فتویٰ نمبر...... 231﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ قربانی (کے گوشت اور کھال) کو قربانی کرنے والا خود فروخت کر کے کسی کو دے سکتا ہے؟ اگر دے سکتا ہے تو ایک شخص کو یا کئی شخص کو؟

محمد اسلام خان

قصبہ شمس آباد ضلع آگرہ

۷ ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما

جس طرح قربانی کے گوشت اور کھال کو اپنے اور اہل وعیال کے خرچ میں لاسکتا ہے قربانی کے گوشت یا کھال کو بیچ کر اس کی قیمت کے درھموں کو اپنے اور اہل وعیال کے خرچ میں نہیں لاسکتا۔ اس واسطے جمہور فقہا تحریر فرماتے ہیں کہ اپنے یا اپنے اہل وعیال کے خرچ میں لانے کی نیت سے قربانی کی کھال کا بیچنا مکروہ ہے اور ناجائز۔ اور اگر بہ نیتِ تصدق علی الفقراء بیچی چونکہ بہ نیتِ صدقہ بیچنا اور صدقہ کرنا بھی عبادت ہے بلاتکلف جائز ہے۔ خواہ بیچ کر اس کی قیمت ایک مسکین کو دی خواہ زیادہ کو۔

چنانچہ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے

ولا یبیعہ بالدراھم لینفق الدراھم علی نفسہ وعیالہ واللحم بمنزلۃ الجلد فی الصحیح حتی لا یبیعہ بما لا ینتفع بہ الا بعد الا ستھلاک و لوباعھا بالدراھم لیتصدق بھا جاز لانہ قربۃ کالتصدق کذا فی التبیین وھکذا فی الھدایۃ والکافی [۱]

---

[۱] الفتاوی العالم گیریہ جلد ۵ صفحہ ۳۰۱ مطبوعہ مصر

(ترجمہ: قربانی کی کھال اس لیے فروخت نہ کرے کہ اس سے حاصل شدہ رقم اپنی ذات یا اپنے اہل وعیال پر خرچ کرے' اس کا گوشت' صحیح قول کی رو سے کھال کے قائم مقام ہے لہٰذا اس کو ایسی چیز کے عوض فروخت نہ کرے جس سے صرف استہلاک کے بعد فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اگر اسے رائج الوقت نقدی کے عوض فروخت کیا تا کہ اس رقم کو صدقہ کرے تو یہ جائز ہے کیوں کہ صدقہ کرنے کی مانند یہ بھی عبادت ہے' تبیین' ہدایہ' کافی)

☆ البتہ مستحب یہ ہے کہ ایک (تہائی) حصہ غربا کو دے اور ایک حصہ (تہائی) خویش و اقربا دوست احباب کو اور ایک حصہ (تہائی) خود رکھے۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبر آباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......232﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین درجِ ذیل مسئلہ کے بارے میں۔

کہ قربانی کی کھال کی قیمت مسجد میں لگ سکتی ہے یا نہیں؟ اگر لگ سکتی ہے تو کس طرح؟

محمد اسلام خان قصبہ شمس آباد ضلع آگرہ

الجواب

نمبر۲: بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما

مسجد میں کھال کو رنگوا کر بطریقِ مصلی دے سکتا ہے مگر بعد فروخت اس کی قیمت مسجد میں یا کسی غریب کے کفن دفن میں نہیں دے سکتا۔ اس واسطے کہ بعد البیع اس کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ صدقہ میں کسی کو مالک بنانا ان دراھم کا شرط ہے۔ فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......233﴾

سوال

قربانی کے چمڑوں کا روپیہ مسجد کی تعمیر میں لگا سکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا

سائل: حاجی عبداللہ

سوداگر ریاست لال گڑھ، ضلع بلاس پور

۲۵ نومبر ۱۹۱۵ء

الجواب

وهو الملهم للحق والصواب

اگر مالک چرم کسی مسلمان کو دے دے اور وہ فروخت کر کے لگائے تو جائز ہوگا اور جو مالک خود فروخت کر کے قیمت لگا دے تو مکروہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

عاجز محمد رمضان عفی عنہ

مفتی واعظ جامع مسجد آگرہ

مورخہ ۲٦ نومبر ۱۹۱۵ء

﴿فتویٰ نمبر......234﴾

سوال

جب قربانی کا چمڑا دوست احباب کو دینا جائز ہے تو قیمت اس کی بھی دے دینا جائز ہوگا؟۔

الجواب

چمڑہ بعینہ دے دینا درست ہے۔اور قیمت اس کی مالک کو مالِ خبیث کا حاصل کرنا ہے۔لہٰذا وہ غرباء ومساکین کو دیں۔دوست احباب کو خبیث مال دینا مکروہ ہے۔

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......235﴾

سوال

حصہ گائے میں عقیقہ درست ہے یا نہیں۔ اور بعد ذبح گائے کے اگر حصے مقرر کئے جائیں تو قربانی ہو جائے گی۔

الجواب

جو شرائط قربانی کے ہیں وہی عقیقہ کے ہیں۔ گائے کے حصہ میں عقیقہ درست ہے۔ اور اگر جانور قربانی کا ذبح کیا اور پھر حصہ مقرر کرے تو جائز نہ ہوگا۔ کیوں کہ اول سے نیت تقرب کی نہ ہوئی جو ضروریاتِ قربانی سے ہے۔ صرف ذبیحہ کا حکم ہو جائے گا۔

کتبہ المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......236﴾

نوٹ: سوال دستیاب نہیں ہوا۔

الجواب

و هو الموفق الصواب

اللهم رب زدنی علما.

صورتِ مسئولہ میں صاحبِ قربانی غنی ہو خواہ فقیر جب قربانی کی نیت سے خرید چکا اور ایام قربانی نہ رہے تو اس پر لازم ہے کہ اس قربانی کو زندہ کسی مسلمان محتاج کو دیدے۔ اور اگر باوصف گزر جانے ایامِ قربانی کے ذبح کر بیٹھا ہو تو اسے کھانا غنی کو نا جائز ہے بلکہ فقیر کو صدقہ کر دے۔

کما فی الجلد الخامس من الشامی فی صفحة ۲۲:

و فی البدائع ان الصحيح ان الشاة المشتراة للاضحية اذالم يضح بها حتى مضى الوقت يتصدق الموسر بعينها حية كا لفقير بلا خلاف بين اصحابنا فان محمد ا قال و هذا قول ابی حنيفة و ابی يوسف و قولنا و تمامه فيه و هو الموافق لما قد مناه آنفا عن غاية البيان و على كل فاظاهر انه لا يحل له الاكل منها اذا ذبحها كما لايجوزله حبس شیء من قيمتها[1].

(ترجمہ: البدائع میں ہے۔ قربانی کے لیے بکری خریدی گئی اسے ذبح نہ کیا جا سکا یہاں تک قربانی کا وقت گذر گیا تو فقیر کی مانند امیر بھی اسے زندہ صدقہ کر دے۔ اس میں ہمارے اصحاب کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کیوں کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور

---

[1] رد المختار: جلد ۵ صفحه ۲۲٦ مطبوعه مكتبه رشيديه كوئٹه

ہمارا قول ہے۔اس کی پوری بحث اسی کتاب (بدائع) میں ہے۔اور یہ اس جزئیہ کے موافق ہے جو ہم نے غایۃ البیان سے نقل کر کے کچھ پہلے ذکر کر دیا ہے۔بہر صورت ظاہر یہی ہے کہ اگر (قربانی کے دن گذر جانے کے بعد) اس کو ذبح کرے تو اس کا کھانا اس کے لیے جائز نہیں۔اسی طرح اس کی قیمت کا کچھ حصہ اپنے پاس روک کر رکھنا جائز نہیں ہے)

حررہ :العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی المشہدی
المفتی فی جامع اکبر آباد

اکراہ
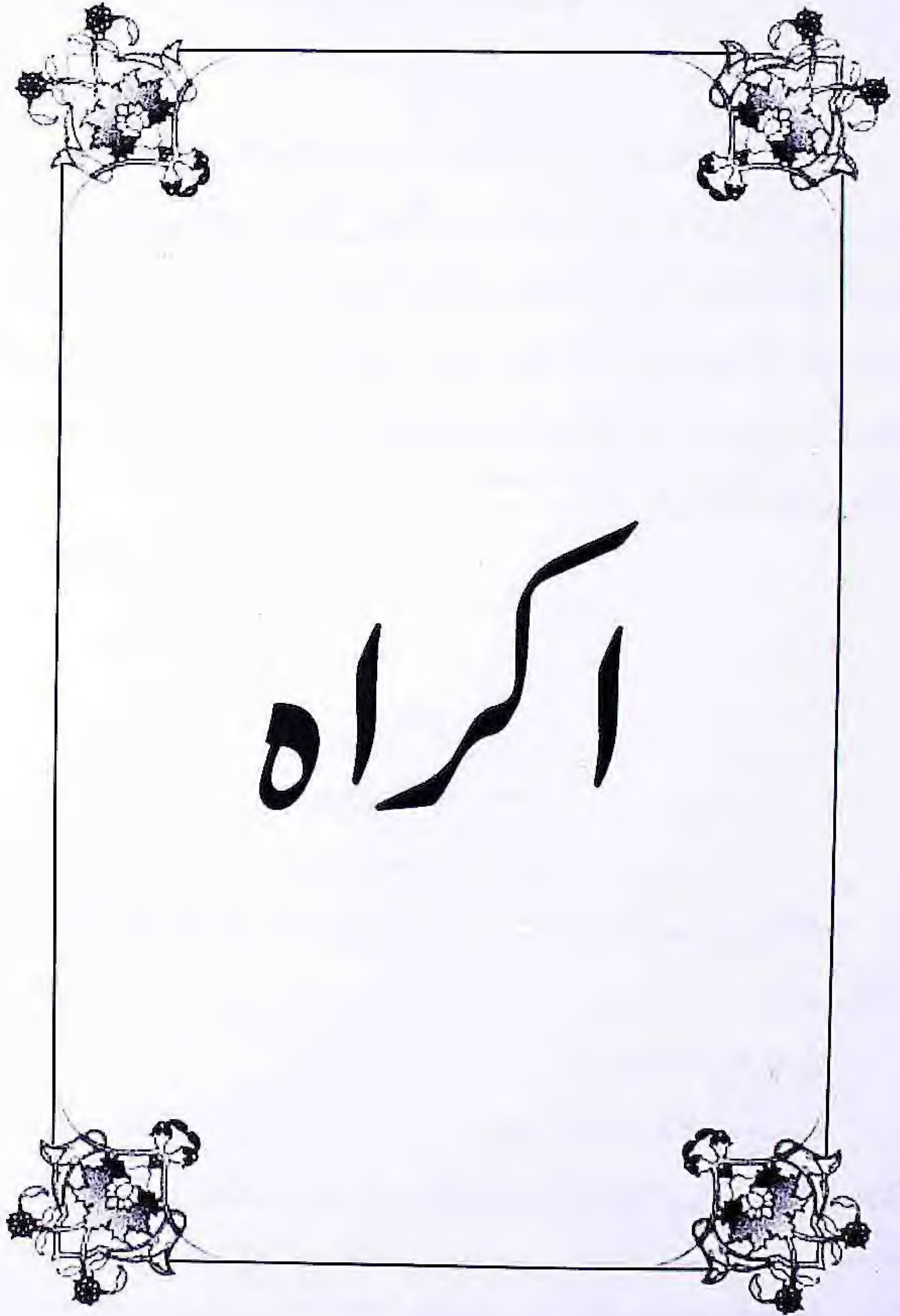
﴿فتویٰ نمبر...... 237﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس صورت میں کہ زید نے بحالتِ خلوت اپنی زوجہ سے باصرار یہ کہا کہ میرے ذمہ جو تیرا مہر لازم ہے اس کو معاف کردے۔ لیکن اس کہنے میں الفاظِ تخویف وتہدید نہ تھے۔ زوجہ کو بوجہ خلوت اندیشہ ہوا کہ اگر اس وقت الفاظ معافی نہیں کہتی ہوں تو شوہر مجھ کو ایذا و ضرر پہنچا دے گا۔ اس خیال سے اس نے اس وقت الفاظ صرف زبان سے ادا کر دیئے لیکن دل میں معافیِ مہر پر ہرگز راضی نہ تھی۔ چنانچہ دوسرے وقت عورت نے اپنے عزیز اقربا سے اس ہی طرح بیان کیا۔ پس ایسی صورت میں عندالشرع معافی مہر مانی جائے گی یا نہیں؟

سائل: فخر الدین۔ مراد آباد

۱۹ ستمبر ۱۹۱۶ء

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

وھو الموفق للصواب

☆ مطلقاً دیون کی معافی بالاکراہ صحیح نہیں اور مہر بھی منجملہ دیونِ واجبہ ہے۔ لہٰذا یہاں بھی صورتِ اکراہ غیر معتبر رہے گی۔

قال فی الدر المختار

لا یصح مع الاکراہ ابراء مدیونه[1]

(ترجمہ: اکراہ کے ساتھ اپنے مقروض کو قرض سے بری قرار دینا درست شمار نہ ہوگا)

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۹ صفحہ ۱۶۶ مطبوعہ بیروت

پھر صورتِ مسئولہ میں اکراہ کا تحقق صرف امر سے ہو جاتا ہے' اگر زوجہ کو اس کے خلاف کرنے میں کسی قسم کی مضرت کا اندیشہ ہو' کچھ الفاظ تہدید و تخویف کے ضروری نہیں۔

چنانچہ درمختار میں ہے:۔

امر السلطان اکراہ و ان لم توعدہ [1]

(ترجمہ: بادشاہ کا حکم اکراہ شمار ہوتا ہے اگرچہ وہ دھمکی نہ دے)

ثم قال ناقلا عن البزازیة

☆ **والزوج سلطان زوجته فتحقق منه الاکراہ** [2]

☆ (ترجمہ: خاوند اپنی بیوی کا سلطان ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی جانب سے اکراہ ثابت ہو جائے گا)

اس پر علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:۔

قلت فظاهر قولهم الزوج سلطان زوجته انه متحقق بمجرد الأمر حيث خافت منه الضرر [3]

(ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ فقہاء کا یہ کہنا کہ خاوند اپنی بیوی کا سلطان ہوتا ہے' اس کا ظاہر نتیجہ یہ ہے کہ خاوند کے صرف حکم کے ساتھ اکراہ ثابت ہو جائے گا بشرطیکہ عورت اس کی طرف سے نقصان پہنچنے سے ڈرتی ہو)

پس چونکہ زوجہ نے بحالتِ خلوت زوج کے اصرار باندیشہ مضرت بظاہر مہر معاف کر دیا تھا ورنہ حقیقۃً وہ راضی نہ تھی لہٰذا معاف نہیں ہو۔

حررہ: العبد المسکین

فخر الدین احمد مدرس مدرسہ شاہی

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۹ صفحہ ۱۵۷' ۱۵۸' مطبوعہ بیروت

[2] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۹ صفحہ ۱۵۸ مطبوعہ بیروت

[3] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۹ صفحہ ۱۵۸ مطبوعہ بیروت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

☆ بے شک عقودِ ھبہ، ابراء، بیع وشریٰ، وغیرہ جو محتمل فسخ ہیں، وہ بصورتِ اکراہ گو نافذ ہو جاویں مگر بعد رفعِ حالتِ اکراہ رضا اور اجازتِ مکرہ پر موقوف رہتے ہیں۔

کما فی الدرالمختار :

ان عقود المکرہ نافذۃ عندنا والمعلق علی الرضا و الاجازۃ لزومہ لا نفاذہ اذا للزوم امر وراء النفاذ کما حققہ ابن الکمال قلت والضابط ان مالا یصح مع الھزل ینعقد فاسدا فلہ ابطالہ و ما یصح فیضمن الحامل[1]

(ترجمہ: اکراہ شدہ شخص کے معاملات ہمارے نزدیک نافذ ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا لازم ہونا رضا اور اجازت کے ساتھ معلق ہے۔ ان کا نفاذ رضا اور اجازت کے ساتھ معلق نہیں ہے۔ کیونکہ کسی معاملہ کا لازم ہونا اس کے نفاذ کے علاوہ امر ہے۔ جیسا کہ امام ابن کمال نے اس کو ثابت کیا ہے۔ اور اس بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ جو معاملہ ہنسی مذاق کے ساتھ منعقد نہیں ہوتا وہ اکراہ کے ساتھ فاسد طور پر منعقد ہو جاتا ہے تو اسے اکراہ کے بعد باطل کرنے کا اختیار ہے۔ اور جو معاملہ ہنسی مذاق میں بھی صحیح ہوتا ہے وہ اکراہ کی حالت میں صحیح ہے لیکن اس صورت میں اگر مکرہ کا نقصان ہو تو اس مجبور کرنے والا نقصان کا ضامن ہوگا)

لہٰذا ابراء اور ہبہ مہر پر اگر مکرھہ راضی رہی، ہبہ مہر لازم ہو جائے گا۔ اور اگر وہ ناراضگی ظاہر کرے، جس طرح صورتِ مسئولہ سے ظاہر ہے تو وہ ھبہ لازم نہ ہوگا اور مہر بدستور قائم رہے گا۔ ☆ اور تحقق اکراہ کی کم از کم ادنیٰ صورت یہ ہے کہ سخت آواز سے حاکم محکوم سے کہے کہ یہ کام کر دے۔

کما فی الدرالمختار فی صفحۃ 89 من الجزء الخامس :

و ھو (ای الاکراہ) یختلف باختلاف الاشخاص فان الاشراف یغمون بکلام خشن

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۹ صفحہ ۱۵۸ مطبوعہ بیروت

والاراذل ربما لا يغمون الا بالضرب المبرح ابن کمال[1]

(ترجمہ: اکراہ لوگوں کے مختلف ہونے سے مختلف ہوجاتا ہے۔ کیوں کہ معزز لوگ درشت بات سے غم ناک ہوجاتے ہیں اور کمینے لوگ تکلیف دہ مار پیٹ سے بھی بعض اوقات غمگین نہیں ہوتے)

لہٰذا اگر شوہر نے تیور بدل کر سختی سے اصرار کیا تھا اور قرینہ ڈرنے اور خائف ہونے عورت کا موجود تھا' تو بلاشبہ معاف کرنا بالاکراہ ثابت ہوگا اور اگر محبت کے ساتھ اصرار تھا تو معافی پر رضامندی متحقق ہوگی۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی

المفتی مسجد جامع اکبر آباد

❁❁❁❁❁

[1] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۹ صفحہ ۱۵۶' ۱۵۷ مطبوعہ بیروت

سیر

﴿فتویٰ نمبر...... 238﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ زید سے کہا گیا تم داڑھی کیوں منڈواتے ہو ایسا مت کیا کرو یہ گناہ ہے۔ اس نے مسخرہ پن سے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتا ہے:

﴿کلا سوف تعلمون ثم کلا سوف تعلمون[1]﴾

اور اس کے معنی یہ بیان کئے تم اپنے گلوں کو صاف کرو کلام کے پاک کے غلط معنی مذاقیہ طور سے لینا ہماری شریعت کا کیا حکم ہے؟ اور کیا سزا ہے؟ اور کس طریق پر اس کی تلافی ہو سکتی ہے؟

۱۲ اپریل ۱۹۱۸ء

محمود الحق کونچہ حکیمان

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما. اللھم قنا من تکفیر المسلمین و من حب المعاندین المرتدین

جب تمام اہلِ اسلام جانتے ہیں کہ ایک مشت داڑھی رکھنا سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔ باوصف جاننے اس امر کے اول تو مجرد بے وقعت سمجھنا سنتِ رسول اللہ ﷺ ہی کا کفر ہے۔

چنانچہ صفحہ ۱۲۱ سطر ۱۳ جلد خامس بحر الرائق مطبوعہ کے باب احکام المرتدین میں ہے۔

و باستخفافه لسنة من السنن[2] (أی یکفر)

(ترجمہ: سنتوں میں سے کسی سنت کو ہلکا سمجھنے سے کافر ہو جائے گا)

---

[1] القرآن المجید : سورۃ التکاثر : آیت ۴، ۵

[2] البحر الرائق شرح کنز الدقائق : جلد ۵ صفحہ ۱۳۰ دار المعرفه بیروت

علاوہ بریں آیۂ کلام اللہ کے ایسے غلط معنے بطریقِ مذاق کرنا باوصف جاننے اس امر کے کہ اس کے یہ معنے نہیں ہیں اور آیتِ کلام کے ساتھ مسخرا پن کرنا تو اس درجہ کا صریح کفر وارتداد ہے کہ جس سے لازم آتا ہے انکار آیتِ کریمہ کا۔

﴿انه لکتاب عزیز لایاتیه الباطل من بین یدیه و لامن خلفه تنزیل من حکیم حمید﴾[1]

(ترجمہ: بلاشبہ یہ ایک غالب کتاب ہے۔ باطل نہ اس کے سامنے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے۔ یہ حکمت والے تعریف کیے گئے پروردگار کی طرف سے نازل شدہ ہے)

قرآنِ مجید کی طرف اس حکمِ فسق وفجور کی نسبت کرنا کہ قرآن فرماتا ہے اپنے گلوں کو صاف کرو اور مکرر صاف کرو صراحتاً قرآن کو متہم کرنا ہے ساتھ امرِ فسق و فجور اور امرِ باطل کے چنانچہ صفحہ ۳۷۴ شفا فی حقوق المصطفی مطبوعہ صدیقی بریلی میں ہے:

و اعلم ان من استخف بالقرآن او المصحف أو بشیء منه أو سبهما او حجده او حرفا منه او آیة أو کذب به أو بشیء منه أو کذب بشیء مما صرح به فیه من حکم أو خبر او اثبت مانفاه او نفی ما اثبته علی علم منه بذلک او شک فی شیء من ذلک فهو کافر عند اهل العلم باجماع۔[2]

(ترجمہ: جان لو کہ جس نے قرآنِ مجید یا اس کی تحریر یا اس کے کسی چیز کو ہلکا جانا یا ان کو برا بھلا کہا یا اس کی تکذیب کی یا جس حکم یا خبر کی اس میں صراحت موجود ہو اس کی تکذیب کی یا اس چیز کا اثبات کیا جس کی قرآنِ مجید نے نفی کی یا اس چیز کی نفی کی جس کا اثبات قرآنِ کریم نے کیا اور یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا یا ان میں کسی چیز میں شک کیا تو وہ اہلِ علم کے نزدیک اجماعاً کافر ہے)

و فی صفحة ۱۲۳ من الجزء الخامس من بحر الرائق

---

[1] القرآن الکریم : سورۃ حم السجدہ : آیت ۴۲

[2] الشفا بتعریف حقوق المصطفی: جلد دوم، صفحہ ۱۱۰۱ مطبعہ عیسی البابی الحلبی مصر

والمزاح بالقران کقوله التفت الساق بالساق اوملأ قدحا وجاء به و قال کاسادها قا اوقال عندالکیل والوزن و اذا کالوهم او وزنوهم یخسرون[1] **(ای یکفر)**

(ترجمہ: قرآن مجید سے مزاح کرنے سے جیسے مزاحیہ انداز سے کہے **التفت الساق بالساق** یاپانی کا پیالہ بھر کر لایااور کہا **کاسا دهاقا** یا کسی چیز کو ماپنے یا تولنے کے وقت کہا **إذا کالوهم او وزنوهم یخسرون** سے کافر ہو جائے گا۔

☆ لہٰذا ایسے شخص کو لازم ہے کہ توبہ کرے اور از سرِ نو تجدیدِ نکاح کرے ورنہ بلا نکاح جو اولاد ہو گی وہ ولدالزنا ہو گی اور جتنی دفعہ اپنی (بیوی) کے ساتھ ہم بستر ہو گا اس کا حکم زنا کا ہو گا۔

چنانچہ صفحہ ۱۰۰ جلد اول تنقیح فتاوی حامدیہ میں ہے

☆ **و لو ارتد والعیاذ بالله تعالی تحرم امراته ویجدد النکاح بعد اسلامه**[2]

(ترجمہ: خدا کی پناہ اگر کوئی شخص مرتد ہو جائے تو اس کی بیوی حرام ہو جاتی ہے اسلام قبول کرنے کے بعد دوبارہ اس کا نکاح کیا جائے گا)

ایضا فیه بعد السطر

المولود بینهما قبل تجدید النکاح بالوطی بعد التکلم بکلمة الکفر ولد زنا[3].

(ترجمہ: مرتد ہونے اور اسلام دوبارہ قبول کرنے درمیان تجدیدِ نکاح سے پہلے اور کلمۂ کفر بولنے کے بعد جماع سے جو اولاد ہو گی زنا کی اولاد ہو گی)

حررہ: العبدالراجی

ابومحمد محمد دیدار علی المفتی فی جامع اکبرآباد

❁❁❁❁❁

---

[1] البحر الرائق: جلد ۵ صفحه ۱۲۱ دارالمعرفه بیروت

[2] تنقیح الفتاوی الحامدیه: جلد اول صفحه ۱۰۱ المکتبة الحبیبة کوئٹه

[3] ایضا:

﴿فتویٰ نمبر......239﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں اساطینِ دینِ متین وشرع مبین اس امر میں کہ غلام احمد قادیانی کے اقوال مندرجہ ذیل ہیں:

﴿۱﴾ آیت مبشرا برسول یاتی من بعدی اسمه احمد کا مصداق میں ہوں۔ (ازالہ اوہام طبع اول صفحہ ۶۷۳)

﴿۲﴾ مسیح موعود جن کے آنے کی خبر احادیث میں آئی ہے میں ہوں۔ (ازالہ اوہام طبع اول صفحہ ۶۶۵)

﴿۳﴾ میں مہدی معہود اور بعض نبیوں سے افضل ہوں۔ (معیار الاخبار صفحہ ۱۱)

﴿۴﴾ ان قدمی علی منارة ختم علیه کل رفعة (خطبہ الہامیہ ۳۵)

(ترجمہ: میرا قدم ایسے مینارہ ہے جہاں پر ہر رفعت ختم ہو چکی ہے)

﴿۵﴾ لا تقیسونی باحد ولا احدا بی (خطبہ الہامیہ ۱۹)

(ترجمہ: مجھے کسی پر قیاس نہ کرا ور نہ ہی کسی اور کو مجھ پر قیاس کرو)

﴿۶﴾ میں مسلمانوں کے لیے مسیح مہدی اور ہندوؤں کے لئے کرشن ہوں۔

﴿۷﴾ میں امام حسین سے افضل ہوں۔ (دافع البلا صفحہ ۱۳)

﴿۸﴾ و انی قتیل الحب لکن حسینکم قتیل العدا فالفرق اجلی و اظهر (اعجاز احمدی صفحہ ۸۱)

(ترجمہ: میں محبت کا کشتہ ہوں لیکن تمہارا حسین دشمن کے ہاتھوں قتل ہوا لہٰذا فرق بڑا واضح اور عیاں ہے)

﴿۹﴾ یسوع مسیح کی تین دادیاں اور تین نانیاں زنا کار تھیں (معاذ اللہ) (ضمیمہ انجام آتھم صفحہ ۸۵)

﴿۱۰﴾ یسوع مسیح کو جھوٹ بولنے کی عادت تھی۔ (ضمیمہ انجام آتھم صفحہ ۵)

﴿۱۱﴾ یسوع مسیح کے معجزات مسمریزم تھے۔ (ازالہ صفحہ ۳۰۳)

﴾۱۲﴿ ان کے پاس بجز دھوکے کے کچھ نہ تھا۔ (ضمیمہ انجام آتھم صفحہ ۷)

﴾۱۳﴿ میں نبی ہوں اس امت میں نبی کا نام میرے لئے مخصوص تھا۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۹۱)

﴾۱۴﴿ مجھے الہام ہوا یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا (معیار الاخبار صفحہ ۱۱)

(ترجمہ: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں)

﴾۱۵﴿ میرا منکر کافر ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۶۳)

﴾۱۶﴿ میرے منکروں بلکہ مقابلوں کے پیچھے بھی نماز ناجائز ہے۔ (فتاوی احمدیہ جلد اول)

﴾۱۷﴿ مجھے خدا نے کہا اسمع ولدی (اے میرے بیٹے سن)۔ (البشریٰ صفحہ ۴۹)

﴾۱۸﴿ لولاک لما خلقت الافلاک (حقیقۃ الوحی صفحہ ۹۹)

(ترجمہ: اگر تو نہ ہوتا میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا)

﴾۱۹﴿ میرا الہام ہے و ما ینطق عن الھوی (اربعین صفحہ ۳)

(ترجمہ: وہ خواہش سے بات نہیں کرتا)

﴾۲۰﴿ و ما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین (حقیقۃ الوحی صفحہ ۸۲)

(ترجمہ: ہم نے تم کو صرف سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا)

﴾۲۱﴿ انک لمن المرسلین (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۰۷)

(ترجمہ: بے شک تو رسولوں سے ہے)

﴾۲۲﴿ آتانی مالم یوت احد من العالمین (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۰۷)

(ترجمہ: اس نے مجھے وہ کچھ دیا جو سارے جہانوں میں کسی کو نہ دیا گیا)

﴾۲۳﴿ اللہ معک یقوم اینما قمت (ضمیمہ انجام آتھم صفحہ ۱۷)

(ترجمہ: اللہ تیرے ساتھ کھڑا ہوگا جہاں تو کھڑا ہوگا)

﴾۲۴﴿ مجھے حوض کوثر ملا ہے۔ انا اعطیناک الکوثر (ضمیمہ انجام آتھم ۸۵)

(ترجمہ: بے شک ہم نے تم کو کوثر عطا کیا)

﴿۲۵﴾ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ہو بہو اللہ ہوں۔ رایتنی فی المنام عین الله و تیقنت انی هو. فخلقت السموات والارض (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۵۶۴٬۵۶۵)

(ترجمہ: میں نے خواب میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا عین دیکھا اور میں نے یقین کر لیا کہ میں وہی ہوں پھر میں نے آسمان اور زمین بنائے)

﴿۲۶﴾ میرے مرید کسی غیر مرید سے لڑکی نہ بیاہا کریں۔ (فتاوی احمدیہ صفحہ ۷)

جو شخص مرزا قادیانی کا ان اقوال میں مصدق ہو اس کے ساتھ مسلمہ غیر مصدقہ کا رشتۂ زوجیت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور تصدیق بعد نکاح موجب افتراق ہے یا نہیں؟۔

الجواب

اللهم ارنا الحق حقا والباطل باطلا۔ ارنا حقائق الاشياء كما هي۔

دعوی مذکورہ صفحہ ۶۷۳ ازالہ اوہام نمبر (۱) اور دعوی سوم مذکورہ صفحہ ۱۱ معیار الاخبار علی ھذا دعوی نہم و دھم یازدھم مذکورہ ضمیمہ انجام آتھم و ازالہ اوہام اگر یسوع مسیح سے مراد مدعی کی سیدنا عیسی علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام ہیں اسی طرح دعوی نمبر (۱) مذکورہ حقیقۃ الوحی اور دعوی سیزدھم و چہاردھم اور دعوی مسیح وغیرہ کفر صریح ہیں۔ ان دعووں کا مدعی اور اس کے قسم کے دعووں کی تصدیق کرنے والا بلاشبہ مرتد اور کافر ہیں۔ چنانچہ صفحہ ۲۹۱ جلد دوم فتاوی عالمگیریہ مطبوعہ مصر میں ہے۔

و لو قال انا رسول الله او قال بالفارسية من پيغمبرم يريدبه من پيغام برم يكفر[۱]

(ترجمہ: اگر کسی نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں یا فارسی زبان میں کہ من پیغمبرم اور اس کی نیت یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا پیغام اٹھانے والا ہوں تو اس کو کافر کہا جائے گا)

اور ظاہر ہے کہ دعوئ اول میں مبشرا برسول الخ کا اپنے آپ کو مصداق سمجھنا بلا تاویل صریح دعوائے

---

[۱] الفتاوی العالم گیریہ جلد ۲ صفحہ ۲۶۳ مطبوعہ مصر

رسالت ہے۔ پھر مرزا کا بلا تاویل اور اس کے بعض معتقدین کا بلا تاویل اور خواجہ کمال الدین وغیرہ کا غالبا بتاویل تصدیق کرنا بھی اس دعوی کا بلاشبہ صراحتاً کفر ہے اور ارتداد بموجب روایتِ مذکورہ عالم گیریہ کے۔ علیٰ ھذا دوسرے اقوال کا بعض میں صراحۃً دعوی نبوت و رسالت ہے اور بعض میں توہینِ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام۔ لہٰذا مدعی اور قائلِ اقوال مذکورہ کے کفر میں تو کلام ہی نہیں۔ مگر جو ایسے شخص کے کفر میں شک کرے اور اس کے ان اقوال پر راضی رہے اور باوصف ان اقوال کے تاویلاتِ بعیدہ کر کے اس کو بزرگ سمجھے اور بغرض حاصل کرنے روپیہ کے مسلمانوں سے بظاہر اپنے آپ کو سنی حنفی معینِ اسلام کہتا رہے وہ بھی بلاشبہ کافر و مرتد ہے۔

چنانچہ صفحہ ۲۱۷ جلد سوم درمختار مطبوعہ حاشیہ ردالمحتار میں ہے:

الکافر بسب نبی من الانبیاء فانه یقتل حدا ولا تقبل توبته مطلقا. و لو سب الله تعالی قبلت لانه حق الله تعالی والاول حق عبد لایزول بالتوبة و من شک فی عذابه و کفره وتمامه فی الدرر فی فصل الجزیة. [1]

☆(ترجمہ: انبیائے کرام علیہم السلام میں سے کسی نبی کو برا بھلا کہنے کے باعث جس نے کفر کا ارتکاب کیا اسے بطورِ حد قتل کیا جائے گا اور اس کی توبہ کسی صورت میں قبول نہ کی جائے گی۔ اور اگر کسی نے اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہا تو اس کو توبہ قبول کی جائے گی کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور پہلی صورت میں بندے کا حق ہے جو صرف توبہ سے زائل نہیں ہوسکتا۔ یہی سزا اس کی ہے جو اس کے عذاب اور کفر میں شک کرے۔ اس کی کامل تفصیل الدرر کی فصل الجزیہ میں ہے)

قال الشامی رحمه الله:

(قوله فانه یقتل حدا) یعنی ان جزاء ہ القتل علی وجه کونه حدا [2]

(ترجمہ: قولہ: اسے بطورِ حد قتل کیا جائے گا یعنی اس کی سزا قتل ہے اس لیے کہ یہ اس کے لیے حد ہے)

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۳۱۷ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

[2] رد المحتار جلد ۳ صفحہ ۳۱۷ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

ویکفر فقط بوجہ سب شیخین او سب عائشة رضی الله عنها و استحلال محرمات[1]

☆(ترجمہ: حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت فاورق اعظم رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو برا بھلا کہنے ☆اور حرام امور کو حلال قرار دینے کے باعث انسان صرف کافر ہوتا ہے۔یعنی اس کی سزا بطورِ حد قتل نہیں ہے)

علامہ شامی فتاوی حامدیہ میں شیعوں کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

و قد اکثر مشائخ الاسلام من علماء الدولة العثمانية لازالت مويدة بالنصرة العلية فی الافتاء فی شان الشيعة المذكورين و قد اشبع الكلا م فی ذلک كثير منهم والفوا فيها الرسائل و ممن افتی بنحو ذلک فيهم المحقق المفسر ابو السعود آفندی العمادی و نقل عبارته العلامة الكواكبی الحلبی فی شرحه علی منظومته الفقهية المسماة الفرائد السنية و من جملة ما نقله عن ابی السعود بعد ذكر قبائحهم علی نحو ما مر فلذا اجمع علماء الاعصار علی اباحة قتلهم و ان من شک فی كفرهم كان كافرا فعندا الامام الاعظم و سفيان الثوری والاوزاعی انهم اذا تابوا و رجعوا عن كفرهم الی الاسلام نجوا من القتل. و يرجی لهم العفو كسائر الكفار اذا تابوا اما عند مالک والشافعی و احمد بن حنبل و ليث بن سعد و سائر العلماء العظام فلا تقبل توبتهم و لا يعتبر اسلامهم و يقتلون حدا الخ فقد جزم بقبول توبتهم عند امامنا الاعظم و فيه مخالفة لما عن المجموعة ويظهرلی ان هذا هو الصواب[2]

(ترجمہ: سلطنتِ عثمانیہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ عالی شان نصرت سے اس کی تائید فرماتا ہے رہے کہ علمائے کرام نے

---

[1]

[2] تنقیح الفتاوی الحامدیه جلد ۱: صفحه ۱۰۵ المكتبة الحبيبية كوئٹه

مذکور شیعوں کے بارے میں کثرت سے فتوی دیئے ہیں۔ ان میں سے کثیر تعداد نے ان کے بارے میں سیر حاصل کلام فرمایا ہے۔ اوران کے متعلق رسائل تحریر فرمائے ہیں۔ ایسا فتوی صادر فرمانے والے علماء میں سے صاحبِ تحقیق اور مفسرِ قرآن حضرت ابومسعود آفندی عمادی رحمہ اللہ بھی ہیں 'علامہ کواکبی حلبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی عبارت کو اپنے فقہی منظومہ کی شرح میں نقل فرمائی ہے۔ جس کا نام الفرائد السنية ہے۔ حضرت علامہ ابومسعود رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے شیعہ مذہب کی قباحتوں کا اسی طرح ذکر کیا جو پہلے مذکور ہو چکا پھر آپ نے ان کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام زمانوں کے علماء نے ان کے قتل کو مباح قرار دیا ہے اور جو شخص ان کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔ لہٰذا امامِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ' سفیان ثوری' اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک اگر وہ اپنے کفر سے توبہ کریں کفر سے رجوع کر کے اسلام لے آئیں تو وہ قتل ہونے سے بچ جائیں گے اور باقی کافروں کی مانند ان کی معافی کی امید ہے جب کہ وہ توبہ کرلیں لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ' امام لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ' اور باقی علمائے عظام کے نزدیک ان کی توبہ قبول نہ کی جائے' ان کے اسلام کا اعتبار نہ کیا جائے اور حد کے طور پر ان کو قتل کر دیا جائے۔ ہمارے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان کی توبہ کی قبولیت یقینی ہے۔ لیکن مجموعہ سے منقول حکمِ شرعی اس کے مخالف ہے اور مجھ پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ درست یہی ہے۔)

بہر نہج بصورتِ سلطنتِ اسلامیہ اور جاری ہونے احکامِ اسلام کے اگر ایسے لوگ توبہ نہ کریں باتفاق واجب القتل ہیں۔ اور اگر توبہ کرلیں اور اپنے اقوالِ کفریہ سے رجوع کرلیں بطریقِ حد بعد توبہ ان کے قتل میں اختلاف ہے اور قولِ راجح علامہ شامی رحمہ اللہ کے نزدیک عدمِ قتل ہے۔ جب وہ توبہ کرلیں مگر قولِ فیصل اور صحیح یہ ہے کہ بعد توبہ اگر آثارِ استقامت علی التوبۃ ان سے ظاہر ہوں قتل نہ کئے جائیں اور اگر توبہ بطریقِ فریب و مکر ان کے افعال واقوال سے ظاہر ہوں تو حاکمِ اسلام پر لازم ہے کہ ضرور ایسے لوگوں کو قتل کر دیں۔

چنانچہ صفحہ ۱۰۴ اور صفحہ ۱۰۵ جلد الاول عقود الدریہ میں علامہ شامی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:۔

و قد اجاب العلامة الفهامة ابو السعود المفتی رحمه الله تعالیٰ عن هذه المسئلة بما حاصله ان المسئلة خلافية فقد عرض علی السلطان المجاهد فی سبيل الرحمن سليمان خان بن سليم خان فی امر الجمع بين القولين و الرعاية للمومنين بان الاولی ان ينظر الی حال الشخص التائب عن سب الرسول ﷺ فان فهم منه صحة التوبة و حسن الاسلام و صلاح الحال يعمل بقول الحنفية فی قبول توبته و يكتفی بالتعزير و الحبس تاديبا و ان لم يفهم منه الخير يعمل بمذهب الغير فلا يعتمد علی توبته و اسلامه و يقتل حدا فامر السلطان جميع قضاة ممالكه ان يعملوا بعد اليوم بهذا الجمع لما فيه من النفع و القمع۔[1]

(ترجمہ: حضرت علامہ ابوسعود مفتی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کا جواب دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ راہِ خدا میں جہاد کرنے والے سلطان سلیمان خان بن سلیم خان کے سامنے دو اقوال کے درمیان تطبیق اور اہل ایمان کی رعایت کے لیے یہ مسئلہ پیش کیا گیا (تو یہ فیصلہ کیا گیا) کہ بہتر یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو برا بھلا کہنے کے بعد توبہ کرنے والے شخص کے حال کو دیکھا جائے اگر اس کی جانب سے توبہ کی درستی، اسلام کی خوبی اور حال کی بہتری معلوم ہوتی ہو تو قبول توبہ میں احناف کے قول پر عمل کیا جائے اور اس کی تادیب کے لیے تعزیر اور قید پر اکتفا کیا جائے اور اگر اس سے بہتری مفہوم نہ ہوتی ہو تو دیگر ائمہ کے مذہب پر عمل کیا جائے۔ لہٰذا اس کی توبہ پر اعتماد نہ کیا جائے۔ اور اسے حد کے طور پر قتل کیا جائے۔ لہٰذا سلطانِ مذکور نے اپنے ممالک کے تمام قاضیوں کو حکم دیا کہ آج کے بعد اس تطبیق کے مطابق عمل کیا جائے کیوں کہ اس میں اسلام کا نفع اور کفر کا خاتمہ ہے)

الحاصل اس زمانہ میں، خصوصا ہند میں، نہ حاکمِ شرع ہے اور نہ جمیع احکام اسلام جاری۔ ضرور ہے کہ اس قسم کے لوگ خصوصا قائلِ اقوالِ مذکورہ اور اس کے معتقدین اگر وہ اپنے عقائدِ فاسدہ مکفرہ سے توبہ نہ

---

[1] تنقیح الفتاوی الحامدیہ جلد ۱: صفحہ ۱۰۶ المکتبۃ الحبیبیۃ کوئٹہ

کریں۔ اوران کے نکاح میں جو اہل سنت اپنی بیٹیوں کو دے چکے ہیں ان سے بذریعہ عدالت ضرور جدا کریں اس واسطے کہ بعد مرتد ہو جانے کے نکاحِ مرتد قائم نہیں رہتا۔ لہٰذا اگر وہ توبہ کرے از سرِ نو پھر تجدیدِ نکاح کر لی جائے۔ اور اگر وہ توبہ سے انکار کرے تو شرعاً عورت کو اختیار ہے جس سے چاہے نکاح کر لے۔

چنانچہ صفحہ ۱۰۰ جلد اول عقود الدریہ میں ہے:۔

لو ارتد والعیاذ باللہ تحرم امرأته و یجدد النکاح بعد اسلامه و هو فسخ عاجل فلا یحتاج الی قضاء و لا ینقص عدد التطلیقات کما فی الدر المختار[1]

☆ (ترجمہ: نعوذ باللہ اگر کوئی شخص مرتد ہو جائے تو اس کی بیوی اس پر حرام ہو جاتی ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اس کے نکاح کی تجدید کی جائے گی ارتداد سے فی الفور نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس بارے میں قاضی کے فیصلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس سے طلاقوں کی تعداد میں کمی واقع ہوتی ہے)

☆ ورنہ بعد ارتداد جو وطی واقع ہو گی اس کا حکم زنا کا ہے۔ اور اس سے جو اولاد پیدا ہو گی وہ ولد الزنا ہو گی۔

چنانچہ صفحہ ۱۰۱ جلد اول عقود الدریہ فی تنقیح فتاوی حامدیہ میں ہے:

و المولود بینهما قبل تجدید النکاح بالوطی بعد بالتکلم بکلمة الکفر ولد الزنا ثم ان اتی بکلمة الشهادة علی العادة لا یجزیه ما لم یرجع عما قاله لان باتیانها علی العادة لا یرتفع الکفر و یومر بالتوبة والرجوع عن ذلک ثم یجدد النکاح[2]

(ترجمہ: ارتداد اور اس کے بعد ایمان قبول کے درمیان، یعنی کلمۂ کفر بولنے کے بعد تجدیدِ نکاح سے قبل وطی کے ساتھ جو اولاد ہو گی ولد الزنا ہو گی۔ اگر عادت کے طور پر کلمۂ شہادت پڑھے یہ اس کے لیے کافی نہیں ہے۔ جب تک اپنے کلمۂ کفر سے رجوع نہ کرے کیوں کہ عادت کے اعتبار سے کلمہ شہادت پڑھنے سے کفر مرتفع نہیں ہوتا اسے کفر سے توبہ اور رجوع کا حکم دیا جائے گا اس کے بعد تجدیدِ نکاح کی جائے گی)

---

[1] تنقیح الفتاوی الحامدیه جلد ۱ : صفحه ۱۰۲ المکتبة الحبیبیة کوئٹه

[2] ایضا

اور ظاہر ہے کہ جب مرتد کا قبلِ ارتداد جو نکاح تھا وہی باقی نہیں رہتا پھر بعد ارتداد جب تک صدقِ دل سے توبہ نہ کرے اور یقینی طور سے بقرائنِ معتبرہ اس کی سچی توبہ ظاہر نہ ہو جائے مسلمان عورت کا اس کے ساتھ کب نکاح ہو سکتا ہے۔ اور اس کو بیٹی دینا اور اپنی بہن، بیٹی کا اس کے ساتھ نکاح کرنا بعینہ ایسا ہے جیسے کہ گبر یا ہندو یا یہودی یا نصرانی کے ساتھ نکاح کر دیا جائے اور ایسے شخص کے ساتھ نکاح کر دینے والے اگر ان کو اچھا سمجھ کر ان کے ساتھ نکاح کر دیں وہ خود مرتد ہیں۔ ورنہ قیامت تک ان غریب عورتوں کے زنا کا عذاب ان کے ورثہ کی گردن پر رہے گا اور اگر بوجہ نکاح وہ عورت بھی مرتدہ ہو گئی تو اس کے عذابِ ارتداد میں وہ ورثہ بھی ضرور معذب ہوں گے۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی المفتی فی جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

جو ان اقوالِ مکفرہ کا مصدّق ہے وہ کافر ہے۔ اس کے ساتھ مسلمہ غیر مصدقہ کا رشتہ زوجیت جائز نہیں۔ اور زوجین میں سے کسی ایک کا بعد نکاح ان اقوالِ کفریہ کی تصدیق کرنا موجب افتراق ہے۔

فقط ضیاء الاسلام امام مسجد جامع اکبر آباد

جو ان اقوالِ کفریہ کا مصدق ہے وہ کافر ہے

ھو اللہ الغنی

معتقد ان اقوال کا اور قائل ان اقوال کا کافر مطلق ہے۔ اس کے کفر میں کچھ شک نہیں۔ اور ان اقوال کے قائل اور معتقد کے ساتھ نکاح مطلق جائز نہیں۔ اگر کرے بھی قابل واسطے افتراق کے ہے۔

سید عبد اللطیف ولایتی

مدرس مدرسہ عالیہ جامع مسجد آگرہ

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر...... 240﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیانِ شرعِ متین کہ عبدالقادر نے حضور سرورِ عالم ﷺ کی توہین کی۔ اور اس پر علماء کا فتوی کفر آچکا ہے۔ اور وہ توبہ سے انکار کرتا ہے۔ اس کا نکاح ٹوٹ گیا یا نہیں؟ اور اگر ٹوٹ گیا ہے تو ان کی مطلقہ بیویوں کا نکاح دوسرے مسلمانوں سے جائز ہے یا نہیں؟ اور وہ مطلقہ بیویاں مہر کی لین دار ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب بحوالۂ کتبِ معتبرہ عطا فرمایا جائے۔ عنداللہ ماجور ہوں گے۔

۲۱ جون ۱۹۷۱ء

محمد رمضان پیش امام مسجد بٹالین کوئٹہ

الجواب

اللھم رب زدنی علما۔

☆ جو شخص بوجہ توہینِ رسول اللہ ﷺ مرتد ہو جائے اور جس پر علما نے ان الفاظ کی توہین سے کفر کا فتوی دے دیا ہو اور وہ الفاظ کے کہنے سے انکار بھی نہ کرے ان الفاظ کو باوصف تنبیہاتِ علماء کفر نہ جانے اور ان الفاظِ کفریہ کو نہ کہنے اور لکھنے سے بھی انکاری ہو۔ اور ان الفاظِ کفریہ کے کہنے کے بعد اس شخص پر شہودِ معتبرہ گزر جائیں۔ ☆ تو بلاشبہ اس کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے دوبارہ نکاح کرے۔ ☆ ورنہ اس زمانہ کی وطی سے جو اولاد ہوگی وہ ولد الزنا ہوگی۔ اور اگر وہ توبہ نہ کرے اس کی بیوی دوسری جگہ احتیاطا حاکم سے اجازت لے کر نکاح کر سکتی ہے۔ چنانچہ صفحہ ۱۰۰ جلد اول عقود الدریہ فی تنقیح الفتاوی الحامدیہ میں ہے۔

و لو ارتد والعياذ بالله تحرم امراته و يجدد النكاح بعد اسلامه وهو فسخ عاجلافلا يحتاج الى قضاء ولا ينقص عدد الطلقات كما فى الدر المختار ويعيد الحج و ليس عليه اعادة الصوم والصلوة و المولود بينهما قبل تجديد النكاح بالوطى بعد التكلم

بکلمة الکفر ولد زنا ثم ان اتی بکلمة الشهادة علی العادة لا یجزیه مالم یرجع عما قاله[1]

(ترجمہ: اگر کوئی شخص العیاذ باللہ مرتد ہو جائے تو اس کی بیوی اس پر حرام ہو جاتی ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اس کا نکاح از سرنو پڑھایا جائے گا۔ ارتداد سے فی الفور نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا قاضی کے فیصلے کی اس میں ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ اس سے طلاق کی تعداد کم ہوتی ہے جیسا کہ درمختار میں ہے۔ ☆ دوبارہ ایمان لانے کے بعد وہ حج کا اعادہ کرے۔ روزے اور نماز کا اعادہ اس پر لازم نہیں ہے۔ کلمہ کفر بکنے اور دوبارہ ایمان قبول کرنے کے درمیان جماع سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ ولد الزنا ہے۔ ☆ ارتداد کے بعد اگر عادت کے انداز میں کلمہء شہادت پڑھے تو وہ ایمان کے لیے کافی نہیں۔ جب تک اپنے بکے ہوئے کفر سے رجوع نہ کرے وہ مومن نہیں ہو سکتا۔) فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[1] تنقیح الفتاوی الحامدیہ : جلد ۱، صفحہ ۱۰۲، المکتبہ الحبیبیہ کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر......241﴾

سوال

گزارش ہے کہ حاجی وارث علی خان سوداگر کے بھائی حاجی عاشق الٰہی صاحب کا نواسا جس کی عمر قریب آٹھ دس ہوگی جس وقت جامع مسجد میں نماز پڑھنے آتا ہے نہایت شرارت کرتا ہے۔ بارہا منع کیا گیا کہ بڑے آدمیوں کی صف میں شریک نہ ہوا کرے۔ لڑکوں کی جماعت جو پیچھے کھڑی ہوتی ہے شامل ہو کر نماز پڑھے مگر باز نہیں آتا۔ جماعت میں شریک ہو کر کچھ ایسی حرکات کرتا ہے جو قریب کے کھڑے ہونے والوں کو ناگوار گزرتی ہیں۔ چنانچہ ۱۲ جولائی ۱۹۱۸ء کو وہ لڑکا عشاء کی جماعت میں شریک اپنی عادت کے موافق کچھ حرکات کرتا رہا۔ نماز ختم ہونے پر شیخ کلن میدہ فروش نے اس کی شکایت جناب امام صاحب سے کی۔ اس بات پر عبدالمجید سوداگر اور شیخ کلن صاحب میں کچھ تیزی کے ساتھ گفتگو ہونے لگی۔ جس کو اس وقت رفع کر دیا گیا۔ لیکن اکثر لوگ اس امر کے شاکی ہیں کہ اہل حدیث یعنی غیر مقلد کچھ عرصہ سے جامع مسجد میں نماز کے لیے آنے لگے ہیں ان کو روکنا چاہئے کہ آئندہ کسی قسم کا جھگڑا پیدا ہونے کا احتمال نہ رہے۔ اطلاعاً عرض ہے۔

۱۵ جولائی ۱۹۱۸ء

دلاور حسین موذن جامع مسجد آگرہ

جناب عالی

واقعی کئی شخصوں نے مجھ سے اس امر کی شکایت کی ہے کہ اہلِ حدیث کو ہماری مسجد میں نماز پڑھنے سے روک دینا چاہئے۔ مگر چونکہ اس کی بابت کمیٹی کا کوئی خاص حکم نہیں ہے اور نماز کے واسطے کسی شخص کو روک دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے اس لئے اس طرف توجہ نہیں دی گئی۔ مگر اس واقعہ کے پیش آنے سے آئندہ اور جھگڑوں کے ہونے کا احتمال ہے۔ اس سبب سے بنابر صدورِ حکمِ مناسب رپورٹِ موذن ارسالِ خدمت ہے۔ فقط

محمد ضیاء الاسلام امام مسجد اکبرآباد

۱۶ جولائی ۱۹۱۸ء

فتویٰ لیا جائے کہ اہلِ حدیث کو مسجد جامع میں نماز پڑھنے سے روک دیا جائے یا نہیں۔

محمد عبدالغفار عفی عنہ ۱۷۔۷۔۱۹۱۸ء

الجواب

وھو الموفق للصواب

☆ اس زمانہ کے اہلِ حدیث جن کو زمانہ غدر میں وہابی کہتے تھے۔ پھر خطاب غیر مقلد کے ساتھ مشہور ہوئے بوجہ بدعت اور حرام کہنے تقلید کے امامِ معین کی ائمہ اربعہ رضوان اللہ علیہم سے غیر مقلد اور لامذہب کہلائے گئے۔ پھر اس منصب سے ناراض ہوئے۔ چونکہ فی الحقیقت اس طریقہ کے بانی کا نام محمد بن عبدالوہاب نجدی تھا ان لوگوں نے اپنا نام محمدی رکھا۔ اور ناواقف مسلمانوں کو یہ دھوکہ دیتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لہٰذا سچے محمدی ہم ہیں اور جو لوگ اپنے آپ کو حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کہتے ہیں وہ بدعتی یا مشرک ہیں۔ وہ محمدی نہیں رہے۔ حالانکہ بمقابلہ یہود و نصاری جب پوچھا جاتا ہے تو سب حنفی ہوں یا شافعی بلکہ روافض خارجی یہی کہتے ہیں کہ ہم محمدی ہیں۔ اور آپ میں جب پوچھا جاتا ہے تو کوئی محمدی کہتا ہے کہ میں حنفی ہوں یعنی تحقیقِ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے موافق قرآن و حدیث پر عمل کرتا ہوں۔ وعلیٰ ھذا دوسرا کہتا ہے میں شافعی ہوں۔ مگر جب یہ راز سربستہ مسلمانوں پر کھل گیا کہ فی الواقعہ محمدی کہنے سے ان کی غرض ہے یہ کہ ہم محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیروکار ہیں۔ جیسے علامہ شامی علیہ الرحمۃ اور مولانا شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ کے زمانہ میں حرمین شریفین پر چڑھائی کر کے وہاں کی تمام زیارتوں کو منہدم کر دیا تھا اور عام طور سے سادات کرام کو قتل کیا تھا۔ اور حضور سرور عالم ﷺ کی شان میں سخت گستاخیاں و بے باکیاں کیں۔ یہاں تک کہ لوگ اس فرقہ سے نفرت کرنے لگے۔ تو اب چند روز سے انہوں نے اپنا نام اہلِ حدیث رکھا ہے۔ ان کے متعلق عرصہ دراز ہوا کہ ایک فتویٰ باتفاقِ علماءِ دہلی، کانپور، لودھیانہ، دیوبند و علماء شہر اندور چھاؤنی اندور مصطفیٰ آباد عرف رام پور افغاناں، چونکہ بہت تحقیق کے ساتھ مع بیان عقائد و اعمال اس فرقہ کے بحوالہ صفحہ و سطر ان کی نئی پرانی تصنیفات سے مرتب ہو کر مسمی بہ جامع الشواہد فی اخراج الوہابین عن المساجد

شائع ہو چکا ہے۔ اور وہ اتفاق سے امام صاحب کے پاس نکل بھی آیا اور اسی کے موافق میری بھی تحقیق ہے۔ اور اسی کے مطابق میرے استاذ الاساتذہ حضرت مولانا وسیدنا ارشاد حسین صاحب قدس سرہ خلیفۂ ارشد حضرت شاہ احمد سعید رحمہ اللہ پیرِ طریقت نواب کلب علی خان صاحب مرحوم کی تحقیق ہے۔ لہٰذا وہی فتوی مطبوعہ مسمی بجامع الشواہد ارسالِ خدمت ہے۔ اس کو ملاحظہ فرما لیا جائے۔ اور اس کو بعینہ میرا ہی فتوی سمجھ لیا جائے۔ اس میں باتفاق جمیع علماءِ کرام اہل سنت و جماعت صاف گو' حق شنو' مصداق لا یخافون لومة لائم بھی لکھا ہے کہ جو حکم اہل سنت و جماعت کے نزدیک رافضی' خارجی' شیعہ وغیرہ کا ہے وہی حکم غیر مقلدوں کا ہے جو چند روز سے اپنے آپ کو اہل حدیث کہتے ہیں۔ جیسے ان کے آنے سے یقینِ فتنہ وفساد ہے اور خوف ناپاک کر دینے مسجد کا ہے ویسا ہی خوفِ فتنہ وفساد خوارج و روافض سے تھا۔ جب ان کا خوف یقینی ہو گیا مسجد اہل سنت میں آنے سے روافض و خوارج کو عموماً تمام جگہ منع کر دیا گیا۔ علی ھذا اکثر شہروں میں ان کو بھی منع کر کے فتنہ وفسادِ مسجد رفع کر دیا گیا ہے۔ اور جہاں ان کی ممانعت میں سستی کی گئی وہاں اول اول گو فتنہ وفساد کم ہوتا دیکھا گیا مگر رفتہ رفتہ جب چند لوگوں کو اپنا سا کر لیا میرا تجربہ ۳۰ سالہ ہے کہ پھر اتنا فساد بڑھتا کہ سرکار سے چارہ جوئی کرنی پڑتی ہے فرو نہیں ہوتا۔ اور پھر اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ایسی مسجد میں مصلینِ نماز بہت کم رہ جاتے ہیں۔ باہم اکثر جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ ان کے نزدیک پانی کتنا بھی کم ہو یا زیادہ کسی نجاست سے ناپاک نہیں ہوتا جب تک اس کا رنگ بو مزہ نہ بدل جائے۔ چنانچہ صفحہ ۶' ۷ طریقہ محمدیہ اور درر بہیہ ان کی معتبر کتابوں میں یہ مسئلہ موجود ہے اور حنفی بلکہ تمام نفیس مزاج اگر گھڑے بھر پانی میں ایک قطرہ پیشاب بھی گر جائے تو گھڑے تک کو ناپاک جانتے ہیں۔ خواہ رنگ' بو مزہ کچھ بھی نہ بدلے۔ لہٰذا باہم بعد واقف ہونے ان کی ایسی حرکات پر سخت جھگڑے ہو کر مسجدیں خراب اور ویران ہو جاتی ہیں لامحالہ ایسے لوگوں کا مساجدِ احناف سے روک دینا لازمی امر ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں اللہ جل شانہ اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:

و من اظلم ممن منع مساجد الله ان يذكر فيها اسمه و سعى فى خرابها اولئك

ماکان لهم ان یدخلوها الا خائفین[1]

(ترجمہ) کون بڑھ کر ظالم ہے اس شخص سے کہ مساجد اللہ کو اللہ اللہ کا نام ذکر کئے جانے سے منع کرے اور کوشش کرے مساجد کی خرابی میں ساتھ ساتھ فتنہ وفساد اور بیانِ عقائدِ فاسدہ اور اعمالِ خبیثہ کے۔ ان کو لائق نہیں کہ بے دھڑک بلاخوف مسجد میں آسکیں۔

علامہ فخر الدین رحمہ اللہ صفحہ ۴۴۵ جلد اول کبیری (تفسیر کبیر) میں اس آیہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں

و هذ ایقتضی ان یمنعوا من دخول المسجد[2]

یعنی اس آیت کا اقتضاء ہے کہ ایسے لوگوں کو مسجد میں آنے سے منع کر دیا جائے۔ واللہ اعلم

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[1] القرآن المجید: سورۃ البقرہ: آیت: ۱۱۴

[2] التفسیر الکبیر: جلد ۴، صفحہ ۴، المطبعۃ البہیہ المصریہ

﴿فتویٰ نمبر......242﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماء ومفتیانِ شرع متین کہ عبدالقادر نے حضور سرورِ عالم ﷺ کی توہین کی۔اور اس پر علما کا فتویٰ کفر کا آچکا ہے اور وہ توبہ سے انکار کرتا ہے۔اس کا نکاح بھی عندالشرع ٹوٹ گیا یا نہیں؟اس کا بھتیجا سراج احمد اس کا معاون ہے۔اس کا نکاح بھی ٹوٹ گیا یا نہیں؟اور اگر ٹوٹ گیا ہے تو ان کی مطلقہ بیبیوں کا نکاح دوسرے مسلمان سے جائز ہے یا نہیں؟اور وہ اپنے مہر کی لین دار ہیں یا نہیں؟اس کا جواب براہِ کرم جلد عطا فرمایا جائے۔فقط

۹ ذی قعدہ ۳۶ھ

ملا محمد رمضان پیش امام بناپورہ

الجواب

بسم الله الرحمن الرحیم.

اللھم ارنا الحق حقا والباطل باطلا. اللھم لا تجعلنا من المداھنین فی الدین و ثبتنا علی الصراط المستقیم والدین القویم امین امین ثم امین۔

جنابِ رسالت مآب ﷺ کی شان میں جو شخص عالم ہو یا جاہل کلمۂ توہین و گستاخی قلم سے یا زبان سے نکال بیٹھے یا آپ کے کسی فرمان یا کسی قول وفعل کے ساتھ تمسخر کرے یا اس کو ہلکا جانے اور ذلیل سمجھے اور پھر اس سے توبہ نہ کرے اور نہ ان امورِ مذکور کو کفر سمجھے نہ اس کے مرتکب کو کافر جانے باوجود ہونے ان کلمات کے باتفاقِ اہلِ عرف کلماتِ توہین یا تمسخر یا استخفاف کرے تو وہ بلاشبہ وہ کافر ہے۔اور جو اس کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔بلکہ علامہ حصفکی رحمہ اللہ تو درمختار میں یہی تحریر فرماتے ہیں کہ اگر وہ توبہ بھی کرے تو حاکمِ اسلام پر لازم ہے کہ اس کی توبہ بھی قبول نہ کرے۔اور اس کو حداً قتل کردے۔مگر مذہب صحیح یہی ہے کہ نزدیک حنفیہ کے اس کی توبہ قبول کرکے قتل سے بچالیا جائے خصوصاً اس زمانہ میں کسی طرح حکمِ قتل نافذ نہیں ہو

سکتا۔ ☆ البتہ قبولِ توبہ یا انکار کرنے ان کلماتِ کفریہ سے اور جاننے ان کلمات کے کفر اور اقرار کر لینے یا لکھ دینے اس امر کے کہ میں ان کلمات کو کلمات کفر وارتداد سمجھتا ہوں جو شخص اس کو کافر نہ جانے بلکہ جو شخص اس کے کفر میں ذرا شک کرے وہ بھی کافر ہے۔ اور جب وہ بھی کافر ہے تو اس کا نکاح بھی جاتا ہے۔

☆ اور چونکہ کلماتِ کفریہ کہہ کر انکار کرنا اور ان کلمات کے کلماتِ کفر ہونے کا اقرار کر لینا بھی قائم مقام توبہ ہے لہٰذا بعد انکار اور اقرار کر لینے اس امر کے کہ یہ کلمات جو میری طرف منسوب کیے گئے ہیں بلاشبہ کلماتِ کفر ہیں یا بعد توبہ کے پھر اس کو کافر کہنا بلاشبہ بڑے بڑے مجتہدوں کی تکفیر کرنا ہے۔ اعاذنا الله و جميع المومنين منه.

چنانچہ صفحہ ۳۱۷ درمختار مطبوعہ علی ہامش ردالمحتار مصری کے جلد ثالث میں ہے:

و كل مسلم ارتد فتوبته مقبولة الا جماعة تكررت ردته على مامر والكافر بسب نبي من الانبياء فانه يقتل حدا ولا يقبل توبته مطلقا ولو سب الله تعالى قبلت لانه حق الله تعالى والاول حق عبد لا يزول بالتوبة و من شك في عذابه و كفره كفرو تمامه في الدرر في فصل الجزية معزيا للبزازية و كذا لو أبغضه بالقلب فتح واشباه و في فتاوى المصنف و يجب الحاق الاستهزاء والاستخفاف به لتعلق حقه ايضا[1]

(ترجمہ: ہر مسلمان جو مرتد ہو جائے اس کی توبہ قبول کی جائے گی لیکن اس جماعت کی توبہ قبول نہ کی جائے گی جس نے تکرار کے ساتھ ارتداد اختیار کیا۔ ☆ نیز وہ شخص جو انبیائے کرام میں سے کسی نبی کو برا بھلا کہہ کر کافر ہوا ہو اس کو حد کے طور پر قتل کیا جائے گا اور اس کی توبہ بالکل قبول نہ کی جائے گی۔ اور اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہے تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور پہلا بندہ کا حق ہے جو صرف توبہ سے زائل نہیں ہوتا۔ نیز جو ایسے شخص کے عذاب اور کفر میں شک کرے وہ بھی کافر قرار دیا جائے گا۔ اس کی پوری تفصیل الدرر کی فصل جزیہ میں ہے اور انہوں نے اس کی نسبت فتاوی بزازیہ کی طرف کی ہے۔ اور یہ حکم اس شخص کا ہے جو اس کے ساتھ دل سے دشمنی کرے۔ فتح القدیر، اشباہ، حضرت مصنف (علامہ تمرتاشی رحمۃ اللہ علیہ) کے فتاوی میں ہے کہ ٹھٹھا کرنے والے اور ہلکا جاننے والے کو بھی اس سے ملحق کرنا واجب ہے کیونکہ بندہ کا حق اس سے تعلق رکھتا ہے)

[1] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۳، صفحہ ۳۱۷، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

قال الشامی رحمه الله:

(قولـه و تـمـامـه فـی الدرر) حیث قال نقلا عن البزازیة قال ابن سخنون المالکی اجمع المسلمون ان شاتمه کافر و حکمه القتل و من شک فی عذابه و کفر کفر الخ

قلت وهذه العبارة مذکورة فی الشفاء للقاضی عیاض المالکی نقلها عنه البزازی واخطا فی فهمها لان المراد بها ما قبل التوبة والالزم تکفیر کثیر من الائمة المجتهدین القائلین بقبول توبته و سقوط القتل بها عنه علی ان من قال یقتل و ان تاب یقول انه اذا تاب لا یعذب فی الآخرة کماصرحوا به و قدمناه آنفا فعلم ان المراد ماقلناه قطعا[1]

(ترجمہ: قولہ: اس کی پوری تفصیل الدرر میں ہے۔ کیوں کہ انہوں نے فتاوی بزازیہ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا حضرت علامہ ابن سخنون مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اہلِ ایمان کا اجماع ہے کہ انبیائے کرام میں سے کسی نبی کو گالی دینے والا کافر ہے۔ اور اس کا حکم قتل ہے۔ اور جو شخص اس کے عذاب اور کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ عبارت شفاء قاضی عیاض مالکی میں ہے انہوں نے اسے علامہ بزازی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے۔ اور اسے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ کیوں کہ مراد یہ ہے کہ توبہ کرنے سے پہلے اس کے حکم قتل ہے۔ ورنہ کثیر مجتہدین ائمہ کی تکفیر لازم آئے گی۔ جن کا یہ کہنا ہے کہ اس کی توبہ قبول ہوگی اور توبہ کے باعث اس سے سزائے قتل ساقط ہوجائے گی۔ علاوہ بریں جو یہ کہتے ہیں کہ اسے قتل کیا جائے گا اگر چہ وہ توبہ کرلے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب اس نے توبہ کرلی تو آخرت میں اسے عذاب نہ دیا جائے گا۔ علماء نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ اور ہم نے تھوڑی دیر پہلے اسے ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد قطعی طور پر وہی ہے جو ہم نے بیان کی ہے) فقط واللہ اعلم بالصواب

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی مسجد جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[1] رد المحتار: جلد ۳، صفحہ ۳۱۷، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر...... 243﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین و مفتیانِ شرع متین بابت اس مسئلہ کے کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی ختم نبوت کا قائل نہیں ہے بلکہ اب بھی بعض لوگوں کو نبی مانتا ہے لہٰذا نص قطعی سے جواب باصواب دے کر ماجور ہوں۔ والسلام

الجواب

وھو الموفق للصواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

حامدا ومصلیا ومسلما. الحمد للہ والصلوۃ علی خاتم انبیائہ ورسلہ و آلہ و صحبہ و سلم اللھم رب زدنی علما.

اللہ عزوجل اپنے کلام پاک میں ارشاد فرماتا ہے:۔

ماکان محمد ابا احد من رجالکم و لکن رسول اللہ و خاتم النبیین [1]

(ترجمہ: اور اے لوگو! محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ ہاں وہ اللہ تعالیٰ کے رسول اور سب نبیوں سے آخری نبی ہیں)۔

لہٰذا جو شخص حضور ﷺ کو خاتم الانبیا والمرسلین نہیں مانتا وہ منکر ہے اس آیتِ کلام اللہ کا۔ اور منکر ایک بھی آیتِ کلام اللہ کا کافر ہی نہیں بلکہ مرتد ہے۔ اور مرتد کے احکام بہ نسبت کافر کے بہت سخت ہیں۔

چنانچہ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

اذا لم یعرف الرجل ان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم آخر الانبیاء علیھم و علی

---

[1] القرآن الحکیم سورہ احزاب آیت ۴۰

نبینا السلام فلیس بمسلم کذا فی الیتیمة[1]

(ترجمہ: جب کوئی آدمی نہ جانتا ہو کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ آخری نبی ہیں تو وہ مسلمان نہیں ہے۔اور یتیمہ میں اسی طرح ہے)

وایضا فیه

و یجب اکفار الزیدیة کلهم فی قولهم بانتظار نبی من العجم ینسخ دین نبینا و سیدنا محمد ﷺ کذا فی الوجیز للکردری[2].

☆(ترجمہ: زیدیہ فرقہ کے تمام افراد کو کافر قرار دینا واجب ہے۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم عجم کے ایک نبی کے انتظار میں ہیں جو ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے دین کو منسوخ کر دے گا۔ امام کردری کی وجیز میں اسی طرح ہے)۔

اور جب ایسے شخص کو کافر کہنا اور جاننا واجب ہے جو منتظر ہو اور مجوز ہو پیغمبرِ جدید کے آنے کا' بعد نبی کے مستقل پیغمبر ہو کر تو ایسے شخص کا کافر جاننا ضروری واجب ہے' جو بالفعل کسی نبیِ مستقل کی موجودگی کا معتقد ہو۔ اور یہ جو عقیدہ اہلِ سنت کا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام قربِ قیامت میں تشریف لائیں گے' وہ پیروِ شریعتِ محمد رسول اللہ ﷺ ہو کر آئیں گے' نہ کہ بحیثیتِ نبیِ مستقل کے۔

حررہ: ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی

❁❁❁❁❁

---

[1] الفتاوی العالمگیریه جلد ۲ صفحہ ۲۶۳ مطبوعه مصر

[2] الفتاوی العالمگیریه جلد ۲ صفحہ ۲۶۴ مطبوعه مصر

﴿فتویٰ نمبر......244﴾

سوال

بخدمت مفتی صاحب انجمنِ اسلام آگرہ۔ مسئلہ حشمت اللہ صاحب بی ایل نے جوتقریر کی ہے ان کا اسلام بغیران مسئلوں کے صاف طور پر ظاہر کئے ہوئے' جو جناب نے ان سے دریافت کئے' عندالشرع مقبول ہے یانہیں؟۔

سائل: علیم الدین دیگراہلِ اسلام آگرہ کناری بازار

۱۵ ستمبر ۱۹۱۶ء

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما.

یہ تو ظاہر ہے کہ باب اللہ' بہاء اللہ وغیرہ مدعیِ نبوت اور رسالت ہیں۔ اوراس وجہ سے وہ ایران وغیرہ سے شہر بدر کئے گئے۔ بہت کچھ مصیبتوں میں وہ اوران کے پیروکار مبتلا ہوئے۔ چنانچہ یہ امر مسٹر صاحب کی مولفہ ومترجمہ اس کتاب سے بھی ظاہر ہے جس کوعلی رؤس الاشہاد دکھلاتے تھے۔ اور مجھ سے جلسہ مسلم لبریری (لائبریری) میں بھی انہوں نے ان کونعوذ باللہ نبی اور رسول برحق ہونے کے دلائل پیش کر کے گفتگو کی تھی۔ اور میں نے ان کو چپ کردیا تو انہوں نے اس کا جواب مفصل لکھ کر بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا جو باوجود تقاضہ اب تک نہیں پہنچا۔ اوران کی مصنفہ کتاب البہائی مسمی بالواح بھی دکھائی تھی۔ چنانچہ اسی کتاب کے صفحہ 10 میں مسٹر صاحب خود لکھتے ہیں:۔

سید مرزا علی باب نے پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے[1]

---

[1] الواح صفحہ مطبوعہ

اور جلدِ ثانی فتاویٰ عالمگیریہ مطبوعہ مصر کے صفحہ 291 میں ہے:

لو قال انا رسول الله او قال بالفارسية من پيغمبرم يريديه من پيغام مى برم يكفر[۱]

(یعنی اگر کوئی شخص معنی قاصد کے مراد لے اور یوں کہے کہ میں رسول اللہ یا پیغامبر ہوں تو وہ کافر ہو جائے گا)

اور مسٹر صاحب کی تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ محمد علی باب نے تو حقیقی پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا نہ کہ بمعنی قاصد پر۔ اہلِ سنت والجماعہ حنفیوں کے نزدیک اس کے کفر میں کیا شک رہا؟ مگر مسٹر صاحب اسی کتاب کے صفحہ 267 مضمونِ نو کو لکھتے ہیں۔

البتہ ان کی یعنی محمد علی باب کی تاریخ ایسی ہے جس کو تفصیل کے ساتھ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں بہت سے واقعات ایسے ضرور پیش آئے جیسے کہ پیغمبروں کو پیش آئے ہیں[۲]

اور پھر اسی کتاب میں اس قسم کے مضمون بہاء اللہ اور عبد البہاء کی نسبت لکھ کر اپنے آپ کو خادم ان مدعیان نبوت کا لکھا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:۔

خادم میثاق بہا حشمت اللہ

اور بحر الرائق کے صفحہ 1033 جلد خامس میں ہے

ان الرضا بكفر غيره كفر[۳]

(یعنی دوسرے شخص کے کفر پر راضی رہنا یعنی اس سے نفرت نہ کرنا بھی کفر ہے)

پھر جو جھوٹے نبیوں کی تصدیق پر لوگوں کو کتابیں چھپوا کر آمادہ ان کی طرف سے جواب کا ہوئے چنانچہ مسٹر صاحب کی کتاب کے صفحہ 1 سے ظاہر ہے۔ وہ جب تک ان لوگوں کے کفر کا اقرار نہ کرے اور ان کے دعویٰ نبوت کو کفر نہ جانے اور اپنے لکھے ہوئے امور سے توبہ نہ کرے مجرد لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ اور

---

[۱] الفتاوی العالم گیریه جلد ۲ صفحه ۲۶۳ مطبوعه مصر

[۱] الواح صفحه مطبوعه

[۲] البحر الرائق: جلد ۵ صفحه ۱۳۳ مطبوعه دار المعرفه بیروت

سنی حنفی کہنے کے باوجود انکار کفران مدعیان نبوت کے شرعا کیسے مسلمان ہوسکتا ہے؟ ☆ کفر کو کفر کہنا حکمِ شریعت بیان کرنا ہے۔ ہرگز گالی نہیں۔ البتہ پیغمبر و نبی کو کافر کہنا بہت بری گالی ہے کہ جس سے آدمی مسلمان نہیں رہتا۔ چنانچہ بموجب اپنے عقیدہ کے مسٹر صاحب نے فرمایا کہ میں کسی کو گالی نہیں دیتا۔ یہ جواب مختصر ہے۔ اگر تفصیل کی ضرورت (ہو) تو مع حوالہ دیگر کتب مفصل لکھ دیا جائے گا۔

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی

ابومحمد محمد دیدار علی، مفتی

مسجد جامع اکبرآباد

﴿فتویٰ نمبر......245﴾

سوال

آباؤ اجدادِ پیغمبر علیہ السلام کے غیر مسلم ہونے میں مصلحتِ الٰہی کیا تھی؟

الجواب

☆ آباؤ اجدادِ آنحضرت ﷺ شائبۂ کفر وشرک سے پاک تھے۔ سب موحد تھے اور آنحضرت پر ایمان لانے کا زمانہ انہوں نے نہ پایا۔ اس میں حضور کی رفعتِ شان منظور تھی۔

جیسا کہ قرآن شریف میں موجود ہے:۔

ووجدک ضالا فهدى ووجدک عائلا فاغنى(۱)

(ترجمہ: اور آپ کو آپ کے رب نے اپنی محبت میں کھویا ہوا اور خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی اور آپ کو حاجت مند یا عیال دار پایا تو غنی کر دیا)

گویا یہ شبہ بھی حضور کی ذات اقدس سے مرفوع کر دیا کہ شاید تعلیمِ ابوین سے حضور کو علم وادب آیا ہو۔ اس واسطے ارشاد ہے

ادبنی ربی فاحسن تادیبی(۲).

(ترجمہ: مجھے میرے رب نے ادب سکھایا لہٰذا اس نے مجھے اچھا ادب سکھایا۔)

سبحان اللہ یہ جلالتِ شان محض افضالِ الٰہی ہے۔

کتبه المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرله

✿✿✿✿✿

---

(۱) القرآن الحکیم : سورۃ الضحیٰ ' آیت نمبر ۷ ' ۸

(۲) الجامع الصغیر مع فیض القدیر جلد ۱ صفحہ ۲۲۴، مطبوعہ: دار المعرفت بیروت

﴿فتویٰ نمبر......246﴾

سوال

عدل کیا ہے؟اور عادل کے درجات بیان فرمائے جائیں۔

جناب مولوی غلام محی الدین خاں صاحب

امام مسجد شاہجہاں پور ۱۷ دسمبر ۱۹۱۵ء

الجواب

عدل بمعنی انصاف جس کا بیان قرآن شریف میں ہے۔

ان اللہ یحب المقسطین[1] ۔

(ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)

اس کا صلہ لاریب جنت ہے۔

اور عدل جو باصطلاحِ محدثین وفقہا ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ کسی شخص کی اچھائیاں اس کی برائیوں پر غالب ہوں۔ وہاں پر باعتبارِ حسنِ ظنِ مرحوم ہے۔

قرآن شریف میں ہے۔

الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللمم ان ربک واسع المغفرۃ۔[2]

(ترجمہ: جولوگ صغیرہ گناہوں کے علاوہ کبیرہ گناہوں اور بے حیائیوں سے اجتناب کرتے ہیں بلاشبہ تمہارا پروردگار وسیع بخشش والا ہے۔)

لمم بمعنے گناہِ خفیف یا ارتکابِ گناہ مجبوراً وغیرہ کے ہیں۔

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

---

[1] (۱) القرآن الحکیم: سورۃ المائدہ: آیت ۴۲

(۲) القرآن الحکیم: سورۃ الحجرات: آیت ۹

[2] القرآن الحکیم سورۃ النجم: آیت ۳۲

حظر و اباحت

﴿فتوی نمبر...... 247﴾

سوال

مصافحہ ایک ہاتھ سے سنت ہے یا دونوں ہاتھ سے؟ بعض حدیثوں میں ایک ہاتھ سے معلوم ہوتا ہے۔

بینوا بالتحقیق.

سائل: رفعت اللہ خان افجان محلہ شاہ جہاں پور

۱۰ مارچ ۱۹۱۶ء

الجواب

ھو المصوب

مصافحہ باتفاقِ علماء وفقہاء دونوں ہاتھ سے سنت ہے۔ چنانچہ حدیث معجم طبرانی میں ہے۔

قال علیه السلام اذا تصافح المسلمان لم تفرق اکفهما حتی یغفر لهما[1] .

(ترجمہ: نبی پاک ﷺ نے فرمایا جب دو مسلمان آپس میں مصافحہ کرتے ہیں تو ان کی ہتھیلیاں الگ ہونے سے پہلے ان کی بخشش کردی جاتی ہے)

پس اگر ایک ہاتھ سے مصافحہ ہوتا تو کفاھما ہوتا لفظ اکفھما جس کے معنے ہاتھوں کے ہیں اور دو سے زائد کو شامل ہے نہ ہوتا۔

اور بخاری میں حضرت امام نے لکھا ہے کہ

صافح حماد بن زید بن المبارک بیدیه.[2]

---

[1] I الجامع الصغیر مع شرحه فیض القدیر جلد اول صفحه ۳۱۸ بحواله طبرانی فی الکبیر مطبوعه دار المعرفة بیروت

II المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۸ صفحه ۲۸۱ حدیث رقم ۸۰۷۶

مطبوعه دار احیاء التراث الاسلامی بیروت

[2] صحیح البخاری جلد ۲ صفحه ۹۲۶ نور محمد اصح المطابع کراچی

حماد (بن زید نے حضرت ابن مبارک سے) دونوں ہاتھ سے مصافحہ کیا۔

پس معلوم ہو کہ زمانہ تابعین بھی دونوں ہاتھ سے رائج تھا۔

اور جس حدیث میں آیا ہے کہ حضرت نے ایک ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں لے کر تعلیم فرمائی[1] تو ظاہر ہے کہ یہ مصافحہ ملاقات کا نہ تھا بلکہ تعلیم کے وقت ایک ہاتھ یا کلائی یا سر پکڑ کر شاگرد کو استاد سمجھاتا ہے۔ اس سے مصافحہ ایک ہاتھ سے سنت ہونے کا نشان نہیں۔ اور جہاں لفظِ ید آیا ہے اس سے مرادِ اسمِ جنس دونوں ہاتھ ہوتے ہیں۔ جیسے کہ ابوداؤد میں ہے۔

ضرب بیدہ علی الارض[1] (فی االتیمم)[2]

ترجمہ: آپ نے اپنا ہاتھ زمین پر مارا (یہ حدیث باب التیمم میں ہے)

ظاہر ہے کہ ایک ہاتھ کو زمین پر مارنے سے تیمم جائز نہیں اور اس طرح اکثر مقام پر یہ تصریح وارد ہے۔ اور غیر مقلدین اکثر احادیث سے بوجہ کم مہارت سیاقِ عبارتِ عرب وقرینہٗ استعمال وغیرہ اولٹے معنے کر دیتے ہیں۔ فقط

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

✿✿✿✿✿

---

[1] وہ حدیث مبارکہ یوں ہے۔

قال ابن مسعود علمنی النبی ﷺ التشهد و کفی بین کفیه

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کے مجھے نبی کریم ﷺ نے تشہد سکھایا جب کہ میری ہتھیلی آپ کی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان تھی۔ (صحیح البخاری جلد ۲ صفحہ ۹۲۶ نور محمد اصح المطابع کراچی)

[2] i سنن ابی داؤد جلد اول صفحہ ۵۲ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان

ii سنن ابی داؤد جلداول صفحہ ۱۲۹ رقم الحدیث ۳۲۱ مطبوعہ دارالکتب العلمیۃ بیروت

﴿فتویٰ نمبر......248﴾

سوال

مصافحہ بعدِ نماز جو معمول بعض جگہ ہے یہ سنت ہے یا نہیں۔ کیوں کہ مصافحہ کا سنت ہونا معمول ہے۔ حضرت مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ لکھنوی نے اس کی بابت خلافِ طریقۂ سلفِ صالح لکھا ہے [1]۔ اور بعض فقہا نے بدعتِ مباحہ فرمایا ہے۔ تحقیق کیا ہے؟۔

۱۳ اپریل ۱۹۱٦ء

مولوی مطیع اللہ القریشی بوٹ مال جامع مسجد

الجواب

هو المصوب

مصافحہ عند اللقاء سنتِ موکدہ ہے۔ بعض فقہا نے اس واسطے اس میں تعیین و تخصیص کو جائز رکھا ہے۔

مرقاۃ میں ہے:۔

نعم لو دخل احد فی المسجد والناس فی الصلوة او علی ارادة الشروع فیها فبعد الفراغ لو صافحهم لکن بشرط سبق السلام علی المصافحة فهذا من جملة المصافحة المسنونة انتهی [2].

(ترجمہ: ہاں اگر کوئی شخص مسجد میں اس وقت آئے جب لوگ نماز میں مصروف ہوں یا اسے شروع کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں تو نماز سے فراغت کے بعد اگر ان سے مصافحہ کرے لیکن شرط یہ ہے کہ مصافحہ سے پہلے سلام کہے تو یہ صورت مسنون مصافحہ سے ہے۔)

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مجموعة الفتاوی جلد دوم صفحہ ۴۵، ۴٦
مطبوعہ ملک سراج الدین اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور

[2] مرقاۃ شرح مشکوۃ جلد ۹ صفحہ ۷۴ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان

پس صورت جائز مصافحہ بعد الصلوۃ یہ ہے کہ جو شخص ایسے وقت نماز میں آیا کہ سلام و مصافحہ ابتدا نہ کر سکا تو بعد نماز اول السلام علیکم کہے اور مصافحہ کرے تو بالاتفاق جائز ہے۔ اور اگر ابتداء سے داخل ہو کر سلام و کلام و قیام وغیرہ کیا اور پھر بعد نماز اس نے مصافحہ کرنا شروع کیا تو یہ صورت بالاتفاق مکروہ اور بدعتِ مذمومہ ہے۔

مرقاۃ میں ہے:

و قد يكون جماعة يتلاقون من غير مصافحة و يتصاحبون بالكلام ومذاكرة العلم وغيره مدة مديدة ثم اذا صلوا يتصافحون فاين هذا من السنة المشروعة و لهذا صرح بعض علمائنا بانها مكروهة و انها من البدع المذمومة[1]

(ترجمہ: کبھی ایسے ہوتا ہے لوگ بغیر مصافحہ کے ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں اور باتیں کرنے، علم کا تذکرہ کرنے کے لیے دراز مدت تک بیٹھے رہتے ہیں اور جب نماز ادا کرتے ہیں تو مصافحہ کرتے ہیں یہ کہاں کی مشروع سنت ہے لہٰذا ہمارے بعض علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ یہ عمل مکروہ ہے اور یہ مذموم بدعات سے ایک ہے)

پس روایاتِ بالا سے فرق سنت و بدعت ظاہر ہو گیا۔

فسارعوا الى الخير

(ترجمہ: نیکی کی جانب ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر) و

قال عليه السلام :

☆ العمل القليل من السنة خير من عمل كثير في بدعة[2]

☆ (ترجمہ: سنت کا تھوڑا سا عمل، بدعت کے بہت سے عمل سے بہتر ہے)

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

✿✿✿✿✿

---

[1] المرقاة شرح المشكوة جلد ۹ صفحہ ۷۴ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان

[2] الجامع الصغير مع شرح فيض القدير جلد ۴ صفحہ ۳۶۲ مطبوعہ دار المعرفہ بیروت میں درج ذیل الفاظ سے یہ حدیث موجود ہے:
عمل قليل في سنة خير من عمل كثير في بدعة

﴿فتویٰ نمبر......249﴾

سوال

جو شخص حاسد اور کینہ ور ہو اور جوابِ سلام نہ دے۔ اور توقع سلام کی دوسرے سے رکھے۔ اور خود سلام نہ کرتا ہو۔ اس کے سلام کا جواب نہ دینے سے یا اس کو سلام نہ کرنے سے شرعاً گناہ ہے؟۔

جناب مولوی غلام محی الدین خان صاحب

امام جامع مسجد، شاہجہاں پور۔ ۱۷ دسمبر ۱۵ء

الجواب

جو حاسد اور متکبر ہو اور اس کو سلام نہ کرنا چاہئے۔ کیوں کہ حدیث میں ہے۔

☆ التکبر مع المتکبر عبادة.(۱)

(ترجمہ: تکبر کرنے والے کے ساتھ تکبر کرنا عبادت ہے)

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

✿✿✿✿✿

---

(۱) موضوعات کبیر صفحہ ۱۳ مطبوعہ مجتبائی دھلی

میں بلفظ: التکبر علی المتکبر صدقة ہے۔

﴿فتویٰ نمبر......250﴾

سوال

کیافرماتے ہیں علماءِ دین کہ مردکورنگ پہننا کون سادرست ہے؟ کتابوں میں کسمی زعفرانی رنگ مرد کوحرام لکھا ہے۔ باقی رنگ سبز و پختہ وخام کون ساجائز ہے یاناجائز؟۔

سائل: مولوی علاء الدین

نگلہ ر پرگنہ نگلاحسن ضلع کھیڑی اودھ

۲۲؍فروری ۱۹۱۶ء

الجواب

مردکوسوائے زعفرانی اورکسم اورسرخ رنگ کے کوئی رنگ مکروہ نہیں۔ ہاں جس میں مشابہت عورتوں کی ہوجاوے یاکوئی بدعت مل جاوے تووہ مکروہ سمجھا جائے گا۔ جس طرح ماتم میں سیاہ لباس پہننا یاایسا چمک دارکہ جس سے زنانہ پن معلوم ہو مردکونہ چاہئے۔ اسی طرح موزہ سوائے سیاہ کے سفید یاسرخ خالص نہ پہنے عالم گیریہ میں ہے:۔

ویکرہ للرجل ان یلبس الثوب المصبوغ بالعصفر و الزعفران والورس کذا فی قاضی خان. وعن ابی حنیفة لا باس بالصبغ الاحمر والاسود کذافی الملتقط [1]

ترجمہ: عصفر' زعفران اور ورس سے رنگا ہوا کپڑا پہننا مرد کے لیے مکروہ ہے۔ قاضی خان میں اسی طرح ہے حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ سرخ اور سیاہ رنگ میں کوئی حرج نہیں)

ولا یجوز صبغ الثیاب اسود او اکھب تاسفا علی المیت [2]

---

[1] فتاوی عالم گیریہ جلد ۵ صفحہ ۳۳۲ مطبوعہ مصر

[2] فتاوی عالم گیریہ جلد ۵ صفحہ ۳۳۳ مطبوعہ مصر

ترجمہ: سیاہ رنگ اور مٹیالے رنگ کے کپڑے میت پر افسوس کے اظہار کے لیے پہننا جائز نہیں ہے۔

والخف الاحمر خف فرعون والخف الابیض خف ھامان والخف الاسود خف العلماء [1].

☆(ترجمہ: فرعون کے موزے سرخ رنگ کے تھے ٗ ہامان کے موزے سفید رنگ کے تھے اور سیاہ رنگ کے موزے علماء کے موزے ہوتے ہیں) واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

❁❁❁❁❁

---

[1] فتاوی عالم گیریہ جلد ۵ صفحہ ۳۳۴ مطبوعہ مصر

﴿فتویٰ نمبر......251﴾

سوال

پھول کا گجرا گلے میں پہننا درست ہے یا نہیں؟۔ امام کو عید کی نماز پڑھانے کے بعد روپیہ پیسہ جو مقتدی دیں لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

پھولوں کا ہار پہننا اور☆ مقتدی خوشی سے جو نذر کریں اس کا لینا جائز ہے۔

واللہ تعالی اعلم و علمہ اتم

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی

ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبرآباد

﴿فتویٰ نمبر......252﴾

سوال

اجنبی مرد کا جھوٹا پانی یا کھانا اجنبی عورت کو پینا کھانا جائز ہے یا ناجائز؟ اسی طرح اجنبی عورت کو اجنبی مرد کا؟

۲۵ جمادی الثانیہ
احمد علی ساکن فرخ آباد

الجواب

بسم الله الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما

مکروہ ہے چنانچہ صفحہ ۳۰۲ در مختار مطبوعہ مع رد المحتار میں ہے

یکرہ للمراۃ سور الرجل وسورھا له [1]

(ترجمہ: عورت کے لیے اجنبی مرد کا جھوٹا اور مرد کے لیے اجنبی عورت کا جھوٹا مکروہ ہے)

قال الشامی رحمه الله :

(قوله ویکرہ) تقدمت المسئلة فی الطهارة فی بحث الاسار والعلة فیها کما ذکرہ فی المنح هناک ان الرجل یصیر مستعملا لجزء من اجزء الاجنبیة وهو ریقها المختلط بالماء وبالعکس فیما لو شربت سورہ و هو لا یجوز وقدمنا الکلام هناک فراجعه و قال الرملی رحمه الله یجب تقییدہ بغیر الزوجة والمحارم [2]

---

[1] الدر مختار مع رد المحتار : جلد ۵ ، صفحہ ۳۰۲ ، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

[2] رد المحتار : جلد ۵ ، صفحہ ۳۰۲ ، ۳۰۳ ، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

(ترجمہ: قولہ: مکروہ ہے۔ یہ مسئلہ کتاب الطہارت میں جھوٹے پانیوں کے احکام میں گذر چکا ہے۔ اور کراہت کا باعث اس میں جیسا کہ المنح میں اسی مقام پر فرمایا کہ ایسی صورت میں مرد اجنبی عورت کے اجزاء میں کچھ جو کہ اس کا پانی میں ملا ہوا تھوک ہے کے استعمال کرنے کا مرتکب ہو گیا۔ اگر عورت پانی پیئے تو اس کا عکس ہوگا جو کہ جائز نہیں ہے۔ اس پر گفتگو پہلے ہم کر چکے ہیں اس کی طرف رجوع کیجئے۔ امام رملی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس حکم کو بیوی اور محرم عورتوں کے علاوہ دیگر مستورات کے ساتھ مقید کرنا ضروری ہے۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی ر
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر......253﴾

سوال

ہندو یا مسلمان سودخوار کی دعوت کھانا جب کہ علاوہ کاروبار سودی کے، وہ کاشتکاری پیشہ، بھی ہو جائز ہے کہ نہیں؟

۱۷ رمضان ۱۳۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اگر زیادہ آمدنی طریقِ حلال سے ہے اور کم حرام سے تو اس کی دعوت کھانا جائز ہے۔☆ اگر زیادہ آمدنی مال حرام سے ہے اور کم حلال سے تو اس کی دعوت کھانا بلاشبہ حرام اور ناجائز ہے۔

چنانچہ صفحہ ۴۴۸ جلد خامس فتاوی عالم گیریہ مطبوعہ مصر میں ہے:

اهدی رجل شیئا او اضافه ان کان غالب ماله من الحلال فلا باس به الاان یعلم بانه حرام فان کان الغالب هو الحرام ینبغی ان لا یقبل الهدیة و لا یاکل الطعام الا ان یخبره بانه حلال ورثته او استقرضته من رجل کذا فی الینا بیع[1]

(ترجمہ: کسی آدمی نے کوئی چیز تحفہ دی یا اس نے دعوت کی اگر اس کا زیادہ تر مال حلال ہے تو اسے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور اگر اسے یقین ہو کہ وہ حرام ہے تو قبول کرنا درست نہیں ہے۔ اور اگر اس کا زیادہ تر مال حرام ہے تو مناسب یہ ہے کہ نہ ہدیہ قبول کرے اور نہ ہی کھانا کھائے۔ ہاں اگر وہ اسے بتادے کہ وہ حلال ہے اور میں نے اسے وراثت میں پایا ہے یا میں نے کسی آدمی سے قرض لیا تو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے)

اسی فتاوی کے ۴۷۹ میں ہے:

---

[1] الفتاویٰ العالم گیریہ : جلد ۵، صفحہ ۳۴۲، مطبوعہ مصر

لا یجیب دعوة الفاسق المعلن لیعلم انه غیر راض بفسقه و کذا دعوة من کان غالب ماله حرام ما لم یخبر انه حلال وبالعکس یجیب ما لم یتبین عنده انه حرام کذا فی التمرتاشی [1]

(ترجمہ: اعلانیہ فسق وفجور میں مبتلا آدمی کی دعوت قبول نہ کرے تا کہ اسے معلوم ہو جائے کہ وہ اس کے فسق پر راضی نہیں ہے۔ یہی حال ایسی دعوت کا ہے اگر اس کا زیادہ تر مال حرام ہو تو قبول نہ کرے جب تک وہ اسے بتانے دے کہ یہ حلال مال سے ہے۔ اور معاملہ اگر اس کے عکس ہو تو قبول کر لے جب تک اس پر واضح نہ ہو کہ یہ حرام مال ہے۔ ایسی صورت میں قبول نہ کرے)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی ر
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبر آباد

---

[1] الفتاویٰ العالمگیریہ: جلد ۵، صفحہ ۳۴۳، مطبوعہ مصر

﴿فتویٰ نمبر......254﴾

سوال

ہولی کے دن چندہ کر کے (جلسہ [1]) کرنا اور ہنود سے چندہ لینا اور کھانا وغیرہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر دوسرے روز کریں تو کیا حکم ہے؟ مگر ہنود کھانے میں شرکت نہیں کریں گے۔ جلسہ میں وعظ میں ہمارے افراد سے کرایا جائے۔

۱۹ مارچ ۱۶ء

فصیح اللہ پارچہ فروش علی حسن کلی

نواب خان امراو شیخ محمد خلیل سوداگران بان منڈی وجامع مسجد

الجواب

ھو المصوب

غیر مذہب کے تہوار ہولی، دوالی وغیرہ میں تعظیم وخوشی کرنا مسلمان کو منع ہے۔ کیوں کہ شبہ اور شرکت گناہ میں لازم آتی ہے۔ اور بطورِ خود چندہ کرنا، کھانا، سیر وشکار نہیں اور اہلِ ہنود کو چندہ میں شریک کرنا اور ان کو کھانے میں شریک نہ کرنا خلاف اخلاق ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔

لایاکل طعامك الاتقی [2] ۔

یعنی اپنا کھانا نیک کو کھلادے

اور خود بھی کھانا نیک مرد کا کھائے اور حالت بے اختیاری اس سے مستثنیٰ ہے۔ لہٰذا سیر اور کھانا اور وعظ یہ سب امر ہولی اور غیر ہولی (ہندوؤں کے تہوار) سب میں مسلمانوں کو جائز نہیں۔ صرف تشبہ ہنود کے باعث منع ہے۔ واللہ اعلم و حکمہ احکم.

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ

---

[1] لفظ "جلسہ" اندازہ سے لکھا گیا ہے اصل مخطوط سے یہ لفظ پڑھا نہ جاسکا۔ مرتب عفی عنہ

[2] مسند احمد جلد ۳ صفحہ ۳۸ مطبوعہ المکتب الاسلامی

﴿فتویٰ نمبر......255﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں مسماۃ بوجہ نا اتفاقی خاوند کے اپنے والدین کے ہاں بیٹھ رہے۔ عرصہ پانچ ماہ کا گزر جائے اس عرصہ میں چند بار بلایا نہ آئی۔ وارثانِ مسماۃ مقتضی اس امر کے ہوں کہ خاوندِ مسماۃ' مکان مسماۃ کے نام لکھ دے یا فارغ خطی مسماۃ کو دے۔ لہٰذا استفتا پیش کیا جاتا ہے امورین میں کوئی ایک خاوند پر لازم ہے؟ اگر دونوں نہ ہوں یعنی نہ مکان لکھے نہ فارغ خطی دے اس حالت میں کوئی قصور خلاف شرعی ذاتِ مسماۃ سے صادر ہوا اس کا گناہ اوپر ذات مسماۃ کے ہے یا خاوند کے ذمہ بھی عائد ہوگا۔؟

۲۸ صفر ۱۳۳۳ھ

زمان خان محلہ ماڑ دروازہ آگرہ

الجواب

هو الموفق للصواب

بسم الله الرحمن الرحيم.

اللهم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں شوہر پر نہ فارغ خطی دینا لازم ہے ☆ اور نہ تحریرِ ہبہ نامۂ مکان بنام مسماۃ لازم ہے۔ اور جو گناہ کرے گا وہ اس کی سزا پائے گا۔ مرتکبِ گناہ کے سوا دوسرا اس کی سزا نہیں پا سکتا۔

قرآن مجید میں اللہ جل شانہ فرماتا ہے:۔

ولا تزر وازرة وزر اخرى[1]

---

[1] i. القرآن المجيد سوره الانعام . آیت نمبر ۱۶۴

ii. القرآن المجيد سورة الاسراء : آیت نمبر ۱۵

iii. القرآن المجيد سوره الزمر : آیت نمبر ۷

iv . القرآن المجيد سوره النجم : آیت نمبر ۳۸

(ترجمہ: کوئی اٹھانے والے کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا)

البتہ باوصفِ قدرت اگر شوہر اپنی زوجہ کو امورِ مخالفِ شرعی سے منع نہ کرے گا نہ منع کرنے کی سزا میں ماخوذ ہوگا۔

☆ الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته۔[۱]

(ترجمہ: خبردار! تم میں سے ہر ایک حکمران ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا)

فرمان سید الانس والجان ﷺ ہے۔

اور اگر وہ یقیناً واقف ہے کہ یہ زنا کرتی ہے اور غیر مردوں سے ملتی رہتی ہے اور پھر اس کو طلاق نہ دے اور اس کو امورِ شنیعہ پر تنبیہ نہ کرے مستحق اس حدیث صحیح کا ہوگا۔ جو مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ اہلِ موقف جنت کی خوشبو ستر ہزار برس کے فاصلہ سے سونگھ لیں گے مگر دیوث کو خوشبو جنت نہ پہنچے گی۔[۲]

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی مفتی مسجد جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

۱ صحیح البخاری: باب الجمعة فی القری والمدن حدیث رقم ۸۹۳ مطبوعہ شرکۃ دار ارقم بیروت

ii. صحیح البخاری باب العبد راع فی مال سیدہ حدیث رقم ۲۴۰۹ مطبوعہ شرکۃ دار ارقم بیروت

نوٹ: یہ حدیث پاک بخاری شریف میں درج بالا مقامات کے علاوہ کتاب الوصایا، کتاب العتق، کتاب النکاح، کتاب الاحکام میں، مسلم شریف کی کتاب الامارہ، سنن ابوداؤد کی کتاب الامارہ، جامع ترمذی کی کتاب جہاد وغیرہ کتب میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی جلد ۲ صفحہ ۲۸۳ مطبوعہ لیڈن۔

۲ النہایہ جلد ۲ صفحہ ۱۴۸ مؤسسہ مطبوعاتی اسماعیلیان ایران میں یہ الفاظ ہیں:

تحرم الجنة على الديوث.

یہی الفاظ غریب الحدیث امام ابن جوزی کی جلد اول صفحہ ۳۵۵ مطبوعہ دار الباز مکہ مکرمہ میں بھی ہیں۔

﴿فتویٰ نمبر...... 256﴾

سوال

کیا مسجد میں سوال کرنا اور سوال کرنے والے کو دینا ناجائز ہے یا مکروہ یا حرام؟ شرع شریف کا اس بارہ میں کیا حکم ہے؟ مع نام کتاب وصفحہ سے آگاہی فرمائیں۔

غلام نبی بازار آگرہ۔

۲۷ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ

الجواب

بعض فقہا کے نزدیک اگر سائل مسجد میں صفوں میں گشت نہ لگائے اور لوگوں پر چڑھتا نہ پھرے تو اس کو دینا جائز لکھتے ہیں۔ مگر قولِ مختار یہی معلوم ہوتا ہے کہ مطلقا مسجد میں سوال کرنا حرام ہے۔ اور مسجد میں سوال کرنے والے کو دینا مکروہ ہے۔

چنانچہ درمختار میں ہے:۔

و یحرم فیه السوال و یکره الاعطاء مطلقا و قیل ان تخطی[1]

(ترجمہ: مسجد میں سوال کرنا حرام ہے اور سوال کرنے کو دینا ہر صورت میں مکروہ ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اگر لوگوں کی گردنیں پھلانگے تو دینا حرام ہے)

مگر شامی علیہ الرحمۃ تحریر فرماتے ہیں کہ اگر صفوں میں لوگوں پر چڑھتا نہ پھرے تو دینا جائز ہے

حیث قال رحمه الله فی صفحة ۴۸۸ من رد المحتار المصری

یکره اعطاء سائل المسجد الاذا لم یتخط رقاب الناس فی المختار لان علیا تصدق بخاتمه فی الصلوة فمدحه الله تعالیٰ ویوتون الزکوة و هم راکعون[2].

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۲ ' صفحه ۳۷۵ بیروت

[2] رد المحتار : جلد ۲ ' صفحه ۳۷۵ بیروت

(ترجمہ: مسجد میں مانگنے والے کو دینا مکروہ ہے۔ لیکن مختار یہ ہے کہ اگر لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگے تو دینا جائز ہے۔
☆ کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی انگوٹھی نماز کی حالت میں صدقہ کردی۔ اس پر اللہ تعالی نے ان کی مدح یوں فرمائی وہ زکوۃ حالتِ رکوع میں ادا کرتے ہیں۔ المائدہ ۶۵)

وھکذا فی صفحہ ۵۶۸ من غنیۃ المستملی المطبوعۃ فی المطبع المجتبائی الدھلی ما

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی
مفتی جامع مسجد اکبر آباد

ما غنیۃ المستملی: صفحہ ۵۶۸ مطبوعہ دیوبند

نوٹ: اس کی عبارت یوں ہے

وعلم مما تقدم حرمۃ السوال فی المسجد لأنہ کنشدان الضالۃ والبیع ونحوہ و کراھۃ الاعطاء لأنہ یحمل علی السوال وقیل إذا لم یتخط الناس ولم یمر بین یدی مصل والاول احوط

ترجمہ: ماقبل بحث سے معلوم ہوا کہ مسجد میں سوال کرنا مکروہ ہے۔ کیونکہ یہ گم شدہ چیز کو تلاش کرنے اور بیع وغیرہ کی مانند ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سائل کو دینا بھی مکروہ ہے۔ کیونکہ اسے بھی سوال کے حکم پر محمول کیا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا کہ سوال کرنا اور سائل کو دینا مکروہ نہیں جب کہ وہ لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگے اور نمازیوں کے سامنے سے نہ گذرے لیکن پہلا قول احوط ہے۔

﴿فتویٰ نمبر...... 257﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک مسجد کا جماعت خانہ بہ نسبت صحن کے بلندی پر واقع ہے جس میں چڑھنے اترنے کو پختہ سیڑھی بنی ہوئی ہے۔ سیڑھی کے اُٹھان کی جگہ میں ایک پتھر پر عربی حروف میں رمضان المبارک کندہ کرا کر چن دیا گیا ہے۔ جماعت خانہ میں آنے جانے والے اس پر قدم رکھ کر آتے جاتے ہیں۔ اس صورت میں علماءِ دین کے نزدیک کیا حکم ہے۔ بے ادبی اور گناہ ہوتا ہے یا نہیں؟ زید جو عالم اور سید کہلاتا ہے اور اس مسجد کا پیش امام بھی ہے کہتا ہے' کہ اس میں کسی قسم کی بے ادبی نہیں ہوتی کیوں کہ دو منزلہ مکان میں ماتحت کے درجہ میں قرآن شریف' احادیث' فقہ کی کتابیں رکھی ہوں اور دوسرے درجہ پر جانا چلنا پھرنا کسی طرح منع نہیں ہے۔ اور آج تک اس کو کسی نے منع نہیں کیا۔ اور اس کے بام پر ہر کس آتا جاتا ہے۔ ان صورت میں جو حکم ہے وہ اس سیڑھی کے لیے بھی ہے۔ اور عمر جو ایک نووارد عالم (ہے) وہ کہتا ہے کہ اس پتھر کو یہاں سے نکال دینا چاہئے کیوں کہ یہ کلماتِ قرآنی ہیں اور کلماتِ قرآن کا ادب لازمی ہے اور عمداً اس کی بے ادبی کرنا یا کرانا خارج از ایمان ہونے کی علامت ہے۔ دیگر تفسیر کبیر و کتاب غایۃ المواعظ سے اللہ کا نام بتلاتا ہے اور اللہ کے نام کی عمداً بے ادبی کرنا اور کرانا خود گمراہ ہونا اور لوگوں کو گمراہ کرنا ہے۔ لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس میں کون حق پر ہے زید یا عمر؟ بحوالہ کتب وعبارت وصفحات مفصل تحریر فرمادیں۔

اور زید کے اصرار نے دو اڑھائی سال سے اس پتھر کندہ شدہ کلماتِ رمضان المبارک کی شب وروز بے ادبی کی اور لوگوں سے کرائی۔ اس کا وبال کا مستحق کون ہوگا؟ کلماتِ قرآن کی وجہ سے بے ادبی ہوگی یا نہیں؟ اور عمداً کلماتِ قرآن یا اسماءِ الٰہی کی بے ادبی کرنے سے بے ادبی نہیں ہوتی ایسا دھوکہ دے کر فتویٰ دینے والے کی بابت کیا حکم ہے۔ اس کو مسلمان سمجھا جائے یا نہیں؟ اس کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا اور اس سے نکاح پڑھوانا اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس پتھر کو نکالنا چاہئے یا نہیں؟

سیٹھ حاجی حسن صدیق موتی والا بازار

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما۔ ارنا الحق حقا والباطل باطلا۔

صفحہ ۱۲۰ جلد دوم تفسیر کبیر میں ہے

اختلفوا فی رمضان علی وجوہ أحدها قال مجاهد انه اسم الله تعالی و معنے قول القائل شهر رمضان ای شهر الله وروی عن النبی ﷺ انه قال لا تقولوا جاء رمضان و ذهب رمضان و لکن قولوا جاء شهر رمضان و ذهب شهر رمضان. ☆ فان رمضان اسم من اسماء الله تعالی ما[1] .

یعنی حضرت مجاہد مفسر فرماتے ہیں کہ رمضان اللہ کا نام ہے اور آنحضرت ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا یوں مت کہا کرو کہ رمضان آیا رمضان گیا بلکہ یوں کرو مہینہ رمضان کا یعنی اللہ کا مہینہ آیا اور مہینہ رمضان کا گیا ☆ اس واسطے کہ رمضان ایک نام ہے من جملہ ان ناموں کے جو اللہ کے ہیں۔

علاوہ ازیں تفسیر عزیزی اور نزہۃ المجالس وغیرہ دوسری کتب میں بھی یہ مضمون نظر سے گزرا ہے۔

اور غنیۃ الطالبین میں حضرت غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تو منقول ہے کہ:

☆ جمیع حروف تہجی من جملہ اسماءِ الٰہی اللہ کے نام ہیں۔ چنانچہ صفحہ ۱۰۲ غنیة الطالبین مطبوعه لاہور مترجم میں ہے:۔

روی عن النبی ﷺ انه قال لعثمان بن عفان لما سال عن ا ب ت ث إلی آخر الحروف فقال الالف من اسم الله الذی هو الله و الباء من اسم الله الذی هو الباری والتاء من اسم الله الذی هو المتکبر والثاء من اسم الله الذی هو الباعث والوراث حتی اتی آخرها وذکر کلها من اسماء الله و صفاته عز وجل غیر مخلوقة و قال النبی ﷺ فی حدیث علی

ما[1] التفسیر الکبیر : جلد ۵ صفحہ ۹۱ مطبوعه ایران.

کرم اللہ وجھہ لما سال عن معنی ابجد ھو زحطی الی آخرھا یا علی الاتعرف تفسیر ابجد والالف من اسم اللہ عز وجل ھو اللہ والباء من اسم اللہ الذی ھو الباری والجیم من اسم اللہ الذی ھو الجلیل إلی آخرھا فذکر النبی ﷺ انھا من اسماء اللہ تعالی [1]

(ترجمہ: نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے فرمایا جب انہوں نے الف، باء، تاء، ثاء الخ کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا کہ الف اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک کا حصہ سے جو اللہ ہے۔ باء اللہ تعالیٰ کے نام مبارک باری کا حصہ ہے۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ نے تمام حروف کو آخر تک شمار فرمایا اور بیان فرمایا کہ یہ تمام اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کا حصہ ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث مبارک میں فرمایا جب انہوں نے تمام حروف، ابجد کے معنی دریافت کیے اے علی! کیا تم ابجد کی تفسیر جانتے ہو الف اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک کا حصہ ہے جو اللہ ہے الخ اس طرح نبی پاک ﷺ نے ذکر فرمایا کہ یہ تمام حروف اللہ تعالیٰ کے اسمائے مبارکہ کا حصہ ہیں)

اسی واسطے فقہاء دیوارِ مسجد وغیرہ پر مطلقا لکھنے سے منع فرماتے ہیں اس خوف سے کہ کبھی یہ حروف گر جائیں اور پاؤں سے مسلے جائیں چنانچہ صفحہ ۴۹۰ درمختار مطبوعہ مصر علی ہامش رد المحتار میں ہے

لا ینبغی الکتابة علی جدرانه [2]

(ترجمہ: مسجد کی دیواروں پر نہیں لکھنا چاہیے)

قال الشامی رحمه اللہ

أی خوفا من ان یسقط و توطأ [3]

(ترجمہ: اس خوف کے باعث کہ کتابت شدہ الفاظ گر پڑیں گے اور پاؤں تلے روندے جائیں گے)

---

[1] غنیة الطالبین : جلد اول صفحہ ٦١ مطبوعہ مکتبہ خاور لاہور

[2] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۱ صفحہ ۴۹۰ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

[3] رد المحتار : جلد ۱ صفحہ ۴۹۰ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

ہاں البتہ اگر اس استحکام سے لکھا جائے کہ پاؤں سے کھندنے اور بے ادبی کا احتمال نہ ہو جیسے اکثر عمارتِ شاہیوں میں آیاتِ قرآنی کندہ ہیں اور اکثر مساجد میں تاریخیں کندہ ہوتی ہیں مضائقہ نہیں۔

بہرنہج مقصودِ فقہا یہ ہے کہ توہین وتذلیلِ آیات وحروف نہ ہو☆اسی بنا پر بعض فقہاء کرام تحریر فرماتے ہیں کہ قبل از غسل میت کے پاس قرآن مجید پڑھنا مکروہ ہے چنانچہ صفحہ ۶۲۱ درمختار میں مذکور ہے:

و تکرہ القراء ة عندہ حتی یغسل[۱]

☆(ترجمہ: میت کے پاس قرآن مجید پڑھنا مکروہ ہے جب تک اسے غسل نہ دے دیا جائے)

عبارة الزیلعی

حتی یغسل[۲]

(ترجمہ: جب تک اس کو غسل نہ دے دیا جائے میت کے پاس قرآن مجید پڑھنا مکروہ ہے)

و عبارة النهر

قبل غسله[۳]

(ترجمہ: غسل سے قبل میت کے پاس قرآن مجید پڑھنا مکروہ ہے)

☆ اور فتاوی عالم گیری میں فتاوی سراجیہ سے منقول ہے کہ نشانہ پر فرعون یا ابوجہل کا نام لکھ کر اس پر تیر لگانا بھی مکروہ ہے اس واسطے کہ حروف تہجی جن سے یہ نام مرکب ہیں واجب الحرمت ہیں۔

چنانچہ صفحہ ۳۰ فتاوی عالم گیری میں ہے:۔

اذا کتب اسم فرعون او کتب ابو جهل علی غرض یکرہ ان یرموا الیه لان لتلک الحروف حرمة کذا فی السراجية[۴]

---

[۱] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۳ صفحہ ۷۹ دار التراث العربی بیروت

[۲] تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق للزیلعی : جلد اول صفحہ ۲۳۵ مکتبہ امدادیہ ملتان

[۳]

[۴] الفتاوی العالم گیریہ جلد ۵ صفحہ ۳۲۳ مطبوعہ مصر

(ترجمہ: جس کسی نشانہ پر فرعون یا ابوجہل کا نام لکھ دیا جائے تو اس کی جانب تیر اندازی کرنا مکروہ ہے کیوں کہ ان حروف کی حرمت وعزت ہے۔ سراجیہ)

اور مثل روایت مذکورہ درمختار صفحہ ۳۵۸ عالم گیریہ میں ہے

و لو کتب القرآن علی الحیطان و الجدران بعضهم قالو یرجی ان یجوز۔[1]

☆ (ترجمہ: قرآن مجید کو اگر چار دیواریوں یا دیواروں پر لکھا جائے تو بعض علماء نے فرمایا امید ہے کہ یہ جائز ہوگا)

مگر یہ اسی صورت میں ہے جب خوف بے ادبی نہ ہو ورنہ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

و بعضهم کرهوا ذلک مخافة السقوط تحت اقدام الناس کذا فی فتاوی قاضی خان۔[2]

(ترجمہ: بعض علمائے کرام نے دیواروں پر قرآنِ مجید لکھنے کو اس خوف کے باعث مکروہ قرار دیا ہے کہ وہ کتابت شدہ نقوش لوگوں کے قدموں کے نیچے کریں گے۔)

☆ اور صورتِ مذکورہ میں صراحتہ بے ادبی و تذلیل اسمِ رمضان ہے گو رمضان کا لفظ پاؤں کے نیچے نہیں آتا مگر جس کھڑے پتھر پر کندہ ہے اس کی اوپر سیڑھی پر تو پاؤں رکھے جاتے ہیں۔ اور فقہا یہاں تک تحریر فرماتے ہیں کہ اگر جزدان میں احادیث یا کتبِ فقہ لپٹی ہوں اور اس جزدان کو سرہانے رکھ کر سونے سے حفاظت مقصود نہ ہو بلکہ مجرد تکیہ لگانا مقصود ہو جب بھی باوجودیکہ کتبِ فقہ اور احادیث اس کپڑے میں چھپے ہوتے ہیں اور پاؤں کے نیچے بھی نہیں آتے بلکہ سر کے نیچے رکھے جاتے ہیں مطلقاً مکروہ تحریر فرماتے ہیں۔ اور مطلقاً کراہت امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کراہت تحریمہ پر محمول ہوتی ہے چنانچہ صفحہ ۳۵۷ عالم گیریہ میں ہے:

متعلم معه خریطة فیها کتب من اخبار النبی ﷺ او کتب ابی حنیفة او غیره فتوسد بالخریطة قصد الحفظ لا یکره و ان لم یقصد الحفظ یکره کذا فی الذخیره۔[3]

---

[1] الفتاوی العالم گیریه جلد ۵ صفحه ۳۲۳ مطبوعه مصر

[2] الفتاوی العالم گیریه جلد ۵ صفحه ۳۲۳ مطبوعه مصر

[3] ایضا

☆(ترجمہ: طالب علم کے پاس تھیلا ہو اس میں احادیث مبارکہ یا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر ائمہ کرام کی کتب ہوں اس تھیلے کو حفاظت کی نیت سے سرہانہ کے طور پر استعمال کرنا مکروہ نہیں ہے اور اگر حفاظت کی نیت نہ ہو تو پھر سرہانہ بنانا مکروہ ہے)

الحاصل کتب دینی اور اسماءِ جناب باری تعالیٰ یا حروفِ تہجی واجب الحرمۃ ہیں اگر بغرضِ حفاظت صندوق میں بحالتِ سفر رکھ کر اس پر بیٹھ جائے یا حجرہ میں بغرضِ حفاظت رکھے اور اس کی چھت پر بیٹھے یا بغرضِ حفاظت سر کے نیچے رکھنے میں مضائقہ نہیں۔ اور بلا ضرورتِ حفاظت اگر اس طرح رکھے جائیں کہ ان کی توہین وتذلیل ہو قطعاً ناجائز اور حرام ہے۔

چنانچہ صفحہ مذکورہ عالم گیریہ میں ہے:۔

التوسد بالكتاب الذى فيه الاخبار لا يجوز الاعلى نية الحفظ كذا فى الملتقط ووضع المصحف تحت راسه فى السفر للحفظ لا باس به و بغير الحفظ يكره كذا فى خزانة الفتاوى[1]

(ترجمہ: ایسی کتاب کو سرہانہ بنانا جس میں احادیثِ مبارکہ ہوں جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر حفاظت کی نیت سے ہو تو جائز ہے۔ ملتقط۔ سفر میں قرآن مجید کو حفاظت کی خاطر سرہانہ بنانے کوئی حرج نہیں ہے لیکن حفاظت کی نیت کے بغیر مکروہ ہے۔ خزانۃ الفتاوی)

فى صفحة ۲۳۷

كل مكروه أى كراهة تحريم حرام أى كالحرام فى العقوبة بالنار عند محمد رحمه الله و عندهما إلى الحرام اقرب انتهى مختصرا[2]

(ترجمہ: ہر مکروہ یعنی مکروہ تحریمی دوزخ میں سزا کے معاملہ میں حرام کی مانند ہے۔ یہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول

---

[1] الفتاوى العالم گيريه جلد ۵ صفحه ۳۲۲ مطبوعه مصر

[2] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۹ صفحه ۴۰۹ دار احياء التراث العربى بيروت

ہے اور شیخین رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک حرام کے قریب ہے)

قال الشامی رحمة الله:

قوله کراهة تحریم و هی المرادة عند الاطلاق کما فی الشرح و قیده بما اذا کان فی باب الحظر و الاباحة[1]

(ترجمہ: قولہ: مکروہ تحریمی الخ اور جب مکروہ بولا جائے اور اس کے ساتھ کوئی قید نہ ہو تو پھر یہی مراد ہوتا ہے جیسا کہ شرح میں ہے اور اسی میں ہے یہ حکم اس وقت ہے جب کہ یہ لفظ باب الحظر والاباحہ میں ہو)

اور ظاہر ہے یہ مسائل باب الکراهة و الحظر و الاباحة شامی اور عالم گیریہ نقل کئے گئے ہیں۔

لہٰذا اس پتھر کو نکلوا کر توہین و تذلیلِ اسماءِ الٰہی سے توبہ کرنا ضرور ہے۔ واللہ اعلم

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی

مسجد جامع اکبرآباد

✿✿✿✿✿

---

[1] رد المحتار: جلد ۱ صفحہ ۴۰۹ ایضا

﴿فتویٰ نمبر...... 258﴾

سوال

تعویذ موم جامہ میں سلا ہوا ہو اگر بوقتِ بیت الخلا ساتھ چلا جائے یا حالتِ غسل میں بازو وغیرہ میں بندھا ہو تو اس میں کوئی ممانعت شرعی تو نہیں ہے؟

الجواب

اگر تعویذ میں آیتِ کلام اللہ یا اللہ کا نام ہے تو باوجود موم جامہ کے بھی اس کو پاخانہ میں لے جانا مکروہ ہے اور اگر اس کو باندھے ہوئے پاک جگہ میں بیٹھ کر پیشاب کرے تو جائز ہے۔ مگر نہانے کی حالت میں چونکہ پانی مستعمل کا اس تک اثر کرنا یقینی ہے لہٰذا اس حالت میں باندھے رہنا قطعاً ناجائز ہے۔

چنانچہ صفحہ ۳۵۸ جلد خامس عالم گیریہ مصری میں ہے:۔

سئل الفقیہ ابو جعفر رحمہ اللہ عمن کان فی کمہ کتاب فجلس للبول یکرہ. ذلک قال ان کان ادخلہ مع نفسہ المخرج یکرہ و ان اختار لنفسہ مبالا طاھرا فی مکان طاھر لا یکرہ کذا فی المحیط۔[1]

(ترجمہ: فقیہ ابوجعفر رحمۃ اللہ علیہ سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس کی آستین میں کتاب ہو پھر وہ پیشاب کرنے کے لیے بیٹھ گیا یہ اس کے لیے مکروہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا اگر اس نے کتاب کو اپنے ساتھ بیت الخلاء میں داخل کیا تو مکروہ ہے اور اگر اس نے پیشاب کرنے کے لیے پاک جگہ کو پیشاب گاہ بنایا تو مکروہ نہیں محیط)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ
ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی مسجد جامع اکبرآباد

✿✿✿✿✿

---

[1] الفتاویٰ العالم گیریہ : جلد ۵ ' صفحہ ۳۲۳' مطبوعہ مصر

﴿فتویٰ نمبر......259﴾

سوال

ایک شخص قرآن ناظرہ پڑھا ہوا ہے۔ اور لڑکوں کو پڑھاتا ہے۔ مسائل اردو اور ہندی میں پڑھاتا ہے کیا ہندی پڑھانا حرام یا ناجائز یا جائز؟

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

مطلقاً ہندی پڑھنا پڑھانا یا کوئی اور زبان کا بقدرِ کاروائی امورِ دنیا جائز ہے بشرطیکہ بطریق کفر نہ پڑھائی جائے یعنی بجائے بسم اللہ گنیش یا رام چندر وغیرہ کا نام بطریق عظمت نہ پڑھایا جائے۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......260﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین دربارہ ایسے عالم کے جو اپنی کتاب میں یہ عمل لکھتا ہے اور اس کے کرنے کی عام مسلمانوں کو اجازت دیتا ہے کہ فلاں آیۂ کلام اللہ انگور کے پتہ پر لکھ کر بغرضِ امساک ران پر باندھنا درست ہے۔ دوسرا شخص اس کی تائید میں کہتا ہے کہ یہ مولانا اشرف علی صاحب نے بہشتی زیور میں لکھا ہے۔ اس پر لوگ اعتراض کرتے ہیں۔

فتاوی عالم گیریہ اور قاضی خان اور فتاوی بزازیہ میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کسی کے نکسیر سے خون آتا ہو اور وہ بند نہ ہوتا ہو اسے خون سے پیشانی پر قرآن کی آیت لکھے شفا ہو گی۔ کہا اس کو ابوبکر اسکاف نے اور بعض کا قول ہے کہ اگر قرآن کو پیشاب سے لکھے تو بھی حرج نہیں ہے مگر اس میں شفا ہو اور مردار کی کھال پر قرآن کا لکھنا درست ہے۔ نعوذ باللہ منھا

۲۱ شوال ۳۶ھ

مولوی تاج محمد ساکن قائم گنج حال مقیم

فیروز آباد ضلع اکبر آباد

الجواب

وهو الموفق للصواب:

اللهم رب زدنی علما.

صفحہ ۳۵۸ جلد خامس من فتاوی العالمگیریه' کتاب الکراهية باب خامس فی آداب المسجد والمصحف و ما کتب فيه شیء من القران او کتب اسم الله تعالی میں ہے۔

کتابة القران علی ما يفترش و يبسط مكروهة كذا فی الغرائب بساط او مصلی

كتب عليه الملک لله يكره بسطه و القعود عليه و استعماله و على هذا قالوا لا يجوز ان يتخذ قطعة بياض مكتوب عليه اسم الله تعالى علامة فيما بين الاور اق لما فيه من الابتذال باسم الله تعالى و لو قطع الحرف من الحرف او خيط على بعض الحروف فى البساط او المصلى حتى لم تبق الكلمة متصلة لم تسقط الكراهة و كذالک لو كان عليها الملک لا غير و كذالک الالف وحدها و اللام وحدها كذا فى الكبرى اذا كتب اسم فرعون او كتب ابو الجهل على غرض يكره ان يرموا اليه لان لتلک الحروف حرمة كذا فى السراجية [1]

(ترجمہ: قرآنِ مجید کو ایسی چیز پر لکھنا جسے بچھونا بنایا جاتا ہو یا زمین پر بچھایا جاتا ہو مکروہ ہے۔ الغرائب' بچھونا یا مصلی جس پر الملک لله (بادشاہت اللہ کی ہے) لکھا ہوا سے بچھانا یا اس پر بیٹھنا اور اس کا استعمال مکروہ ہے۔ ☆ اور اسی بنا پر علمائے کرام نے فرمایا (کاغذ کا) سفید ٹکڑا جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لکھا ہوا ہوا سے اوراق کے درمیان بطور نشانی کے رکھنا جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ اس میں باری تعالیٰ کے نام کی توہین ہے۔ ☆ اور اگر بچھونے یا مصلی پر لکھے ہوئے ان کلمات سے ایک حرف کو دوسرے سے الگ کر دیا جائے یہاں تک کہ ایک کلمہ متصل نہ رہے تب بھی کراہت ساقط نہیں ہوتی۔ ☆ یہی حکم ہے جب اس پر الملک لکھا ہو اس کے سوا کچھ اور نہ لکھا ہو یا الف یا لام اکیلا لکھا ہو۔ کبریٰ' ☆ فرعون یا ابو جہل کا نام کسی نشانہ لگانے کی جگہ پر لکھا ہو اس کی طرف تیر اندازی مکروہ ہے۔ کیونکہ ان حروف کی ایک حرمت ہے۔ سراجیہ)

وایضا فيه فى آخر تلک الصفحة :

ولا يجوز فى المصحف الخلق الذى لا يصلح للقراة ان يحلد به القرآن [2]

☆ (ترجمہ: بوسیدہ قرآنِ مجید جو پڑھنے کے لائق نہ رہے اس کے اوراق سے قرآنِ مجید کو جلد کرنا جائز نہیں ہے)

---

[1] الفتاوى العالم گيريه : جلد ۵، صفحه ۳۲۳، مطبوعه مصر

[2] الفتاوى العالم گيريه : جلد ۵، صفحه ۳۲۳، مطبوعه مصر

☆ بلکہ ابتداء صفحہ مذکورہ میں فتاوی قاضی خان سے تو جن پیسوں پر اللہ تعالیٰ کا نام لکھا ہوا ہے ان کو بھی بلا طہارت ہاتھ میں لینا مکروہ ہے۔

ویکرہ لمن لا یکون علی الطهارة ان یاخذ فلو سا علیها اسم الله تعالی کذا فی فتاوی قاضی خان[1]

☆ (ترجمہ: جو شخص طہارت کے ساتھ نہ ہو اسے ایسے پیسوں کو پکڑنا جن پر اللہ تعالیٰ کا اسم مبارک ہو مکروہ ہے)

اندریں صورت ظاہر ہے کہ فقہائے کرام کے نزدیک ایک ایک حرف قرآن سے جب اس درجہ تعظیم مدنظر ہے کہ اگر نشانہ پر ابوجہل یا فرعون لکھا ہو تو نامِ فرعون و ابوجہل چونکہ مرکب ہے ان حروف تعظیم سے بلحاظ تعظیم ان حروف کے اس کی طرف تیر پھینکنا تک جائز نہیں رکھتے۔ تو بغرضِ تحصیلِ خواہشِ نفسانی بلاشبہ مولوی اشرف علی لکھیں یا کوئی اور آیہ کلام اللہ کو انگور کے پتہ پر خواہ کاغذ پر لکھ کر ران پر باندھنا ہرگز ہرگز جائز نہیں ہوسکتا۔

☆ اب رہا یہ امر جو فقہا پر بلا فہمِ مقصود اتہام رکھا گیا ہے کہ فتاوی عالمگیریہ اور خانیہ اور بزازیہ میں پیشاب سے یا خونِ نکسیر سے آیۃ کلام اللہ کو لکھنا جائز لکھا ہے اس کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے **و انتم سکاری** کی قید کو علیحدہ کر کے کوئی کہے کہ قرآنِ مجید میں اللہ جل شانہ فرماتا ہے:۔

ولا تقربوا الصلواة[2]

ترجمہ: نماز کے قریب نہ جاؤ۔

اور اس طریق سے دلیل پکڑے اس امر پر کہ قرآن شریف سے ثابت ہے کہ نماز پڑھنا تو درکنار نماز کے قریب جانا بھی درست نہیں۔ **نعوذ بالله من تلک الاتهامات و الافهام الكاسدات**

اس واسطے کہ صفحہ ۳۹۱ جلد خامس کتاب الکراھیۃ باب ثامن عشر فتاوی عالمگیریہ میں ہے:

---

[1] الفتاوی العالم گیریہ : جلد ۵ ، صفحہ ۳۲۳ ، مطبوعہ مصر

[2] القرآ ن مجید : سورۃ النساء : آیت نمبر ۴۳.

اعلـم بـان الاسبـاب الـمـزيلة للضرر تنقسم الى مقطوع به كالماء المزيل لضرر العـطـش والـخبز المزيل لضرر الجوع والى مظنون كالفصد والحجامة و شرب المسهل وسـائـر أبـواب الـطـب اعـنـى مـعالجة البرودة بالحرارة و معالجة الحرارة بالبرودة وهى الاسبـاب الـظـاهـرة فى الطب والى موهوم كالكى والرقية اما المقطوع به فليس تركه من التـوكل بل تركه حرام عند خوف الموت و اما الموهوم فشرط التوكل تركه اذ به وصف رسـول الـلـه ﷺ الـمتـوكـلـيـن اما الدرجة المتوسطة وهى المظنونة كالمداوة بالاسباب الظاهرة عند الاطباء ففعله ليس مناقضا للتوكل [1]

☆(ترجمہ: وہ اسباب جو نقصان اور تکلیف کو زائل کرنے والے ہیں (ان کی تین قسمیں ہیں)

(۱) یقینی طور پر ضرر کو زائل کرنے والے جیسے پانی کہ پیاس کی تکلیف کو زائل کر دیتا ہے اور روٹی جو بھوک کی تکلیف کو ختم کر دیتی ہے۔

(۲) ظنی اسباب مثلاً فصد لگوانا' پچھنے لگوانا' جلاب آور دوا کا پینا اور طب کے تمام ابواب یعنی سردی کا علاج گرمی سے اور گرمی کا علاج سردی سے کرنا۔ اور یہ طب میں ظاہر اسباب ہیں۔

(۳) موہوم اسباب۔ جیسے اعضاء کو داغنا' تعویذ لینا' ان میں سے یقینی اسباب کو ترک کرنا توکل نہیں ہے۔ بلکہ اگر موت کا خوف ہو تو ان کا ترک حرام ہے۔ موہوم اسباب میں توکل کی شرط یہ ہے کہ ان کو چھوڑ دیا جائے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے اسی صفت کے ساتھ توکل کرنے والوں کی تعریف فرمائی ہے۔ باقی رہے درمیانی درجے کے اسباب جو کہ ظنی ہیں مثلاً حکماء کے نزدیک ظاہر اسباب کے ساتھ علاج کرنا تو یہ توکل کے منافی نہیں ہیں)

یعنی وہ اسباب جو دافع ضررِ انسانی ہیں اگر وہ یقینی ہیں ان کا چھوڑنا موجب گناہ ہے بلکہ بوقتِ خوفِ موت ان کا ارتکاب لازم اور واجب ہو جاتا ہے۔

---

[1] الفتاوی العالمگیریہ : جلد ۵' صفحہ ۳۵۵' مطبوع مصر

چنانچہ قرآن مجید میں اللہ جل شانہ فرماتا ہے۔ چھٹے سپارے کے پانچویں رکوع میں ہے:۔

فمن اضطر فی مخمصة غیر متجانف لاثم فان الله غفور رحیم[1]

(ترجمہ: لہٰذا جو مجبور ہو جائے بھوک میں اور گناہ کی طرف جھکنے والا نہ ہو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے)

قال العلامة ابو السعود الحنفی رحمة الله فی تفسیر المطبوعه علی هامش الکبیر فی صفحة ۳۵۷ :

قوله تعالی فمن اضطر متصل بذکر المحرمات ای فمن اضطر الی تناول شیء من هذه المحرمات فی مخمصة ای مجاعة یخاف لها الموت او مبادیه غیر متجانف لاثم قیل غیر مائل و منحرف الیه بان یاکلها تلذذاً او مجاوزاً حد الرخصة او ینتزعها من مضطر آخر کقوله تعالی غیر باغ ولا عاد فان الله غفور رحیم لا یواخذه بذالک بناء علیه

(ترجمہ: قولہ: پس جو شخص مجبور ہو جائے الخ یہ محرمات کے متصل بعد ہے یعنی جو شخص ان حرام چیزوں میں سے کسی کے کھانے پر ایسی بھوک کی حالت میں مجبور ہو جائے جس کے باعث موت یا اس کے مبادی کا خوف ہو لیکن وہ گناہ کی طرف مائل ہونے والا اور اس کی جانب جھکنے والا نہ ہو اس طرح سے کہ اسے لذت حاصل کرنے کے لیے کھائے یا رخصت کی حد سے زیادہ کھائے یا کسی اور مجبور سے چھین کر کھائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا غیر باغ یعنی نہ وہ بغاوت کرنے والا اور نہ ہی حد سے تجاوز کرنے والا ہو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے یعنی اس کے کھانے کی بنا پر اس سے مواخذہ نہ فرمائے گا)

صفحہ ۳۹۱ فتاوی عالمگیریہ میں تحریر فرماتے ہیں

یجوز للعلیل شرب الدم والبول واکل المیتة للتداوی اذا أخبره طبیب مسلم ان شفاءه فیه و لم یجد من المباح ما یقوم مقامه و ان قال الطبیب یتعجل شفاء ک فیه و جهان[2]

---

[1] القرآن المجید : سورۃ المائدہ : آیت ۳،

[2] الفتاوی العالم گیریه : جلد ۵، صفحه ۳۵۵، مطبوعه مصر

☆ یعنی اگر طبیب یہ کہدے کہ یقیناً اس بیمار کو بغیر پیشاب پینے کے یا مردار کھانے کے کبھی شفاء نہ ہوگی اور کوئی ایسی مباح دواء نہیں رہی کہ جس سے امیدِ شفا ہو۔ تو اندریں صورت پیشاب پینا یا مردار کھانا بقدرِ دواء جائز ہے۔ اور اگر یہ کہے کہ شفاء کی اور بھی جائز دوا ہونے کی امید ہے مگر پیشاب اور مردار سے امید ہے جلد شفاء ہو جائے تو بموجب آیۃ مذکورہ صحیح روایت یہی ہے کہ جائز نہیں۔

خلاصہ یہ کہ اگر کسی ظالم سے خوف جان جانے کا یقینی ہو اور زبان سے کلمہ کفر کہہ دینے سے جان بچ جائے اور دل میں ایمان راسخ ہو تو کلمۂ کفر تک کہہ دینے کی قرآنِ مجید سے رخصت ثابت ہے چنانچہ سپارہ چار دھم بیسویں رکوع میں ہے۔

من کفر من بعد ایمانه الامن اکره و قلبه مطمئن بالایمان و لکن من شرح بالکفر صدراً فعلیهم غضب من الله ولهم عذاب عظیم [1]

(ترجمہ: جو شخص اپنے ایمان لانے کے بعد کافر ہو جائے مگر جس کو کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے لیکن اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو لیکن جس نے کھولا سینہ کفر کے ساتھ تو ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے غضب اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے)

اور صفحہ ۳۷۷ جلد سادس تفسیر ابو مسعود مذکور میں ہے تفسیر آیۃ مذکورہ میں

روی ان مسلیمة الکذاب اخذ رجلین فقا ل لاحدهما ما تقول فی محمد ﷺ قال رسول قال فما تقول فی قال فانت ایضا فخلاه وقال للاخر ما تقول فی محمد ﷺ قال رسول الله قال فما تقول فی قال أنا اصم فاعاد ثلاثا فاعا دجوابه فقتله فبلغ ذالک رسول الله صلی الله علیه و اله وصحبه و سلم فقال اماالاول فقد اخذ برخصة الله تعالی و اما الثانی فقد صدع بالحق [2]

---

[1] القرآن العظیم : سورة النحل ' آیت ۱۰۶

[2] تفسیر ابو سعود جلد صفحه مطبوعه

☆(ترجمہ: بیان کیا گیا ہے کہ مسیلمہ کذاب نے دو اہلِ ایمان مردوں کو پکڑا ایک سے کہا تو (حضرت) محمد (ﷺ) کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ اس نے جواب دیا وہ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر اس نے پوچھا تو میرے بارے میں کیا کہتا ہے۔ تو اس نے جواب دیا تو بھی۔ اس پر اس نے اسے چھوڑ دیا۔ دوسرے مسلمان سے پوچھا تو (حضرت) محمد مصطفیٰ (ﷺ) کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ اس نے جواب دیا وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اس پر اس نے کہا تو میرے بارے میں کیا کہتا ہے۔ تو اس نے جواب دیا میں گونگا ہوں۔ اس نے سوال کو تین بار دہرایا تو اس مسلمان نے اسی جواب کو دہرایا۔ لہٰذا اس نے اسے قتل کر دیا۔ یہ بات نبی اکرم ﷺ تک پہنچی تو فرمایا پہلے مسلمان نے رخصت کو اپنایا اور دوسرے نے حق کا اعلان کر دیا۔)

خلاصۂ مضمونِ آیۂ کریمہ اور حدیثِ مذکور یہ ہوا کہ بخوف جان بچانے کے واسطے ظالم سے کلمۂ کفر کہہ دینا تک جائز ہے۔ چنانچہ حدیثِ مذکورہ سے ثابت ہے کہ مسیلمہ کذاب کے خوف سے جن صحابی نے جان بچانے کے لیے زبان سے مسیلمہ کو کہہ دیا تھا کہ تو بھی رسول اللہ ہے اور دل سے اس کے منکر تھے ان کی نسبت حضور ﷺ نے بموجب حکمِ آیۂ کریمہ یہی فرمایا کہ انہوں نے اس امر پر عمل کیا جو ان کے لیے جائز تھا اور جنہوں نے جان دیدی اور شہید کر دیئے گئے مگر مسیلمہ کذاب کو رسول نہ کہا ان کی تعریف کی اور فرمایا جو عزیمت اور بڑے مرتبہ کی بات تھی انہوں نے اس کو اختیار کیا۔

علی ھذا القیاس جملہ فقہا خصوصا صاحب فتاوی عالمگیری تحریر فرماتے ہیں کہ اگر چہ ادنی توہینِ کلام اللہ کفر ہے یہاں تک کہ اگر کوئی دف کے ساتھ قرآن پڑھے یا قرآن کو بانگِ طوفان کہدے کافر ہو جائے گا۔ چنانچہ صفحہ ۲۹۴ جلد ثانی فتاوی عالمگیریہ میں ہے:۔

اذا قراء القران علی ضرب الدف و القصب فقد کفر رجل یقرء القران فقال رجل ایں چہ بانگِ طوفان است فھذا کفر کذا فی المحیط لو قال قرأت القران کثیرا فما رفعت الجنایة عنا یکفر کذا فی الخلاصة من قال بغیرہ قل ھو اللہ احد را پوست باز کر دی او قال الم نشرح را گریبان گرفته او قال لمن یقرء یٰس عند المریض یس در دھان

مر دہ منہ اوقال لغیرہ ای کوتاہ تراز انا اعطیناک الکوثر الخ کفر فی ھذہ الصور کلھا۔[1]

☆(ترجمہ: جب کوئی بانسری اور دف کی چوٹ پر قرآن پڑھے تو وہ کافر ہو جائے گا۔ ایک شخص قرآن پڑھ رہا تھا دوسرے نے کہا یہ کیا طوفان کی آواز ہے یہ کہنا کفر ہے۔ محیط میں اسی طرح ہے۔ اگر کسی نے کہا میں نے قرآن بہت پڑھا لیکن ہم سے جنابت نہ گئی تو اسے کافر قرار دیا جائے گا۔ خلاصہ میں اسی طرح ہے۔ کسی نے پوچھا کیا تو چھلکا اتار دیا تو اس نے کہا قل ھو اللہ احد یا کسی کا گریبان پکڑا اسے کہا الم نشرح یا کوئی مریض کے پاس سورۂ یٰس پڑھ رہا تھا تو اس نے کہا یٰس مردہ کے منہ میں نہ رکھو یا کسی کو کہا اے انا اعطیناک الکوثر سے چھوٹے تو ان سب صورتوں میں اسے کافر قرار دیا جائے گا۔)

چہ جائیکہ قرآن مجید کو پیشاب یا خون سے لکھنا اس کے کفر ہونے میں کون کلام کرسکتا ہے؟ مگر جیسے جان بچانے کی غرض سے موقعِ اکراہ میں کلمۂ کفر منہ سے مجبوراً کہہ دینا نصِ صریح قرآن اور حدیث سے جائز ہے ایسے ہی موقع پر جب انسان شدتِ مرض سے خواہ مرض نکسیر ہو یا کچھ اور عاجز آ جائے زیست سے بسبب شدتِ مرض نا امید ہو اور طبیبِ حاذق مسلمان متقی کے کہنے یہ یقین ہو جائے کہ بجز مردار کھانے یا پیشاب پینے کے اب کوئی دواء ایسی باقی نہیں رہی جس سے امیدِ صحت ہو مگر ان حرام دواؤں سے مجھ کو یقین ہے کہ انشاء اللہ شفا ہو جائے گی۔ اندریں صورت فقہا تحریر فرماتے ہیں اس مریضِ مضطر سے حکمِ حرمت اٹھ جاتا ہے۔ اور اس کو پیشاب وغیرہ کا بقدرِ دواء پینا جائز ہوگا۔ علیٰ ھذا البعض مقامات پر عالمگیریہ وغیرہ میں لکھ دیا ہے ایسے مریض نکسیر کو جس کا خون ٹھہرتا ہی نہیں اور اس کو خوفِ موت غالب ہو علیٰ ھذا اگر کسی دوسرے مریض کو خوفِ موت غالب ہو اور کسی ذریعہ سے اس کو یقین ہو جائے یا ظنِ غالب ہو کہ قرآن کو پیشانیِ مریض پر اس خون سے لکھا جائے تو قطعاً آرام ہوگا اگرچہ قرآن کا خون سے لکھنا یا پیشاب سے لکھنا کفر ہے مگر ایسی صورت میں جیسے اس کو کلمہ کفر کہہ دینا بموجب نص صریحِ کلام اللہ جائز ہے بغرض جان بچانے کے یہ فعلِ کفر یعنی بعض قرآن کا خون سے یا پیشاب سے لکھنا بھی اس کے حق میں جائز ہوگا۔ نعوذ باللہ منھا.

---

[1] الفتاوی العام گیریہ جلد ۲ صفحہ ۳۳۸ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت لبنان

اور جب ظاہر ہے کہ بوجہ کفر ہونے کے کوئی مسلمان ایسے عمل کا تجربہ نہیں کرسکتا جس میں قرآنِ مجید کی بے ادبی ہو۔ اور ایسے معاملات میں کافر کے کہنے کے اعتبار نہیں۔ تو لامحالہ یہ مسئلہ از قسم تعلیق بالمحال العادی ہوا جیسے کوئی کسی سائل سے کہے کہ اگر میں ھفت اقلیم کا بادشاہ ہو جاؤں تو تجھ کو اپنا سارا مال و متاع دیدوں۔ اس کہنے سے تمام اہل زبان جانتے ہیں کہ قائل کا یہی مقصود ہوتا ہے کہ نہ میں ھفت اقلیم کا بادشاہ ہوں نہ تجھ کو گھر بار دوں۔ چنانچہ سننے والا اس کلام کو سن کر فورا کہدیتا ہے کہ تم کو دینا ہی مقصود نہیں۔ علیٰ ھذا الفقہا کا شفاءِ یقینی پر اس عمل کا معلق کرنا دلیلِ صریح ہے کہ بیان اس حکم سے مقصودِ فقہاء بیانِ حرمتِ عملِ مذکور ہی نہیں ہے بلکہ بیان کرنا اس امر کا ہے کہ ایسے عمل کا کرنا کفر ہے۔ مگر جس موقع پر قرآنِ مجید سے کلمۂ کفر منہ سے کہہ دینے کی رخصت ہے اس عمل کی بھی رخصت ہے۔ اور اس طریق پر بیان کرنے سے اظہارِ عظمتِ جانِ انسان ہے نزدیک خالقِ انس و جان کے کہ جس کے بچانے کے واسطے بصورتِ یقین قرآن سے کلمہ کفر منہ سے کہہ دینا جائز ہے علیٰ ہذا فعلِ کفر مثل ایسے اعمال کے کرنا بھی اگر کسی ذریعہ سے یقین شفا ہو جائے جائز ہے۔ مگر ایسے اعمال پر یقینِ شفا ہونا ہی محال ہے۔ لہٰذا اسی غرض سے فتاوی عالمگیریہ میں مطلقا رقیہ اور داغ وغیرہ کے علاج کو اسبابِ مظنونہ سے بھی نہیں گنا بلکہ اسبابِ موھومہ سے شمار کیا ہے جن کا چھوڑ دینا بصورتِ جائزہ افضل لکھا ہے۔ چہ جائیکہ اندریں صورت ایسے اعمال کا کرنا جو سراسر کفر ہوں باوجود موھوم ہونے کے کب جائز ہو سکتے ہیں؟ اور ایسے موھوم امور عندالفقہاء کس طرح یقینی ہو سکتے ہیں؟ اللہ مسلمانوں کو سمجھ عطا فرمادے۔ شعر

چشمِ بداندیش بر کندہ باد کہ　　　عیب نما یدھنرش در نظر

(ترجمہ: ایسے بداندیش کی آنکھ نہ رہے جس کو ہنر بھی عیب نظر آئے)

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی
ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبرآباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر...... 261﴾

سوال

یہاں پر اطراف و جوانب میں طاعون شروع ہو رہا ہے۔ ایسی حالت میں اصلی مقام کو چھوڑ کر شہر سے باہر بوجہ وحشت عیال واطفال یا دیگر مواضع میں جانا شرعاً درست ہے کہ نہیں ہے؟ اور ڈاکٹر حکما کہتے ہیں کہ یہ ایک قسم کے پسو ہیں۔ اول چوہوں میں یہ مرض پیدا ہوتا ہے۔ جب یہ حالت ہو تو مکان کو چھوڑ دینا چاہئے اور اسباب میں آگ لگا دی جائے یا کہ دیگ میں جوش دے دیئے جائیں۔ اور ایسے مریض سے نہ ملنا چاہئے تو کیا اہلِ اسلام کو (یہ) سب کرنا شرعاً درست ہے کہ نہیں؟ اور حضور مقبول ﷺ نے اس کی کیا اصلیت ظاہر فرمائی ہے؟ اور ایسی اموات والے شہید کہلاویں گے یا کیا؟

۱۷ رمضان ۱۳۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

حضور سرورِ عالم علیہ السلام فرماتے ہیں:

لا عدوی و لا طیرة[i]

ترجمہ: کسی کا مرض خواہ وہ طاعون ہو یا چیچک' خواہ ہیضہ' خواہ (کوئی اور) کسی کو اور نہیں لگتا اور بدشگونی کوئی چیز نہیں۔

اور دوسری حدیث میں وارد ہے کہ حضور سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا کہ:

خارش زدہ اونٹ کو تندرست اونٹ کے پاس نہ لاؤ۔

---

[i] i. الجامع الصغیر مع فیض القدیر : جلد ٦ صفحہ ٤٣٦ دار المعرفہ بیروت
بحوالہ مسند احمد وصحیح مسلم

ii. مشکوۃ المصابیح : صفحہ ۳۹۱ بحوالہ بخاری

اس قسم کی تمام احادیث نقل کر کے علامہ طحاوی صفحہ ۳۸۰ جلد دوم کتاب الکراھیۃ میں تحریر فرماتے ہیں:

فثبت بذلک ان الخروج من الارض التی وقع بھا الطاعون مکروہ للفرار منہ و مباح لغیر الفرار [۱]

ترجمہ: ان تمام احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر خوفِ طاعون سے یہ سمجھ کر کہ اگر یہاں رہوں گا ضرور اڑ کر لگ جائے گی کہیں دوسری جگہ بھاگ جائے مکروہ یعنی مکروہ تحریمہ ہے۔☆ اور اگر بوجہ وحشتِ کثرتِ اموات اور پریشانی کے لوگوں کو پریشان دیکھ کر اور یہ یقین کر کے کہ بغرضِ دفعِ وحشت جاتا ہوں ورنہ یقیناً موت یہاں چھوڑے اور نہ وہاں چھوڑے اور قبل الوقت کچھ نہیں ہوتا تو مضائقہ نہیں۔

یہی مضمون امام غزالی رحمہ اللہ احیاء العلوم میں تحریر فرماتے ہیں اور اس کی تائید فرماتے ہیں علامہ زبیدی حنفی شارح احیاء العلوم شرح احیاء مسمی بہ اتحاف السادۃ المتقین کی جلد تاسع صفحہ ۲۶۹ میں۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ مقصودِ ممانعت یہ ہے کہ تندرست مریضوں کو تنہا چھوڑ کر کہیں نہ بھاگ جائیں۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ
ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی المفتی
فی جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[۱] شرح معانی الآثار: جلد ۲، صفحہ ۴۱۸، مطبوعہ سعید کمپنی کراچی

﴿فتویٰ نمبر......262﴾

سوال

شرح وقایہ، درِمختار، مشکوٰۃ شریف وغیرہ ترجمہ اردو جس میں کہ مغالطہ نہ ہو کس مطبع اور پتہ سے طلب کی جائے۔

۱۷رمضان ۱۳۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مالا بدمنہ مسائل ضروری کے واسطے عمدہ کتاب ہے۔ مظاہرِ حق شرح مشکوٰۃ اور غایۃ الاوطار ترجمہ درِ مختار اچھی کتابیں ہیں۔ مگر ان کے مصنفین میں کسی قدر وہابیت تھی۔ لہٰذا ایسے مقامات خود کھٹک جاتے ہیں۔ ان پر عمل نہ کرے ☆ اور بہتر یہی ہے کہ اگر فارسی کی لیاقت ہو اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ اور تفسیر عزیزی فارسی کا' مجبوراً اردو کا مطالعہ کیا جائے

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ

ابو محمد محمد دیدار علی المفتی فی جامع اکبر آباد

۱۷رمضان ۱۳۳۶ھ

✿✿✿✿✿

میراث

﴿فتویٰ نمبر......263﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کہ زید نے اپنی بیوی کو جس کا مہر بتیس (۳۲) روپیہ تھا جو مہر شرع محمدی مشہور ہے ایک مکان قیمتی تخمینا چھ سو روپیہ کا جو ملکِ زید تھا' اس غرض سے دے دیا' کہ میرے بعد کبھی میرا بیٹا جو دوسری بیوی سے ہو اس کو نہ نکال دے اور اس کے نام ہبہ نامہ لکھ دیا۔ اور کہہ دیا کہ یہ تیرے مہر میں میں دیتا ہوں۔ اور پھر دونوں میاں بیوی اس مکان میں رہتے رہے جیسے قدیم سے رہتے تھے۔ زید مر گیا اور اس نے یہ ورثہ چھوڑے۔ زوجہ اور دو لڑکی اور ایک لڑکا دوسری بیوی سے اور ایک ماموں زاد بھائی۔ پھر زوجۂ زید جو نو مسلمہ تھی لاولد مر گئی اور کوئی وارث نہیں چھوڑا سوا شوہر کی اولاد کے جو دوسری بیوی سے تھی۔ اور وقتِ مرگ زید سے وہی لڑکے مع زوجہ زید کے اس مکان پر بدستورِ سابق اب تک قابض ہیں اندریں صورت اس مکان کا کون مستحق ہے؟ بینوا توجروا.

۲۸ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما.

صورتِ مسئولہ میں زید نے مکان قیمتی چھ سو روپیہ کا جو اپنی زوجہ کو بعوض مہر کے جو مبلغ بتیس (۳۲) تھا ھبہ کیا تھا۔ نہ تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ کہہ کر دیا ہے کہ اب تیرا مہر بجائے بتیس چھ سو روپیہ کا زائد فی المہر کر کے دیتا ہوں' نہ یہ صراحتا مفہوم ہوتا ہے کہ ہبہ ہی کیا ہے۔ مگر بہر نہج اگر زید کی غرض اس سے یہی تسلیم کر لی جائے کہ مہر زیادہ کر کے مہر میں دیا ہے' تو زوجہ ء زید سے قبولیت زیادتی کی تصریح نہیں پائی جاتی لہٰذا یہ زیادتی صحیح نہیں ہوئی۔

کما فی الدر المختار:

او زید علی ما سمی فانها تلزمه بشرط قبولها فی المجلس[1]

☆(ترجمہ: مقرر شدہ مہر سے زائد کر دیا جائے' تو وہ زیادتی خاوند کے ذمہ لازم ہو جاتی ہے' بشرطیکہ بیوی اس زیادتی کو مجلس کے اندر قبول کر لے)

قال الشامی رحمہ اللہ:

فانه(الی الزیادة فی المهر) یصح ان قبلت فی مجلس الاقرار[2]

(ترجمہ: کیونکہ مہر میں وہ اضافہ صحیح ہے بشرطیکہ خاوند کی طرف سے زیادتی کے اقرار کی مجلس میں بیوی اس اضافہ کو قبول کر لے)

و فی الخانیة المصریة فی صفحة ۳۴۷ من الجزء الاول

ان الزیادة فی المهر لا یصح من غیر قبول المرأة[3]

(ترجمہ: مہر میں اضافہ بیوی کے قبول کرنے کے بغیر صحیح نہیں)

علاوہ بریں تحریرِ زوج سے قصدِ زیادتی فی المہر مفہوم نہیں ہوتا بلکہ مصلحتاً بخوف اپنے بیٹوں کے اگر غور کیا جاتا ہے تو یہی سمجھتا جاتا ہے کہ اپنی زوجہ کے نام اس واسطے ہبہ نامہ لکھا ہے کہ میرے بعد میرے بیٹے اس کو میرے گھر سے نکال نہ دیں کما هو ظاهر من صورة السوال.

(ترجمہ: جس طرح کہ صورت سوال سے ظاہر ہے)

اور مہر کے زائد کرنے میں بموجبِ روایاتِ بزازیہ عندالهبة قصدِ زیارت صحتِ زیارت فی المہر میں زوج کی جانب سے ضروری ہے۔

کما هو فی الدر المختار:

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۴ صفحہ ۱۸۰ دار احیاء التراث العربی بیروت

[2] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۴ صفحہ ۱۸۰ دار احیاء التراث العربی بیروت

[3] فتاوی قاضی خان : جلد اول صفحہ ۱۷۵ بلوچستان بک ڈپو کوئٹہ

و فی البزازیة الاشبه ان لاتصح (ای الزیادة فی المھر) ولا تجعل زیادة بلا قصد الزیادة[1]

(ترجمہ: اشبہ یہ ہے کہ عورت کے قبول کے بغیر مہر میں اضافہ صحیح نہیں ہے۔ نیز مہر میں اضافہ خاوند کی طرف سے اضافہ کے قصد کے بغیر نہیں کیا جائے گا)

اور بسبب نہ رکھنے زوجہ زید کے صورتِ مذکورہ میں کوئی وارث اسی روایت پر فتوی دینا انسب۔ اور جب ثابت ہوگیا کہ ہبہ مکان صورتِ مسئولہ میں زیادت فی المہر نہیں ہے تو ہبہ مکان ہبہ خالص رہ گیا۔☆ مگر ہبہ اس وجہ سے صحیح نہیں ہوا کہ صحتِ ہبہ میں موہوب لہ کا قبضہ کامل کر لینا مکانِ موہوبہ پر شرط تھا۔ اور صورتِ مسئولہ میں شوہر یعنی زید واہبِ مکان بدستور اسی مکانِ موہوبہ میں مع سامان تا بمرگ رہتا رہا اور اب تک حسبِ دستورِ سابق وہی لڑکے مع زوجہء زید اس پر قابض ہیں۔

اور صفحہ ۵۶۹ درمختار میں ہے

و هبة المشغول لا تجوز[2]

(ترجمہ: مشغول چیز کا ہبہ درست نہیں ہے)

لہٰذا چونکہ مکانِ موہوبہ سے بوجہ عدمِ صحتِ ہبہ ملکِ زید سے نہیں گیا اور بدستور زید ہی مالک مکان رہا۔ مکانِ مذکور ورثۂ زید پر اس طرح تقسیم کیا جائے گا کہ بعد ادائے دینِ مہرِ زوجہء زید کے بتیس روپیہ مہر کے اور مصارفِ تجہیز و تکفین وغیرہ کل مال زید کے بتیس (۳۲) حصہ کر کے چار حصہ زوجہء زید کو اور سات سات حصہ زید کے دونوں بیٹیوں کو اور چودہ حصہ پسر زید کو دے دیئے جائیں گے اور بعد انتقالِ زوجۂ زید چونکہ زوجہء زید لاولد اور لاوارث محض ہے نہ کسی کو کچھ وصیت کر کے مری ہے لہٰذا اس مال کے مستحق وہ محتاج مسلمان ہیں جو محنت مزدوری کرنے سے اور کمانے سے عاجز ہیں۔

---

[1] (i) البزازیه علی هامش الهندیة: صفحه ۱۳۳ مطبوعه مصر
(ii) الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۴ صفحه ۱۸۲، مطبوعه دار احیاء التراث العربی بیروت

[2] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۸ صفحه ۵ دار احیاء التراث العربی بیروتز

کما فی دلیل الورّاث نقلا عن ردالمحتار:

و حاصله ان مصرفه (ای مصرف الترکة التی لاوارث لها) الفقراء العاجزون[1]

☆(ترجمہ: خلاصۂ بحث یہ ہے کہ ایسا ترکہ جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا مصرف وہ فقراء ہیں جو عاجز ہوں)

اور اگر اس کے شوہرِ متوفی کے عزیزوں میں اس طرح کے فقراء ہوں تو بہ نسبت غیروں کے بوجہ رکھنے علاقۂ قرابت فی الجملہ اس کے مصرف قرار دیئے جائیں انسب ہے۔ فقط

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی مفتی

جامع مسجد اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[1] i. دلیل الوارث حاشیه السراجی — صفحه ۵ — مکتبه امدادیه ملتان

ii. رد المحتار: — جلد ۳: صفحه ۲۵۶ — دار احیاء التراث العربی

نوٹ: رد المحتار میں "العاجزون" کا لفظ "الفقراء" سے مقدم ہے۔

﴿فتویٰ نمبر......264﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص حافظ عبدالرحیم نامی نے اپنے مرنے سے تین سال پہلے اپنی املاک از قسمِ مکانات اپنے ایک نابالغ لڑکے اور دو نابالغ پوتوں کے نام لکھوا کر رجسٹری کر دیا اور تا مرگ املاک پر اپنا قبضہ رکھا ہبہ نامہ کی خبر اپنی زندگی میں وارثوں کو نہ ہونے دی۔ اب وہ شخص فوت ہو گیا تو بڑے لڑکے نے ہبہ نامہ ظاہر کیا۔ پس مرنے والے کے حقیقی وارث حسبِ ذیل ہبہ نامہ کرنے پر حصۂ ترکہ پا سکتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر ان وارثوں کا حق ہے تو فی ہزار ایک فرد کو کیا ملنا چاہئے؟ اور مرنے والے نے جو کیا وہ کیسا؟۔ بینوا توجروا

مرنے والے کی حقیقی وارث

دو لڑکے یعنی ایک بڑا لڑکا (پوتوں کا باپ) ایک نابالغ لڑکا مذکورہ بالا دو لڑکیاں شادی شدہ شوہر والی' ایک بیوی۔

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

☆ صورتِ مسئولہ میں اسی طرح ہبہ کرنا کہ بعض ورثہ کو جائداد سے بالکل محروم کر دیا جائے حرام تو نہیں مگر مکروہ اور ظلم بلاشبہ ہے چنانچہ صفحہ ۲۶۱ حاشیہ مشکوۃ شریف میں طیبی شرح مشکوۃ سے منقول ہے

ولو وھب لبعضھم ای بعض الاولاد دون بعض فمذھب الشافعی و مالک و ابی حنیفة رحمھم اللہ انه مکروہ و لیس بحرام والھبة صحیحة[1]

---

[1] i. حاشیہ مشکوۃ المصابیح صفحہ ۲۶۱ مکتبہ امدادیہ ملتان

ii. شرح الطیبی جلد ۷ صفحہ ۲۲۲۸ مکتبہ نزار مصطفی الباز مکة المکرمه

(ترجمہ: اگر کسی شخص نے اپنی بعض اولاد کو کوئی چیز ہبہ کی اور بعض کو نظر انداز کردیا تو اس بارے میں امام شافعیؒ امام مالک اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہم کا مذہب یہ ہے کہ ایسا کرنا مکروہ ہے۔ حرام نہیں اور ہبہ درست ہے)

☆ مگر تکمیلِ ھبہ میں چونکہ موھوب لہ کا قبضہ شئی موہبہ پر شرط ہے☆ اور نابالغ بچوں پر جب ہبہ کیا جائے ان کے اس ولیِ اقرب یا ابعد یعنی نزدیکی رشتہ دار جیسے باپ یا دور کے رشتہ دار جیسے ماں بھائی وغیرہ کا قبضہ قائم مقام قبضہ ان نابالغ بچوں کے جن پر ہبہ کیا گیا ہے شرعاً قرار پایا ہے۔ بصورت ہونے اس ولی کے متکفلِ پرورش ان نابالغوں کا جن پر اس نے ہبہ کیا ہے ہبہ تمام ہوگیا۔ کما فی الفتاوی العالمگیریة

و لو كان الصغير فی عيال الجداو الاخ اوالام او العم فوهب له هبة فقبض الهبة من كان الصغير فی عياله والاب حاضر اختلف المشائخ فيه والصحيح الجواز هكذا فی فتاوی قاضی خان وبه يفتی هكذا فی فتاوی الصغری [1] فقط

(ترجمہ: اگر نابالغ، دادا یا بھائی یا ماں یا چچا کی کفالت میں ہو اسے کوئی چیز ہبہ کی گئی تو اس نے اس پر قبضہ کیا جس کی کفالت میں وہ نابالغ ہے اور باپ حاضر ہے اس ہبہ کے مکمل ہونے میں مشائخ کرام کا اختلاف ہے صحیح یہ ہے کہ جائز ہے فتاوی قاضی خان۔ اسی پر فتوی ہے فتاوی صغری۔)

وايضا فيه وهبة الاب لطفله تتم بالعقد ولا فرق فی ذلك بينما اذا كان فی يده اوفی مودعه.... وكذا لو وهبته امه و هو فی يدها والاب ميت وليس له وصی وكذا كل من يعوله كذا فی التبين وهكذا فی الكافی [2]

☆(ترجمہ: باپ اپنے نابالغ بچے کو ہبہ کرے تو وہ عقد کے ساتھ کامل ہوجاتا ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں خواہ وہ شے اس کے باپ کے قبضہ میں ہو یا اس شے کو اپنے پاس ودیعت رکھنے والے کے پاس ہو۔۔۔۔ اور اسی طرح اگر ماں نے اپنے نابالغ بچے کو ہبہ کیا اور وہ شے اس کے قبضہ میں ہے اور باپ مرچکا ہے نیز اس کا وصی بھی کوئی نہیں۔ اور یہی حکم اس شخص کے لیے ہے جو اس بچے کی کفالت کررہا ہے۔ تبیین۔ کافی)

---

[1] الفتاوی العالمگیریہ : جلد ۴ صفحہ ۳۹۳ مطبوعہ مصر

[2] الفتاوی عالم گیریہ جلد ۴ صفحہ ۳۹۱ مطبوعہ مصر

لہٰذا ہبہ پدر واہب ان نابالغوں پر جن کا پرورش کنندہ بھی باپ ہی تھا شرعاً صحیح اور تمام ہوگیا۔ اب بعد مرگِ واہب شئ موھوب میں کسی وارث کا حق نہیں۔ جملہ مالِ موھوب کے وہی نابالغ مالک ہیں جن پر واھب ہبہ کرگیا۔

البتہ اگر باپ جس نے ان نابالغ بیٹے پوتوں پر ھبہ کیا ہے ان نابالغوں کی پرورش سے بالکل دست بردار تھا اور ان کی پرورش علاوہ باپ کے جس نے ان پر ہبہ کیا ہے اور کوئی آدمی پرورش کرتا تھا تو بلاشبہ وہ ھبہ ناتمام سمجھا جائے گا۔ اور ورثہ اس کے بعد ماتقدم علی الارث سے اس قدر حقوق کے مستحق ہوں گے کہ کل مال میت کے اڑتالیس حصے کر کے چھ حصے تو اس کی زوجہ کو دیئے جائیں گے اور چودہ چودہ حصے بیٹوں کو اور سات سات حصے بیٹیوں کو مگر ظاہر حال سوال سے یہ بات بہت بعید ہے کہ ان کے نام ہبہ تو کرگیا ہے اور ان کی پرورش سے غافل رہا۔ھو صورتہ

زید مسئلہ ۴۸

میت

زوجہ	ابن کلاں	ابن خورد	بنت خانم	بنت بیگم
مریم	حبیب	عمر	۷	۷
۱/۶	۱۴	۱۴		

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی الرضوی
مفتی جامع مسجد اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......265﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید فوت ہو گیا۔ اس نے اپنا وارث اپنی زوجہ کو اور اپنے ماموں زاد بھائی کو جس کو زید نے مثل اپنی اولاد کے پرورش کیا تھا چھوڑا۔ اور زید چونکہ لاولد ہے اس لئے ماموں زاد بھائی کے لڑکے کو متبنیٰ کر لیا تھا۔ جب کہ زید بیمار ہوا اور اس کو اپنی زندگی سے مایوسی ہوئی تو اس نے ایک وصیت نامہ بنام اپنے ماموں زاد بھائی کے اس مضمون کا لکھا کہ میرا مکانِ سکونت اور تمام جائدادِ منقولہ وغیر منقولہ کا مالک وقابض میرا ماموں زاد بھائی ہے۔ اور بحالتِ شمولِ خورد ونوش وغیرہ کے میری زوجہ کے اخراجات کے کفیل و ذمہ دار میرے ماموں زاد بھائی ہوں گے۔ اور اگر میری زوجہ علیحدہ رہنا چاہے تو صرف چار روپیہ ماہواری میرے ماموں زاد بھائی دیا کریں گے۔ اور اگر میری زوجہ باعفت وعصمت نہ رہے تو میری زوجہ کے اخراجات کے کفیل و ذمہ دار نہ ہوں گے۔ اور زوجہ کے عقد ثانی کرنے کی حالت میں کس قدر شرعی حصہ پانے کی مستحق ہے؟ اور ماموں زاد بھائی اور متبنیٰ کو کس قدر شرعی حصہ ملے گا؟ بینوا وتوجروا

سائل: فقیر محمد مندوی سمید خان آگرہ

۲۷ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں کل مالِ زید سے چوتھائی یعنی چہارم حصہ زوجہ زید کو ملے گا۔ لقولہ تعالیٰ

و لھن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد[1]

---

[1] القرآن الحکیم: سورہ النساء: آیت نمبر ۱۲

(ترجمہ: اور (تمہاری) بیویوں کے لیے تمہاری چھوڑی ہوئی میراث سے چوتھائی حصہ ہے اگر تمہاری اولاد ہو)

اور باقی تین ربع زید کے ماموں زاد بھائی کو ملیں گے، بوجہ نہ ہونے ذوی الفروض نسبیہ وعصبات کے اور ہونے ماموں زاد بھائی کے ذوی الارحام سے۔

کما فی الشامی فی صفحة ۴۵۰ من الجزء الخامس:

قوله ذوی الارحام ای یبدا بهم عند عدم ذوی الفروض النسبیه و العصبات فیاخذون کل المال و ما بقی عن احد الزوجین لعدم الرد علیهما[1]۔

☆ (ترجمہ: قولہ: ذوی الارحام، یعنی اگر نسبی ذوالفروض اور عصبات سے کوئی وارث موجود نہ ہو، تو ذووالارحام سارے کا سارا ترکہ یا میاں بیوی میں ایک سے جو بچ جائے وہ حصہ لے لے گا۔ کیونکہ حصوں سے باقی ماندہ مال میاں بیوی کی طرف لوٹ کر نہیں آتا)

اور چونکہ صورتِ مسئولہ میں ماموں زاد بھائی مستحق میراث ہو کر داخل ورثہ ہو گیا لہٰذا بموجب حدیث صحیح

الا لاوصیة لوارث[2]

☆ (ترجمہ: خبردار وارث کے لیے وصیت باطل ہے)

اب اس کے حق میں وصیت نامہ زید نافذ نہیں ہو سکتا۔ **کما هو ظاهر من الشامی حیث قال المولی ابن عابدین رحمة الله علیه فی صفحة ۴۵۹ رد المحتار المصری**

(قوله و کونه غیر وارث وقت الموت) ای لا وقت الوصیة حتی لوا وصی لاخیه و هو وارث ثم ولدله ابن صحت الوصیة للاخ و لواوصی لاخیه و له ابن ثم مات الابن قبل

---

[1] رد المحتار: جلد ۱۰: صفحه ۴۱۵، دار احیاء التراث العربی بیروت.

[2] ۱. سنن ابی دائود: صفحه ۴۱۷ حدیث رقم ۲۸۷۰، مطبوعه دار السلام للنشر والتوزیع ریاض
۲. جامع الترمذی: صفحه ۴۸۶ حدیث رقم ۲۱۲۰ ایضا
۳. سنن النسائی: صفحه ۵۱۵ حدیث رقم ۳۶۷۱، ۳۶۷۳
۴. سنن ابن ماجه: صفحه ۳۹۱ حدیث رقم ۲۷۱۳، ۲۷۱۴، ایضا

فوت الموصی بطلت الوصیة زیلعی[1]۔

☆ (ترجمہ: قولہ: کسی کے لیے وصیت تب جائز ہوگی جب وہ وصیت کنندہ کی موت کے وقت وارث نہ ہو۔ یعنی وصیت کے وقت وارث ہونے سے وصیت کی درستی میں فرق نہیں آتا۔ حتی کہ اگر کسی نے بھائی کے لیے وصیت کی جب کہ وہ وارث تھا۔ پھر وصیت کنندہ کے ہاں لڑکا پیدا ہوگا' تو اب بھائی کے لیے وصیت درست ہے۔ اور اگر اپنے بھائی کے لیے اس وقت وصیت کی جب کہ وصیت کنندہ کا بیٹا تھا' پھر وصیت کنندہ کے مرنے سے پہلے بیٹا فوت ہوگیا' تو اب وصیت باطل ہے۔)

☆ اور متبنی بنا لینے سے متبنی مستحقِ میراث نہیں ہوسکتا۔ اس واسطے کہ گود لینے اور بیٹا بنا لینے سے کوئی کسی کا شرعاً نہ بیٹا بن سکتا ہے اور نہ بوجہ متبنی کے کسی کی میراث لے سکتا ہے۔

لانہ قال جل مجدہ فی کتابہ القدیم واجب التعظیم و التکریم فی سورۃ الاحزاب.

(ترجمہ: کیونکہ اللہ تعالی نے اپنی واجب التعظیم والتکریم کتاب کی سورۂ احزاب میں فرمایا)

و ما جعل ادعیائکم ابناء کم ذلکم قولکم بافواھکم[2]

(ترجمہ: تمہارے متبنی تمہارے حقیقی بیٹے نہیں ہیں۔ یہ تمہارے مونہوں کی باتیں ہیں۔)

و اخرج ابن ابی داؤد بسندہ عن عائشة زوج النبی ﷺ وام سلمة ان ابا حذیفة بن عتبة بن ربیعة بن عبد شمس کا ن یتبنی سالما و الکحه ابنة اخیه ھندة بنت الولید بن عتبة بن ربیعة و ھو مولی لامراۃ من الانصار کما یتبنی رسو ل اللہ ﷺ زیدا و کان من یتبنی رجلا فی الجاھلیة دعاہ الناس ابنه و ورث میراثه حتی انزل اللہ عزوجل فی ذلک ادعوھم لآبائھم الی قوله فاخوانکم فی الدین و موالیکم فردوا الی اٰبائھم فمن لم یعلم له

---

[1] رد المحتار: جلد ۱۰: صفحہ ۲۷۷' دار احیاء التراث العربی بیروت.

[2] القرآن الحکیم: سورۂ احزاب آیت نمبر ۴

اب کان مولی و اخا فی الدین۱ ۔

(ترجمہ: امام ابن ابی داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ بن عبدشمس رضی اللہ عنہ نے حضرت سالم رضی اللہ عنہ کو متبنیٰ بنالیا تھا اور اپنی بھتیجی ہندہ بنت ولید بن عتبہ بن ربیعہ سے ان کا نکاح کر دیا تھا۔ اور وہ انصار میں سے ایک عورت کے آزاد کردہ غلام تھے۔ جس طرح حضور نبی پاک ﷺ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو اپنا متبنیٰ بنالیا تھا۔ جاہلیت کا یہ دستور تھا کہ جو شخص کسی کو اپنا متبنیٰ بنالیتا لوگ اسے اس کا بیٹا کہہ کر پکارتے تھے۔ اور وہ اس کی میراث کا وارث بنتا تھا۔ یہاں کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

ادعوھم لآبائھم. الی قولہ. فاخوانکم فی الدین وموالیکم

اس پر لوگوں نے ان کو دوبارہ باپوں کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیا اور جس کے باپ کا علم نہ ہوتا وہ متبنیٰ بنانے والے کا مولیٰ اور دینی بھائی قرار پاجاتا۔ فقط

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی
ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
جامع مسجد اکبرآباد

❁❁❁❁❁

---

۱ الدر المنثور فی التفسیر بالماثور : جلد ۵ صفحہ ۱۸۱ دار المعرفہ بیروت

نوٹ: امام سیوطی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو عبدالرزاق، ابن منذر، ابن ابی حاتم، طبرانی ابن مردویہ کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے۔ لیکن مخطوط میں ابن ابی داؤد کے حوالہ سے ہے۔ سنن ابی داؤد میں یہ حدیث نہیں مل سکی۔ مرتب عفی عنہ

﴿فتویٰ نمبر......266﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ مریم نے وقتِ انتقال یہ وصیت کی کہ میرا اس قدر مال یعنی زیور میرے بعد میرے بیٹے خالد کی جب شادی ہو جائے اس کی بیوی کو دے دینا۔ اور مریم کو اس کا شوہر جو نان ونفقہ وسعت کے ساتھ دیتا تھا۔ اس سے بھی مریم نے کچھ پس انداز رکھا تھا۔ مگر مہر کے نام سے شوہر سے کچھ وصول نہیں ہوا۔ اور مریم کچھ لوگوں کے ذمہ قرض بھی چھوڑ مری تھی۔ مگر ان کو بلا رضا دیگر ورثا شوہرِ مریم نے معاف کر دیا۔ اور تجہیز و تکفین مریم کے مصارف شوہرِ مریم نے بلا درخواستِ ورثہ اپنے ذمہ لے لئے۔ اور اس کا کل مال برضامندیِ شوہر میرے پاس' چونکہ میں مریم کا باپ ہوں' موجود ہے۔ مگر شوہرِ مریم کہتا ہے کہ کل مالِ مریم ایک مسجد میں جو بالفعل زیرِ تعمیر ہے لگا دو ورنہ میں دوسری جگہ لگا دوں گا۔ حالانکہ مریم اتنے ورثہ چھوڑ کر مری ہے۔ شوہر زید' پدر شمس الدین' مادر زینب' ابن خالد جس کی عمر تقریباً ڈھائی برس کی ہے اور اس کو ہم نانا ماموں پرورش کر رہے ہیں۔ اس صورت میں جیسا حکم ویسا کیا جائے۔ بینوا وتوجروا

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

☆ صورتِ مسئولہ میں اگر خالد کی منگنی مریم کی وصیت کرنے کے وقت ہو چکی تھی تو وصیتِ مریم زوجۂ خالد کے واسطے تہائی کل مالِ متروکہء مریم میں نافذ ہو جائے گی۔ اس تہائی کو کوئی وارث لے کر خرچ نہیں کر سکتا۔ اور اگر منگنی نہیں ہوئی تھی اور موصی لہا زوجۂ خالد مجہولہ تھی بلکہ معدومہ' اس طرح کہ خالد کی ابھی کسی وجہ سے مثلاً شادی ہی نہ ہو اور ہو' تو کس سے ہو' کہاں ہو' وہ وصیت قطعاً نافذ نہ ہوگی۔ ☆ اس واسطے کہ نفاذِ وصیت میں موصی لہ کا معلوم ہونا بھی شرطِ نفاذ ہے۔

چنانچہ صفحہ ۴۵۹ جلد خامس کتاب الوصایا درِمختار میں ہے:۔

وهل يشترط كونه (اى الموصى له) معلوما قلت نعم كما ذكره ابن سلطان وغيره

فی الباب الآتی[۱]۔

(ترجمہ: کیا جس کے لیے وصیت کی جائے اس کا معلوم ہونا شرط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہاں جیسا کہ علامہ ابن سلطان اور دوسرے علماء نے آئندہ باب میں بیان فرمایا ہے)

لہٰذا کل مال مریم بلا نفاذِ وصیت جملہ ورثا میں تقسیم ہوگا۔ اور مہرِ مریم اگر شوہر نے ادا نہیں کیا تھا' وہ بھی ہمراہ کل مالِ مریم کے ورثہ میں تقسیم ہوگا۔ اور کل ورثہ کو حق ہے کہ بقدر اپنے اپنے حصہ کے مہرِ مریم کو شوہرِ مریم سے جب چاہیں وصول کرلیں۔ چنانچہ کتاب المداینات صفحہ ۲۲۲ جلد دوم العقود الدرایۃ میں ہے۔

ماتت المرأة والمهر على الزوج فاجله سائر الورثة شهرا فلهم ان يطالبوه قبل شهر الجواب نعم[۲]۔

☆ (ترجمہ: عورت مرگئی۔ مہر ابھی خاوند کے ذمہ ہے تو تمام ورثہ نے اسے ایک ماہ کی مہلت دے دی۔ تو کیا ان کو حق حاصل ہے کہ وہ مہینہ ختم ہونے سے پہلے اس سے مطالبہ کریں؟ جواب: ہاں)

☆ ہاں البتہ بلا اجازتِ شوہر علاوہ حقِ نان ونفقہ وضروریات اگر مریم نے مالِ زوج سے چرا کرلیا تھا اور یقیناً زوج کو معلوم ہوجائے تو اس کو شوہر مہر میں محسوب کرسکتا ہے۔

☆ اور جب مصارفِ تجہیز وتکفینِ مریم کو بلا درخواست کسی وارث' شوہرِ مریم نے اپنے ذمہ لے لیا' تو اب اس کو مالِ مریم سے وضع نہیں کرسکتا۔ اور وہ تبرعا سمجھا جائے گا۔

چنانچہ صفحہ ۲۲۶ جزو ثانی عقود الدریہ فی تنقیح فتاوی حامدیہ میں ہے:

و فی العمادية من احكام السفل و العلو المتبرع لا يرجع بما تبرع به على غيره كما لوقضى دين غير بغير امره[۳]

(ترجمہ: فتاوی عمادیہ کے احکام السفل والعلو میں ہے کہ اپنی خوشی سے کسی کو کوئی چیز دینے والا دی ہوئی

---

[۱] الدر المختار مع رد المحتار : جلد ۱۰ : صفحه ۲۷۷، ۲۷۸ مطبوعه دار احياء التراث العربی بيروت

[۲] تنقيح الفتاوى الحامديه : جلد ۲ : صفحه مطبوعه

[۳] تنقيح الفتاو الحامديه : جلد ۲ : صفحه مطبوعه

چیز کو واپس نہیں لے سکتا' جیسا کہ کسی پر قرض ہو اس کے حکم کے بغیر وہ قرض ادا کر دے۔)

لہٰذا کل مالِ متروکہ مریم معہ مہر کے بلا وضع مصارف تجہیز و تکفین اور بلا نفاذِ وصیت بصورتِ ثانی اور بعد نفاذِ وصیت اور جدا کر لینے تہائی کے کل مالِ مریم سے باقی مالِ مریم بصورتِ اول اس طرح تقسیم ہوگا کہ کل مالِ مریم کے بارہ حصہ کریں اس میں سے تین حصہ شوہرِ مریم مسمی زید کو دیئے جائیں گے۔ ان تین حصوں کا شوہر مریم کو اختیار ہے۔ بناءِ مسجد میں خرچ کرے۔ خواہ اپنے خرچ میں لائے۔ باقی دو حصہ شمس الدین مریم کے باپ کو اور دو حصہ زینب ام مریم کو پانچ حصہ خالد طفل نابالغ مریم کو جن کو تاوقت بلوغ خالد کہیں صرف نہیں کر سکتا نہ مسجد میں نہ کہیں اور۔ پرورش خالد کے مصارف زید والد خالد کے ذمہ ہیں۔ البتہ مریم کے ماں باپ کو اپنے دو دو حصوں کا مثل زید کے اختیار حاصل ہے۔ جہاں بھی چاہیں خرچ کریں۔ خواہ اپنے خرچ میں لائیں۔

مریم بنت شمس الدین مسئلہ ۱۲

میت

زوج	اب	ام	ابن	اخ	اخت	اخت
زید	شمس الدین	زینب	خالد	م	م	م
۳	۲	۲	۵			

اور موجودگی ابنِ مریم کے بہن بھائی کو کچھ نہیں ملے گا اور سوتیلی ساس اور نندوں کو شرعاً کچھ نہیں ملتا۔ اور جس کے ذمہ مریم نے کچھ قرض چھوڑا تھا اس میں بھی بموجب اپنے اپنے حصہ کے سب حقدار شریک ہیں۔ مجرد شوہر کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہو سکتا۔ مگر اس وقت معاف ہو سکتا ہے کہ شوہرِ مریم بقدر حصہ ورثہ کو اپنے پاس سے دے دے اور ان کو معاف کر دے۔ واللہ اعلم بالصواب

حررہ: العبد الراجی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی

المفتی فی جامع مسجد اکبرآباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر...... 267﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص مسمی ریاض الدین نے انتقال کیا اور ایک بی بی مسماۃ نبی بیگم اور چار لڑکے مسمی سراج الدین واکرام الدین ووہاب الدین ووجیہہ الدین اور دولڑکیاں مسماۃ امیر جان اور احمدی بیگم وارث چھوڑے۔ اور پھر ۹ ماہ کے بعد بی بی نے بھی انتقال کیا اور مذکورہ بالالڑکے اور لڑکیاں چھوڑے۔

موافق شرع شریف کے کل جائداد سے ہر ایک وارث کیا کیا پاسکتا ہے؟ اور کل جائداد کتنے سہام پر تقسیم ہوگی؟

مسماۃ احمدی بیگم نے اپنا حصہ عدالت کے باضابطہ کاروائی کر کے پالیا ہے۔

اور مسمی اکرام الدین نے اپنا حصہ بلاتقسیم کیئے ہوئے ایک ہندو کے ہاتھ بیچ ڈالا اور اس ہندو سے مسمی شرف الدین (زوج مسماۃ امیر جان) نے اسی حالت میں خرید لیا ہے۔

بعد انتقالِ مسمی ریاض الدین مرحوم مورث کے کل جائدادِ متروکہ کا اہتمام وانتظام مسمی وجیہہ الدین کے ہاتھ میں ہے۔ اس وقت سے اب تک کل کرایہ وغیرہ وصول کرتے رہے۔ اور سوائے مسمی سراج الدین کے کل ورثاء کو اس کی آمدنی بحصہ رسد دیتے رہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مسمی سراج الدین والدین کے انتقال سے اب تک کل جائداد کی آمدنی میں سے بحساب حصہ رسد اپنا کل حصہ پاسکتا ہے یا نہیں؟۔ بینوا توجروا

سراج الدین

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما۔

صورتِ مسئولہ میں چونکہ مسماۃ نبی بیگم زوجہ ریاض الدین کے بھی وہی چار پسر اور دو بیٹیاں وارث ہیں جو ریاض الدین مرحوم کے وارث تھے لہٰذا بصورتِ انحصارِ ورثہ کے ورثۂ مذکورہ میں بعد ماتقدم علی الارث کل

جائداد منقولہ وغیر منقولہ ریاض الدین مرحوم کی نبی بیگم کو کالعدم رکھ کر دس حصہ کر کے دو دو حصے چاروں بیٹوں کو اور ایک ایک حصہ دو بیٹیوں کو دیا جائے گا۔ صورته هکذا

ریاض الدین مسئلہ ۱۰

میت

ابن	ابن	ابن	ابن	بنت	بنت
۲	۲	۲	۲	۱	۱

☆ اور مسمی اکرام الدین نے جو اپنا حصہ بلا تقسیم فروخت کر دیا اگر عند التقسیم دوسرے شریکوں کو کچھ نقصان نہ پہنچے تو بقول امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ بقدر اس کے حصہ کے بیع صحیح ہوگی ورنہ بالاتفاق بیع ناجائز رہے گی۔ اور حسب خواہش شرکاء اس کو باطل قرار دیا جائے گا اور مشتری سے واپس کرا کر کل جائداد بموجب تقسیم مذکور تقسیم کی جائے گی۔ کما فی الفتاوی الحامدیة

قال فی البزازیة فی مسائل بیع المشاع دار بین اثنین باع احدهما بیتا معینا من رجل لا یجوز عن الثانی انه یجوز فی نصیبه و فی شرح الطحاوی لو باع احد الشریکین من الدار نصیبه من بیت معین فللآخر ان یبطله و مثله فی الخانیة و العمادیة معللین بتضرر الشریک بذالک عند القسمة[1]۔

(ترجمہ: بزازیہ میں بیع مشاع کے مسائل میں ہے۔ ایک گھر دو آدمیوں کے درمیان مشترک ملکیت کا ہے۔ ان میں سے ایک نے اپنا ایک معین کمرہ کسی کے ہاتھ بیچ دیا تو یہ جائز نہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اپنے حصے سے جائز ہے۔ شرح الطحاوی میں ہے دو شراکت داروں میں سے ایک نے اپنے حصہ سے ایک معین کمرہ فروخت کر دیا تو دوسرے شریک کو حق حاصل ہے کہ اسے باطل قرار دے دے۔ فتاوی خانیہ میں بھی اس طرح ہے۔ انہوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ تقسیم کے وقت اس سے شریک کو نقصان ہوگا۔)

[1] تنقیح التفاوی الحامدیه جلد اول صفحه ۲۲۳ مطبوعه المکتبه الحبیبیه کوئٹه

☆ اور مسمی وجیہہ الدین نے بلا اجازت سراج الدین جو جائدادِ مشترکہ غیرِ مقسومہ سے کرایہ وصول کیا ہے وجیہہ الدین پر لازم ہے کہ بقدر حصۂ سراج الدین آج تک جو کرایہ وصول کیا ہے وہ سب حساب کر کے سراج الدین کو دے بلکہ اگر سراج الدین موجود بھی نہیں ہوتا وجیہہ الدین پر لازم تھا کہ بقدر حصہ سراج الدین جس قدر کرایہ وصول کیا تھا اس کو صدقہ کر دیتا۔ چنانچہ کتاب الشرکہ حامدیہ میں ہے:

غاب احد شریکی الدار فاراد الحاضر ان یسکنها رجلا او یوجرها لاینبغی ان یفعل ذالک دیانة اذا التصرف فی ملک الغیر حرام ولا یمنع قضاء اذ الانسان لا یمنع من التصرف فیما بیده لو لم ینازعه فلو آجرو واخذ الاجر یرد علی شریکه قدر نصیبه لو قدر والا یتصدق لتمکن الخبث فی حق شریکه فکان کغاصب آجر یتصدق بالا جراویرد علی مالکه اما نصیبه فیطیب له[1] ۔

(ترجمہ: ایک گھر کے دو شراکت داروں میں سے ایک موجود نہیں۔ موجود شراکت دار نے چاہا کہ کسی آدمی کو وہاں ٹھہرانے یا اسے کرایہ پر چڑھادے۔ دیانتاً اسے ایسا نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ کسی دوسرے شخص کی ملکیت میں تصرف حرام ہے۔ لیکن قاضی اسے نہیں روکے گا۔ کیوں کہ جو چیز کسی کے قبضہ میں ہو اسے اس میں تصرف کرنے اس وقت تک قاضی نہیں روک سکتا جب تک کوئی نزاع کرنے والا موجود نہ ہو۔ اگر اس نے اسے کرایہ پر چڑھا دیا اور کرایہ وصول کر لیا تو اپنے حصہ دار کو اس کے حصہ کے برابر اس کرایہ سے ادا کرے بشرطیکہ اسے ادا کرنے پر قادر ہو ورنہ اس کو صدقہ کر دے کیوں کہ اس کے شریک کے حق میں خباثت اس میں پختہ ہو گئی ہے تو وہ اس غاصب کی مانند شمار ہوگا جس نے غصب کردہ چیز کو کرایہ پر چڑھا دیا تو وہ کرایہ کو صدقہ کر دے یا اس کے مالک کو واپس کر دے۔ اس کا اپنا حصہ اس کے لیے پاکیزہ ہے)

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی

ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی

مفتی جامع مسجد اکبرآباد

---

[1] تنقیح التفاوی الحامدیه جلد اول صفحه ۹۱ مطبوعه المکتبه الحبیبیه کوئٹه

﴿فتویٰ نمبر......268﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارے میں کہ مسمی امیر جان حالتِ مرض میں کہ جس سے شفایاب نہیں ہوئے اور اسی میں انتقال کر گئے' اپنی بیوی کی خدمت سے خوش ہو کر دو عدد مکان تخمیناً قیمتاً پندرہ سو کے دیدیئے کہ جن میں وہ وقتِ ھبہ بھی قابض تھی اور اب تک ہے۔اور پہلے سے اسی میں رہتی تھی۔اور مقدارِ مہر کل پانچ سو روپیہ تھے۔جس کے گواہ یہ تین شخص ہیں۔اب بعد وفات امیر جان کی بہن کی دختر ان مکانات کو ترکہ خیال کر کے تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔شرع شریف سے ان کو جو کچھ ملتا ہے' لکھ دیا جائے۔اور سوائے مکانات کے صرف ایک کوٹھی جو علاوہ مکانات کے ہے اور کوئی جائداد نہیں چھوڑی۔

سائل: منصب علی خان'

۱۹ شوال ۱۳۳۴ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

الحمد للہ رب العالمین. والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین والہ و صحبہ اجمعین.

صورتِ مسئولہ میں امیر جان مرحوم نے دو مکان تخمینا قیمتی پندرہ سو کے' جو اپنی بیوی کو دیئے ہیں' ظاہر ہے کہ علاوہ بعض مکان قیمتی پانچ سو کے' جو قدر مہر ہے' دو حصہ باقی قیمتی ایک ہزار یا کم وبیش کے' بعد تقسیم اور جدا کرنے حصہ مہر کے' ھبہ نہیں کئے ہیں۔☆ اور ھبہ' مشاع ایسی چیز کا' جو تقسیم ہو سکے اور تقسیم سے بیکار نہ ہو' جیسا کہ حیثیتِ مکانات مذکور سے ظاہر ہے' نا جائز ہے۔گو حصہ' مشاع علاوہ ھبہ دوسری طریق سے مملوک یا مقبوضِ موھوب لہ ہی کر دیا جائے یا پہلے سے ہو' جس طرح صورتِ مسئلہ میں کچھ حصہ' مکان بغیر تقسیم و تحدیدِ مہر مین امیر جان مرحوم نے دیا ہے اور کچھ بطریق ھبہ۔چنانچہ ھدایہ میں ہے۔

و لو وهب من شريكه لا يجوز لان الحكم يدار على نفس الشيوع [1]

(ترجمہ: اگر کسی نے اپنے شراکت دار کو شراکت والی چیز ہبہ کی تو جائز نہیں کیوں کہ عدمِ جواز کے قول کا دارومدار تقسیم نہ ہونے پر ہے)

و فی الفتاوی العالمگیریة عن المحیط السرخسی رحمة الله علیه

رجل دفع الی رجل تسعة دراهم و قال ثلاثة قضاء من حقک و ثلاثة هبة لک و ثلاثة صدقة فضاع الکل یضمن ثلاثة الهبة لانها هبة فاسدة و لا یضمن ثلاثة الصدقة لان صدقة المشاع جائز الافی روایة[2]

(ترجمہ: ایک شخص نے کسی دوسرے کو نو درہم دیئے اور کہا تین درہم تیرے حق کی ادائیگی کے لیے ہیں، تین درہم تیرے لیے ہبہ ہیں اور تین درہم صدقہ ہیں۔ وہ ساری رقم ضائع ہوگئی تو وہ شخص ہبہ کے تین درہموں کا ضامن ہوگا کیونکہ کہ وہ فاسد ہبہ تھا۔

صدقہ کے تین درہموں کا ضامن نہ ہوگا کیونکہ کہ صدقہ، تقسیم کیے بغیر بھی درست ہے ہاں ایک روایت کی رو سے درست نہیں ہے۔

وأیضا فیه عن المضاربة الکبیر

إنه اذا کان دفع الی آخر الفا. قال نصفها مضاربة و نصفها هبة لک فهلک الالف فی یده ضمن المضارب حصة الهبة کذا فی الفتاوی الغیائیة [3]

☆(ترجمہ: اگر کسی دوسرے آدمی کو ہزار روپے دیئے اور کہا ان میں سے آدھے مضاربت کے لیے ہیں اور آدھے تیرے لیے ہبہ ہیں۔ اس کے ہاتھ میں وہ ہزار روپے ہلاک ہوگئے تو مضارب ہبہ کے حصہ کا ضامن ہوگا۔ فتاوی غیاثیہ میں اسی طرح ہے)

---

[1] الهدایه جلد ۳ صفحه ۲۸۶ مطبوعه مکتبه شرکت علمیه ملتان

[2] الفتاوی عالم گیریه جلد ۴ صفحه ۳۷۹ مطبوعه مصر

[3] الفتاوی العالم گیرية جلد ۴ صفحه ۳۷۹ مطبوعه مصر

☆ علاوہ بریں یہ ہبہ ہے ہبہ مرض الموت میں ۔اور ہبہ مرض الموت میں اگر چہ ابتداءً ھبہ ہوتا ہے مگر بعد موت منقلب بوصیت ہو جاتا ہے۔اس طرح ہبہ مرض الموت کا 'بعد الموت' اگر وارث کو کیا گیا ہے اور قبضہ دے کر تمام بھی کر دیا گیا' چونکہ وصیت وارث کو نا جائز ہے' نا جائز ہو کر' جملہ ورثہ کا حق ہو جاتا ہے۔

چنانچہ صفحہ 181 جلد ثانی الفصولین میں ہے جامع الفتاوی سے۔

وھب قنا لامراتہ فاعتقتہ ثم مات المریض نفذ وتضمن القیمة اذا لتملیک فی الابتداء صح لکن انقلب وصیة بعد ذلک وھو المختار[1]

(ترجمہ: اپنی بیوی کو ایک غلام ہبہ کیا۔اس بیوی نے اسے آزاد کر دیا۔پھر خاوند مریض مر گیا۔تو عتق نافذ ہوگا اور عورت اس غلام کی قیمت کی ضامن ہوگی کیوں کہ عورت کو مالک بنانا آغاز میں درست تھا لیکن بعد میں وہ وصیت میں تبدیل ہو گیا۔یہی مختار ہے)

اور اگر غیر کو ہبہ کیا ہے چونکہ ابتداءً ہبہ ہے' بغیر قبضہ کے تمام نہ ہوگا۔

کما فی تنقیح الفتاوی الحامدیہ :

وھب فی مرض الموت و لم یسلم حتی مات تبطل البتة لان الھبة فی مرض الموت و ان کانت وصیة لکنھا ھبة حقیقة فتفقر الی القبض و لم توجد[2]

(ترجمہ: کسی نے ہبہ کیا لیکن ہبہ کردہ چیز موہوب لہ کو اپنے مرنے تک سپرد نہ کی۔تو ہبہ یقیناً باطل ہو جائے گا۔ کیونکہ ہبہ مرضِ موت میں اگر چہ وصیت بن جاتا ہے' لیکن حقیقت میں وہ ہبہ ہوتا ہے۔لہٰذا اس کے صحیح ہونے کے لیے موہوب لہ کے قبضہ کی ضرورت ہے جو پایا نہیں گیا)

اور چونکہ یہ مآلاً وصیت ہے بعد الموت' لہٰذا اگر کل مال ھبہ کر دیا ہے باوصفِ قبضہ' دو ثلث مال' جائدادِ مقبوضہ سے موہوب لہ کے لیے ورثہ کو واپس دینا لازم ہوگا'

---

[1] جامع الفصولین جلد ۲ صفحہ ۱۸۱ مطبوعہ دار الاشاعة العربیة کوئٹہ

[2] تنقیح الفتاوی الحامدیة جلد صفحہ مطبوعہ

کما فی صفحہ 180 جلد ثانی جامع الفصولین من الزیادات :

مریض وھب شیئا لا یخرج من الثلث یرد الموھوب لہ مازاد علی الثلث بلاخیار[1]

(ترجمہ: مریض نے کوئی چیز ہبہ کی۔ جو اس کے ترکہ کا تہائی نہیں' بلکہ زائد بنتی ہے' تو موہوب لہ ترکے کے تہائی سے زائد واپس کرے گا۔ اس میں اس کی پسندیدگی کا اعتبار نہیں)

وفیہ من الفتاوی الصغری لصدر الشھید

وھب دارہ فمات ولا مال لہ و لم تجز الورثۃ فسخت فی الثلثین و لم تبطل الھبۃ فی الثلث[2]

(ترجمہ: مرض الموت میں اپنا گھر کسی کو ہبہ کیا۔ ورثاء نے اس کی اجازت نہ دی' تو ایک تہائی میں ہبہ باطل نہ ہوگا۔ اور دو تہائی میں ہبہ فسخ ہو جائے گا)

اور جب ہبہ صحیح نہ ہوا۔ اور علاوہ حصہ مہر وہ مکان اور نیز تیل کی کوٹھی مملوکِ امیر جان رہی' تو بعد وفاتِ امیر جان بعد ماتقدم علی الارث کل جائداد امیر جان کی بقدر حصہ مہر مبلغ پانچ سو روپیہ منہا کر کے اگر بجز بھانجی اور زوجہ کے اور کوئی وارث ذوی الفروض اور عصبون سے نہیں لہٰذا چار حصہ کر کے ایک حصہ زوجہ امیر جان کو دیا جائے گا اور ماقبی کی مالک بھانجی ہوگی۔ بوجہ ہونے بھانجی کے ذوی الارحام سے' اور عدمِ جواز رد کرنے باقی کے زوجین پر۔

کما فی الدر المختار

و ذوالارحام ھو کل قریب لیس بذی سھم ولا عصبۃ فھو قسم ثالث حینئذ ولا یرث مع ذی سھم ولا عصبۃ سوی الزوجین لعدم الرد علیھما فیاخذ المنفرد جمیع

---

[1] جامع الفصولین — جلد ۲ صفحہ ۱۸۰ — مطبوعہ دار الاشاعت العربیہ کوئٹہ

[2] ایضاً

المال بالقرابة[1]

(ترجمہ: ذورحم ہر وہ وارث ہوتا ہے جو نہ تو ذو سہم ہو اور نہ ہی عصبہ ہو۔ یہ ورثاء کی تیسری قسم ہے۔ اس قسم ورثاء ذو سہم اور عصبہ کی موجودگی میں وارث نہیں ہوتے۔ ہاں خاوند اور بیوی کی موجودگی میں وارث بنتے ہیں۔ کیوں کہ حصوں سے بچا ہوا ترکہ ان کی طرف نہیں لوٹتا' تو ذورحم اکیلا سارا مال رشتہ داری کی وجہ سے حاصل کرلیتا ہے)

قال الشامی رحمة الله :

قوله فیاخذ المنفرد ای الواحد منهم من ای صنف کان جمیع المال ای او ما بقی بعد فرض احدالزوجین[2]

(ترجمہ: قولہ ذورحم اکیلا سارا ترکہ حاصل کرے گا۔ یعنی ذورحم رشتہ داروں میں کوئی ایک اگرچہ وہ کسی قسم سے تعلق رکھتا ہو سارا ترکہ پالے گا یا زوجین کے حصوں سے جو بچے گا وہ پالے گا) فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی ر
ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی المجددی
مفتی مسجد جامع اکبرآباد

✿✿✿✿✿

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۱۰ صفحہ ۴۴۸، ۴۴۹ مطبوعہ بیروت

[2] ایضاً

﴿فتویٰ نمبر......269﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسماۃ چھوٹی بیوہ ایک مکان مالیت ڈھائی ہزار کا چھوڑ کر مر گئی اور مسماۃ مذکور نے مسماۃ اچھو' منتو' انتا یہ تین لڑکیاں چھوڑیں اور مسمی کلا ایک بھتیجا چھوڑا اور ان چاروں کے سوا اور کوئی حقدار نہیں۔

مسماۃ چھوٹی نے نصف مکان اپنی زندگی میں مسماۃ اچھو اپنی لڑکی کے نام بیعنامہ لکھ کر رجسٹری کر دیا ہے اور ۱۴ برس اپنی زندگی بھر اسی مسماۃ اچھو اپنی لڑکی کے گھر رہی۔ وہیں مری۔

اب وہ نصف مکان بھی کہ جو مسماۃ اچھو کے نام بیع کر کے رجسٹری کر دیا ہے' وہ بھی حصوں میں آ سکتا ہے یا نہیں؟ اور کون کون حقدار ہیں؟

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اگر فی الواقع چھوٹی نے اپنا نصف مکان معہ زمین قیمتی دو اڑھائی ہزار اپنی بیٹی مسماۃ اچھو کے نام بیع کر دیا ہے اور آدھا حصہ معین کر کے بیچا تھا تو بلا تکلف وہ بیع صحیح ہو گئی۔ اور تحریر رجسٹری سے یہی ظاہر ہو رہا ہے۔ لہٰذا وہ ملکِ اچھو ہو گیا۔ قبل موت و بعدِ موتِ چھوٹی اس میں کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ رہا باقی نصف مکان وہ ورثۂ چھوٹی میں اس طرح تقسیم ہو گا کہ کل مال چھوٹی کا بعد ما تقدم علی الارث نو حصہ کر کے دو دو حصہ تینوں بیٹیوں کو دیئے جائیں گے اور تین حصہ باقی کلا بھتیجا کو دیں۔ صورتہ ھکذا

چھوٹی مسئلہ ۳/۹

میت

بنت	بنت	بنت	ابن الاخ
اچھو	منتو	انتا	کلا
۲	۲	۲	۳

حررہ: العبد محمد دیدار علی' مفتی جامع مسجد اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر......270﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین بابت حصہ شرعی کے ایک شخص مسمی کریم اللہ لاولد فوت ہوگیا۔ اس نے صرف اپنی زوجہ کا پہننے کا زیور' کچھ زر نقد' برتن و کپڑا وغیرہ استعمالی زوجہ کے پاس چھوڑا۔ جو کچھ زرِ نقد تھا وہ اس کی ولیہ نے مرحوم کے گور و کفن' فاتحہ سوم چہلم میں صرف کیا۔ صرف زیور پہننے کا پارچہ و برتن استعمالی اس کی بیوہ کے پاس موجود ہے۔ مرحوم کی ایک حقیقی بہن اور ایک بھائی جو دوسرے باپ سے پیدا ہوا موجود ہے۔ اس مال میں کچھ حصہ حقیقی بہن اور اس بھائی کا جو دوسرے باپ سے پیدا ہوا ہے واجب ہوتا ہے؟ اور اگر واجب ہے تو ان ہر ایک کے حصہ میں کیا کیا پہنچتا ہے؟

سائل: بسم اللہ خان' از رزباندی کوٹ۔

۲۷ فروری ۱۹۱۸ء

الجواب

صورتِ مسئولہ میں بعد تقدم علی الارث اگر متوفی اور موجود بھائی کی ماں ایک ہی ہے' یعنی یہ بھائی اخیافی ہے' تو کل مال کریم اللہ کے سولہ (۱۶) حصہ کر کے چار (۴) حصہ زوجہ کو دیئے جائیں گے اور ۹ حصہ حقیقی بہن کو اور تین (۳) حصہ اخیافی بھائی کو۔

اور اگر بھائی موجود کے ماں باپ اور متوفی کے ماں باپ بالکل جدا ہیں' تو اس فرضی بھائی کو کچھ نہیں ملے گا۔ اور کل مال کے چار حصہ کر کے ایک حصہ بیوی کو ملے گا اور باقی بہن کو۔

الصورة الاولی هکذا

کریم اللہ مسئلہ ۴/ ۱۶

میت

زوجہ	اخت حقیقی	اخ اخیافی
۱/۴	۹	۳

الصورة الثانية ھکذا

کریم اللہ مسئلہ

میت

زوجہ	اخت حقیقی
۱	۳

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی، مفتی جامع مسجد اکبر آباد
۱/ مارچ ۱۹۱۸ء

﴿فتویٰ نمبر...... 271﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ زید منجملہ ایک منزل مکان کے نصف کا مالک تھا۔ اور اس کی دو زوجہ تھیں۔ جب زید نے انتقال کیا تو اس نے زوجہ اول کی اولاد میں ایک لڑکی نفیس بیگم اور ایک لڑکا مسمی لیاقت علی چھوڑا اور زوجہ اول بحیات زید انتقال کر گئی اور زوجہ ثانی مسماۃ مریم سے دو لڑکیاں نیازی بیگم وریاضی بیگم چھوڑیں۔

بعدہ ریاضی بیگم کا انتقال ہوا اس نے ایک ماں مریم اور ایک حقیقی بہن مسماۃ نیازی بیگم اور ایک بھائی علاتی مسمی لیاقت علی اور ایک بہن علاتی مسماۃ نفیس بیگم چھوڑی۔

بعدہ زوجۂ ثانی مریم کا انتقال ہوا اس نے اپنی اولاد میں فقط ایک لڑکی نیازی بیگم چھوڑی۔

اس کے بعد زوجہ اول کے لڑکے لیاقت علی کا انتقال ہوا اس نے اپنا ایک لڑکا یوسف علی اور تین لڑکیاں وحید بیگم، سعید بیگم، عزیز بیگم اور ایک زوجہ مسماۃ زینب اور بہن حقیقی نفیس چھوڑی۔

شرعاً مال زید کس طرح تقسیم ہوگا؟۔

سائل: لیاقت خان محلہ ھتیالی نائی کی منڈی آگرہ

۱۲ جمادی الاولی ۱۳۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں بعد ما تقدم علی الارث کل مال زید کے دس ہزار چار سو (۱۰۴۰۰) حصہ کر کے اٹھارہ سو بیس (۱۸۲۰) نفیس بیگم کو دیئے جائیں گے اور پینتالیس سو بیس (۴۵۲۰) نیازی بیگم کو اور چار سو بیس (۴۲۰)

حامد کو اور چار سو پچپن (۴۵۵) زینب کو اور بارہ سو چوہتر (۱۲۷۴) یوسف کو اور چھ سو سینتیس (۶۳۷) وحید بیگم اور اتنے ہی حصہ سعید بیگم اور عزیز بیگم کو دیئے جائیں گے۔ فقط صورته هکذا

زید مسئلہ ۸/۴۰/۵۲۰/۱۰۴۰۰

میت

زوجہ	ابن	بنت	بنت	بنت
مریم	لیاقت علی	نفیس بیگم	نیازی بیگم	ریاضی بیگم
۱/۵/۶۵	۱۴/۱۸۲	۷/۹۱/۱۸۲۰	۷/۹۱/۱۸۲۰	۷

ریاضی بیگم مسئلہ ۱۲/۱۳

میت بیدہ (۷)

زوج	ام	اخت عینی	اخ علاتی	اخت علاتی
حامد	مریم	نیازی بیگم	لیاقت علی	نفیس بیگم
۳/۲۱/۴۲۰	۴/۲۸	۶/۴۲/۸۴۰	م	م

مریم مسئلہ ۱

میت بیدہ (۹۴)

بنت نیازی بیگم

۱/۹۳/۱۸۶۰

لیاقت علی مسئلہ ۸/۴۰

میت توافق بالنصف بیدہ ۱۸۲

زوجہ	ابن	بنت	بنت	بنت
زینب	یوسف	وحید بیگم	سعید بیگم	عزیز بیگم
۱/۵/۴۵۵	۱۴/۱۲۷۴	۷/۶۳۷	۷/۶۳۷	۷/۶۳۷

الاحیاء

نفیس بیگم	نیازی بیگم	حامد	زینب	یوسف	وحید بیگم	سعید بیگم	عزیز بیگم
۱۸۲۰	۴۵۲۰	۴۲۰	۴۵۵	۱۲۷۴	۶۳۷	۶۳۷	۶۳۷

المبلغ

۱۰۴۰۰

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی مفتی جامع مسجد اکبر آباد

مورخہ ۱۲ جمادی الاولی ۱۳۳۶ھ
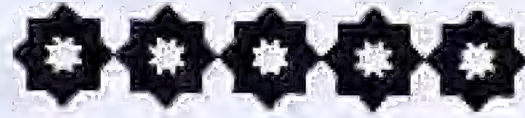
﴿فتویٰ نمبر......272﴾

سوال

کیافرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مورثِ اعلیٰ امیر خان نے انتقال کیا۔انہوں نے ایک بیٹا فیض اللہ خان اور تین بیٹیاں حیبا' احمدی' محمدی کو وارث چھوڑا

اس کے بعد حیبا نے انتقال کیا۔انہوں نے پانچ بیٹے فیاض بیگ' عظیم بیگ' ریاض الدین بیگ' اسماعیل بیگ' غفور بیگ اور دو بیٹیاں ہرمزی۔حمو اور ایک بھائی فیض اللہ خان اور دو بہنیں احمدی' محمدی کو وارث چھوڑا۔

اس کے بعد ہرمزی نے انتقال کیا انہوں نے ایک خاوند لطف اللہ خان اور دو بیٹے مسیح اللہ خان' شفیع اللہ خان اور پانچ بھائی مذکور الصدر اور ایک بہن حمو کو وارث چھوڑا۔

اس کے بعد فیض اللہ خان نے انتقال کیا انہوں نے ایک بیٹا لطف اللہ خان دو بہنیں احمدی' محمدی کو وارث چھوڑا

اس کے بعد مسیح اللہ خان نے انتقال کیا انہوں نے ایک باپ لطف اللہ خان اور ایک بھائی شفیع اللہ خان اور ایک بی بی شافیہ اور بیٹے حبیب اللہ ور فیع اللہ کو وارث چھوڑا۔

اس کے بعد احمدی نے انتقال کیا انہوں نے ایک بیٹی مسماۃ ممتازی ایک بہن محمدی اور ایک بھتیجا لطف اللہ خان کو وارث چھوڑا۔

اس کے بعد مسماۃ محمدی نے انتقال کیا انہوں نے ایک بیٹا محمود خان' ایک بھتیجا لطف اللہ' ایک بہن جی مسماۃ ممتازی کو وارث چھوڑا۔

اس کے بعد رفیع اللہ خان نے انتقال کیا انہوں نے ایک بھائی حبیب اللہ خان اور والدہ شافیہ اور دادا لطف اللہ خان کو وارث چھوڑا۔

اس کے بعد لطف اللہ خان نے انتقال کیا انہوں نے دو بیٹے شفیع اللہ خان ولیاقت اللہ خان اور دو

بیٹیاں منیر النساء وشوکت النساء کو وارث چھوڑا۔

پس از روئے شرع شریف امیر خان مورثِ اعلیٰ کا ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟ اور ہر وارث کو کتنا کتنا ملے گا؟

سائل: شفیع اللہ خان

۴ مارچ ۱۹۱۷ء

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں کل مال امیر خان کے انہتر ہزار ایک سو بیس (۶۹۱۲۰) حصہ کر کے تئیس سو چار (۲۳۰۴) حصہ ریاض بیگ کو اور اسی قدر دوسرے چاروں بیٹوں کو دیئے جائیں گے۔ گیارہ سو باون (۱۱۵۲) حصہ حمو کو اور نو ہزار آٹھ سو دو (۹۸۰۲) شفیع اللہ خان اور ایک سو پانچ (۱۰۵) شافیہ کو اور ایک سو ترپن (۱۵۳) حبیب اللہ کو اور چھ ہزار نو سو بارہ (۶۹۱۲) ممتازی کو اور بیس ہزار سات سو چھتیس (۲۰۷۳۶) محمود خان اور نو ہزار تین سو ستر (۹۳۷۰) لیاقت کو اور چار ہزار چھ سو پچاسی (۴۶۸۵) شوکت النساء اور اسی قدر حصہ منیر النساء کو ملیں گے۔ فقط واللہ اعلم صورتہ ھکذا

امیر خان مسئلہ ۶۹۱۲۰/۲۳۰۴۰/۷۶۸۰/۴۸۰/۶۰/۵

میت

ابن (فیض اللہ خان)	حمیا	احمدی	محمدی
۲/۲۴/۱۹۲	۱	۱/۱۲/۹۶/۱۵۳۶	۱/۱۲/۹۶/۱۵۳۶

حیبا مسئلہ ۱۲

میت

ابن	ابن	ابن
ریاض بیگ	فیاض بیگ	غفور بیگ
۲۳۰۴/۷۶۸/۲۵۶/۱۶/۲،	۲۳۰۴/۷۶۸/۲۵۶/۱۶/۲،	۲۳۰۴/۷۶۸/۲۵۶/۱۶/۲

ابن	ابن
اسماعیل	عظیم بیگ
۲۳۰۴/۷۶۸/۲۵۶/۱۶/۲	۲۳۰۴/۷۶۸/۲۵۶/۱۶/۲

بنت	بنت	اخ	اخت	اخت
ہرمزی	حمو	فیض اللہ خان	محمدی	احمدی
۱	۱۱۵۲/۳۸۴/۱۲۸/۸/۱	م	م	م

ہرمزی مسئلہ

میت بیدہ(۱)

زوج (لطف اللہ)	ابن (مسیح اللہ)	ابن (شفیع اللہ)
۹۶/۳۲/۲/۱	۳	۴۳۲/۱۴۴/۴۸/۳

فیض اللہ مسئلہ ا

میت بیدہ(۱۹۳)

ابن لطف اللہ	اخت محمدی	اخت محمدی
۹۲۱۶/۳۰۷۲/۱۹۲	م	م

مسیح اللہ خان مسئلہ ۴۸

میت بیدہ (۳)

زوجہ شافیہ	ابن حبیب اللہ	ابن رفیع اللہ	اب لطف اللہ	اخ شفیع اللہ
۳/۶/۱۸/۵۴	۱۷/۵۱/۱۵۳	۱۷	۴/۸/۲۴	م

احمدی مسئلہ ۲

میت بیدہ (۱۵۳۶)

بنت ممتازی	اخت محمدی	ابن الاخ لطف اللہ
۱/۷۶۸/۲۳۰۴/۶۹۱۲	۱/۷۶۸	م

محمدی مسئلہ ۱

میت بیدہ (۲۳۰۴)

ابن محمود خان

۱/۲۳۰۴/۹۳۱۲/۴۰۷۳۶

رفیع اللہ مسئلہ

میت بیدہ (۱۷)

ام شافیہ	اب لطف اللہ	اخ حبیب اللہ
۱/۱۷/۵۱	۲/۳۴	م

لطف اللہ مسئلہ

میت

ابن شفیع اللہ	ابن لیاقت اللہ	بنت شوکت النساء	بنت مہر النساء
۲/۹۳۷۰	۲/۹۳۷۰	۱/۴۶۸۵	۱/۴۶۸۵

الاحیاء

ریاض بیگ	فیاض بیگ	غفور بیگ	اسماعیل بیگ	عظیم بیگ	حمو
۲۳۰۴	۲۳۰۴	۲۳۰۴	۲۳۰۴	۲۳۰۴	۱۱۵۲

الاحیاء

حبیب اللہ	ممتازی	محمود خان	شافیہ	شفیع اللہ	لیاقت اللہ
۱۵۳	۶۹۱۲	۲۰۷۳۶	۱۰۲	۹۸۰۲	۹۳۷۰

الاحیاء

شوکت النساء	منیر النساء
۴۶۸۵	۴۶۸۵

المبلغ

۶۹۱۲۰

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی
مفتی جامع مسجد اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر......273﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں صورت کہ

حبیب اللہ نے بعد انتقال پانچ بیٹے مسمیان امان اللہ، خدا بخش، احمد، حسو، سعد اللہ اور ایک بیٹی مسماۃ امامن چھوڑی۔

بعدہ خدا بخش کا انتقال ہوا۔ اس نے ایک بیٹی مسماۃ زینب اور چار بھائی اور ایک بہن مذکور الصدر چھوڑی

پھر مسمی امان اللہ کا انتقال ہوا اس نے ایک زوجہ مسماۃ شرافت اور ایک بنت مسماۃ اچھوا اور تین بھائی اور ایک بہن مذکورہ بالا چھوڑی۔

من بعد مسمی احمد میاں کا انتقال ہوا۔ انہوں نے دو بھائی اور ایک بہن مسطورہ چھوڑی۔

بعد ازاں مسماۃ امان اللہ کا انتقال ہوا۔ اس نے تین بیٹے مسمیان معشوق اور عنایت اور امداد اور دو دختر مسماۃ منتو اور حسو کو چھوڑا۔

اب حبیب اللہ مورث اعلیٰ کا ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟

سائل: درج نہیں.

۱۹ جمادی الاولی ۱۳۳۵ھ

الجواب

هو الموفق للصواب

بسم الله الرحمن الرحيم۔

اللهم رب زدني علما

صورتِ مسئولہ میں بعد ما تقدم علی الارث کل مال حبیب اللہ کے پانچ ہزار پانسو چوالیس (۵۵۴۴) حصہ کر کے سولہ سواسی (۱۶۸۰) حسو کو اور سولہ سواسی (۱۶۸۰) ہی سعد اللہ کو دیئے جائیں گے اور

پانچ سو چار (۵۰۴) زینب کو اور دو سو اسی (۲۸۰) شرافت کو اور پانچ سو ساٹھ (۵۶۰) اچھو کو اور دو سو دس (۲۱۰) معشوق کو اور اتنے اتنے ہی عنایت اور امداد کو اور ایک سو پانچ (۱۰۵) مسماۃ حسو اور اتنے ہی منتو کو۔ فقط

صورتہ ھکذا

حبیب اللہ مسئلہ ۵۵۴۴/۶۹۳/۹۹/۱۱

میت

ابن	ابن	ابن	ابن	ابن	بنت
امان اللہ	خدابخش	احمد میان	حسو	سعداللہ	امامن
۲/۱۸	۲	۲/۱۸/۱۲۶	۲/۱۸/۱۲۶/۱۰۰۸	۲/۱۸/۱۲۶/۱۰۰۸،	۱/۹/۶۳

خدابخش مسئلہ ۱۸/۲

میت بیدہ (۲)

بنت	اخ	اخ	اخ	اخ	اخت
زینب	امان اللہ	احمد میان	حسو	سعداللہ	امامن
۱/۹/۶۳/۵۰۴	۲	۲/۱۴	۲/۱۴/۱۱۲	۲/۱۴/۱۱۲	۱/۷

امان اللہ مسئلہ ۳۱/۴

میت بیدہ (۲۰)

زوجہ	بنت	اخ	اخ	اخ	اخت
شرافت	اچھو	احمد میان	حسو	سعداللہ	امامن
۱/۷/۳۵/۲۸۰	۲/۱۴/۷۰/۵۶۰	۲/۱۰	۲/۱۰/۸۰	۲/۱۰/۸۰	۱/۵

احمد میاں مسئلہ ۵

میت　تداخل　بیدہ (۱۵۰۹)

اخ حسو	اخ سعداللہ	اخت امامن
۲/۶۰/۴۸۰	۲/۶۰/۴۸۰	۱/۳۰

امامن　مسئلہ

میت　بیدہ (۱۰۵)

ابن معشوق	ابن عنایت	ابن امداد	بنت منتو	بنت حسو
۲۱۰	۲۱۰	۲۱۰	۱۰۵	۱۰۵

الاحیاء

حسو	سعداللہ	زینب	شرافت	اچھو	معشوق	عنایت	امداد	حسو	منتو
۱۶۸۰	۱۶۸۰	۵۰۴	۲۸۰	۵۶۰	۲۱۰	۲۱۰	۲۱۰	۱۰۵	۱۰۵

المبلغ

۵۵۴۴

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

محمد دیدار علی الرضوی الحنفی، مفتی جامع مسجد اکبر آباد

۱۹ جمادی الاولی ۱۳۳۵ھ

س ﴿فتویٰ نمبر......274﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس صورت میں کہ خواجہ وزیر نے وقت انتقال یہ وارث چھوڑے۔ زوجہ مسماۃ نجیبن دو پسر تقی الدین، نقی الدین، دو پوتے علیم الدین، وجیہہ الدین تین پوتی بسم اللہ، منتو، مختو۔

بعدہ نقی الدین کا انتقال ہوا اور یہ ورثہ چھوڑے زوجہ مسماۃ اکرامی بیگم والدہ نجیبن، برادر کلاں تقی الدین، دختران بدر النساء، بن، سرداری بیگم، بھتیجے علیم الدین، وجیہہ الدین، بھتیجیاں بسم اللہ بیگم، منتو، مختو۔

پھر نجیبن کا انتقال ہوا۔ اس نے یہ ورثہ چھوڑے۔ بیٹا تقی الدین، پوتیاں بدر النساء، بن، سرداری، پوتے علیم الدین، وجیہہ الدین، پوتیاں، دختران پسر، بسم اللہ، مختو، منتو،

بعدہ تقی الدین کا انتقال ہوا۔ اور یہ ورثہ چھوڑے زوجہ محبوبا، بھتیجے علیم الدین، وجیہہ الدین، بھتیجیاں، بسم اللہ بیگم، عفتو، مختو، منتو، بدر النساء، بن، سرداری۔

شرعاً یہ لوگ جائداد خواجہ وزیر سے کس قدر مستحق ہوں گے۔ بینوا وتوجروا

۲۵ فروری ۱۹۱۷ء

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما۔

صورت مسئولہ میں بعد ما تقدم علی الارث اور انحصار الورثہ کے اشخاص مذکورہ میں، کل مال خواجہ وزیر کے نو ہزار دو سو سولہ (۹۲۱۶) حصہ کر کے پانچ سو چار (۵۰۴) حصہ اکرامی بیگم زوجہ نقی الدین اور بن بیگم، بدر النساء، سرداری بیگم دختران نقی الدین سے ہر دختر کو آٹھ سو چھیانوے (۸۹۶) حصہ اور محبوبا زوجہ تقی الدین کو پندرہ سو چھ (۱۵۰۶) حصہ۔ اور علیم الدین و وجیہہ الدین ابنائے خیر الدین برادر زادگان نقی الدین کو دو ہزار دو سو انسٹھ (۲۰۶۹) حصہ ہر برادر زادہ کو دیئے جائیں گے اور باقی ورثہ مذکورہ سوال محروم رہیں گے۔

خواجہ وزیر مسئلہ ۴/۸/۱۹۲/۷۶۸

میت

ابن (نقی الدین)	ابن (تقی الدین)	زوجہ نجیبن
۳	۳	۱/۲/۴۸

نقی الدین مسئلہ ۲/۲۴/۷

میت بیدہ (۷)

میت بیدہ (۷)

زوجہ	والدہ	بنت	بنت	بنت	اخ
اکرامی بیگم	نجیبن	بہن	بدرالنساء	سرداری بیگم	تقی الدین
۳/۹/۳۶	۴/۱۲	۱۶/۶۴	۱۶/۶۴	۱۶/۶۴	۱/۳

نجیبن مسئلہ ۱

میت بیدہ (۲۲۸)

ابن (نقی الدین)

۶۰

مسئلہ ۴ (تقی الدین)

میت تباین بیدہ (۱۳۵)

زوجہ محبوبن	ابن الاخ، وجیہہ الدین بن خیر الدین المتوفی فی حیاۃ خواجہ وزیر
۱/۱۳۵	۳/۴۰۵

مسئلہ بدرالنساء مسئلہ ۱۶/۴

میت بیدہ (۶۴)

زوج	ابن	بنت	بنت
کریم الدین	فصیح الدین	عزیز جہاں بیگم	شاہ جہاں بیگم
۱/۴/۱۶	۶/۲۴	۳/۱۲	۳/۱۲

اکرامی بیگم	بہن	سرداری بیگم	محبوبن	وجیہہ الدین	کریم الدین
۳۶	۶۴	۶۴	۱۳۵	۴۰۵	۱۶

فصیح الدین	عزیز جہاں بیگم	شاہ جہاں بیگم
۲۴	۱۲	۱۲

المبلغ

۷۶۸

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی

محمد دیدار علی مفتی جامع مسجد اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر......275﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید کی حیات میں' اس کے بیٹے عمر کا انتقال ہوا۔ اس وقت عمر نے حامد اور حمیدہ دو اولاد اور ایک صفیہ اپنی بی بی کو چھوڑا۔ پھر زید کا انتقال بعد انتقال عمر اپنے بیٹے کے ہوا۔ اس وقت زید نے ایک اپنا پوتا حامد اور پوتی حمیدہ کو اور ایک بی بی اپنے بیٹے عمر کی چھوڑے۔ پھر حامد کا انتقال ہوا۔ حامد نے ایک ماں اور ایک بی بی اور ایک بیٹی اور ایک بہن حمیدہ چھوڑی۔ اب جو جائداد موروثی سلسلہ سے متوفی تک منتقل ہوتی چلی آئی ہے اس کی تقسیم شرعی طور پر جس طرح ہو تحریر فرمائی جائے۔

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں بعد ماتقدم علی الارث اور انحصار ورثہ کے اشخاصِ مذکورہ میں' کل جائداد عمر کے دو سو اٹھاسی (۲۸۸) حصے کر کے' چونسٹھ (۶۴) حصے تو صفیہ کو دیئے جائیں کے اور ایک سو انیس (۱۱۹) حمیدہ کو اور اکیس (۲۱) زوجہ حامد کو اور چوراسی (۸۴) بنت حامد کو۔ صورتہ ھکذا

عمر مسئلہ ۲۸۸/۷۲/۲۴

میت

زوجہ	بنت	ابن	اب
صفیہ	حمیدہ	حامد	زید
۳/۹/۳۶	۱۷/۶۸	۳۴	۴/۱۲

زید	مسئلہ ۳	
میت	توافق بالسبب	بیدہ (۱۲)
ابن الابن	بنت الابن	زوجہ ابن المتوفی المسمی بعمر
حامد	حمیدہ	م
۲/۸	۱/۴/۱۶	

حامد	مسئلہ ۲۴	توافق بالسدس	
میت			بیدہ (۴۲)
بنت	زوجہ	ام صفیہ	اخت حمیدہ
۱۲/۸۴	۳/۲۱	۴/۲۸	۵/۳۵

الاحیاء

صفیہ	حمیدہ	زوجہ	بنت
۶۸	۱۱۹	۲۱	۸۴

المبلغ

۲۸۸

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی

مفتی جامع مسجد اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......276﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس صورت میں کہ مسمی حسن خان ایک منزل مکان کا مالک ہے۔اور اس مکان میں اس کے لڑکے نے ڈیڑھ سو روپیہ اپنی ذات سے لگائے۔ چنانچہ حسن خان مالکِ مکان کہتا ہے کہ اس کے روپیوں کا دیندار ہوں۔اور اسی مکان میں سے وہ روپیہ ادا کروں گا۔اور میرے ایک لڑکا اور دو لڑکی وارث ہیں۔لڑکیاں میری حیات میں اس مکان پر قبضہ کرتی ہیں اور اپنا اپنا حصہ مانگتی ہیں۔آیا میری حیات میں وہ اپنا حصہ مجھ سے جبراً لے سکتی ہیں یا نہیں؟ اور مکان میں قفل لگا دیا ہے کہ پہلے ہمارا حصہ دیدو جب ہم قفل کھولیں گے۔اور اگر حسن خان مالک مکان اپنی حیات میں یہ کرنا چاہے تو از روئے شرع شریف ہر ایک وارث مذکور بالا کو کتنا کتنا حصہ ملنا چاہیے؟ اس کا جواب باصواب ارشاد فرمائیں۔

سائل: حسن خان ساکن کڑہ دواری خان آگرہ

۲۶ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اپنی حینِ حیات حسن خان اپنے مکان کا مالک ہے۔اس کو اختیار ہے خواہ اس سے اپنا قرض ادا کرے یا جس کو چاہے کل یا بعض مالِ مملوک اپنا بخشدے۔☆ البتہ طریقِ انصاف یہ ہے کہ اپنی حینِ حیات میں اگر ورثہ پر تقسیم کرے تو ورثۂ مذکور پر جس قدر تقسیم کرنا چاہے اس کے چار حصہ کر کے دو حصہ بیٹے کو دیدے اور ایک ایک حصہ دونوں دختروں کو دیدے۔اور بعض فقہاء کا قول ہے کہ حین حیات میں لڑکا لڑکیوں کو برابر تقسیم کرے۔ مگر حین حیاتِ حسن خان میں جبراً حسن کے مال سے کوئی وارث کچھ نہیں لے سکتا۔فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی

﴿فتویٰ نمبر...... 277﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید نے انتقال کیا۔ اور تین فرزند ایک بیوہ اور ایک دختر زوجہء اول سے ورثاء وقتِ وفات اپنی کے چھوڑے۔ اور جو زیور کہ نقرئی وطلائی اپنا از مکسوبہ متوفی نے اپنی زوجہ مذکورہ یعنی موجودہ کے واسطے بنوایا تھا' وہ سب اس نے اس کو پہنا دیا۔ چنانچہ کل زیور بقبضہ بیوہ متوفی کا ہے اور نیز ایک جائداد بحق بیوہ مذکورہ اور ایک جائداد بحق فرزندان مذکوران متوفی کے ہبہ کر دی کہ جو ان کے قبض وتصرف میں موجود ہے۔ علاوہ زیور وہر دو جائدادِ موہوبہ مذکورہ کے اور جائداد منقولہ وغیرہ منقولہ واثاث البیت' جو ہنوز باقی ہے ان میں کون کون حقدار شرعی ہے؟ اور کس قدر بقیہ جائدادِ متوفی میں ہر وارث کو شرعی حق پہنچتا ہے؟

۲۶ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما

☆ صورتِ مسئولہ اگر زید نے بحالتِ صحت وتندرستی بیوی کو زیور ہبہ کر کے پہنا دیا یا بموجب عرف اپنی قوم کے یہ سمجھ کر کہ پہنا دینا بمنزلہ ہبہ کر کے قبضہ دیدینے کے ہی قائم مقام سمجھا جاتا ہے' پہنا دیا وہ ملکِ زوجہٗ زید ہو گیا۔ اس میں کسی وارث کا حق باقی نہیں رہا۔ ماسوائے اس کے جو کچھ ملکیتِ منقولہ وغیرہ منقولہٗ زید ہے اس کے بعد ماتقدم علی الارث اداءِ دینِ مہر وقرض وغیرہ آٹھ حصہ کر کے اس میں سے ایک حصہ بیوی کو دیا جائے گا اور ایک حصہ دختر زید کو باقی چھ حصے علی السواء تینوں بھائی باہم لیں گے۔

صورته هکذا

زید مسئلہ۸

میت

زوجہ	ابن	ابن	ابن	بنت
۱	۲	۲	۲	۱

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی
ابومحمد محمد دیدارعلی الرضوی الحنفی
مفتی جامع مسجد اکبرآباد

﴿فتویٰ نمبر......278﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس صورت میں کہ ممن مرا اس نے وزیرٗ امیر دو بیٹے ایک بیوی کریما چھوڑی۔

وزیر مرا اس نے تین بیٹی چھوڑیں اور ایک بیوی اور ایک ماں چھوڑی۔

پھر وزیر کی ماں مری اس نے ایک بیٹا امیر چھوڑا۔ اب جائدادِ ممن سے کریما کو کیا ملے گا۔

۱۳ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ

امیر بخش محلہ ڈھولی کہار آگرہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما۔

صورتِ مسئولہ میں بعد ماتقدم علی الارث وانحصارِ ورثہ کل مالِ ممن کے چھ سو چالیس (۶۴۰) حصے کر کے تین سو ساٹھ (۳۶۰) حصے امیر کو دیئے جائیں گے اور ۳۵ حصے زوجۂ وزیر کو اور ۹۸ ایک بنتِ وزیر کو اور ۹۸ دوسری بنتِ وزیر کو اور ۴۹ وزیر کی ماں کو ملیں گے۔ صورتہ ھکذا

ممن مسئلہ ۸/۱۶/۶۴

میت

ابن امیر	ابن وزیر	زوجہ کریما
۷/۲۸۰	۷	۱/۲/۸۰

وزیر مسئلہ ۴۰/۴

میت بیدہ(۷)

زوجہ	بنت	بنت	ام
۱/۵/۳۵	۱۴/۹۸	۱۴/۹۸	۱/۷/۴۹

کریما

میت بیدہ(۸)

ابن امیر

۸۰

الاحیاء

امیر	زوجۂ وزیر	بنت وزیر	بنتِ وزیر	امِ وزیر
۳۶۰	۳۵	۹۸	۹۸	۴۹

المبلغ

۶۴۰

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی

ابومحمد محمد دیدار علیؒ

مفتی جامع مسجد اکبرآباد

﴿فتویٰ نمبر......279﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علما دین اس صورت میں کہ ممن مرا اس نے وزیر اور امیر دو بیٹے اور ایک بیوی کریما چھوڑی۔

بعد وزیر مرا اس نے تین بیٹیاں چھوڑیں اور ایک بیوی اور ایک ماں چھوڑی۔

پھر وزیر کی ماں مری اس نے ایک بیٹا امیر چھوڑا۔

اب جائداد ممن سے کریما کو کیا ملے گا؟۔فقط

الجواب

صورت مسئولہ میں بعد ما تقدم علی الارث وانحصارِ ورثہ کے ورثاء مذکور میں کل مال ممن کے ۱۹۲۰ حصے کر کے ۱۲۲۷ تو امیر کو دیئے جائیں گے اور ۱۰۵ وزیر کی زوجہ کو اور ۵۸۸ تینوں بیٹیوں کو۔ حصوں سے ہر ایک وزیر کی بیٹی کو ۱۹۶ حصے ملیں گے۔فقط صورته هكذا

ممن مسئلہ ۱۹۲۰/۱۶/۸

میت

زوجہ مسماۃ کریما	ابن مسمی وزیر	ابن مسمی امیر
۲/۲۴۰	۷	۷/۸۴۰

وزیر مسئلہ ۱۲۰/۴۰/۸

میت بیدہ (۷)

زوجہ	بنت	بنت	بنت	ام
۱/۵/۱۰/۱۰۵،	۲۸/۸۴/۵۸۸/۱۹۶،	۱۹۶/۵۸۸/۸۴/۲۸،	۱۹۶/۵۸۸/۸۴/۲۸،	۱۴۷/۲۱/۷

کریمن مسئلہ ۳۸۷

میت بیدہ ۳۸۷

امیر

۳۸۷

الاحیاء

امیر	زوجہ وزیر	بنت وزیر	بنت وزیر	بنت وزیر
۱۲۲۷	۱۰۵	۱۹۶	۱۹۶	۱۹۶

المبلغ

۱۹۲۰

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابومحمد محمد دیدار علی مفتی جامع مسجد اکبرآباد

﴿فتویٰ نمبر......280﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ محبوب کا انتقال ہوا تو ایک لڑکا اپنی پہلی بیوی سے جو مرگئی تھی اور زوجہ ثانی اور اس سے ایک لڑکی اور ایک اپنی ہمشیرہ کو زندہ چھوڑا۔

بعد کو لڑکا نابالغ مرگیا تو لڑکے نے نانا' نانی' ماموں' پھوپھی' علاتی بہن' سوتیلی ماں کو زندہ چھوڑا۔

بعد کو زوجہ محبوب نے انتقال کیا تو زوجہ نے ایک بیٹی' ایک ماں اور ایک باپ کو زندہ چھوڑا۔

اس کے بعد لڑکی محبوب کی مری تو اس نے خاوند اور نانا' نانی' پھوپھی کو زندہ چھوڑا

اس صورت میں جو حصے شرعی ہوں گے عندہ اللہ اس سے اطلاع دی جائے۔ فقط

سائل: چھنگا جنی خانہ آگرہ

الجواب

صورتِ مسئولہ میں بعد ماتقدم علی الارث اور انحصارِ ورثہ مذکورہ کے کل مال محبوب کے ۹۶ حصے کر کے خانم کو ۱۴ حصے اور کریمن کو ۲۱ اور عبدالرحیم کو ۴ حصے اور خالد کو ۵۷ حصے دیئے جائیں گے۔

صورتہ هکذا

محبوب مسئلہ ۸/۲۴/۴۸/۹۶

میت

زوجہ حفیظا	بنت حفیظن مسماۃ زینت	ابن مسمی زید من زوجۃ اخری ماتت	اخت
۱/۳/۶	۱۴/۷	۱۴	م

زید مسئلہ توافق بالنصف بیدہ ۱۴

میت

زینب اخت علاتی	ام الام خانم	عم	زوجہ الاب	اب الام	خال
۳/۲۱	۱۴/۷/۱	م	م	م	م

۲۴ حصہ کر کے تین حصہ تو زوجہ کو دیئے جائیں گے۔

اور ۱۶ حصے دختر کو ۱۲ باپ کی میراث سے اور ۴ حصے ماں کی میراث سے جو مادرِ دختر نے اپنے شوہر کی میراث سے پائی تھی۔

اور پانچ حصوں کا ۲۴ حصوں سے جو اڑتالیس ہزار سے دس ہزار ہوئے ہیں بھائی مستحق ہے اور بھائی کی موجودگی میں بھتیجی کو کچھ نہیں ملتا۔

لہٰذا زید متوفی کا بھائی زوجہ زید سے جو کل مال زید پر متصرف ہے اپنے حصہ وصول کر سکتا ہے باقی کا زوجہ ودختر زید کو اختیار ہے خود رکھیں یا کسی کو ہبہ کریں۔

☆ بوجہ بد چلنی کے کوئی میراث سے محروم نہیں ہو سکتا۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ الغنی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی مفتی جامع مسجد اکبرآباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......282﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قصبہ بمبورہ علاقہ راج الور میں قاضی محمد صادق کے دو پسر امیر محمد وحسام الدین تھے۔ امیر محمد اپنے والد کی حیات میں کہ جس کو عرصہ تین سال کا ہوا فوت ہو گیا۔ اس وقت متوفی مذکور دولڑکے نابالغ چھوڑ گیا تھا کہ بالغ ہو کر وہ اپنے دادا کی حیات میں دونوں لڑکے فوت ہو گئے۔ پسرِ خورد اس وقت حیات ہے۔ انجام خدمتِ قضات دے رہا ہے۔ لہٰذا عرض پرداز ہوں کہ شرعا فوت ہوئے دادا خسر کے ترکہ ونیز حقِ قضات نکاح خوانی وغیرہ میں مستحق حصہ پانے کے ہے یا نہیں۔ یہ نکاح خوانی پشت در پشت چلی آتی ہے یہ ترکہ میں داخل ہے یا کہ حق الخذمت ہے اندریں صورت پوت بہو کا حق ہے یا نہیں۔

سائل: حسام الدین از بمبورہ علاقہ الور

۱۹ صفر ۳۵

الجواب

اللھم رب زدنی علما۔

بیٹی کی موجودگی میں جب شرعا پوتی ہی وارث نہیں ہو سکتی تو پوت (بہو) کس طرح وارث ہو سکتی ہے۔

☆ اور قضاتِ مروجہ حق الخذمت ہے داخلِ میراث نہیں۔ جو نکاح پڑھانے جائے گا وہ اپنے آنے کی اجرت لے گا۔

حررہ: العبد الراجی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی مفتی

جامع مسجد اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر......283﴾

سوال

منشی بدرالدین صاحب مرحوم کا ایک لڑکا اور دولڑکی ہیں۔ لڑکیوں کی شادی ہوگئی ان کا ترکہ جائداد مکانات نقد وغیرہ شرع کے کس حساب سے تقسیم ہونا چاہیے؟۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۱۶ء

مہتاب خان سب انسپکٹر محلہ منیجہ ٹولہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما.

صورتِ مسئولہ میں بصورت انحصار ورثہ کے اشخاص مذکورہ سوال میں بعد ماتقدم علی الارث یعنی مصارفِ تجہیز تکفین اور اداءِ دین اگر ہو اور تنفیذِ وصیت اگر میت نے کسی کو علاوہ ورثہ کی ہو تمام مال منقولہ وغیرہ منقولہ منشی صاحب مرحوم کی چار حصے پورے کر کے دو حصہ ان کے بیٹے کو دیدیئے جائیں اور ایک ایک حصہ ان کی دونوں لڑکیوں کو۔ صورتہ ھکذا

مسئلہ ۴

منشی بدرالدین

میت

لڑکا	دختر	دختر
۲	۱	۱

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی

محمد دیدار علی الرضوی مفتی جامع مسجد اکبرآباد

﴿فتویٰ نمبر......284﴾

سوال

ہزاری کے ورثہ' بیوہ ہزاری امیرن' ہزاری کا بھتیجا علی بخش' اور ہزاری کا بھتیجا رحیم بخش' اور بھتیجا ہزاری کا اللہ رکھا ہے۔

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

صورتِ مسئولہ میں بعد ما تقدم علی الارث یعنی ہزاری کی بیوی کے مہر وغیرہ اگر فی الواقع فقط یہی وارث ہیں' ان کے سوا اور کوئی وارث نہیں ہے' تو ہزاری کے کل مالِ متروکہ کے چار حصے کر کے چوتھائی مال یعنی ایک حصہ امیران زوجہ ہزاری کو ملے گا۔ اور بوجہ عصبہ ہونے کے ایک ایک حصہ تینوں بھتیجے بھی لیں گے۔

صورتہ ھکذا

ہزاری مسئلہ ۴

زوجہ	ابن الاخ	ابن الاخ	ابن الاخ
امیران	علی بخش	رحیم بخش	اللہ رکھا
۱	۱	۱	۱

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی الغنی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مفتی جامع مسجد اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......285﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک عورت کا انتقال ہوا۔اس نے شوہر ایک بیٹی ایک چچازاد بھائی ایک ماں وارث چھوڑے۔اس کے بعد شوہر کا انتقال ہوا۔اس نے ایک بیٹی ایک بھتیجا ایک بھتیجی وارث چھوڑے۔ہر ایک کا شرعی حصہ کیا ہوا؟

الجواب

بسم الله الرحمن الرحیم.

اللهم رب زدنی علما.

صورت مسئولہ میں کل مال ھندہ کے ۲۴ حصہ کر کے پندرہ حصہ بنت کو اور چار ام کو دو ابن العم کو اور تین ابن الاخ کو دیئے جائیں گے۔صورته هکذا.

ھندہ مسئلہ ۱۲/۲۴

میت

زوج	بنت	ام	ابن العم
۳	۶/۱۲	۲/۴	۱/۲

زوج مسئلہ ۲

میت

بنت	ابن الاخ	بنت الاخ
۱/۳	۱/۳	م

الاحیاء

بنت	ام	ابن الاخ	ابن العم
۱۵	۴	۳	۲

المبلغ

۲۴

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی ر

محمد دیدار علی الرضوی المفتی فی مسجد اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر......286﴾

سوال

مسمی نجا ولد بلاقی مرحوم کا مکان موروثی ہے۔ مسمی نجا کی زوجہ اور چھ دختران زندہ اور حیات ہیں۔ اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ اس مکان مذکورہ میں حق شرعا زوجۂ مسمی نجا مرحوم کا کیا ہے؟ اور دخترانِ نجا مرحوم کا کیا حق شرعی ہوتا ہے؟ اور مسمی نجا مرحوم کی زوجہ مسماۃ زبیا نے دختروں کی غیبت میں اس مکانِ مذکورہ بلا رضامندی دختران کے فروخت کر دیا۔ اب دختران اور زوجہ کا حق کتنا ہوا بتلایا جائے؟

سائل: کریم بخش محلہ ھینگ منڈی منالال کاٹیلہ

۱۷ ستمبر ۱۹۱۶ء

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما.

صورتِ مسئولہ میں بعد ماتقدم علی الارث مہر وغیرہ مسئلہ ۲۴ سے ہوگا یعنی جائداد نجا کے 24 حصے کر کے آٹھواں حصہ جو تین حصے ہیں نجا کی بیوی کو ملیں گے اور باقی بیٹیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ فقط

حررہ:

محمد دیدار علی، مفتی مسجد جامع اکبر آباد

۱۸ ستمبر ۱۹۱۶ء
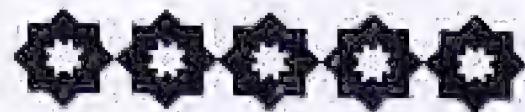
﴿فتویٰ نمبر...... 287﴾

سوال

فضل علی شاہ نے انتقال کیا۔ ایک بی بی اور کئی ورثہ چھوڑے۔ بی بی کا مہر پانچ ہزار روپیہ ہے۔ اور وہ ادا نہیں ہوا ہے۔ سرکار میں (ریاست گوالیار) کے ایک محکمہ آب پاشی میں اس کا (متوفی کا) صرف چھ سو بیالیس روپیہ پندرہ آنہ زر اصل جمع ہے اور کچھ نہیں ہے۔ آیا یہ روپیہ کل مہر میں دیا جائے یا ورثہ پر تقسیم ہوگا۔ فقط

سائل: الٰہی بخش ڈاکٹر پینشنر سکنہ لوہامنڈی شہر آگرہ

۲۶ اگست ۱۹۱۶ء

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اللھم رب زدنی علما.

یہ کل روپیہ دینِ مہر میں دیا جائے گا۔ ورثہ کو کچھ نہیں مل سکتا۔ چنانچہ سراجی میں ہے۔

الاول یبدأ بتکفینه و تجهیزه غیر تبذیر ولا تقتیر ثم یقضی دیونه من جمیع ما بقی من ماله[۱] الخ.

(ترجمہ: میت کے ترکہ میں سب سے پہلے اس کی تجہیز و تکفین کی جائے اس میں فضول خرچی اور کنجوسی نہ کی جائے۔ پھر اس کے باقی ماندہ مال سے اس کے قرض ادا کیے جائیں)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

❁❁❁❁❁

---

[۱] السراجی صفحہ ۳ قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی

﴿فتویٰ نمبر......288﴾

سوال

علمائے دین کی خدمت میں گزارش ہے کہ ایک شخص فضل علی شاہ نے وفات پائی اور ماں' بھائی و باپ بہن اور بیوی وارث چھوڑے۔ بیوی کا مہر مبلغ پانچ ہزار روپیہ ہے جو ہنوز ادا نہیں ہوا ہے۔ مبلغ چھ سو بیالیس روپیہ ۵ آنہ زر اصل یافتنی متوفی مذکور سرکار گوالیار میں جمع ہیں۔ دریافت طلب' موجب استفتار یہ امر ہے کہ اول حصہ شرعی بروئے تقسیم زرِ مجتمع متوفی مذکور سے جملہ ورثا کو ملنا چاہئے یا زر جو بطورِ قرضہ متوفی مذکور پر ہے وہ بیوی متوفی کو ادا ہونا چاہئے۔

الجواب

حامدا و مصلیا و مسلما.

اللھم رب زدنی علما.

زرِ مجتمع اور جائدادِ منقولہ غیر منقولہ سے' اگر ہے' بعد تجہیز و تکفین زرِ مہر ادا کیا جائے گا۔ بعدہ اگر کچھ باقی رہے گا اور غیرِ ورثہ کو میت نے کوئی وصیت بھی کی ہو تو اس کے تین حصہ کرے۔ تہائی مال سے وصیت پوری کی جائے گی۔ پھر جو کچھ بچے گا وہ ورثہ پر اس طرح تقسیم کیا جائے گا۔ کہ کل مالِ باقیہ کے بارہ حصے کر کے تین حصہ زوجہ کو دیئے جائیں اور دو حصہ ماں کو اور باقی باپ کو صورته هكذا.

فضل علی شاہ مسئلہ ۱۲

میت

اخت حقیقی	اخ حقیقی	ام	اب	زوجہ
م	م	۲	۷	۳

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی مسجد جامع اکبر آباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......289﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دینِ متین اس مسئلہ میں کہ نبی بخش کا انتقال ہوگیا۔ اس نے تین لڑکے مسمی قادر بخش و حسین بخش و دیدار بخش اور ایک لڑکی مسماۃ لاڈو اور ایک بیوی مسماۃ ظہورن چھوڑی۔ بعدہ مسماۃ ظہورن کا انتقال ہوگیا اور اس نے ایک دختر اور تین پسر مذکور چھوڑے۔ بعدہ مسماۃ لاڈو کا انتقال ہوگیا۔ اس نے ایک پسر مسمی منا اور تین بھائی قادر بخش، حسین بخش، دیدار بخش مذکورہ چھوڑے۔ بعدہ دیدار بخش لاولد مرے اور انہوں نے دو بھائی قادر بخش، حسین بخش اور بیوی مسماۃ ممن۔ اب مسماۃ ممن اور قادر بخش حسین بخش اور منا پسر زندہ ہے۔ ان کو جائدادِ نبی بخش سے کس قدر حصہ ملے گا؟۔

سائل: حسین بخش، ۲۴ شوال ۱۳۳۴ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفی خصوصا علی حبیبہ محمد المصطفی و علی آلہ المرتضی و صحبہ ہداۃ الہدی اللھم ارنا الحق حقا و الباطل باطلا

صورتِ مسئولہ میں بعد ما تقدم علی الارث اور ہونے اسی قدر ورثہ کے کل جائداد و مالِ متروکہ نبی بخش کے چھپن 56 حصہ کر کے 22 حصے قادر بخش کو اور 22 حسین بخش کو دیئے جائے گی اور 8 حصہ ننھے کو اور چار حصے ممن زوجۂ دیدار بخش کو: صورتہ ھکذا۔

نبی بخش مسئلہ ۸/۵۶

میت

زوجہ	ابن	ابن	ابن	بنت
ظہورن	قادر بخش	حسین بخش	دیدار بخش	لاڈو
۱	۲/۱۴	۲/۱۴	۲/۱۴	۱/۷

ظہورن مسئلہ

میت

ابن قادر بخش	ابن حسین بخش	ابن دیدار بخش	بنت لاڈو
۲	۲	۲	۱

لاڈو مسئلہ۸

میت

ابن منا	اخ قادر بخش	اخ حسین بخش	اخ دیدار بخش
۸	محروم	محروم	محروم

دیدار بخش مسئلہ۴/۸

میت

زوجہ ممن	اخ قادر بخش	اخ حسین بخش	ابن الاخت
۱/۲/۴	۳/۶	۳/۶	محروم

الاحیاء

قادر بخش	حسین بخش	منا	ممن
۲۲	۲۲	۸	۴

حررہ: العبد العاصی
ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی المجددی
مفتی جامع مسجد اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......290﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس بارے میں کہ ھندہ کا انتقال بعمر ۲ سال ہوگیا۔ اس نے ایک بہن حقیقی اور والد اور والدہ چھوڑیں۔اور جائدادِ غیر منقولہ چھوڑی۔

اس کے ترکہ کا وارث شرعاً کون ہے؟

آیا بموجودگیِ والدین، ہمشیرہ بھی ترکہ پانے کی مستحق ہے یا نہیں؟

اور والدہ کو بھی ترکہ پہنچتا ہے یا نہیں؟

سائل: محمد زکریا خان ساکن فرید نگر

۱۶ شوال ۱۳۳۴ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وھو الموفق للصواب

صورتِ مسئولہ میں کل جائداد متروکہ ھندہ کے چھ حصہ کر کے ایک حصہ اس کی والدہ کو دیا جائے گا اور باقی پانچ حصہ بوجہ عصبہ ہونے کے اس کے باپ کو ملیں گے۔ اور بہن بوجہ موجودگی باپ کے محروم رہے گی۔ صورتہ ھکذا

ھذہ مسئلہ ۶

میت

ہمشیرہ حقیقی	اب	ام
محروم	۵	۱

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی المجددی

﴿فتویٰ نمبر……291﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ مسماۃ حبیباً نانی مجھ سائل کی تھی۔اس نے واقع ۲۲ دسمبر ۱۸۷۱ء کو جائدادِ مفصلہ ذیل بذریعہ بیع نامہ نوشتہ شوہرِ خود مسمی قادر بیگ حاصل کی۔اور اس پر قبضہ مالکانہ حاصل کر کے تاحیاتِ شوہر و بعد وفاتِ شوہر قابض و متصرف بلاشرکت غیرے رہی۔وقتِ وفاتِ خود فقط پانچ فرزند فیاض بیگ، اسماعیل بیگ، ریاض الدین بیگ، عظیم بیگ، غفور بیگ اور دو دختر مسماۃ ھرمزی و جمو کو وارث چھوڑا۔

بعدہ مسماۃ ھرمزی نے انتقال کیا۔اور وقتِ وفات لطف اللہ خان شوہر خود اور دو لڑکے مسیح اللہ خان و شفیع اللہ خان کو وارث چھوڑا۔امر مسئول یہ ہے کہ سائل شفیع اللہ خان متروکہ حبیباً سے منجملہ کتنے سہام کا مالک و مستحق بروئے شرع محمدی ہوتا ہے؟ بینوا توجروا

سائل: شفیع اللہ خان

ساکن مدرسہ شاہی آگرہ

۱۱ شوال ۱۳۳۴ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صورتِ مسئول عنہا میں بعد ماتقدم علی الارث مسماۃ حبیبا کے کل مال کے چھیانونے (۹۶) حصہ کر کے سولہ سولہ تو پانچوں بیٹوں کو دیئے جائیں گے اور آٹھ آٹھ دونوں دختروں کو۔پھر ھرمزی دختر متوفیہ کے آٹھ حصوں میں دو حصے اس کے شوہر مسمی لطف اللہ خان کو دیئے جائیں گے اور تین تین حصہ اس کے دونوں پسر مسمی مسیح اللہ خان اور شفیع اللہ خان کو فقط

و صورة المسئلة هكذا

حیا ۶۹/۱۲

میت

فیاض بیگ	اسماعیل بیگ	ریاض الدین بیگ	غفور بیگ	عظیم بیگ	ہرمزی	حمو
۲/۱۶	۲/۱۶	۲/۱۶	۲/۱۶	۲/۱۶	۱/۸	۱/۸

ہرمزی مسئلہ ۸/۴

میت

شوہر لطف اللہ خان	پسر مسیح اللہ خان	پسر شفیع اللہ خان
۱/۲	۳	۳

حررہ: العبد الراجی ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی مفتی جامع مسجد آگرہ

﴿فتویٰ نمبر......292﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس جائداد مفصل ذیل میں مسماۃ اختر بیگم نے کچھ جائداد بذریعہ ہبہ نامہ جمیلہ بیگم و زینت جہاں بیگم کو حصہ مساوی دے دی اور زینت جہاں بیگم کا بعمر ۲' ۳ سال تخمیناً انتقال ہو گیا۔ بعد انتقال زینت جہاں بیگم کی متروکہ جائداد کس قدر ہمشیرہ حقیقی مسماۃ جمیلہ بیگم و منشی محمد زکریا خاں صاحب والد اور والدہ کو کس قدر حصہ شرعی پہنچتا ہے؟ اور ایک لڑکا اور ایک لڑکی اختر بیگم کے شوہر ثانی کا بھی ہے۔ وہ بھی حقدار ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

سائل: مستجاب خان'
سکنہ بلوچ پورہ
۹ شوال ۱۳۴۴ھ

الجواب

اللھم رب زدنی علما

☆ اگر اختر بیگم نے اپنی جائداد کے دو حصے مساوی کر کے دونوں لڑکیوں کو ہبہ کر کے ولی قریب ہر دو دختران کے' جو ان کا باپ ہے' اُس جائداد پر قبضہ دے دیا تھا' تو بے شک وہ جائداد اُن دونوں نابالغہ لڑکیوں کی مملوک ہو گئی۔ لہٰذا بعد وفات ایک دختر مسماۃ زینت جہاں بیگم بحالتِ صغر سنی اس کی جائداد مملوکہ سے چھ حصے کر کے ایک حصہ اس کے والدہ کو اور باقی پانچ حصہ بطریقِ عصوبت سب باپ کو۔ اور باپ کی موجودگی میں اخیافی یعنی ماں کی طرف سے' بہن بھائی بالاتفاق محروم رہیں گے اور نیز حقیقی بہن محجوب۔

صورته هکذا

زینت جہاں بیگم مسئلہ /۶

میت

اخت جمیلہ بیگم	اب محمد زکریا خان	ام اختر بیگم	اخ اخیافی	اخت اخیافی
محروم	۵	۱	محروم	محروم

فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ المفتی

ابو محمد محمد دیدار علی مفتی

جامع مسجد اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر.......293﴾

سوال

عظمت علی مرے۔ رحمت علی، محمد علی لڑکے چھوڑے۔ محمد علی مرا۔ زوجہ دلبری، لڑکا عبدالرزاق چھوڑے پھر عبدالرزاق مرا، ماں دلبری، چچا رحمت علی چھوڑا۔ رحمت علی مرا، واحد علی اور فاطمہ کو چھوڑا ترکہ کس طرح تقسیم ہو گا، مہرِ زوجہ محمد علی پانچ ہزار باقی ہے۔

سائل: مراد علی محلہ گڑھ حجام

۲۳ اپریل ۱۹۱۶ء

الجواب

هو المصوب

عظمت علی   مسئلہ ۱۴۴

میت

رحمت علی	محمد علی
۱/۸/۲۴	۱

محمد علی   مسئلہ ۸

میت

زوجہ	ابن
دلبری	عبدالرزاق
۱/۳/۹	۷

عبدالرزاق مسئلہ ۳

میت

ام	عم
دلبری	رحمت علی
۱/۷/۲۱	۲/۱۴

رحمت علی مسئلہ ۳

میت

ابن	بنت
واحد علی خان	فاطمہ
۲/۷۶	۱/۳۸

بعد ادائے دینِ مہر ترکہ ایک سو چوالیس سہام (۱۴۴) ہو کر دلبری کو تیس (۳۰) حصے، واحد علی کو چھہتر (۷۶) اور فاطمہ کو اڑتیس (۳۸) دے دیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب وعندہ ام الکتاب.

المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......294﴾

سوال

صغریٰ مری۔اس کے ماموں کے چار لڑکے' ایک لڑکی اور خالہ کے ایک لڑکی اور ایک لڑکا چھوڑا۔ترکہ کیوں کر تقسیم ہوگا؟۔

سائل: محمد دلیر خان محلّہ قاضی خیل شاہ جہان پور
۲۳ اپریل ۱۹۱٦ء

الجواب

هو المصوب

صغری مسئلہ ۳/ ۲۷

رسول بی بی	شفاعت اللہ	اصغری	عزیز اللہ'	لطف اللہ'	ابن حسن'	علی حسن'
۳	٦	۲	۴	۴	۴	۴

(ابناء الخال — اولاد الخالہ)

بصورتِ عدمِ مانع ترکہ مورثہ بست و ہفت سہام کردہ چار چار ہر یک از حسن علی' ابن حسن' لطف اللہ' عزیز اللہ' دو بمسماۃ اصغری' شش بہ شفاعت اللہ' و سہ بہ رسولن خواہند بخشید۔

لانهم اخذوا الصفة من الاصول والعدد من الفروع و به نفتى .حامديه.

(ترجمہ: مانع موجود نہ ہونے کی صورت میں' وراثت میں چھوڑے ہوئے ترکہ کے ستائیس (۲۷) حصے کر کے چار' چار (۴'۴) حصے حسن علی' ابن حسن' لطف اللہ اور عزیز اللہ کو' دو (۲) حصے مسماۃ صغری کو چھ (٦) حصے شفاعت اللہ کو اور تین (۳) حصے رسولن کو عطا کیے جائیں گے۔کیونکہ انہوں نے اصول کی صفت پالی ہے اور عدد فروع سے ہے تنقیح فتاوی حامدیہ۔ **واللہ اعلم وحکمہ احکم**

المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......295﴾

سوال

شیخ حراب النبی نے انتقال کیا اور زوجہ وجہ النساء اور دختر سلمی اور بھائی عبد النبی کو چھوڑا۔ پھر وجہ النساء فوت ہوئی اور دختر کنیز سلمی اور چار بھتیجے چھوڑے۔

سائل: سید اصغر حسین
مسجد لوکل
۲۳ اپریل ۱۹۱۶ء

الجواب

هو المصواب

حراب النبی مسئلہ ۸×۸=۶۴

میت

زوجہ	دختر	اخ
وجہ النساء	کنیز سلمی	عبد النبی
۱	۴×۸=۳۲	۳×۸=۲۴

وجہ النساء مسئلہ

میت

دختر	ابناء الاخ ۴ نفر
۴	۴

الاحیاء

سلمی	عبد النبی	ابناء الاخ
۳۶	۲۴	۴

ترکۂ مورث شصت و چہار سہام کردہ، سی و شش سہام بہ سلمی، و بہ عبد النبی بست و چار سہام، و بہ ہر چار

ابناءالاخ چار سہام بدہند۔

(ترجمہ: وراثت میں چھوڑے ہوئے ترکہ کے چونسٹھ (۶۴) حصے کرکے چھتیس (۳۶) سلمی کو چوبیس (۲۴) عبدالنبی کواور چار ے حصے چاروں بھتیجوں کو دیں گے) واللہ اعلم وحکمہ احکم

المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

﴾فتویٰ نمبر......296﴿

سوال

ولایت اللہ خان کی تین زوجہ تھیں۔اور اولاد ہر ایک سے موجود ہے۔اول سے مجید اللہ خان دوم سے دو بیٹے لوشاء اللہ،ماشاء اللہ۔سوم سے ثناء اللہ، مسماۃ حسینی۔زوجہ اول کا انتقال ہوگیا۔مجید اللہ دینِ مہر میں قابض کچھ جائیداد کا ہوگا۔زوجہ دوم، سوم حقیقی بہنیں ہیں۔اور اب ولایت اللہ نے تمام جائداد (مجید اللہ خان کے نام) ہبہ لکھ دی۔اور ایک زوجہ کو طلاق لکھ دی۔

اب استفسار یہ ہے کہ مجید اللہ کے بیٹوں اور تین بیٹیوں کو کیا ملے گا۔اور سوتیلی ماؤں کا حصہ اس کی جائیداد میں ہے یا نہیں؟

الطاف حسین از سرائے اگست ضلع ایٹہ

۲۲۔اپریل ۱۹۱۶ء

الجواب

ھو المصوب

ترکہ مجید اللہ خان یک ہزار و ہشت سہام کردہ بعد ادائے دینِ مہر ہر دو زوجۂ مجید اللہ یک صد و بست و شش سہام نصف نصف کردہ بدہند و ہر یک از دختراں دو صد و بست و چار و برادران علاتی ہر یک را شصت سہام و نصف آں مسماۃ حسینی خواہند داد۔اگر بدرستی وارثان ولایت اللہ ہر دو زوجہ کہ ہمشیرگانِ حقیقی ہستند۔تفریق واجب است و تعزیر لازم۔

ترجمہ: دین مہر کی ادائیگی کے بعد، مجید اللہ خان کے ترکہ کے ایک ہزار آٹھ کرکے، اس کی دونوں میں بیویوں کو ایک سو چھبیس (۱۲۶) کا نصف نصف (۶۳، ۶۳) حصے دیئے جائیں گے بیٹیوں میں سے ہر ایک کو دو سو چوبیس (۲۲۴) حصے، علاتی بھائیوں میں ہر ایک کو ساٹھ (۶۰) اور اس کا نصف یعنی تیس (۳۰) حصے مسماۃ حسینی کو دیئے

جائیں گے۔ ولایت اللہ کے وارثوں میں دونوں بیویاں جو حقیقی بہنیں ہیں ان میں تفریق واجب تھی اور تعزیر لازم)

مجید اللہ

میت

زوجہ	زوجہ	بنات			اخوۃ الاب			اخت الاب
سلمٰی	لیلٰی	کریمہ	سمیدہ	حمیدہ	لوشاء اللہ۔	ماشاء اللہ۔	ثناء اللہ	حسینی بیگم
۶۳	۶۳	۲۲۴	۲۲۴	۲۲۴	۶۰	۶۰	۶۰	۳۰

عالم گیریہ میں ہے:۔

و ان فارقها بعد الاخول فلها المهر و يحب الاقل من المسمى و من مهر المثل و عليها العدة و يثبت النسب و يعتزل عن امراته حتى تنفضى عدة اختها كذافى المحيط[1] .

(ترجمہ: اگر زوجہ کی بہن سے نکاح کیا اور دخول کے بعد اس سے الگ ہوا تو اس کے لیے مہر ہے۔ مہر مثل اور مقرر کردہ مہر میں سے جو کم ہوگا واجب ہوگا۔ اور علیحدہ ہونے والی اس صورت پر عدت لازم ہے اور اگر اس سے اولاد ہوگی تو اس کا نسب اس مرد سے ثابت ہوگا۔ وہ مرد اپنی پہلی زوجہ سے الگ رہے جب تک کہ اس کی بہن کی عدت ختم نہ ہو جائے) والله اعلم بالصواب و عنده ام الكتاب.

المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

❁❁❁❁❁

---

[1]. الفتاوی العالم گیریہ مع ترجمہ اردو جلد ۲ صفحہ ۷۲ مطبوعہ المکہ پریس .

﴿فتویٰ نمبر...... 297﴾

سوال

باز میر اور اس کی زوجہ کو چند قرابت داروں نے قتل کیا۔ اول باز میر خان مر گیا۔ پھر اس کی زوجہ مری۔ اس نے ایک بہن اور بھانجی وغیرہ چھوڑے۔ ترکہ بموجب حکم شرع کس کو ملے گا؟۔

سائل: رحم علی خان افغان'
قصبہ ماڑی ریاست دھول پور
۲۸ مارچ ۱۹۱۶ء

الجواب

بصورت عدم مانع' ترکۂ باز میر خان کا تمام و کمال اس کی زوجہ کو پہنچا اور اس کی وفات پر اس کی بہن کو دیا جاوے گا۔ بہن کی موجودگی میں شرعاً کوئی ضبط کر سکتا نہیں ہے۔ اور قاتلان ترکہ سے قطعی محروم ہیں۔

مسئلہ باز میر خان
میت
زوجہ سکھو

مسئلہ
میت
اخت سکھو

هكذا حكم الفرائض والله اعلم بالصواب و عنده ام الكتاب
المفتی السید محمد اعظم شاہ عفی عنہ

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر...... 298﴾

سوال

نظام الدین مرا۔ اس نے بی بی اور دو لڑکیاں چھوڑیں اور دو سگے بھائی۔ بعد بی بی مری اس نے دو لڑکیاں چھوڑیں۔ پس از روئے شرع شریف ترکہ کیسے تقسیم ہوگا۔ جب تین سو باسٹھ روپیہ آٹھ آنہ چھوڑا ہو۔

سائل: نواب حسین برادر نظام کڑہ سوئی آگرہ

۹ مارچ ۱۹۱۶ء

الجواب

هو المصوب

نظام الدین

میت

زوجہ	بنت	بنت	اخ	اخ
امتیازی بیگم	مصطفائی	خوشنودی	نواب	ولی الدین
(۶)	۱۶	۱۶	۵	۵

امتیازی بیگم

میت بیدہ ۶/۳

مصطفائی	خوشنودی
۳	۳

بصورتِ عدمِ موانع ترکۂ مورث چہل و ہشت سہام کردہ نوزدہ، نوزدہ، ہر یک از مصطفائی بیگم و خوشنودی بیگم و پنج پنج، بہر یک از نواب و ولی الدین خواہند داد۔

یعنی بہ مصطفائی یک صد و چہل سہ روپیہ ہفت آنہ و سہ پیسہ و سہ پائی و ہمیں قدر بہ خوشنودی و بہ نواب سی

هفت روپیہ، دوازدہ آنہ ودو پائی و بہ ہمیں قدر بہ ولی الدین گردید۔

(ترجمہ: مانع موجود نہ ہونے کی صورت میں مورث کے ترکہ کے اڑتالیس (۴۸) حصہ کر کے مصطفائی بیگم اور خوشنودی بیگم میں سے ہر کو انیس (۱۹) انیس (۱۹) حصے، نواب اور ولی الدین میں سے ہر ایک کو پانچ (۵)، پانچ (۵) حصے دیئے جائیں گے۔ یعنی مصطفائی بیگم کو ایک سو تینتالیس روپے سات آنے، تین پیسے اور تین پائی (۳۔۳۔۷۔۱۴۳) اور اتنے ہی خوشنودی بیگم کو، نواب سینتیس روپے بارہ آنے اور دو پائی (۲۔۰۔۱۲۔۳۷) اور اتنے ہی ولی الدین کا حصہ ہے)

واللہ اعلم وحکمہ احکم

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......299﴾

سوال

مجید اللہ جان نے حسب ذیل ورثا چھوڑے۔ شرعاً تقسیم فرمادی جائے۔ دو زوجہ، تین دختر، تین بھائی علاتی، ایک چچا کا لڑکا۔

۴ مارچ ۱۹۱۶ء

حاکم گنج محلہ چلوی فرخ آباد انسپکٹر حلقہ او

الجواب

ھو المصوب

حمید اللہ خان مسئلہ ۱۰۰۸

میت

زوجہ	زوجہ	بنت	بنت	بنت	اخوہ علاتی			اخت علاتی	ابن العم
امیر بیگم	عید جان بیگم	بیگم	رحمت	نعمت	ماشاء اللہ	لوشاء اللہ	نثار اللہ	حسینی بیگم	نصرت اللہ
۶۳	۶۳	۲۲۴	۲۲۴	۲۲۴	۶۰	۶۰	۶۰	۳۰	محروم

بعد ادائے حقوق یک ہزار وہشت سہام کردہ شصت وسہ ہر یک از امیر بیگم و عید جان بیگم، دوصد بست وچہار ہر یک، بیگم ورحمت ونعمت وشصت سہام ہر یک از ماشاء اللہ ولوشاء اللہ ونثار اللہ وسی سہام بہ حسینی بیگم خواہند داد۔

(ترجمہ: حقوق کی ادائیگی کے بعد جائداد کے ایک ہزار آٹھ (۱۰۰۸) حصے کر کے زوجہ امیر بیگم اور زوجہ عید جان بیگم میں سے ہر ایک کو تریسٹھ (۶۳) بیٹی بیگم، بیٹی رحمت اور بیٹی نعمت میں سے ہر ایک جو سو چوبیس (۲۲۴) علاتی بھائی ماشاء اللہ، علاتی بھائی لوشاء اللہ اور علاتی بھائی نثار اللہ میں سے ہر ایک کو ساٹھ (۶۰) اور اخت علاتیہ حسینی بیگم کو تیس حصے دیں گے) واللہ اعلم و حکمہ احکم۔

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

﴿فتویٰ نمبر......300﴾

سوال

سالار بخش مرے۔ دو پسر، تین دختر چھوڑیں اور ایک زوجہ۔ پھر زوجہ مری۔ ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟

سائل: چوہدری اللہ بخش کڑہ نیال آگرہ

۲۱ فروری ۱۹۱۶ء

الجواب

بعد تقدیم ما تقدم ۵۶ سہام کر کے سولہ سولہ دونوں دونوں لڑکوں کو اور آٹھ آٹھ تینوں دختروں کو دیں گے۔

واللہ اعلم و حکمہ احکم.

مسئلہ ۷×۸=۵۶

میت

زوجه	ابن	ابن	بنت	بنت	بنت
ماتت وترکت	۷×۲	۸×۲	۸×۱	۸×۱	
هذه الورثة	۱۶	۱۶	۸	۸	

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

﴿فتویٰ نمبر...... 301﴾

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ درج ذیل میں مسمی امیر بخش نے ایک زوجہ اور ماں' دو بھائی' ایک بہن اپنے وارث چھوڑے' اور بھتیجہ یتیم' جس کا باپ مرحوم کے سامنے فوت ہو گیا تھا چھوڑا۔ اور تین بھانجے اور دو بھانجیاں جن کی ماں یعنی مرحوم کی ہمشیرہ مرحوم کے سامنے فوت ہو گئی ہے چھوڑے ہیں۔ اب مرحوم کا ترکہ بحکمِ شرع کس طرح تقسیم ہو؟

الجواب

هو الموفق للحق والصواب

امیر بخش مسئلہ ۱۲/۶۰

زوجہ	ام	اخ	اخ	اخت
۳/۱۵	۲/۱۰	۱۴	۱۴	۷

صورتِ مسئولہ مذکورہ بالا میں ترکہ امیر بخش کا ساٹھ 60 سہام پر تقسیم ہوگا۔ ان جملہ میں سے 15 زوجہ کو اور 10 ماں کو' 14-14 دونوں بھائی کو اور 7 بہن کو ملیں گے۔ باقی وارث محروم رہیں گے۔

هکذا حکم الفرائض والله اعلم

عاجز محمد رمضان عفی عنہ
مفتی واعظ جامع مسجد آگرہ
۲۲ دسمبر ۱۹۱۵ء

﴿فتویٰ نمبر......302﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ حسب ذیل اشخاص کی وفات ہوئی۔ از روئے شرع شریف حصہ ہر ایک کا کیا ہوا؟۔ بینوا تو جروا

1 امان اللہ مرا۔ اس نے نبی بخش، کریم بخش پسران، عمدہ، نبی جان دختران چھوڑیں۔

2 نبی بخش مرا اس نے زوجہ لدو، امرن، رحیمن، قسیمن دختران کریم بخش بھائی، عمدہ، نبی بہن چھوڑیں۔

3۔ کریم بخش مرا زوجہ خواجن، بہن عمدہ، نبی جان چھوڑیں

4۔ عمدہ مری بدرالدین، پیرالدین، وہاب الدین پسران، بوبن، بیگم دختران چھوڑیں۔

5۔ خواجن مری، بھانجا یک، بھانجیاں ۳ نفر، بھتیجی یک بھتیجی یک چھوڑیں۔

۲۰ دسمبر ۱۵ء شیخ عنایت

الجواب

ھو المصوب

امان اللہ مسئلہ ۲۷۶۴۸/۳۴۵۶/۸۶۴/۶

بنات		ابناء	
عمدہ	نبی جان	نبی بخش	کریم بخش
۱/۱۴۴/۵۷۶	۱/۴۴/۵۷۶/۴۶۰۸	۲	۲/۲۸۸

نبی بخش مسئلہ ۱۴۴/۲۸۸/۷۲/۲۴/

میت بیدہ (۲)

لدو (زوجہ)	امرن (بنت)	رحیمن (بنت)	قسیمن (بنت)
۳/۹/۳۶/۱۴۴/۱۱۵۴	۱۶/۲۴/۲۵۶/۲۰۴۸	۱۶/۲۴/۲۵۶/۲۰۴۸	۱۶/۲۴/۲۵۶/۲۰۴۸

اخ	اخت	
کریم بخش	عمدہ	بنی جان
۳۰	۱۵/۶۰	۱۵/۶۰/۴۸۰

مسئلہ:۴/۸/۴ کریم بخش

میت بیدہ۱۰۹/۳۱۸

زوجہ	اخوات	
خواجن	عمدہ	نبی جان
۱/۲/۲۱۸/۱۷۴۴	۳/۳۲۷	۳/۳۲۷/۲۶۱۶

مسئلہ۸ عمدہ بیدہ ۹۶۳

ابناء			بنات	
بدرالدین،	پیرالدین،	وہاب الدین اق	بوبن،	بیگم
۲/۱۲۶	۲/۱۹۲۶	۲/۱۹۲۶	۱/۹۶۳،	۱/۹۶۳

مسئلہ۱۵/۳ خواجن

میت

بنات الاخ		بنات الاخت			ابن الاخت
سعیدہ،	شریفہ	سلمیٰ،	لیلیٰ،	عزیزہ	شفیق
۵	۵	۱	۱	۱	۲

واللہ تعالیٰ اعلم احکم

کتبہ: المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

﴿فتوی نمبر...... 303﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ زید نے انتقال کیا اور ایک بی بی سات بیٹیاں ایک بیٹا ایک بھتیجی وارث چھوڑے پس بموجب شرع شریف زید کا ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟۔

سائل کریم بخش ۸ دسمبر ۱۹۱۵ء

الجواب

ھوالملھم للحق والصواب

زید
↓
میت

زوجہ۔	ابن۔	بنت۔	بنت۔	بنت۔	بنت۔	بنت۔	بنت۔	بنت۔	بنت الاخ
↓	↓	↓	↓	↓	↓	↓	↓	↓	↓
۱/۹	۱۴	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	م

بعد تقدیم ما تقدم علی الارث وعدمِ موانع وانحصارِ ورثہ جملہ ترکہ زید کا ۷۲ سہام پر منقسم ہوگا۔ ازاں جملہ 9 سہام زوجہ کو ملے گا اور 14 سہام ابن کو اور سات سات سہام ہر ایک بنت کو ملیں گے۔ اور بنت الاخ محروم ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

حررہ: عاجز محمد رمضان عفی عنہ

مفتی واعظ جامع مسجد آگرہ

مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۱۵ء

﴿فتویٰ نمبر......304﴾

سوال

کیافرماتے ہیں علماءِ دین اندریں صورت کہ ہندہ نے وقتِ انتقال ایک شوہر چھوڑا اور ایک مادر اور دو بھائی اور ایک زمین اور کچھ جائداد جو شوہر اول کے مہر سے خریدی تھی۔ اور وہ مہر اب شوہر ثانی کے ذمہ باقی ہے۔ یہ ترکہ ان ورثہ میں کس طرح تقسیم ہوگا؟

حافظ ظہور علی ساکن تیراھولی دروازہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صورتِ مسئولہ میں بعد ماتقدم علی الارث یعنی مصارفِ تجہیز و تکفین متوسط اور اداءِ قرضِ میت اگر ہو اور جاری کرنے وصیتِ میت کے اگر کوئی وصیت علاوہ وارث کے کی ہو جو کچھ مال بچے اس کے تیس (۳۰) حصہ کر کے اس میں سے پندرہ (۱۵) حصہ شوہر کو اور پانچ (۵) ماں کو اور چار (۴) چار (۴) دونوں بھائیوں کو اور دو (۲) بہن کو دیا جائے گا۔

صورتہ ھکذا

ھندہ مسئلہ: ۳۰/۶

میت

شوہر	ام	اخ	اخ	اخت
۱۵/۳	۵/۱	۴	۴	۲

المبلغ

۳۰

حررہ العبد الراجی رحمۃ ربہ

ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی المفتی فی جامع اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر......305﴾

سوال

اللہ بخش، خدا بخش، مولا بخش، تینوں بھائیوں نے ایک جائداد پختہ مکان اور کچھ زمین شرکت میں خریدی۔ پھر اللہ بخش کا انتقال ہوا۔ اس نے وقتِ انتقال علاوہ جائداد مذکور کے دوڈھائی سو کا زیور بھی چھوڑا۔ اور یہ وارث چھوڑے۔ زوجہ مسماۃ فیاضی، ماں مسماۃ رحمان بی بی اور دو بھائی۔ ان کی میراث کس طرح تقسیم ہوگی؟ بینوا توجروا

سائل: خدا بخش سکنہ نائی کی منڈی حلقہ ہدن خان

۲۷ شوال ۱۳۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صورتِ مسئولہ میں بعد ماتقدم علی الارث تیسرے حصے جائدادِ مشترکہ اور زیورِ متروکہَ اللہ بخش یعنی جائداد اور زیورِ اللہ بخش چوبیس (۲۴) حصے کر کے چھ (۶) حصے زوجہ کو دیئے جائیں گے اور چار (۴) حصے ام یعنی والدہَ اللہ بخش کو اور سات (۷) سات (۷) حصہ دونوں بھائیوں مسمی خدا بخش اور مولا بخش کو دیئے جائیں گے۔

واللہ اعلم بالصواب

حررہ العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحھی مسجد جامع اکبر آباد

حفظہ اللہ من شر الحساد

﴿فتویٰ نمبر......306﴾

سوال

بخدمت جناب مولانا دیدار علی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ ایک شخص کی زوجہ کا انتقال ہو گیا اس کے مال سے شوہر کو کس قدر ملے گا؟

۲ جمادی الاولی ۳۶ھ/ آدم جی جان محمد متولی
جامع مسجد ریاست بہاول نگر ملک کاٹھیاواڑ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

شوہر کو اگر دوسرے اولاد چھوڑ کر مری ہے۔لڑکا خواہ لڑکی چوتھائی کل مال کا ملے گا۔اور اگر لاولد مری ہے تو کل مالِ زوجہ سے آدھا ملے گا۔باقی دوسرے ورثہ بہن بھائی کو۔اگر بیٹی بیٹا نہ ہو اس طرح کہ دو دو حصہ بھائیوں کو ملیں گے اور ایک ایک حصہ بہنوں کو۔اور اگر بیٹا بیٹی ماں باپ سے ہوں باقی ان میں تقسیم ہوگا۔☆اور بغیر زوج کوئی وارث نہیں چھوڑا یہاں تک کہ نہ ماموں چھوڑا نہ خالہ نہ خالہ زاد بھائی نہ ماموں زاد وغیرھم تو اس زمانہ میں بوجہ نہ ہونے بیت المال کے وہ باقی بھی زوج کو دے دیا جائے اگر بہت مفلس ہو ورنہ مسلمان اپاہجوں کا وہ حق ہے۔

حررہ العبد الراجی رحمۃ ربہ
محمد دیدار علی مفتی جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر...... 307﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ مسماۃ حبیبا نے انتقال کیا اس نے پانچ بیٹے مسمیان فیاض بیگ و عظیم بیگ و ریاض الدین بیگ و غفور بیگ و اسماعیل بیگ' دو بیٹیاں ہرمزی خانم و حمو خانم کو وارث چھوڑا۔

اس کے بعد ہرمزی خانم نے انتقال کیا۔ اس نے ایک خاوند لطف اللہ خان دو بیٹے مسیح اللہ خان و شفیع اللہ خان اور پانچ مذکورہ الصدر (برادران) اور حمو بہن کو وارث چھوڑا۔

اس کے بعد مسیح اللہ خان نے انتقال کیا۔ اس نے ایک باپ لطف اللہ خان ایک بھائی شفیع اللہ خان اور ایک لڑکا سمیع اللہ خان اور ایک بی بی شافیہ کو چھوڑا۔

اس کے بعد لطف اللہ خان نے انتقال کیا اس نے ایک بیٹا شفیع اللہ خان و پوتا سمیع اللہ خان کو چھوڑا۔

امرِ مسئول یہ ہے کہ جائدادِ متروکہ حبیبا سے ہر ایک کتنے کتنے سہام کا بروئے شرع شریف مالک و مستحق ہے؟ اور کون محروم ہے۔ بینوا توجروا

شفیع اللہ خان

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں بعد ما تقدم علی الارث بصورت ہونے ورثہ کے اسی قدر جتنے مندرجہ ہیں' کل مالِ متروکہ حبیبا کے سات سو اڑسٹھ (۷۶۸) حصہ کر کے ایک سو اٹھائیس (۱۲۸) فیاض بیگ' عظیم بیگ' ریاض الدین بیگ' غفور بیگ' اسماعیل بیگ کو دیئے جائیں گے۔ اور چونسٹھ (۶۴) حصہ حمو کو اور چوالیس (۴۴) شفیع

اللہ کو اور سترہ (۱۷) سمیع اللہ کو اور تین (۳) شافیہ کو۔

صورتہ ھکذا

حبیا مسئلہ: ۱۲/۹۶/۷۶۸

میت

ابن	ابن	ابن	ابن	ابن
فیاض بیگ	عظیم بیگ	ریاض الدین بیگ	غفور بیگ	اسماعیل بیگ
۲/۱۶/۱۲۸	۲/۱۶/۱۲۸	۲/۱۶/۱۲۸	۲/۱۶/۱۲۸	۲/۱۶/۱۲۸

بنت	بنت
ہرمزی	حمو
۱	۱/۸/۶۴

ہرمزی مسئلہ ۴/۸

میت بیدہ (۱)

زوج	ابن	ابن	اخوہ	اخت
لطف اللہ	مسیح اللہ	شفیع اللہ	م	م
۱/۲/۱۶	۳	۳/۲۴		

مسیح اللہ خان مسئلہ ۲۴ بالثلث

میت بیدہ (۳)

زوجہ	اب	ابن	اخ
شافیہ	لطف اللہ	سمیع اللہ	شفیع اللہ
۳	۴	۱۷	م

لطف اللہ خان مسئلہ:۱

میت بیدہ(۲۰)

ابن	ابن الابن
۱/۲۰	م

الاحیاء

فیاض بیگ	عظیم بیگ	ریاض الدین بیگ	غفور بیگ	اسماعیل بیگ
۱۲۸	۱۲۸	۱۲۸	۱۲۸	۱۲۸

حمو	شفیع اللہ	سمیع اللہ	شافیہ
۴	۴۴	۱۷	۳

المبلغ

۷۶۸

حررہ العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی المفتی
فی جامع اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر...... 308﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص فوت ہوا اور اس نے مفصلہ ذیل رشتہ دار چھوڑے۔ بیوی' لڑکی' بھائی کا لڑکا' لڑکی جو بغیر عقدِ نکاح پیدا ہوئی یعنی باہر کی عورت سے جس سے نکاح نہیں ہوا۔

۱۳ فروری ۱۸ اء/۳ جمادی الاولی ۱۳۳۶ھ
عثمان علی محلہ خٹک پورہ فرخ آباد معرفت فضل حسین

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

صورتِ مسئولہ میں بعد ماتقدم علی الارث اور ادائے قرض ومہر وغیرہ کل مالِ زید کے آٹھ (۸) حصہ کر کے ایک (۱) حصہ بیوی کو دیا جائے گا اور سات (۷) حصہ بیٹی کو۔ صورتہ ھکذا

زید مسئلہ ۸

میت

زوجہ	بنت
۱	۷

اس واسطے کہ بھتیجا بھتیجی اگر فی الواقع ولد الزنا ہیں اور ان کا باپ بھی ان کے ولد الزنا ہونے اور بلا نکاح رکھنے ان کے کا مقر ہے تو ان کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس واسطے کہ زنا سے نسب ثابت نہیں ہوتا۔

کما ھو ظاھر من الروایۃ المذکورۃ فی آخر باب العدۃ فی صفحہ ۸۳ من الجزء الثانی من الجوھرۃ النیرۃ حیث قال:

واذا تـروجـت الـحامل من الزنا جاز النكاح ....ولا توطأ حامل حتى تضع حملها الا ان يكون هو الزانی فيجوز له ان يطاها.... ولا يمنع من و طيها ولها التفقة عند الكل ثم اذا جـاء ت بـولد ستة اشهر فصاعدا بعدالنكاح ثبت نسبه و يرث منه و ان جاء ت به لاقل من ذلک لا يثبت نسبه ولا يرث منه كذا في الواقعات[1]

☆(ترجمہ: زنا سے حاملہ عورت اگر نکاح کرے تو اس کا نکاح جائز ہے۔ ارشادِ نبوی ہے زنا سے حاملہ عورت کے ساتھ اس کا خاوند وضع حمل تک جماع نہ کرے ہاں اگر زانی نے نکاح کیا ہو تو وہ اس سے جماع کر سکتا ہے۔ اسے اس سے جماع سے منع نہ کیا جائے گا۔ تمام علماء کے نزدیک وہ عورت نفقہ کی مستحق ہے۔ پھر نکاح کے چھ ماہ یا اس سے زائد مدت کے بعد اس کے ہاں بچہ کی پیدائش ہو تو اس بچے کا نسب ثابت ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے باپ کی وراثت پائے گا۔ اور اگر اس سے کم مدت میں اس کا ہاں بچے کی پیدائش ہو تو اس کا نسب نکاح کرنے والے سے ثابت نہ ہوگا۔ اور نہ ہی وہ وراثت کا پائے گا۔ الواقعات میں اسی طرح ہے)

اور اگر فی الواقع نکاح ہو گیا تھا اور بھتیجا بھتیجی فی الواقع ولد الزنا نہیں ہیں گو بجز دو گواہوں کے اور کسی کو خبر نکاح نہ ہو تو آٹھ (۸) حصہ کل مال کے کر کے ایک حصہ تو بیوی کو ملے گا اور چار حصہ بیٹی کو اور دو بھتیجے کو اور ایک بھتیجی کو اگر بھتیجا بھتیجی دو ہیں۔

صورته هكذا

زید مسئلہ ۸

میت

زوجہ	بنت	ابن الاخ	بنت الاخ
۱	۴	۲	۱

حررہ العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی مسجد جامع اکبر آباد

[1] الجوهرة النيرة : جلد ۲ صفحه ۱۶۳ مطبوعه مكتبه امداديه ملتان

﴿فتویٰ نمبر......309﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ محمد بخش ہمارے دادا نے عرصہ تقریبا ۸۰ سال کا ہوا وفات پائی۔ اور انہوں نے دو لڑکے بڑا شیخ عنایت اللہ اور چھوٹا شیخ نصر اللہ اور ایک بیوہ اور دو مکان نمر ا' نمبر ۲ چھوڑے۔

عرصہ پچاس سال کا ہوا کہ بڑا لڑکا شیخ عنایت اللہ نے وفات پائی۔ انہوں نے تین لڑکے احمد اللہ و انعام اللہ' غلام جیلانی اور ایک اپنی زوجہ چھوڑی۔

چند سال بعد زوجہ محمد بخش نے انتقال کیا۔ اور اس کے چند سال بعد چھوٹے نصر اللہ نے انتقال کیا۔ انہوں نے دو لڑکی اور ایک لڑکا چھوڑا۔ اور اپنی زوجہ چھوڑی۔ شیخ نصر اللہ نے اپنی حیات میں ہر دو مکان نمبر ا' نمبر ۲ کو بضرورتِ خود رہن کر دیا۔ بابت مکان نمبر ا مرتہن نے نالش دائر عدالت کر دی۔ مکان نمبر ا زرِ رہن میں قرق ہو گیا۔ پسرانِ شیخ عنایت اللہ مرحوم نے جو اس وقت نابالغ تھے عدالت میں عذر دائر کر دی کہ ہم نابالغان کے حصہ کا رہن رکھنے کا چچا کو اختیار نہ تھا۔ عدالت سے مکانِ مذکور میں نصف حق ثابت کیا گیا۔ اور نصف مکان جو حصہ نصر اللہ سمجھا گیا نیلام کر دیا گیا۔ اس پر ہم لوگ قابض و داخل رہے۔ ایک بھائی ہمارا انعام اللہ درمیان میں فوت ہو گیا۔ بقیہ دو بھائی احمد اللہ و غلام جیلانی اب تک اس پر قابض چلے آتے ہیں۔

بعد گزرنے زمانہ ۴۵ سال کے پسر شیخ نصر اللہ کا دعوی کرتا ہے کہ اس مکان سے میری دادی کا حصہ مجھ کو دیا جائے۔

آیا وہ کچھ پانے کا مستحق ہے؟ دوسرا مکان نمبر ۲ خود ہی رہن تھا وہ بعد وفات شیخ نصر اللہ کے بیع ہو گیا۔ چونکہ مکان ۲ موروثی جائداد ہے اس میں مکان میں شرعی کچھ حق پسرانِ شیخ عنایت اللہ کو پہنچتا ہے یا نہیں؟ اور اگر مکان نمبر ا میں کچھ حصہ شرعی دادی کا پسر نصر اللہ کا نکلے تو وہ حصہ حالتِ موجودہ سے دیا جائے گا یا حالتِ سابقہ

سے؟ کیوں کہ بوجہ کہنہ اور بوسیدہ ہونے کے مکان کو پسران شیخ عنایت اللہ نے از سرِ نو بنوایا ہے۔

شجرہ محمد بخش

شیخ عنایت اللہ	شیخ نصر اللہ	بیوہ
احمد اللہ۔ انعام اللہ۔ غلام جیلانی	فیاض الدین۔ دختر۔ دختر	

الجواب

اللھم رب زدنی علما

محمد بخش مسئلہ ۹۲۱۶/۱۱۵۲/۱۶/۸

میت

زوجہ مریم	ابن عنایت اللہ	ابن نصر اللہ
۱۴۴/۲/۱	۷	۷

عنایت اللہ مسئلہ ۷۲۴/۲

میت　　بیدہ ۷

زوجہ	ام	ابن	ابن	ابن
فاطمہ	مریم	احمد اللہ	انعام اللہ	غلام جیلانی
۵۰۴/۶۳/۹/۳	۸۴/۱۲/۴	۹۵۲/۱۱۹/۱۷	۹۵۲/۱۱۹/۱۷	۹۵۲/۱۱۹/۱۷

مریم مسئلہ ۱

میت　　بیدہ (۲۲۸)

ابن نصر اللہ

۲۸۸　　بیدہ ۲۲۸

نصر اللہ مسئلہ ۳۲/۸　　توافق بالربع

میت　　بیدہ ۱۸۴/۷۳۲

زوجہ	ابن	بنت	بنت
زینب	عمر	زیدن	خانم
۱/۴/۷۳۲	۱۴/۲۵۶۲	۷/۱۲۸۱	۷/۱۲۸۱

اللھم ارنا الحق و الباطل باطلا. صورتِ مسئولہ میں بعد ماتقدم علی الارث کل مالِ محمد بخش کے نو ہزار دوسولہ (۹۲۱۶) حصہ کر کے حسبِ صورتِ مذکورہ بالا فاطمہ کو پانچ سو چار (۵۰۴) حصہ دیئے جائیں گے اور احمد اللہ کو نوسو بانوے (۹۹۲) اور اتنے ہی انعام اللہ اور اتنے ہی غلام جیلانی کو اور سات سو بتیس (۷۳۲) حصہ زینب کو دو ہزار پانچ سو باسٹھ (۲۵۶۲) حصہ عمر کو اور ایک ہزار دوسو اکیاسی (۱۲۸۱) زیدن اور اتنے ہی خانم کو بدیں تفصیل

الاحیاء

فاطمہ	احمداللہ	انعام اللہ	غلام جیلانی	زینب	عمر	زیدن	خانم
۵۰۴	۹۵۲	۹۵۲	۹۵۲	۷۳۲	۲۵۶۲	۱۲۸۱	۱۲۸۱

المبلغ

۹۲۱۶

لہٰذا کل مالِ محمد بخش کے من جملہ نو ہزرا دوسو سولہ (۹۲۱۶) حصوں کے تین ہزار تین سو ساٹھ (۳۳۶۰) حصہ کے حق دار عنایت اللہ کے تینوں بیٹے اور بیوی ہے ۔اور پانچ ہزار آٹھ سو چھپن (۵۸۵۶) حصوں کے حق دار نصر اللہ کے بیٹا' بیٹی اور بیوی رہی۔ اور اگر محمد بخش کی بیوی مریم نے قبلِ تقسیمِ حصص مہر بھی لیا ہوگا تو وہ بھی اور جو بھی اس کی ملک ہوگا وہ بھی فقط نصر اللہ کے ذریعہ فقط ورثۂ نصر اللہ ہی پر حسبِ تفصیلِ مذکورہ تقسیم ہوگا۔ اور اس میں سے اولادِ عنایت اللہ کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس واسطے کہ عنایت اللہ مریم سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ اور موجودگی بیٹے میں دادی کے مال سے پوتوں کو کچھ نہیں ملتا۔ البتہ انعام اللہ کے مال سے اگر انعام اللہ بعد مریم مرا ہے نصرا اللہ کی اولاد کو کچھ نہیں مل سکتا۔ اور اگر انعام اللہ مریم اپنی دادی کے سامنے مرا ہے تو جب بھی مالِ انعام اللہ سے اولادِ نصر اللہ کو کچھ نہیں مل سکتا۔ اس واسطے کہ دادی کی موجودگی میں کہ جو فاطمہ

ام انعام اللہ سے کچھ نہیں ملتا۔ لہٰذا کل مال انعام اللہ کا انعام اللہ کے بھائی اور ماں ہی کو ملے گا۔ اور اب صورت مسئولہ اس طرح ہو جائے گی کہ بعد ماتقدم علی الارث از مہر و دیگر دیونِ میت وغیرہ کے کل مال میت کے ستائیس ہزار چھ سو اڑتالیس (۲۷۶۴۸) حصہ کر کے انیس سو اٹھاسی (۱۹۸۸) حصہ فاطمہ کو دیئے جائیں گے اور احمد اللہ کو چار ہزار چھیالیس (۴۰۴۶) اور اتنے ہی غلام جیلانی کو۔ لہٰذا جملہ ورثا عنایت اللہ کے دونوں مکانوں میں دس ہزار اسی (۱۰۰۸۰) حصہ ہوئے۔ اور نصر اللہ سے زینب کو دو ہزار ایک سو چھیانوے (۲۱۹۶) حصہ دیئے جائیں گے۔ اور عمر کو سات ہزار چھ سو چھیاسی (۷۶۸۶) اور زیدن کو تین ہزار آٹھ سو تینتالیس (۳۸۴۳) اور اتنے ہی حصے خانم کو دیئے جائیں گے۔ لہٰذا جملہ ورثہ نصر اللہ کے کل سترہ ہزار پانچ سو اڑسٹھ (۱۷۵۶۸) حصے ہوں گے۔ حسبِ صورۃ:

محمد بخش مسئلہ ۸/۱۶/۱۱۵۲/۱۳۸۲۴/۲۷۶۴۸

میت

زوجہ	ابن	ابن
مریم	عنایت اللہ	نصر اللہ
۱/۲/۱۴۴	۷	۷/۵۰۴/۶۰۴۸

عنایت اللہ مسئلہ ۲۴/۷

میت بیدہ ۷

زوجہ	ام	ابن	ابن	ابن
فاطمہ	مریم	احمد اللہ	انعام اللہ	غلام جیلانی
۳/۹/۶۳/۷۵۶	۴/۱۲/۸۴	۱۷/۱۱۹/۱۴۲۸/۲۸۵۶	۱۷/۱۱۹	۱۷/۱۱۹/۱۴۲۸/۲۸۵۶

مریم مسئلہ ۱

میت بیدہ ۲۲۸

ابن	ابن الابن	ابن الابن	ابن الابن
نصر اللہ	احمد اللہ	انعام اللہ	غلام جیلانی
۲۲۸/۲۷۳۶	م	م	م

انعام اللہ مسئلہ ۱۲/۶

میت　　　　بیدہ ۱۱۹

جدہ	ام	اخ	اخ
مریم	فاطمہ	احمد اللہ	غلام جیلانی
م	۱/۲/۲۳۸/۴۷۶	۵/۵۹۵/۱۱۹۰	۵/۵۹۵/۱۱۹۰

نصر اللہ مسئلہ ۳۲/۸ توافق بستۃ عشر

میت　　　　بیدہ ۵۴۹/۸۷۸۴

زوجہ	ابن	بنت	بنت
زینب	عمر	زیدن	خانم
۱/۴/۲۱۹۶	۱۴/۷۶۸۶	۷/۳۸۴۳	۷/۳۸۴۳

الاحیاء

فاطمہ	احمد اللہ	غلام جیلانی	زینب	عمر	زیدن	خانم
۱۹۸۸	۴۰۴۶	۴۰۴۶	۲۱۹۶	۷۶۸۶	۳۸۴۳	۳۸۴۳

المبلغ

۲۷۶۴۸

حررہ: العبد الراجی

ابو محمد محمد دیدار علی المفتی فی جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......310﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ زید مرا۔ وہ صرف ایک مکان چار پانچ سو روپیہ کا رکھتا تھا ۔اس نے ایک لڑکی نابالغ' ایک بہن اور اپنی زوجہ اور اپنی والدہ چھوڑی۔ زوجہ نے دوسرا نکاح کر لیا ہے۔ وہ مکان ایک شخص کے پاس متوفی رہن کر گیا تھا۔ والدۂ متوفی اور اس کی بہن اس مکان کو فروخت کرنا چاہتی ہے۔ آیا اس میں زوجہ کے مشورے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ موافق شریعت کے ہر ایک کا کیا حصہ ہوا؟

۲۷ مارچ ۱۹۱۸ء

شیخ نبی بخش

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئلہ میں بعد ما تقدم علی الارث کل مالِ زید کے چوبیس (۲۴) حصہ کر کے تین (۳) حصہ زوجہ کو ملیں گے اور چار (۴) حصہ ماں کو اور بارہ حصہ بیٹی کو اور باقی پانچ (۵) حصہ بہن کو۔

صورته ھکذا

زید مسئلہ ۲۴

میت

زوجہ	ام	بنت	اخت
۳	۴	۱۲	۵

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی المفتی فی جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر...... 311﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسمی پہاڑی رنگ ریز نے ۱۲ مارچ ۱۸ء کو قضا کی۔ اور حسب ذیل رشتہ دار چھوڑے۔ تجیا ماں' فخر الدین بھائی' حبیب لڑکا' شکورن بیوی' بہن شکورن' بہن بشیرا۔ ۱۸ مارچ ۱۸ء کو حبیب ولد پہاڑی کا انتقال ہوگیا۔ تجیا دادی' فخر الدین چچا' شکورن ماں' زینب بیوی چھوڑی۔ اثاث البیت جو کہ موجود ہے وہ پہاڑی اور حبیب کی کمائی ہے۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس کی کتنی کمائی ہے؟ اس صورت میں اثاث البیت ورثا میں کس طرح تقسیم ہوگا؟

ورثا پہاڑی و حبیب از محلہ املی

الجواب

بسم الله الرحمن الرحيم۔

اللهم رب زدني علما

صورتِ مسئولہ میں بعد ماتقدم علی الارث اداءِ دین مہر وغیرہ اور وصیت ثلث مال سے اگر میت نے وصیت کسی وارث کو کی نہ ہو بصورت ہونے اسی قدر وارثوں کے ہر دو میں کل مال پہاڑی کے دوسو اٹھاسی (۲۸۸) حصہ کر کے چھتیس (۳۶) حصہ شکورن کو دیئے جائیں گے اور بیاسی (۸۲) حصہ تجیا کو اور اکیاون (۵۱) زینب کو اور ایک سو انیس (۱۱۹) فخر الدین کو باقی کسی کو کچھ نہیں ملے گا۔

صورته هكذا:

پہاڑی مسئلہ ۲۴/۲۸۸

میت

زوجہ ام ابن اخ اخت اخت

شکورن	تجیا	حبیب	فخرالدین	شکورن	بشیرا
۳/۳۶	۴/۴۸	۱۷	م	م	م

حبیب مسئلہ ۱۲

میت بیدہ ۱۷

زوجہ	جدہ	عم	سوتیلی ماں
۵۱/۳	۲۴/۲	۱۱۹/۷	م

الاحیاء

شکورن	تجیا	زینب	فخرالدین
۳۶	۸۲	۵۱	۱۱۹

المبلغ

۲۸۸

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی

ابومحمد محمد دیدارعلی المفتی فی جامع اکبرآباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر...... 312﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ مسماۃ ہندہ فوت ہوئی۔ اس نے وارث حسب ذیل چھوڑے۔ ترکۂ متوفی کتنے سہام پر تقسیم ہوگا؟ اور ہر وارث کو کتنے کتنے سہام پہنچیں گے؟ بینوا توجروا

تفصیل وارثان

پدرِ متوفی　　شوہرِ متوفی　　پسرِ متوفی　　دخترِ متوفی　　دخترِ متوفی

۵ جمادی الثانیہ ۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ھندہ مسئلہ ۱۲/۴۸

میت

شوہر	اب	ابن	بنت	بنت
۳/۱۲	۲/۸	۱۴	۷	۷

صورتِ مسئلہ میں بعد ماتقدم علی الارث اور منحصر ہونے ورثاء کے ورثۂ مذکورہ میں کل مال ہندہ کے اڑتالیس (۴۸) حصہ کر کے بارہ (۱۲) حصہ شوہر کو دیئے جائیں گے اور آٹھ (۸) باپ کو اور چودہ (۱۴) بیٹے کو اور سات (۷) سات (۷) حصہ دونوں بیٹیوں کو حسبِ صورتِ مذکورہ بالا واللہ اعلم وحکمہ أحکم

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ
ابو محمد محمد دیدار علی المفتی فی جامع اکبر آباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......313﴾

سوال

چہ می فرمایند علمائے دین متین دریں مسئلہ: مسمی فجا' امیر اللہ و عبداللہ یہ تین برادر حقیقی ہیں۔ اول فجا فوت ہوا اس کا ترکہ ایک بیٹا' چار بیٹیاں اور ایک زوجہ پر پہنچا۔ زاں بعد امیر اللہ فوت ہوا لاولد۔ وارثوں میں ایک عبداللہ برادر اور مسماۃ نجو زوجہ چھوڑی فجا کی۔ اولاد کو ترکہ پہنچے گا یا نہیں؟ مسئلہ کے سہام پر تقسیم ہوگا؟

۲۴ جمادی الثانی رسخاوت علی

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صورتِ مسئولہ میں بعد ماتقدم علی الارث اور ہونے ورثہ کے اسی قدر کل مالِ فجا کے اڑتالیس (۴۸) حصہ کر کے چھ (۶) حصہ زوجہ کو دیے جائیں گے اور چودہ (۱۴) حصہ ابن کو اور سات (۷) سات (۷) حصہ برابر چاروں بیٹیوں کو صورتہ ھکذا:

فجا مسئلہ ۸

زوجہ	ابن	بنت	بنت	بنت	بنت
۱/۶	۱۴	۷	۷	۷	۷

علی ہذا بعد ماتقدم علی الارث اور ہونے ورثہ کے اسی قدر کل مالِ امیر اللہ کے چار (۴) حصہ کر کے ایک (۱) زوجہ کو دیا جائے گا اور تین (۳) حصہ بھائی مسمی عبداللہ کو اور عصبہ قریب بھائی کی موجودگی میں بھتیجوں کو کچھ نہیں تھا۔

اللہ اعلم و علمہ احکم. صورتہ ھکذا:

امیر اللہ مسئلہ ۴

میت

اخ	زوج	ابناء الاخ
۳	۱	م

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ
ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی المفتی فی جامع اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر......314﴾

سوال

چہ می فرمایند علماءِ دین ومفتیانِ شرعِ متین دریں مسئلہ مسماۃ لاڈو فوت ہوئی۔ الٰہی بخش خاوند ڈ مسماۃ رحیما والدہ اور تین بھائی حقیقی چھوڑے۔ مسئلہ کتنے سہام پر تقسیم ہوگا؟

سخاوت علی

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صورتِ مسئولہ میں بعد ماتقدم علی الارث کے اگر بجز ان ورثہ کے اور کوئی وارث نہیں ہے کل مالِ لاولد کے اٹھارہ (۱۸) حصہ کر کے نو حصہ شوہر کو دیئے جائیں گے اور تین (۳) حصہ اس کی والدہ مسماۃ رحیما کو اور باقی دو (۲) دو (۲) حصہ تینوں بھائیوں کو

صورتہ ھکذا

لاڈو مسئلہ ۱۸/۶

میت

زوج	ام	اخ	اخ	اخ
الٰہی بخش	رحیمن	۲	۲	۲
۳/۹	۱/۳			

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی المفتی فی جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......315﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ ایک عورت مسماۃ بشارتی بیگم فوت ہوئی ۔اس نے ایک بہو مسماۃ نیازی بیگم اور ایک بھاوج مسماۃ فیاضی بیگم جن کے خاوند بشارتی بیگم کی حیات میں فوت ہو چکے ہیں اور ایک علاتی بہن مسماۃ ارشادی بیگم' مرحومہ کی ایک لڑکی یعنی بشارتی کی بھانجی مسماۃ کنیز فاطمہ اور دوسری علاتی بہن مسماۃ ممتازی بیگم مرحومہ کی ایک لڑکی مسماۃ اکرامی بیگم اور دو لڑکے حکیم سید باقر علی اور حکیم سید یاد علی چھوڑے ۔اس صورت میں ترکۂ بشارتی بیگم کس کس پر کس طرح تقسیم ہوگا؟

۲ رجب ۳۶ھ

محمد علی میوہ کڑہ اکبر آبادی

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں امام محمد اور امام اعظم رحمۃ اللہ کے نزدیک چونکہ بوجہ ہونے مسئلہ کے ردیہ بعد ماتقدم علی الارث کل مالِ بشارتی بیگم کا نصف ارشادی کا اور نصف ممتازی کا قرار دے کر دونوں کی اولاد پر بطریق معروف للذکر مثل حظ الانثین کما ھو ظاھر من روایۃ المذکورۃ فی صفحہ ۵٦۱ من الشافعی المصری.

لہٰذا کل مال بشارتی کے دس (۱۰) حصہ کر کے پانچ (۵) حصہ ارشادی بیگم کو دیئے جائیں گے اور دو (۲) دو (۲) حصہ حکیم سید یاد علی اور حکیم سید باقر علی کو اور ایک (۱) حصہ اکرامی بیگم کو اور بوجہ امام اعظم رحمۃ اللہ امام محمد رحمۃ اللہ کے ساتھ یہی قول قوی معلوم ہوتا ہے اور چونکہ ارشادی بھی قبل بشارتی کے مر چکی ہے لہٰذا اس کے پانچ (۵) حصہ

کنیز فاطمہ کو مل جائیں گے۔

صورته هکذا

بشارتی بیگم مسئلہ ۲/۱۰

اخت ارشادی بیگم	اخت ممتازی بیگم
۵/۱	۱

ممتازی بیگم مسئلہ ۵

ابن یادعلی	ابن باقرعلی	اخت اکرامی بیگم
۲	۲	۱

بہو اور بھاوج کو شرعاً کچھ نہیں ملتا۔ فقط

اور امام ابی یوسف رحمہ اللہ چونکہ لحاظ ان اصول کا جو میت کے سامنے مر چکے ہیں نہیں کرتے لہٰذا ان کے نزدیک میراثِ بشارتی اس طرح تقسیم ہوگی کہ کل مال بشارتی کے بعد ماتقدم علی الارث چھ (۶) حصہ کر کے دو (۲) دو (۲) حصہ حکیم سید یادعلی اور حکیم سید باقرعلی کو اور ایک (۱) ایک (۱) حصہ اکرامی بیگم اور کنیز فاطمہ کو دیا جائے گا۔

بشارتی بیگم مسئلہ

میت

ابن الاخت	ابن الاخت	بنت الاخت	بنت الاخت
باقرعلی	یادعلی	اکرامی بیگم	کنیز فاطمہ
۲	۲	۱	۱

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ

ابو محمد محمد دیدار علی المفتی فی جامع اکبرآباد

﴿فتویٰ نمبر...... 316﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص وزیر خان نامی جس کے تین بیٹے اور تین لڑکیاں اور جائداد یعنی مکان وزیر خان مرحوم کا مبلغ چار سو روپیہ کا ہے۔ جس میں دو سو قرض ہیں۔ اب مطابق شرع شریف تقسیم کس طرح ہونی چاہیے؟

۶ رجب ۳۶ھ

نذیر خان ساکن منٹولہ اکبر آباد

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں بعد ما تقدم علی الارث اداءِ دینِ میت وغیرہ کے جو فارغ قرض سے جائداد قیمتی دو سو روپیہ کی بچے اس کے نو (۹) حصہ کر کے دو (۲) دو (۲) حصہ تینوں بیٹوں کو دے دیئے جائیں گے اور ایک (۱) ایک (۱) حصہ تینوں بیٹیوں کو۔

صورتہ ھکذا

وزیر خان مسئلہ ۹

میت

ابن	ابن	ابن	بنت	بنت	بنت
۲	۲	۲	۱	۱	۱

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر...... 317﴾

سوال

بعالی خدمت فیض درجت جناب مولانا مولوی مفتی سید محمد دیدار علی صاحب جامع مسجد شہر آگرہ دام ظلہ

بعد سلام سنت الاسلام کے عرض ہے کہ ایک مقدمہ دیوانی حسب ذیل فتوی عدالت سٹی مجسٹریٹی بھرت پور میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے التماس ہے کہ بموجب قانونِ شرع محمدی فتوی ارقام فرما کر مرحمت فرمایا جائے تا کہ پیشِ عدالت موصوف کیا جائے۔

پدر نے اپنے پسر کو بوجہ اس کے کہ اس نے ایک طوائف کو بہ سلسلہ آشنائی ڈال لیا اس کو دو مکان اپنی جائداد سے علیحدہ کر کے بموجب حصہ دے دیئے۔ اور وہ مکانات تا حیات اس کے قبضہ میں رہے۔ چنانچہ پسر اس کے ان مکانات سے بروئے تحریر کچھ تعلق نہ رکھتے۔ اور اس طوائف کے بطن سے دو پسر ناجائز ہوئے۔ اور وہ مکانات بوجہ بد چلنی پسرانِ طوائف ضبط و نیلام ہو جائیں تو کیا ہر دو طوائف زادہ بوجوہاتِ بالا بقیہ ترکہ مورثِ اعلی میں حقدار ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ اس بارے میں علمائے دین کیا فرماتے ہیں؟

۱۹ اپریل ۱۹۱۸ء

فاطمہ بیوہ نبی بخش قوم شیخ بلند دروازہ بھرت پور

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

☆ طوئف زادے اگر اس طوائف سے نکاحِ صحیح نہیں ہوا تھا اور بلا نکاح وطیِ حرام کے وہ پیدا ہوئے ہیں ان کا نسب اس حرام کار سے ثابت نہیں ہوتا۔ ☆ وہ اس حرام کار کی میراث میں کسی وراثت سے کوئی حصہ نہیں لے سکتے۔ اور ان کو اس کے مالِ متروکہ سے کچھ نہیں پہنچتا۔ چنانچہ یہ امر عبارت صفحہ ۵۰

جلد ہشتم بحرالرائق سے ظاہر ہے حیث قال

و فی المضمرات اعلم بان الکفار یتوارثون فیما بینھم بالاسباب التی یتوارث بھا المسلمون من نسب او سبب او نکاح ولا خلاف انھم لا یرثون بالانکحۃ التی لا تصح بین المسلمین بحال نحو نکاح المحارم بنسب اور ضاع و نکاح المطلقۃ قبل التزویج بزوج آخر[1]

(ترجمہ: مضمرات میں ہے کہ کفار آپس میں ان اسباب کی بنا پر وراثت پاتے جن کی وجہ سے مسلمان وراثت کے مستحق ہوتے ہیں۔ مثلاً نسب یا سبب یا نکاح اور اس بارے میں میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ ان نکاحوں کے باعث وراثت نہیں پاتے جو مسلمانوں کے درمیان کسی صورت میں بھی صحیح نہیں۔ مثلاً نسب' رضاعت کے باعث محارم کے ساتھ نکاح یا جس عورت کو تین طلاقیں دی جا چکی ہوں اس کے ساتھ دوبارہ نکاح بغیر اس کے کہ وہ کسی دوسرے خاوند کے ساتھ نکاح کرے)

☆ البتہ اگر زانیِ مذکور اپنی حینِ حیات میں بحالتِ صحت وتندرستی وثباتِ ہوش وحواس ان طوائف زادوں کو جو بلا نکاح پیدا ہوئے تھے یا کسی اور کو اپنی کچھ جائداد یا کل جائداد ھبہ کر کے قبضہ کرا دے بلاشبہ وہ موھوب لہ کہ جس کو وہ ہبہ کر دے ملک ہو جائے گی۔ لہٰذا بعد موتِ واہب کوئی وارث دعوی نہیں کر سکتا۔ فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبر آباد

❁❁❁❁❁

---

[1] البحر الرائق: جلد ۸' صفحہ ۵۷۱' دار المعرفہ بیروت

﴿فتویٰ نمبر......318﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ میری زوجہ نے وقتِ انتقال ایک لڑکی بارہ یوم کی چھوڑی۔ اور وہ لڑکی بھی اپنی ماں سے نو یوم بعد مرگئی۔ اب میری زوجہ کے ورثہ میں اس کی خالہ نانی پھوپھی زندہ ہیں۔ مرحومہ کا مہر دوسو روپیہ کا تھا اور زیور برتن کپڑے وغیرہ جو اس کی والدین نے جہیز میں دیا تھا تقریبا پچاس روپیہ کے مالیت کا تھا۔ لہٰذا ازروئے شرع شریف اس کی زیور اور مہر وغیرہ پانے کا کون کون مستحق ہوسکتا ہے؟

۱۷ رجب ۳۶ھ

کریم خان ساکن محلہ رکاب گنج آگرہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں بعد ماتقدم علی الارث کل مال زوجۂ کریم خان کے بتیس (۳۲) حصہ کرکے تیئس (۲۳) حصہ کریم خان کو دیئے جائیں گے اور نو (۹) زینب نانی زوجۂ کریم خان کو دیئے جائیں گے۔

صورتہ ھکذا

زوجۂ کریم خان مسئلہ

میت

زوج کریم خان	بنت مریم	ام الام زینب	خالہ	عمہ
۳/۴/۸	۶/۹	۲/۳/۶	م	م

مریم مسئلہ ۶

میت

اب کریم خان	ام ام الام زینب	خالۃ الام	عمۃ الام
۵/۱۵	۱/۳	م	م

الاحیاء

کریم خان	زینب
۲۳	۹

المبلغ

۳۲

حررہ: العبدالراجی رحمت ربہ القوی ر
ابومحمد محمد دیدارعلی الرضوی الحنفی
جامع مسجد اکبرآباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......319﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اندریں صورت کہ زید نے وقتِ انتقال ایک زوجہ زینب اور بیٹا خیراتی اور دو بنت تمیزن اور اللہ رکھی چھوڑے۔ بعدہ اللہ رکھی کا انتقال ہوا۔ اس نے ایک زوج حسنی بیگ' ابن محمد بیگ' بنت معصومن' ماں زینب' چھوڑی۔ بعدہ زینب کا انتقال ہوا۔ اس نے ابن خیراتی' بنت تمیزن' ابن البنت محمد بیگ' بنت البنت معصومن' چھوڑی' ترکہ زید کس طرح تقسیم ہوگا؟

۹ رجب ۳۶ھ

اسٹیشن ماسٹر سابق ریاست الور

الجواب

بسم الله الرحمن الرحیم۔

اللهم رب زدنی علما

صورت مسئولہ میں بعد ماتقدم علی الارث اور دینِ مہر وغیرہ کے کل مالِ زید کے گیارہ سو باون (۱۱۵۲) حصہ کر کے چھ سو اٹھائیس (۶۲۸) حصہ خیراتی کو اور تین سو چودہ (۳۱۴) حصہ تمیزن کو اور تریسٹھ (۶۳) حصہ حسنی بیگ کو اور اٹھانوے (۹۸) حصہ محمد بیگ کو اور انچاس (۴۹) حصہ معصومن کو دیئے جائیں گے۔ فقط

صورتہ ھکذا

زید مسئلہ

میت

بنت اللہ رکھی	بنت تمیزن	ابن خیراتی	زوجہ زینب
۷	۷/۲۵۲	۱۴/۵۰۴	۱/۴/۱۴۴

اللہ رکھی مسئلہ

میت

زوج حسنی بیگ	ابن محمد بیگ	بنت معصومن	ام زینب
۳/۹/۶۳	۱۴/۹۸	۷/۴۹	۲/۶/۴۲

زینب مسئلہ

میت

ابن خیراتی	بنت تمیزن	ابن البنت محمد بیگ	بنت البنت معصومن
۲/۱۲۴	۱/۶۲	م	م

الاحیاء

خیراتی	تمیزن	حسنی بیگ	محمد بیگ	معصومن
۶۲۸	۳۱۴	۶۳	۹۸	۴۹

المبلغ

۱۱۵۲

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبرآباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر...... 320﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ پھوپھی اگر لاولد مری تو اس کے مال سے بھتیجے، بھتیجیوں کا شرعا کوئی حصہ ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو ہر ایک کو کس قدر مال متروکہ سے ملے گا؟

۱۰ رمضان المبارک ۱۳۳۶ھ

عبدالعزیز ملنگ دہلوی

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

اگر پھوپھی نے جو لاولد مری ہے۔ بجز بھتیجہ، بھتیجیوں کے اور کوئی وارث شرعا بھائی، بہن، باپ، یا شوہر وغیرہم نہیں چھوڑا تو بعد ما تقدم علی الارث کل مال بھتیجوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔ اور بھتیجیوں کو بھتیجوں کی موجودگی میں کچھ نہ ملے گا۔ اس واسطے کہ بھتیجے عصبہ ہیں اور بھتیجی ذوالارحام۔☆ اور عصبہ کی موجودگی میں ذوالارحام کو کچھ نہیں ملتا۔ فقط

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی المشہدی الرضوی الحنفی
المفتی فی جامع اکبرآباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر...... 321﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرعِ متین اس صورت میں کہ ہندہ نے انتقال کیا۔ اور بجز جہیز اور کچھ مال نہیں چھوڑا۔ اور وارث فقط خاوند اور باپ اور ماں اور دو بہن ایک بھائی کو چھوڑا ہے۔ اندریں صورت مالِ متروکہٴ ہندہ کیوں کر تقسیم ہوگا؟

فضل اللہ گھٹیا ماموں بھانجہ شہر آگرہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صورتِ مسئولہ میں بعد ما تقدم علی الارث کل مالِ متروکہٴ ہندہ کے چھ (۶) حصہ کر کے نصف مال یعنی تین (۳) حصہ شوہرِ ہندہ کو اور سدس یعنی ایک (۱) حصہ ماں کو اور مابقی دو (۲) حصہ والدِ ہندہ کو ملیں گے۔ اور موجودگیِ عصبہٴ قریب باپ میں بھائی بہن کو کچھ نہیں ملتا۔ فقط

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ
ابو محمد محمد دیدار علی المفتی فی
جامع اکبر آباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر……322﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین کہ زید کا انتقال ہوگیا۔ اس نے ایک زوجہ دولڑکیاں اور تین لڑکے چھوڑے۔ بعد کچھ عرصہ کے زوجہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ زوجہ کا بھائی مہر کا دعوی کرنا چاہتا ہے۔ رقم کل ۴۵ عدد گنیان زیور قریب سات سو کے سب ماموں کے پاس ہے۔ اب ہم کس طرح تقسیم کریں؟

شریف حسین۔ حجام آگرہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صورتِ مسئولہ میں بعد ماتقدم علی الارث دینِ مہر وغیرہ کل مالِ زید کے ۶۴ حصہ کر کے چودہ (14) چودہ (14) حصہ تینوں بیٹوں کو اور سات (۷) سات (۷) دونوں بیٹیوں کو اور آٹھ (۸) حصہ زوجہ کو دیئے جائیں گے۔ اور پھر مہر کل مالِ مریم کے آٹھ (۸) حصہ کر کے دو (۲) دو (۲) حصہ تینوں بیٹوں کو ایک (ا) ایک (ا) حصہ دونوں بیٹیوں کو ملے گا اور بیٹوں کی موجودگی میں بھائی کو کچھ نہیں ملے گا۔

صورتہ ھکذا

زید مسئلہ ۸/۶۴

میت

زوجہ	ابن	ابن	ابن	بنت	بنت
مریم	زید	عمر	بکر	مریم	خانم
۸	۱۴	۱۴	۱۴	۷	۷

مریم مسئلہ ۸

میت

ابن	ابن	ابن	بنت	بنت	اخ
۲	۲	۲	۱	۱	محروم

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی المشہدی المفتی فی جامع اکبرآباد

﴿فتویٰ نمبر...... 323﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلۂ ذیل میں۔ایک شخص نے بعد انتقال دو وارث چھوڑے ایک زوجہ ولڑکا۔اور کچھ اثاثہ مثل زیور وغیرہ وہ اپنی حیات میں اپنے دوا دارو وغیرہ میں فروخت کر کے صرف کر گیا۔ماقبی اثاثہ تجہیز وتکفین وفاتحہ اور سوم میں صرف ہوا۔سوم کے روز ہی خوش دامن اور خسر اپنی لڑکی کو بہکا کر اپنے مکان میں لے گئے۔حتی کہ ایامِ عدت کا بھی خیال نہ کیا۔اورلڑکے مرحوم کو جو تقریباً ڈیڑھ سال کا ہے متوفی کے والدین کے پاس چھوڑ گئے۔اب والدینِ زوجۂ مرحوم سے اپنا سامانِ جہیز والدینِ مرحوم سے طلب کرتے ہیں اس صورت میں زوجۂ متوفی مستحق پانے سامانِ جہیز کے ہوسکتی ہے یانہیں؟ جواب باصواب سے ازروئے قانونِ شرع آگاہی بخشی جاوے۔

۲۵ شوال ۱۳۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

☆ صورتِ مسئولہ میں بعد منہائی مصارفِ تجہیز وتکفین واداءِ دین مہر وغیرہ ماتقدم علی الارث کل مال ماقبی زید کے چوبیس (۲۴) حصہ کر کے تین حصہ زوجہ کو دیئے جائیں گے اور چار (۴) چار (۴) حصہ ماں باپ کو اور تیرہ (۱۳) حصہ باقی ابن زید کو دیئے جائیں گے۔

☆ اور علاوہ مصارفِ تجہیز وتکفین بطریقِ متوسط فاتحہ، سوم وغیرہ میں بلا اجازت دیگر ورثہ جس وارث نے مالِ زید سے صرف کیا ہے وہ فقط اس کے حصہ سے وضع کرلیا جائے گا۔☆ اور حصہءِ نابالغ اگر باجازتِ دیگر ورثہ صرف کیا گیا ہے تو سب کے حصوں سے بقدر اس کے حصوں کے وضع ہو جائے گا۔

☆ اور کل سامانِ جہیز کی حق دار بلاشبہ زوجۂ زید ہے۔اس واسطے کہ عرفاً کل سامانِ جہیز ماں باپ اپنی لڑکی کو ہی دیا کرتے ہیں ☆ اور لڑکے کی پرورش کا اس کو اختیار ہے۔اگر وہ چاہے اس کو حقِ پرورش حاصل ہے۔

ورنہ پرورش کرنے پر اس پر بقولِ صحیح جبر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ صفحہ ۳۸۷ فتاوی قاضی خان میں ہے:

و اذا امتنعت الام عن امساک الولد و لیس لها زوج اختلفوا فیه قال الفقیه ابوجعفر والفقیه ابو اللیث رحمهما الله تعالی یجبر الام علی امساک الولد و قال مشائخنا رحمهم لا تجبر لان الام لا تجبر فی الصحیح[1] انتهی مختصرا بقدر الحاجة.

(ترجمہ: ماں نے بچے کو اپنے پاس روکے رکھنے سے انکار کردیا۔ اور اس کا خاوند بھی نہیں۔ اس بارے میں علمائے کرام کا اختلاف ہے۔ امام فقیہ ابوجعفر اور امام فقیہ ابواللیث رحمۃ اللہ علیہما نے فرمایا اس کو مجبور کیا جائے گا کہ بچے کو اپنے پاس رکھے اور ہمارے مشائخ رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا اس پر جبر نہ کیا جائے گا کیوں کہ صحیح قول کی روسے ماں پر جبر نہیں کیا جاسکتا)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابومحمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبرآباد

✿✿✿✿✿

---

[1] الفتاوی القاضی خان: جلد ۱، صفحہ ۱۹۴، بلوچستان بک ڈپو کوئٹہ

﴿فتویٰ نمبر......324﴾

سوال

اللہ بخش، خدا بخش، مولا بخش، تینوں بھائیوں نے ایک جائداد پختہ مکان اور کچھ زمین شرکت میں خریدی۔ پھر اللہ بخش کا انتقال ہوا۔ اس نے وقتِ انتقال علاوہ جائداد مذکور کے دوڈھائی سو کا زیور بھی چھوڑا۔ اور یہ وارث چھوڑے۔ زوجہ مسماۃ فیاضی، ماں مسماۃ رحمان بی بی اور دو بھائی۔ ان کی میراث کس طرح تقسیم ہوگی ؟بینوا توجروا

سائل: خدا بخش سکنہ نائی کی منڈی حلقہ ہدن خان

۲۷شوال ۱۳۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صورتِ مسئولہ میں بعد ما تقدم علی الارث تیسرے حصے جائدادِ مشترکہ اور زیورِ متروکہ اللہ بخش سے جائداد اور زیور اللہ بخش چوبیس (۲۴) حصے کر کے چھ (۶) حصے زوجہ کو دیئے جائیں گے اور چار (۴) حصے ام یعنی والدہ اللہ بخش کو اور سات (۷) سات (۷) حصہ دونوں بھائیوں مسمی خدا بخش اور مولا بخش کو دیئے جائیں گے۔

واللہ أعلم بالصواب

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبرآباد

✿✿✿✿✿

فتویٰ نمبر......325

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ زید مر گیا۔ زید کی دو بہنیں تھیں۔ اور حقیقی بھائی کوئی نہیں تھا۔ صرف ایک بہنوئی موجود ہے۔ اور دونوں بہنیں زید کی حیات ہی میں مر گئیں تھیں۔ زید کی دونوں بہنوں کے دو لڑکے موجود ہیں۔ یعنی ایک لڑکا ایک بہن کا اور ایک لڑکا دوسری بہن کا۔ زید کے حقیقی چچا کا ایک لڑکا موجود ہے۔ زید اپنے بھانجہ کے مکان پر مرا۔ صرفہ علاج وخوراک زید کے بھانجہ نے اپنے ذاتی روپیہ سے کیا۔ اب بتلایئے کہ حسب شرع شریف بھانجوں کا کیا ترکہ ہوگا؟ اور حقیقی چچازاد بھائی کا کیا ترکہ ہوگا؟ کیونکہ زید کی اولاد و بیوی وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ اور صرفہ خوراک و علاج جو زید کے بھانجہ کا ہوا ہے وہ شرعا پانے کا مستحق ہے یا نہیں؟۔

۱۹ ذی قعدہ ۳۶ھ

صوبہ دار علی رضا خان محلہ لاڈپورہ راجپوتانہ

الجواب

بعد تقدم علی الارث بصورت ہونے ورثا اس قدر جو درج سوال ہیں کل مال زید کا زید کے چچا کے بیٹے کو ملے گا۔ اس واسطے کہ وہ عصبہ ہے۔

کما فی السراجی

اما العصبة بنفسه فكل ذكر لا تدخل فی نسبته الی الميت انثی و هم اربعة اصناف جزء الميت واصله و جزء ابيه و جزء جده الاقرب فالا قرب يرجحون بقرب الدرجة أعنی أولهم بالميراث جزء الميت أی البنون ثم بنوهم وان سفلوا ثم أصله أی الأب ثم الجد أی أب الأب وإن علا ثم جزء أبيه أی الإخوة ثم بنوهم وإن سفلوا ثم جزء جده ای

الاعمام ثم بنوهم و ان سفلوا[1]

(ترجمہ: عصبہ بنفسہ ہر وہ مرد ہوتا ہے کہ میت کے ساتھ اس کے رشتہ میں کوئی عورت داخل نہ ہو۔ اور اس کی چار قسمیں ہیں۔ (۱) جزء المیت (۲) اصل المیت (۳) جزء اب المیت (۴) جزء جد الاقرب ثم الاقرب یہ تمام درجہ کے قرب کے ساتھ ترجیح پائیں گے۔ یعنی ان تمام میں میت کی میراث کا سب سے زیادہ حق دار میت کا جزء یعنی اس کے بیٹے پھر بیٹوں کے بیٹے ہیں اگرچہ وہ کتنے ہی نیچے کیوں نہ ہوں۔ ان کی عدم موجودگی میں میتِ اصل یعنی باپ پھر دادا اگرچہ وہ کتنا ہی اونچے درجہ کا ہوا۔ اس کے بعد میت کے باپ کی جزء یعنی بھائی پھر ان کے بھائی ان کے بیٹے اگرچہ وہ کتنے ہی نیچے ہوں وارث ہوں گے۔ ان کے بعد میت کے دادا کی جزء یعنی چچا پھر ان کے بیٹے اگرچہ نیچے ہوں وارث ٹھہریں گے)

☆ اور بھانجوں کو موجودگیِ ابن العم میں کچھ نہیں ملتا اس واسطے کہ وہ ذوی الارحام سے ہیں۔

اور اگر بھانجوں نے اپنے پاس سے باوصف موجود ہونے مالِ زید کے علاج وخوراک زید میں صرف کیا ہے اس کا ان کو ثواب ملے گا۔ مالِ زید سے وہ صرفہ نہیں لے سکتے اس واسطے کہ بعد موت زید کے وہ مال چچا کے بیٹے کا ہوگیا۔ البتہ اگر بطریقِ قرض زید کو اگر روپیہ دے کر اس کے علاج وخوراک میں صرف کیا تھا تو بشرط ثابت ہو جانے اس امر کے بشہادتِ شہودِ معتبر مالِ زید سے اپنا قرض وصول کر سکتے ہیں۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی

مسجد جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

---

[1] السراجی : صفحہ ۱۴، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ، ملتان

﴾فتویٰ نمبر......326﴿

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ شریعتِ غرا اس مسئلہ میں کہ زید نے ایک اپنی زوجہ وارث اور ایک بہن ضعیفہ وارث چھوڑی۔ اور مبلغ تین سو روپیہ کا قرض جو بعد نکاح چھوڑا۔ اور مبلغ پانچسو روپیہ مہر کے چھوڑا۔ پہلے دین مہر ادا کیا جائے یا قرضہ؟ اور بہن کا اگر ہے حصہ تو کتنا؟ اور بہن نے بعد فوتید گی اپنے بھائی کے جو کچھ روپیہ نقد و اشیا' ظروف خیانت سے یا رضامندی سے اپنی بھاوجہ سے زائد وصول کر لیے یہ اس میں یعنی اگر حصہ بہن کا ہے محسوب ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور جائداد جو چھوڑی ہے ذاتی زید کی ہے موروثی نہیں ہے؟

۱۷ شوال ۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں کل مالِ متروکہ زید سے بعد تجہیز و تکفین جو کچھ بچے اس سے اس کے ذمہ جس قدر قرض ہو خواہ قرضہ مہر ہو یا علاوہ اس کے وہ سب ادا کیا جائے گا۔ چنانچہ صفحہ ۵۳۶٬۵۳۵ درمختار میں ہے

یبدأ من ترکة المیت بتجهیزه یعم التکفین من غیر تقتیر ولا تبذیر تقدم دیونه التی لها مطالب من جهة العباد[1] انتهی مختصرا

(ترجمہ: میت کے ترکہ میں سب سے پہلے اس کی تجہیز پر کیا جائے گا۔ اس میں اس کا کفن بھی داخل ہے۔ جو کنجوسی اور فضول خرچی کے بغیر کیا جائے گا۔ ☆ اس کے بعد اس کے وہ قرض ادا کیے جائیں گے جن کا مطالبہ بندوں کی جانب سے ہوگا)

[1] الدر المختار مع رد المحتار: جلد ۱۰ ' صفحہ ۴۰۹ '۴۱۰ ' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

☆ اور پھر بعد اداءِ دیون اور اجراءِ وصیت کے تہائی مال باقی سے اگر میت نے وصیت غیر وارث کو کی ہو۔ اگر کچھ بچے اس کے چار حصہ کر کے ایک حصہ زوجہ کو دیا جائے گا اور تین حصہ بہن کو بطریق فرضیت اور ایک بطریقِ رد۔ اور رضامندی سے زوجہ زید نے جس قدر مال زید کی بہن کو دے دیا اس کے علاوہ جو خیانت سے زید کی بہن نے لیا ہے وہ بلاشبہ اس کے حصہ سے مجرا لیا جائے گا اگر اس کا ثبوت شرعاً اختِ زید پر ہو جائے۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر...... 327﴾

سوال

بحضور جناب مفتی صاحب جامع مسجد آگرہ

السلام علیکم مہربانی فرما کر غلام علی مرحوم کے حصص تقسیم فرما کر ممنون مشکور فرمائیں والسلام

غلام علی مرحوم نے قضا کی اور زندہ چھوڑا اصغر علی‘ تراب علی‘ امان علی‘ مسماۃ امامی جان‘ پسران و دخترِ غلام علی مرحوم اصغر علی نے قضا کی زندہ چھوڑا مسماۃ بسم اللہ و مسماۃ بندو دختران اصغر علی مرحوم اور تراب علی و امان علی و مسماۃ امامی جان

مسماۃ بسم اللہ نے قضا کی زندہ چھوڑا زید و بکر پسرانِ مسماۃ بسم اللہ مرحومہ اور مسماۃ بندو دختر علی اصغر مرحوم اور تراب علی و امان علی و مسماۃ امامی جان

مسماۃ بندو نے قضا کی زندہ چھوڑا عبداللہ پسرِ مسماۃ بندو مرحومہ اور تراب علی و امان علی و مسماۃ امامی جان پسران و دخترِ غلام علی اور زید و بکر پسران بسم اللہ

مسماۃ امامی جان نے قضا کی زندہ چھوڑا احمد بخش مراد بخش پسرانِ مسماۃ امامی جان اور زید و بکر و عبداللہ اور تراب علی و امان علی

احمد بخش نے قضا کی زندہ چھوڑا مسماۃ عشو بیوہ و محمود بخش و مولا بخش و الٰہی بخش و مسماۃ آمنہ پسران و بیوہ و دختر احمد بخش مرحوم اور مراد بخش اور زید و بکر و عبداللہ و تراب علی و امان علی

مراد بخش نے قضا کی زندہ چھوڑا مسماۃ زبیدہ بیوہ و عبدالواحد و رموں و مسماۃ جیبو و مسماۃ عشو و مسماۃ اللو و مسماۃ وللو پسران و دختران و بیوہ مراد بخش مرحوم و مسماۃ عشو و محمود بخش و الٰہی بخش و مولا بخش و مسماۃ آمنہ پسران و دخترِ بیوہ احمد بخش اور زید و بکر و عبداللہ اور تراب علی و امان علی۔

تراب علی نے قضا کی زندہ چھوڑا محبوب علی و بشارت علی و حکمت علی و مسماۃ اللو پسران و دخترِ تراب علی مرحوم اور امان علی پسرِ غلام علی اور مسماۃ زبیدہ بیوہ و عبدالواحد و رموں و مسماۃ جیبو و مسماۃ عشو و مسماۃ اللو و مسماۃ وللو

پسران ودختران وبیوہ مراد بخش اور مسماۃ عشو بیوہ ومحمود بخش والٰہی بخش ومولا بخش ومسماۃ آمنہ پسران ودختر وبیوہ احمد بخش مرحوم اورزید وبکر پسران مسماۃ بسم اللہ مرحومہ اور عبداللہ پسر مسماۃ بندو مرحومہ۔

امان علی نے قضا کی زندہ چھوڑا احسان علی وفیاض علی ومسماۃ نین ومسماۃ ببن پسران ودختران امان علی مرحوم اور محبوب علی وبشارت علی وحکمت علی ومسماۃ اللو پسران ودختر تراب علی مرحوم اور مسماۃ عشو ومحمود بخش والٰہی بخش ومولا بخش ومسماۃ آمنہ پسران ودختر وبیوہ احمد بخش مرحوم اور عبداللہ پسرِ مسماۃ بندو مرحومہ وزید وبکر پسرانِ مسماۃ بسم اللہ مرحوم اور مسماۃ زبیدہ بیوہ وعبدالواحد رمون ومسماۃ جیبو ومسماۃ عشو ومسماۃ اللو وللو پسران ودختران وبیوہ مراد بخش۔کل ۲۳ ورثہ زندہ موجود ہیں۔

۱۶ شوال ۳۶ھ

الجواب

وهو الموفق للصواب

بسم الله الرحمن الرحيم۔

اللهم رب زدني علما

اللھم رب زدنی علما ۔ صورتِ مسئولہ میں کل مال منقولہ وغیر منقولہ غلام علی مرحوم کے بعد ماتقدم علی الارث پینتیس ہزار دو سو اسی (۳۵۲۸۰) حصہ کر کے ایک ہزار چھ سو اسی (۱۶۸۰) زید کو اور اتنے بکر کو تین ہزار تین سو ساٹھ (۳۳۶۰) عبداللہ کو اور اتنے ہی عشو زوجہ احمد بخش کو اور سات ہزار چودہ (۷۰۱۴) محمود بخش کو اتنے ہی مولا بخش کو اتنے ہی الٰہی بخش کو اور تین سو ستاون (۳۵۷) آمنہ کو اور اتنے ہی زبیدہ واللو وجیبو وعشو وللوا مو اور سات سو چودہ (۷۱۴) عبدالواحد کو اور تین سو چونسٹھ (۳۶۴) محبوب علی، بشارت علی، حکمت علی کو ایک ہزار چھ سو بتیس (۱۶۳۲) اللو بنت مراد بخش اور تین ہزار آٹھ سو آٹھ (۳۸۰۸) احسان علی کو اور اتنے ہی فیاض علی کو اور ایک ہزار نو سو چار (۱۹۰۴) نین کو اور اتنے ہی ببن کو دیئے جائیں گے۔

صورتہ ھکذا

زید	بکر	عبداللہ	عشوزوجہ احمد بخش	محمود بخش
۱۶۸۰	۱۶۸۰	۳۳۶۰	۳۵۷	۷۰۱۴

الٰہی بخش	مولابخش	آمنہ	زبیدہ	امو	جیبو	عشو	اللو	وللو
۷۰۱۴	۷۰۱۴	۳۵۷	۳۵۷	۳۵۷	۳۵۷	۳۵۷	۳۵۷	۳۵۷

عبدالواحد	محبوب علی	بشارت علی	حکمت علی	اللو
۷۱۴	۳۶۴	۳۶۴	۳۶۴	۱۶۳۲

احسان علی	فیاض علی	نین	بنن
۳۸۰۸	۳۸۰۸	۱۹۰۴	۱۹۰۴

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی
ابومحمد محمد دیدارعلی الرضوی الحنفی
مسجد جامع اکبرآباد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر...... 328﴾

سوال

ایک متوفی مسلمان کے دو فرزند ایک چھوٹا دیگر بڑا ہے ان میں سے زائد حصہ جائداد متروکہ کا کون حقدار ہے؟ اور جائداد کی باہمی کس طرح پر تقسیم ہوگی؟

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

☆ تقسیمِ میراث میں چھوٹے بڑے کی رعایت نہیں کی جاتی۔ بصورت نہ ہونے کسی اور وارث کے بعد مصارفِ تجہیز و تکفین اور اداءِ دینِ میت خواہ دین مہر یا کسی اور کا ہو اور اداءِ وصیتِ میت تہائی مال سے اگر علاوہ وارث کسی اور کو وصیت کی ہو۔ کل مال میت سب برابر سب بیٹوں میں تقسیم ہوگا۔ کسی کے حصہ میں بوجہ خورد و کلاں ہونے کے ایک رتی کی کمی بیشی جائز نہیں۔

هكذا في جميع كتب الفرائض

(ترجمہ: علم میراث کی تمام کتابوں میں اسی طرح ہے)

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ

ابو محمد محمد دیدار علی المفتی فی جامع اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر...... 329﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص محمد جان ہے۔اس کے دو پسر یونس خان و یوسف خان تھے۔جن جملہ ان کے یونس خان فوت ہوگیا۔یوسف خان موجود ہے۔لیکن متوفی یونس خان متوفی نے دو پسر صلبی چھوڑے۔بعدہ محمد جان بھی فوت ہوگیا۔اب فرمایئے کہ محمد خان کی جائداد اور ترکہ گزاشتہ سے یونس خان متوفی کے دونوں لڑکوں یعنی محمد خان کے پوتوں کو بروئے قرآن وحدیث حصہ ملے گا یا نہیں اور وہ حصہ پاسکتے ہیں یا نہیں؟

۱۴ رمضان ۱۳۳۶ھ

حافظ عبدالرحیم بیگ از مقام بھرت پور

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

و علیکم السلام رحمہ اللہ و برکاتہ

چونکہ یونس خان، محمد جان کے سامنے فوت ہوگیا لہٰذا یونس خان متوفی کو جائداد محمد خان سے کچھ نہیں ملے گا۔اور محمد خان نے وقتِ انتقال چونکہ ایک بیٹا یوسف خان چھوڑا ہے اور دو پوتے یونس خان متوفی کے حقیقی بیٹے ہیں ☆ لہٰذا بیٹے کی موجودگی میں پوتوں کو کچھ نہیں مل سکتا۔اس واسطے کہ عصبہءِ اقرب کی موجودگی میں عصبہءِ بعید کو کچھ نہیں ملتا۔فقط

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ القوی

ابومحمد محمد دیدارعلی الحنفی المشہدی المفتی

فی جامع اکبرآباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......330﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و حامیانِ شرع متین کہ شیخ الٰہی بخش نے انتقال کیا۔ انہوں نے تین لڑکیاں مسمیان منتو، بندو، عنتو اور ایک پوتا منیر الدین، ایک بیوہ مسماۃ جانی بیگم چھوڑے۔ بعدہ مسماۃ عنتو نے انتقال کیا۔ اس کی دو لڑکیاں اور دو لڑکے اور ایک شوہر چھوڑا۔ پھر زوجہ مسماۃ جانی بیگم کا انتقال ہوا۔ پھر مسماۃ منتو کا انتقال ہوا اس نے دو لڑکے ایک لڑکی اور ایک شوہر چھوڑا۔ بینوا توجروا

۲۴ شعبان ۱۳۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں مال نبی بخش کے بارہ ہزار نو سو ساٹھ (۱۲۹۶۰) حصہ کر کے تین ہزار پانچ سو اسی (۳۵۸۰) بندو کے دیئے جائیں گے۔ اور تین ہزار چار سو (۳۴۰۰) منیر الدین کو اور سات سو بیس (۷۲۰) حمدو اور پانچ سو ساٹھ (۵۶۰) زید کو اور پانچ سو ساٹھ (۵۶۰) خالد کو او راسی قدر مسعود کو اور پانچ سو سینتیس (۵۳۷) محمودہ کو بعد ما تقدم علی الارث حصص مذکورہ کر کے دیئے جائیں گے واللہ اعلم وعلمہ احکم۔

صورتہ ھکذا

الٰہی بخش مسئلہ ۲۴/۷۲/۶۴۸/۱۲۹۶۰

میت

ابن الابن	بنت	بنت	بنت	زوجہ
منیر الدین	بندو	عنتو	منتو	جانی بیگم
۱۵/۱۳۵/۲۷۰۰	۱۶/۱۴۴/۲۸۸۰	۱۶	۱۶/۱۴۴	۳/۹/۸۱

عفو مسئلہ ۷۲/۱۲

میت　　　　توافق بالثمن　　　　بیدہ ۲/۱۶

زوج	ابن	ابن	بنت	بنت	ام
حمدو	زید	خالد	مریم	فاطمہ	جانی بیگم
۳/۱۸/۳۶/۷۲۰،	۱۴/۲۸/۵۶۰،	۱۴/۲۸/۵۶۰،	۷/۱۴/۲۸۰	۷/۱۴/۲۸۰	۲/۱۲/۲۴

جانی بیگم مسئلہ

میت　　　　بیدہ ۳۵/۱۰۵

بنت	بنت	ابن الابن
منتو	بندو	منیرالدین
۱/۳۵	۱/۳۵/۷۰۰	۱/۳۵/۷۰۰

منتو مسئلہ ۲۰/۴

میت　　　　تباین　　　　بیدہ ۱۷۹

زوج	ابن	ابن	بنت
عمر	محمود	مسعود	محمودہ
۱/۵/۸۹۵	۶/۱۰۷۴	۶/۱۰۷۴	۳/۵۳۷

المبلغ

۱۲۹۶۰

الاحیاء

بندو	منیرالدین	حمدو	زید	خالد	مریم	فاطمہ	عمر
۳۵۸۰	۳۴۰۰	۷۲۰	۵۶۰	۵۶۰	۲۸۰	۲۸۰	۵۹۵

محمود	مسعود	محمودہ
۱۰۷۴	۱۰۷۴	۵۳۷

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی
ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی المفتی الالوری ثم الاکبرآبادی
واعظ اسلام جامع مسجد اکبرآباد

﴿فتویٰ نمبر...... 331﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک عورت فوت ہوئی۔ اس نے چار علاتی بھانجے اور بھانجیاں اور ایک علاتی بھتیجا چھوڑا۔ ایسی صورت میں بھانجوں کو ترکہ ملے گا یا بھتیجے کو یا دونوں کو؟ اور اگر وہ بھتیجا بغیر نکاح کے کسی طوائف وغیرہ کے شکم سے ہو تو اس کو بھانجے کے مقابلے میں حصہ ملے گا یا نہیں؟۔

۱۵ شعبان ۳۶ھ

محمد علی میوہ کڑہ

الجواب

اللھم رب زدنی علما

بھتیجا عصبہ ہے اور بھانجا بھانجی ذوی الارحام۔ لہٰذا کل مال متوفیہ کا بھتیجا لے گا اور بھانجا بھانجی کو کچھ نہیں ملے گا۔ ☆ اور اگر وہ بھتیجا بلا نکاح کسی طوائف سے پیدا ہوا ہے چونکہ زنا سے نسب ثابت نہیں ہوتا لہٰذا وہ بھتیجا شرعاً بھتیجا نہیں مانا جائے گا۔ اس واسطے اس کو مالِ متروکہ متوفیہ سے کچھ نہیں ملے گا اور کل مال متروکہ متوفیہ کا چونکہ یہاں بمقتضاء ظاہر سوال ایک ہی علاتی بہن سے کل بھانجا بھانجی ہیں لہٰذا ہر بھانجا دو بھانجیوں کے برابر سمجھا جائے گا اور اسی حساب سے بقدران حصہ داروں کو حصہ کر کے دیئے جائیں۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی المفتی

فی مسجد جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......332﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شیخ اللہ بخش نے انتقال کیا۔ انہوں نے ایک زوجہ پانچ لڑکے مسمیان احمد حسن، سجاد حسن، محمد حسن، حافظ واجد حسن، امداد حسن اور ایک دختر چھوڑا ہے۔ از روئے شرع شریف متروکہ مال ورثہ پر کس طرح تقسیم ہوگا؟

۲۶ مئی ۱۸ء/۱۵ شعبان ۱۳۳۶ھ

سجاد حسن صابن گڑھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں کل مال اللہ بخش کے اٹھاسی (۸۸) حصہ کر کے گیارہ (۱۱) حصہ زوجہ کو اور چودہ (۱۴) چودہ (۱۴) بیٹوں کو اور سات (۷) بیٹی کو دیئے جائیں گے۔

صورتہ ھکذا

اللہ بخش مسئلہ ۸/۸۸

زوجہ	ابن	ابن	ابن	ابن	ابن	اخت
۱/۱۱	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴	۷

حررہ: العبد الراجی رحمتہ

ابو محمد محمد دیدار علی الحنفی المفتی

جامع اکبرآباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......333﴾

سوال

حسب ذیل مسئلہ کے متعلق علمائے دین کیا فرماتے ہیں۔ زید و بکر دو حقیقی بھائی تھے۔ زید نے انتقال کے بعد اپنی منکوحہ بیوی اور ایک نابالغ لڑکے کو چھوڑا۔ قضاءِ الٰہی سے لڑکا بھی فوت ہو گیا۔ اب صرف زید کی بیوی اور اس کا بھائی بکر موجود ہے۔ پس از روئے شرع شریف زید مرحوم کی کل جائداد کا مالک وحقدار کون ہو سکتا ہے؟ زید کی وفات کے تین ماہ بعد اس کی بیوی کے ایک لڑکی پیدا ہوئی جواب تک موجود ہے۔ ایک لڑکا جو پہلے خاوند سے تھا (اس خاوند کی بھی وفات ہو چکی) وہ بھی موجود ہے۔

امام الدین آگرہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورت مسئولہ میں کل مال زید کے بہتر (۷۲) حصہ کر کے سولہ (۱۶) زینب کو دیئے جائیں گے اور بیالیس (۴۲) مریم کو اور سات (۷) زفر کو اور اتنے ہی بکر کو۔ واللہ اعلم. صورتہ ھکذا

زید مسئلہ ۸/۲۴/۲/۷۲

میت

زوجہ	ابن	بنت	اخ
زینب	خالد	مریم	بکر
۱/۳/۹	۱۴	۷/۲۱	م

مسئلہ خالد

میت		بیدہ ۱۴	
ام	اخت	زفر	عم
زینب	مریم	زفر	بکر
۱/۷	۳/۲۱	۱/۷	۱/۷
الاحیاء			
زینب	مریم	زفر	بکر
۱۶	۴۲	۷	۷
المبلغ			
۷۲			

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی مفتی

جامع مسجد اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر......334﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ شیخ اللہ بخش نے انتقال کیا۔ چھ لڑکے ایک دختر ایک زوجہ چھوڑی۔ بعدہ ایک لڑکے نے انتقال کیا جس کے کوئی اولاد نہیں۔ ازروئے شرع شریف ترکہ مورثِ اعلیٰ سے اور برادر سے ہم فرزندان کو کس طرح پہنچتا ہے؟

۲۸ مئی ۱۸ء

شمشاد حسین صابون کٹرہ آگرہ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صورتِ مسئولہ میں بعد ماتقدم علی الارث کل مال اللہ بخش کے تین ہزار چار سو بتیس (۳۴۳۲) حصہ کر کے پانچ سو چھ (۵۰۶) مریم کو دیئے جائیں گے اور پانچ سو بتیس (۵۳۲) عمر کو اور اتنے ہی بکر، خالد، زفر اور حمید کو اور دو سو چھیاسٹھ (۲۶۶) زینب کو۔ صورتہ ھکذا

اللہ بخش مسئلہ ۸/۱۰۴/۳۴۳۲

میت

زوجہ	ابن	ابن	ابن	ابن	ابن	ابن	بنت
مریم	زید	عمر	بکر	خالد	زفر	حمید	زینب
۱/۱۳/۴۲۹	۱۴	۱۴/۴۶۲	۱۴/۴۶۲	۱۴/۴۶۲	۱۴/۴۶۲	۱۴/۴۶۲	۷/۲۳۱

زید مسئلہ ۳۴/۶۶/۶

میت — بیدہ ۷/۱۴

ام	اخ	اخ	اخ	اخ	اخ	اخت
مریم	عمر	بکر	خالد	زفر	حمید	زینب
۷۷/۱۱/۱	۱۰/۷۰	۱۰/۷۰	۱۰/۷۰	۱۰/۷۰	۱۰/۷۰	۵/۳۵

الاحیاء

مریم	عمر	بکر	خالد	زفر	حمید	زینب
۵۰۶	۵۳۲	۵۳۲	۵۳۲	۵۳۲	۵۳۲	۲۶۶

المبلغ

۳۴۳۲

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ
ابو محمد محمد دیدار علی المفتی
جامع مسجد اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر......335﴾

سوال

بعد حمد و صلوة سید المرسلین .

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ارشاد حسین نے وقت انتقال اپنے کے تین بھائی اور دو زوجہ منکوحہ اور دو دختران بہ تفصیل ذیل چھوڑیں۔ ایک بھائی کا نام ولایت حسین اور دوسرا سخاوت حسین اور تیسرا فیاض حسین اور ایک زوجہ اول مرزائی بیگم اور زوجہ دوئم سکندر بیگم زوجہ اول لا ولد' کوئی اولاد نہیں۔ اور زوجہ دوم سکندر بیگم کی دو دختر ایک کا نام جعفری بیگم دوسری کا نام ممتازی بیگم۔ جعفری بیگم کا انتقال ہوا جس نے ایک شوہر تجمل حسین اور ایک دختر باقری بیگم چھوڑے۔ دختران کے چچا مسمی ولایت حسین کا انتقال ہوا۔ اور ولایت حسین نے چھ لڑکے چھوڑے ان کو ارشاد حسین کے ورثہ میں سے کیا کیا حصہ کس کس کا ہوگا؟

الجواب

صورت مسئولہ میں کل مال متروکہ ارشاد حسین کے بعد ما تقدم علی الارث چار سو بتیس (۴۳۲) حصہ کر کے ستائیس (۲۷۔۲۷) دونوں بیویوں ارشاد حسین کو' ایک سو چوالیس (۱۴۴) ممتازی کو اور تیس تیس (۳۰'۳۰) حصہ سعادت حسین وفیاض حسین کو اور چھتیس (۳۶) تجمل حسین کو اور ایک سو آٹھ (۱۰۸) باقری کو اور پانچ پانچ (۵'۵) حصہ چھ بیٹوں کو ولایت حسین مرحوم دیئے جائیں گے۔

صورته هکذا:

ارشاد حسین مسئلہ ۲۴/۱۴۴/۴۳۲

میت

زوجہ	زوجہ	بنت	بنت	اخ	اخ	اخ
مرزائی بیگم	سکندر بیگم	جعفری	ممتازی	ولایت حسین	سخاوت حسین	فیاض حسین
۹/۲۷	۹/۲۷	۴۸	۴۸/۱۴۴	۱۰	۱۰/۳۰	۱۰/۳۰

جعفری مسئلہ۴

میت بیدہ ۱۲/۴۸

زوجہ تجمل حسین	بنت باقری بیگم
۱/۱۲/۳۶	۳/۳۶/۱۰۸

ولایت حسین مسئلہ ۶/۳

میت بیدہ ۵/۱۰

ابن	ابن	ابن	ابن	ابن	ابن
۵	۵	۵	۵	۵	۵

الاحیاء

مرزائی	سکندر بیگم	ممتازی بیگم	سخاوت حسین	فیاض حسین	تجمل حسین
۲۷	۲۷	۱۴۴	۳۰	۳۰	۳۶

باقری	ابن(۶)
۱۰۸	۳۰(۵X۶=۳۰)

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی مفتی شہر آگرہ

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر...... 336﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ مسمی ممن نے انتقال کیا۔ اور مکان خاص تعمیر شدہ ذات اپنی کا چھوڑا۔ اور وارث اپنے مسماۃ اکبری زوجہ' ایک لڑکا بندا' مسماۃ انوری اور سروری دو لڑکیاں چھوڑے۔ جو خاص ممن کے نطفہ سے پیدا تھیں۔

اور ایک وحید لڑکا اور اصغری لڑکی' اکبری کے پیٹ' مگر باپ دوسرا تھا۔ وقت عقد کے ان دونوں نابالغوں کو ہمراہ لائی تھی جس کی شادی ممن نے اپنی ذات سے کی۔

سروری لڑکی کا انتقال ہوا بعد ممن کے اور اس کے بعد بندا کا انتقال ہوا۔ یہ لڑکی لاولد تھی اور لڑکا نابالغ۔ اور بعد اس کے اکبری کا انتقال ہوا اور ایک لڑکی انوری جو خاص ممن سے پیدا ہوئی تھی وہ موجود ہے۔ اور وحید لڑکا اور اصغری لڑکی جو کہ اکبری ہمراہ لائی تھی وہ موجود ہے۔ غرض یہ ہے کہ اس کا حصہ کس طرح تقسیم ہوگا؟

اور مسمی ممن کے خاص دو بھائی تھے شیخ کلا و ببو جن کا موجودگی ممن میں انتقال ہو چکا تھا اب کلا مرحوم کا لڑکا اور ببو کی پانچ لڑکیاں موجود ہیں ان کا حصہ اس مکان موجودہ میں ہے یا نہیں؟

اور ایک لڑکا ممن کا پرورش کیا ہوا موجود ہے اس کا حصہ بھی مکان موجودہ میں ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

۱۱ شعبان ۳۶ھ

وحید پسر ممن

الجواب

وھو الموفق للصواب.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ممن مسئلہ ۸/۳۲/۱۹۲/۶۷/۱۱۵۲

میت

زوجہ اکبری	ابن بندو	بنت سروری	بنت انوری
۱/۴/۲۴/۷۲	۱۴/۸۴	۷	۷/۴۲/۱۲۶/۲۵۲

سروری مسئلہ

میت تباین بیدہ ۷

ام اکبری	اخ بندو	اخت انوری	اخ لام وحید	اخت لام اصغری
۱/۷/۲۱	۲/۱۴	۱/۷/۲۱/۴۲	۱/۷/۲۱/۴۲	۱/۷/۲۱/۴۲

بندو مسئلہ ۶/۳

توافق بالنصف بیدہ ۴۹/۹۸

میت

ام اکبری	اخت انوری	اخ لام وحید	اخت لام اصغری
۱/۴۹/۱	۳/۱۴۷/۲۹۴	۱/۴۹/۹۸	۱/۴۹/۹۸

اکبری مسئلہ ۲/۴

میت توافق بالنصف بیدہ ۷۱/۱۴۲

بنت انوری	ابن وحید	بنت اصغری
۱/۷۱	۲/۱۴۲	۱/۷۱

الاحیاء

انوری	وحید	اصغری
۶۵۹	۲۸۲	۲۱۱

المبلغ

۱۱۵۲

صورتِ مسئولہ میں بموجب صورتِ مذکورہ بالا بعد ما تقدم علی الارث کل مال ممن کے ایک ہزار ایک سو

باون (۱۱۵۲) حصہ کر کے چھ سوانسٹھ (۶۵۹) حصہ انوری کو دیئے جائیں گے اور دو سو بیاسی (۲۸۲) حصہ وحید کو اور دو سو گیارہ (۲۱۱) حصہ اصغری کو اور موجودگیٔ پسر میں بھائی اگر موجود بھی ہوتے ان کو کچھ نہ ملتا پھر بھتیجوں کو کس طرح مل سکتا ہے۔ علی ہذا شریعت میں متبنیٰ یعنی پروردہ کو کچھ نہیں ملتا۔ واللہ اعلم وحکمہ أحکم

حررہ: العبد الراجی
ابو محمد محمد دیدار علی المفتی
فی مسجد جامع اکبر آباد

فتویٰ نمبر...... 337

سوال

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس صورت میں کہ مدار بخش اور ان کے ورثہ کا حسب ترتیب ذیل انتقال ہوا۔ اب ان کی جائداد اور مالِ متروکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟

مدار بخش نے وقتِ انتقال غلام حسین' وزیر' امیر' چھٹا' قادر بخش' حیدر بخش بیٹے اور نصیبن' فہیما' چھٹیا بیٹیاں اور نبی بخش' محمد حسین پوتے اور عمدہ پوتی چھوڑی۔

بعدہ چھٹیا بیٹی کا انتقال ہوا اس نے بھی فقط مذکورہ بالا بھائی اور بہنیں اور بھتیجا بھتیجی چھوڑیں۔

علی ھذا حیدر بخش نے بھی یہی بھائی بہن بھتیجے بھتیجی چھوڑیں

پھر غلام حسین نے بھی بھائی بہن بھتیجا بھتیجی کے سوا کچھ نہ چھوڑا پھر وزیر بخش نے بھی یہی ورثہ اور ایک مسماۃ کماں بیوی چھوڑی پھر امیر بخش نے بھی بجز ورثۂ مذکورہ کچھ نہ چھوڑا۔

پھر قادر بخش نے بھی بجز ایک بیوی مسماۃ بیگم اور ورثۂ مذکورہ کے کچھ نہ چھوڑا۔

بعدہ فہیما نے بھی بجز بھائی بہن بھتیجا بھتیجی مذکور کے کچھ نہ چھوڑا۔ بعدہ نصیبا نے ورثۂ مذکورہ چھوڑے اور چار بیٹے عبدالحکیم' محمد امین' عنایت حسین' ممتاز حسین اور دو بیٹی امانی حسینی وارث چھوڑے۔ من بعد مسمی چھٹیا نے وقتِ انتقال دو بھتیجے نبی بخش امداد حسین اور تین بھتیجی امراون' نذیرن' مخدومن چھوڑے۔

من بعد نبی بخش نے ایک بیوی مسماۃ فاطمہ چھوڑی اور دو بیٹی نوابن' بتولن چھوڑیں۔

اور غلام حسین نے چونکہ بلا نکاح ایک طوائف گھر میں ڈال لی تھی اور زنا سے دو بچے مسمی مصطفیٰ حسین اور چھٹن پیدا ہوئے تھے لہٰذا علاوہ بھائی بہن وغیرہ یہ زنا سے دو بیٹے اور چھوڑے تھے۔

امیر بخش نے چونکہ جان محمد کو متبنی کر لیا تھا لہٰذا علاوہ بہن بھائیوں کے جان محمد نے لے پالک بیٹا بھی چھوڑا تھا۔

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں بعدما تقدم علی الارث کل مال مدار بخش کے ایک لاکھ اکاون ہزار دو سو (۱۵۱۲۰۰) حصہ کر کے سات ہزار پانچ سو ساٹھ (۷۵۶۰) کماں کو پانچ ہزار نو سو پچاسی (۵۹۸۵) بیگم کو اور باون ہزار تین (۵۲۰۰۳) حصہ امداد حسین کو اور آٹھ ہزار تین سو اناسی (۸۳۷۹) امراون کو اور اتنے ہی مخدومن کو اور نذیرن کو اور چھ ہزار تین سو چوراسی (۶۳۸۴) عبدالحکیم کو اور اتنے ہی محمد امین' عنایت حسین' ممتاز حسین کو اور تین ہزار ایک سو بانوے (۳۱۹۲) امانی کو اور اتنے ہی حسینی کو اور تین ہزار نو سو نوے (۳۹۹۰) فاطمہ کو اور نواب ن کو دس ہزار چھ سو چالیس (۱۰۶۴۰) اور اتنے ہی بتولن کو اور تین ہزار تین سو پچیس (۳۳۲۵) محمد حسین کو دیئے جائیں گے۔

☆ علاوہ بریں زنا سے بلا نکاح جو طوائف کے دولڑکے مصطفیٰ حسین اور چھٹن غلام حسین نے چھوڑے ہیں چونکہ زنا سے ثبوت نسب نہیں ہوتا لہٰذا ان کو بطریق میراث کچھ نہیں ملے گا۔

☆ اور نہ جان محمد کو اس واسطے کہ شرعاً لے پالک بیٹا نہیں سمجھا جاتا۔ بیٹا وہی ہوتا ہے جو اپنے نطفہ سے پیدا ہوتا ہو۔ واللہ اعلم و صورتہ ھکذا

مدار بخش مسئلہ ۱۵/۲۹۰/۴۲۰/۳۳۶۰/۱۶۸۸۰/۵۰۴۰۰/۱۵۱۲۰۰

میت

ابن	ابن	ابن	ابن
غلام حسین	وزیر	امیر	چھٹا
۲/۲۸/۵۶	۲/۲۸/۵۶	۲/۲۸/۵۶/۴۴۸	۲/۲۸/۵۶/۴۴۸/۲۲۴۰/۶۷۲۰

ابن	ابن	بنت	بنت

قادر بخش	حیدر	نصیبا	چھٹیا
۲/۲۸/۵۶/۴۴۸	۲/۲۸	۱/۱۴/۲۸/۲۲۴/۱۱۲۰/۳۳۶۰	۱

بنت	ابن الابن	ابن الابن	بنت الابن
فہیما	نبی بخش	محمد حسین	عمدہ
۱/۱۴/۲۸/۲۲۴/۱۱۲۰	م	م	م

چھٹیا مسئلہ

میت　بیدہ ۱

اخ	اخ	اخ	اخ	اخ	اخ
غلام حسین	وزیر	امیر	چھٹا	قادر بخش	حیدر
۲/۴	۲/۴	۲/۴/۳۲	۲/۴/۳۲/۱۶۰/۴۸	۲/۴/۳۲	۲

اخت	اخت	ابن الاخ	ابن الاخ	بنت الاخت
نصیبا	فہیما	نبی بخش	محمد حسین	عمدہ
۱/۲/۱۶/۸۰/۲۴۰	۱/۲/۱۶/۸۰	م	م	م

حیدر بخش مسئلہ ۱۲　توافق بالسدس

میت　بیدہ ۵/۳۰

اخ	اخ	اخ	اخ	اخ	اخت
غلام حسین	وزیر	امیر	چھٹا	قادر بخش	فہیما
۲/۱۰	۲/۱۰	۲/۱۰/۸۰	۲/۱۰/۸۰/۴۰۰/۱۲۰۰	۲/۱۰/۸۰	۱/۵/۴۰/۲۰۰

اخت	ابناء الاخ		بنت الاخ
نصیبا	نبی بخش	محمد حسین	عمدہ
۱/۵/۴۰/۲۰۰/۶۰۰	م	م	م

غلام حسین مسئلہ ۱/

میت ۷/۷۰

اخ	اخ	اخ	اخ	اخت
وزیر	امیر	چھٹا	قادر بخش	فہیما
۲/۱۴	۲/۱۴/۱۱۲	۲/۱۴/۱۱۲/۵۶۰/۱۶۸۰	۲/۱۴/۱۱۲	۱/۷/۵۶/۲۸۰

اخت	ابناء الاخ		بنت الاخ
نصیبا	نبی بخش،	محمد حسین	عمدہ
۱/۷/۵۶/۲۸۰/۸۴۰	م	م	م

وزیر بخش مسئلہ ۸/۳۲/۴

میت	توافق بالربع		بیدہ
زوجہ	اخ	اخ	اخ
کمان	امیر	چھٹا	قادر بخش
۱/۸/۱۶۸/۸۴۰/۲۵۲۰/۷۵۶۰	۶/۱۲۶	۶/۱۲۶/۶۳۰/۱۸۹۰	۶/۱۲۶

اخت	اخت	ابناء الاخ		بنت الاخ
نصیبا	فہیما	نبی بخش۔	محمد حسین	عمدہ
۳/۶۳/۳۱۵/۹۴۵	۳/۶۳/۳۱۵	م	م	م

امیر بخش مسئلہ ۶

میت		بیدہ ۱۳۳/۷۹۸	
اخ	اخ	اخت	اخت
چھٹا	قادر بخش	نصیبن	فہیمن
۲/۲۶۶/۱۳۳۰/۳۹۹۰	۲/۲۶۶	۱/۱۳۳/۶۶۵/۱۹۹۵	۱/۱۳۳/۶۶۵

ابناء الاخ		بنت الاخ
نبی بخش۔محمد حسین		عمدہ
م	م	م

قادر بخش مسئلہ ۸/۴۰/۵ توافق بالثمن

میت بیدہ ۱۳۳/۱۰۶۴۰

زوجہ	ابن	بنت
بیگم	امداد حسین	امراون
۱/۵/۶۶۵	۱۴/۱۸۶۲/۵۵۸۶/۱۶۷۵۸	۷/۹۳۱/۲۷۹۳/۸۳۷۹

بنت	بنت	اخ	اخت	اخت
نذیرن	مخدومن	چھٹا	نصیبا	فہیما
۷/۹۳۱/۲۷۹۳/۸۳۷۹	۷/۹۳۱/۲۷۹۳/۸۳۷۹	م	م	م

ابناء الاخ	بنت الاخ
م	م

فہیما مسئلہ ۳ تباین

میت بیدہ ۲۶۶۰

اخ	اخت	ابناء الاخ	بنت الاخ
چھٹا	نصیبا	م	م
۲/۵۳۲۰	۱/۲۶۶۰		

نصیبا مسئلہ ۱/

میت بیدہ ۱۰۶۴/۱۰۶۴۰

ابن	ابن	ابن	ابن	بنت
عبدالحکیم	محمد امین	عنایت حسین	ممتاز حسین	امانی
۲/۲۱۶۸/۶۳۸۴	۲/۲۱۶۸/۶۳۸۴	۲/۲۱۶۸/۶۳۸۴	۲/۲۱۶۸/۶۳۸۴	۱/۱۰۶۴/۳۱۹۲

بنت حسینی	اخ	ابناء الاخ	بنت الاخ
۱/۱۰۶۴/۳۱۹۲	م	م	م

چھٹا مسئلہ ۲

میت بیدہ ۱۰۶۴۰/۲۱۲۸۰

ابن الاخ	ابن الاخ	بنات الاخ		
نبی بخش	امداد حسین	امراون۔نذیرن۔مخدومن		
۱/۱۰۶۴۰/۳۱۹۲۰	۱/۱۰۶۴۰/۳۱۹۲۰	م	م	م

نبی بخش مسئلہ ۳/۴۸/۲۴

توافق بستۃ عشر

میت بیدہ ۶۶۵/۱۰۶۴۰

زوجہ	بنت	بنت	ابن العم	ابن العم	بنت العم
فاطمہ	نوابن	بتولن	امداد حسین	محمد حسین	عمدہ
۳/۶/۳۹۹۰	۸/۱۶/۱۰۶۴۰	۸/۱۶/۱۰۶۴۰	۵/۳۳۲۵	۵/۳۳۲۵	م

الاحیاء

کمان	بیگم	امداد حسین	امراون	نذیرن	مخدومن	عبدالحکیم	محمد امین
۷۵۶۰	۵۹۸۵	۵۲۰۰۳	۸۳۷۹	۸۳۷۹	۸۳۷۹	۶۳۸۴	۶۳۸۴
عنایت حسین	ممتاز حسین	امانی	حسینی	فاطمہ	نوابن	بتولن	محمد حسین
۶۳۸۴	۶۳۸۴	۳۱۹۲	۳۱۹۲	۳۹۹۰	۱۰۶۴۰	۱۰۶۴۰	۳۳۲۵

المبلغ

۱۵۱۲۰۰

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی المفتی فی جامع اکبر آباد

۲۲ رجب المرجب ۳۶ھ

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر...... 338﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ

محمد بخش ہمارے دادا نے عرصہ 80 سال کا ہوا کہ وفات پائی انہوں نے دو لڑکے، بڑا شیخ عنایت اللہ اور چھوٹا شیخ نصر اللہ اور ایک اپنی بیوہ اور دو مکان چھوڑے۔

عرصہ 50 سال کا ہوا بڑے لڑکے شیخ عنایت اللہ نے وفات پائی اور انہوں نے تین لڑکے احمد اللہ، انعام اللہ وغلام جیلانی اور ایک اپنی زوجہ چھوڑی۔

چند سال بعد زوجہ محمد بخش مرحوم نے انتقال کیا۔

اور اس کے چند سال بعد چھوٹے لڑکے شیخ نصر اللہ نے اپنی حیات میں ہر دو مکان کو بضرورتِ خود رہن رکھ دیا بابت مکان نمبر 1 مرتہن نے نالش دائرِ عدالت کی۔ مکان نمبر 1 زیرِ رہن میں قرق ہو گیا۔ پسرانِ شیخ عنایت اللہ مرحوم نے جو اس وقت نابالغ تھے عدالت میں عذر داری کر دی کہ ہم نابالغان کے حصہ کا رہن رکھنے کا چچا کو اختیار نہ تھا۔ عدالت سے مکانِ مذکور میں نصف حصہ ثابت کیا گیا اور نصف مکان جو حصہ نصر اللہ سمجھا گیا نیلام کر دیا گیا۔ اس پر ہم لوگ قابض اور دخیل ہیں۔ ایک بھائی ہمارا انعام اللہ درمیان میں فوت ہو گیا۔ باقی دو بھائی احمد اللہ وغلام جیلانی اب تک اس پر قابض اور دخیل چلے آتے ہیں۔

بعد گزرنے زمانہ 45 سال کے پسر شیخ نصر اللہ دعوی کرتا ہے کہ اس مکان نمبر 1 میں میری دادی کا حق ہے مجھ کو دیا جائے۔ آیا وہ کچھ پانے کا مستحق ہے؟

اور دوسرا مکان نمبر 2 جو دخلی رہن تھا بعد وفات شیخ نصر اللہ من جانب مرتہن بیع ہو گیا ہے۔ چونکہ مکان 2 موروثی جائداد ہے۔ اس مکان میں شرعی کچھ حصہ پسران شرعی دادی کا پسر شیخ نصر اللہ کا نکلے تو وہ حصہ حالت موجودہ سے دیا جائے گا یا حالتِ سابقہ سے؟ کیوں کہ بوجہ کہنہ اور بوسیدہ ہونے کے مکان کو پسران شیخ عنایت اللہ نے از سرِ نو بنوایا ہے۔

بینوا بالکتاب وتوجروا بالصواب

الجواب

بسم الله الرحمن الرحيم

.اللھم رب زدنی علما

محمد بخش مسئلہ ۹۲۱۶/۱۱۵۲/۱۶/۸

میت

زوجہ	ابن	ابن
مریم	عنایت اللہ	نصر اللہ
۴۴/۲/۱	۷	۴.۵/۷

عنایت اللہ مسئلہ ۷/۲۴/۲

زوجہ	ام	ابن	ابن	ابن
فاطمہ	مریم	احمد اللہ	انعام اللہ	غلام جیلانی
۵۰۴/۶۳/۹/۳	۸۴/۱۲/۴	۹۵۲/۱۱۹/۱۷	۹۵۲/۱۱۹/۱۷	۹۵۲/۱۱۹/۱۷

مریم مسئلہ ۱

میت بیدہ ۲۸۸

ابن نصر اللہ

۲۸۸

نصر اللہ مسئلہ ۳۲/۸

میت توافق بامریم بیدہ ۷۳۲/۱۸۲

زوجہ	ابن	بنت	بنت
زینب	عمر	زیدن	خانم
۷۳۳/۴/۱	۲۵۶۴/۱۴	۱۲۸۱/۷	۱۲۸۱/۷

اللهم أرنا الحق حقا و الباطل باطلا

صورتِ مسئولہ میں بعد ماتقدم علی الارث کل مال محمد بخش کے نو ہزار دو سو سولہ (۹۲۱۶) حصہ کر کے حسبِ صورتِ مذکورہ بالا فاطمہ کو پانچ سو چار (۵۰۴) حصہ دیئے جائیں گے اور احمد اللہ کو نو سو باون (۹۵۲) اور اتنے ہی انعام اللہ کو اتنے ہی غلام جیلانی کو اور سات سو بتیس (۷۳۲) حصہ زینب کو اور دو ہزار پانچ سو باسٹھ (۲۵۶۲) حصہ عمر کو اور ایک ہزار دو سو اکیاسی (۱۲۸۱) زیدن اور اتنے ہی خانم کو بدیں تفصیل

الاحیاء

فاطمہ	احمد اللہ	انعام اللہ	غلام جیلانی	زینب	عمر	زیدن
۵۰۴	۹۵۲	۹۵۲	۹۵۲	۷۳۲	۲۵۶۲	۱۲۸۱

المبلغ

۹۲۱۶

لہٰذا کل مال محمد بخش سے من جملہ ۹۲۱۶ حصوں کے تین ہزار تین سو ساٹھ (۳۳۶۰) کے حقدار عنایت اللہ کے تینوں بیٹے اور بیوی رہے اور پانچ ہزار آٹھ سو چھپن (۵۸۵۶)' حصوں کے حقدار نصر اللہ کے بیٹا' بیٹی اور بیوی رہے۔

اور اگر محمد بخش کی بیوی مریم نے قبل تقسیمِ حصص مہر بھی لیا ہوگا تو وہ بھی اور جو بھی اس کی ملک ہوگا تو وہ بھی نصر اللہ کے ذریعہ سے فقط ورثۂ نصر اللہ کا ہے۔

پھر حسبِ تفصیلِ مذکورہ تقسیم ہوگا میراثِ نصر اللہ اور اس میں سے اولا دعنایت اللہ کو کچھ نہیں مل سکتا اس واسطے کہ عنایت اللہ مریم سے پہلے ہی مر چکا تھا اور موجودگی بیٹے میں دادی کے مال سے پوتوں کچھ نہیں مل سکتا۔

البتہ انعام اللہ کے مال سے اگر انعام اللہ بعد مریم مرا ہے۔ نصر اللہ کی اولاد کو کچھ نہیں مل سکتا اور اگر انعام اللہ مریم اپنی دادی کے سامنے مرا ہے تو جب بھی انعام اللہ سے اولا د نصر اللہ کو کچھ نہیں مل سکتا۔ اس واسطے کہ دادی کو موجودگی ام میں جو فاطمہ ام انعام اللہ کچھ نہیں ملتا۔ لہٰذا کل مال انعام اللہ کا انعام اللہ کے بھائی اور ماں ہی کو ملے گا۔

اب صورتِ مسئلہ اس طرح ہو جائے گی کہ بعد ما تقدم علی الارث، زرِ مہر، دیگر دیونِ میت وغیرہ کے کل مالِ میت کے ستائیس ہزار چھ سو اڑتالیس (۲۷۶۴۸) حصہ کر کے انیس سو اٹھاسی (۱۹۸۸) حصہ فاطمہ کو دیئے جائیں گے اور احمد اللہ کو چار ہزار چھیالیس (۴۰۴۶) اور اتنے ہی غلام جیلانی کو۔

لہٰذا جملہ ورثۂ عنایت اللہ کے دونوں مکانوں میں دس ہزار اسی (۱۰۰۸۰) حصہ ہوئے اور ورثہ نصر اللہ سے زینب کو دو ہزار ایک سو چھیانونے (۲۱۹۶) حصہ دیئے جائیں گے اور عمر کو سات ہزار چھ سو چھیاسی (۷۶۸۶) اور زیدن کو تین ہزار آٹھ سو تینتالیس (۳۸۴۳) اور اتنے ہی حصہ خانم کو دیئے جائیں گے۔ لہٰذا جملہ ورثہ نصر اللہ کے کل سترہ ہزار پانچ سو اڑسٹھ (۱۷۵۶۸) حصہ ہوں گے حصہ صورت آئندہ

اور پسرانِ عنایت اللہ نے جس قدر نیا مکان اس زمین میں جو حصہ پسرانِ نصر اللہ خان میں آئے بنوا لیا ہے اگر باجازتِ نصر اللہ یا پسرانِ نصر اللہ بنایا ہے۔ زمین مع نو ساختہ مکان پسرِ نصر اللہ کو دے دی جائے گی اور بعد منہائی قیمت اس قدر ملبے کی جو اصل مکان سے بحصۂ پسرانِ نصر اللہ آئے۔ پسرانِ نصر اللہ سے اسی قدر روپیہ جو بنوانے مکانِ جدید میں بحصہ نصر اللہ صرف ہوا ہے۔ پسران عنایت اللہ کو دلوایا جائے۔

چنانچہ یہ امر اس روایت سے جو جامع الفصولین کے صفحہ ۱۶۰ میں مذکور ہے دائر ہے۔ وھذہ عبارتہ

الاصل ان من بنی فی دار غیرہ بامر فالبناء فلرب الدار و یرجع علیه بما انفق[1] .

☆(ترجمہ: قاعدہ یہ ہے کہ جس نے کسی دوسرے شخص کے گھر میں اس کے حکم سے کوئی تعمیر کی تو وہ تعمیر کردہ عمارت گھر کے مالک کی ہوگی اور تعمیر کرنے والے نے جو کچھ خرچ کیا اس کی وصولی کے لیے گھر کے مالک کی طرف رجوع کرے)

☆ اور اگر پسرانِ عنایت اللہ نے بلا اجازت پسرانِ نصر اللہ کے ان کے حصہ میں اپنے واسطے مکان بنا لیا تھا تو اس مکان کی وہی مالک رہیں گے مگر مالکِ زمین جب چاہے اپنی زمین کو مکان گروا کر لے سکتا ہے۔ اور اگر بتراضیءِ طرفین زمین کی قیمت مالکِ زمین کو دے دے تو مضائقہ نہیں۔ اور اگر بانی مکان نے زمین والے کے

---

[1] جامع الفصولین، جلد ۲ صفحہ ۱۶۰ دار الاشاعت العربیۃ کوئٹہ

واسطے ہی مکان بنوایا تھا تو مکان وزمین دونوں کا مالک زمین والا ہی رہے گا اور لاگت مکان بھی نہ دلوائی جائے گی۔

چنانچہ صفحہ ۵۲۷ درمختار مطبوعہ علی ہامش درالمختار مصری میں ہے:

عمر دار زوجته بماله باذنها فالعمارة لها و النفقة دين عليها لصحة امرها و لو عمر لنفسه بلا اذنها فالعمارة له ويكون غاصبا للعرصة فيومر بالتفريغ بطلبها ذلک ولها بلا اذنها فالعمارة لها و هو متطوع[۱] هكذا فى الشافى[۲]

(ترجمہ: کسی نے اپنے مال سے عورت کی اجازت کے ساتھ اس کا گھر تعمیر کیا تو وہ عمارت عورت کی ملکیت ہوگا اور خرچ شدہ رقم اس کے ذمہ دین ہوگا کیوں کہ اس کا حکم کرنا درست ہے۔ اور اگر خاوند نے اپنی ذات کے لیے اس کی اجازت کے بغیر (اس کی جگہ پر) تعمیر کیا تو تعمیر کردہ مکان خاوند کا ہے اور وہ اس زمین کا غاصب ٹھہرے گا جب وہ مطالبہ کرے تو اس کو وہ جگہ خالی کرنے کا حکم دیا جائے گا اور اگر خاوند نے عورت کے اجازت کے بغیر اس کی زمین پر عورت کے لیے گھر تعمیر کا تو وہ عمارت عورت کی ہے اور مرد خوشی سے خرچ کرنے والا شمار ہوگا)

محمد بخش

میت

زوجہ	ابن عنات اللہ	ابن نصر اللہ
۱/۲/۱۴۴	۷	۷/۵۰۴/۶۰۴۸

عنایت اللہ مسئلہ ۲/۲۴ ۷

میت بیدہ ۷

ابن انعام اللہ	ابن غلام جیلانی	زوجہ فاطمہ	ام مریم	ابن احمد اللہ
۱۷/۱۱۹	۷/۱۱۹/۱۴۲۸/۲۸۶۵	۴۳/۹/۶۳/۷۵۶/۱۵۱۲	۴/۱۲/۸،	۱۷/۱۱۹/۱۴۲۸/۲۸۶۵

---

[۱] الدر المختار مع رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۵۲۷ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

[۲] یہ عبارت الدر المختار میں نہیں ہے۔

مریم مسئلہ ۱/

میت

ابن نصر اللہ	ابن الابن احمد اللہ	ابن الابن انعام اللہ	ابن الابن غلام جیلانی
۲۸۸/۲۷۳۶	م	م	م

انعام اللہ مسئلہ ۶/۱۲

میت

جدہ مریم	ام فاطمہ	اخ احمد اللہ	اخ غلام جیلانی
م	۱/۲/۲۳۸/۴۷۶	۵/۵۹۵/۱۱۹۰	۵/۵۹۵/۱۱۹۰

نصر اللہ مسئلہ ۸/۳۲

میت

زوجہ زینب	ابن عمر	بنت زیدن	بنت خانم
۱/۴/۲۱۹۶	۱۴/۷۶۸۶	۷/۳۸۴۳	۷/۳۸۴۳

الاحیاء

فاطمہ	احمد اللہ	غلام جیلانی	زینب	عمر	زیدن	خانم
۱۹۸۸	۴۰۴۶	۴۰۴۶	۲۱۹۶	۷۶۸۶	۳۸۴۳	۳۸۴۳

المبلغ

۲۷۶۴۸

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ

ابو محمد محمد دیدار علی الرضوی المفتی

فی جامع اکبر آباد

﴿فتویٰ نمبر......339﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص کا انتقال ہوا اور پانچ ورثا چھوڑے۔ دو بی بی' دو بھائی' ایک بہن۔ اس شخص کا ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟

الجواب

صورتِ مسئولہ میں بعد ما تقدم علی الارث مہر دو زوجہ وغیرہ کل مال زید کے چالیس حصہ کر کے پانچ پانچ حصہ دونوں زوجہ کو اور بارہ بارہ حصہ دونوں بھائیوں کو اور چھ حصہ بہن کو حسبِ مسطورِ ذیل دیئے جائیں گے۔

زید مسئلہ ۴۰

میت

زوجہ	زوجہ	اخ	اخ	اخت
۵	۵	۱۲	۱۲	۶

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ
محمد دیدار علی الحنفی المفتی فی جامع اکبر آباد

✿✿✿✿✿

﴿فتویٰ نمبر...... 340﴾

سوال

ایک لڑکی ڈھائی برس کی ہے جس کے ماں' باپ' دادا' دادی' نانا' نانی' بہن' خالہ سب کا انتقال ہو گیا ہے۔ فقط اس کے قرابتیوں میں سے یہ رشتہ دار باقی ہیں۔ اس کی ماں کا ماموں اور تین چچا تایا اور تین پھوپھی۔ اس مال کا جو اس لڑکی کے ماں باپ نے بوقتِ مرگ مکان وغیرہ چھوڑا ہے اس میں اس لڑکی کا کتنا حصہ ہے؟ اور اس کی ماں کے بھائی بہنوں اور اس کے باپ کے بھائی بہنوں کا کتنا حصہ ہوگا۔؟

الجواب

کل مالِ پدر سے لڑکی کو نصف ملے گا۔ اس طرح کہ کل مالِ زید پدرِ دختر کے اٹھارہ حصہ کر کے اس میں سے نو حصہ لڑکی کے ہوں گے۔ دو دو حصہ تینوں زید کے بھائیوں کے اور ایک حصہ زید کی تینوں بہنوں کا جو لڑکی کی تین پھوپھیاں ہیں اور مال کا چونکہ بجز اس نابالغہ کے اور ایک ماموں کے جو ذوی الارحام سے ہے اور کوئی وارث نہیں ہے۔☆ لہٰذا کل مال والدۂ نابالغۂ مذکورہ کا اس لڑکی نابالغہ کو ملے گا۔

☆ پھر لڑکی کے حصہ کا کل مال اگر لڑکی کی پرورش کی ضرورت ہو وہاں خرچ کیا جائے گا ورنہ چچا تایوں میں جو امانت دار ہو۔ اس کے پاس لڑکی کے بالغ ہونے تک محفوظ رہے۔

واللہ اعلم وعلمہ احکم

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ
محمد دیدار علی الحنفی المفتی فی جامع اکبر آباد

۱۶ فروری ۱۹۱۸ء

﴿فتویٰ نمبر...... 341﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ کریم بیگ نے وقتِ انتقال ایک جائداد مشترکہ چھوڑی جو آدھی کریم بیگ کی تھی، اور آدھی الف بیگ برادر حقیقی کریم بیگ کی اور یہ وارث چھوڑے۔

زوجہ مغلانی چار بیٹے نعیم بیگ، ابراہیم بیگ، قسیم بیگ، مستقیم بیگ، دو دختر امراؤ خانم، بادشاہی خانم، مگر معلانی نے کل جائداد حصہ کریم بیگ اپنے مہر میں نیلام کرادی جس کو الف بیگ پہلی بیوی مسماۃ کھمی نے خریدلی۔

بعدہ کھمی کا انتقال ہوا اس نے یہ وارث چھوڑے۔ شوہر الف بیگ، دختر نظامی دو برادر احمد حسین، تجمل حسین۔

بعدہ الف بیگ کا انتقال ہوا۔ اس نے ایک بیوی چھوڑی، مسماۃ خانم اور دو دختر ایک اپنی زوجہ اول مسماۃ کھمی سے مسماۃ نظامی بیگم اور ایک زوجہ دوم مسماۃ خانم سے مسماۃ ثریا بیگم اور ایک بہن مسماۃ امامی بیگم اور چار بھتیجے اور دو بھتیجی

بعدہ تجمل حسین کا انتقال ہوا اس نے یہ ورثہ چھوڑے۔ زوجہ رفیق بیگم اور دو لڑکے جمیل حسن و جلیل حسن اور تین لڑکی عزیز بیگم، شریف بیگم، شفیق بیگم اور ایک بھائی احمد حسین۔

بعدہ عزیز بیگم کا انتقال ہوا۔ اس نے ایک ماں رفیق بیگم اور دو بھائی جمیل اور جلیل اور دو بہن شریف بیگم اور شفیق بیگم اور ایک چچا احمد حسین کو چھوڑا۔

بعدہ نعیم بیگ کا انتقال ہوا اس نے ایک بیوی نظامی کو اور ایک ماں مسماۃ مریم مغلانی اور تین بھائی ابراہیم بیگ، مستقیم بیگ، قسیم بیگ اور دو بہن امراؤ بیگم اور بادشاہی بیگم کو چھوڑا۔

بعدہ امراؤ بیگم کا انتقال ہوا اس نے ایک بہن بادشاہی بیگم چھوڑی اور تین بھائی ابراہیم، مستقیم، قسیم اور ایک ماں مغلانی۔

بعدہ نظامی کا انتقال ہوا اس نے دو بھتیجے جلیل اور جمیل اور دو بھتیجی شریف بیگم اور شفیق بیگم اور ماموں احمد حسین

اندریں صورت ترکہ الف بیگ وکبھی کس طرح تقسیم ہوگا؟ اس واسطے کہ نعیم بیگ نے تو کچھ ترکہ نہ چھوڑا۔

۲۷ ربیع الثانی ۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔

اللھم رب زدنی علما

صورتِ مسئولہ میں اول بعد ماتقدم علی الارث کل جائداد زرخرید کبھی اس طرح تقسیم ہوگی کہ کل جائداد کبھی کے ایک ہزار ایک سو باون (۱۱۵۲) حصہ کر کے دوسو اٹھاسی (۲۸۸) حصہ الف بیگ کو دیئے جائیں گے اور پانچ سو چھہتر (۵۷۶) نظامی کو اور ایک سو چوالیس (۱۴۴) احمد حسین کو اور چوبیس (۲۴) رفیق بیگم اور چالیس (۴۰) جمیل اور چالیس (۴۰) ہی جلیل کو اور بیس (۲۰) شریف بیگم کو اور بیس (۲۰) ہی شفیق بیگم کو۔

صورته هذا

کبھی مسئلہ ۴/۶۴/۱۱۵۲

زوج	بنت	اخ	اخ
الف بیگ	نظامی	احمد حسین	تجمل حسین
۱/۲/۱۶/۲۸۸	۲/۴/۳۲/۵۷۶	۱//۸۱۴۴	۱

تجمل حسین مسئلہ ۸

میت

زوجہ	ابن	ابن	بنت	بنت	بنت	اخ
رفیق بیگم	جمیل حسن	جلیل حسن	شریف بیگم	عزیز بیگم	شفیق بیگم	احمد حسین
۱/۱۸	۲/۳۶	۲/۳۶	۱/۱۸	۱	۱/۱۸	م

عزیز بیگم مسئلہ ۱۸/۳

میت

ام	اخ	اخ	اخت	اخت	عم

رفیق بیگم	جلیل	جمیل	شریف بیگم	شفیق بیگم	احمد حسین
۶/۱	۴	۴	۲	۲	م

الاحیاء

الف بیگ	نظامی	احمد حسین	رفیق بیگم	جمیل	جلیل	شفیق بیگم	شریف بیگم
۲۸۸	۵۷۶	۱۴۴	۲۴	۴۰	۴۰	۲۰	۲۰

المبلغ

۱۱۵۲

اور نصف جائداد الف بیگ معہ اس حصہ کے جو الف بیگ کو جائداد زرخرید کبھی اپنی زوجہ سے ملا ہے اس طرح تقسیم ہوگی کہ کل مالِ الف بیگ کے چوبیس حصہ کر کے تین حصہ خانم زوجہ الف بیگ کو ملیں گے اور آٹھ حصہ ثریا بنت الف بیگ کو جو خانم زوجہ ثانی سے ہے اور آٹھ ہی نظامی بنت الف بیگ کو جو زوجۂ اول مسماۃ کبھی سے ہے اور پانچ حصہ امامی خانم اخت الف بیگ کو اور بھتیجا بھتیجیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ صورتہ ھکذا

الف بیگ مسئلہ

زوجہ خانم	بنت ثریا خانم	بنت نظامی	اخت امامی خانم
۳	۸	۸	۵

اور نعیم بیگ نے کچھ مال چھوڑا نہیں لہذا اس کی تقسیم کی حاجت نہیں۔

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ

ابو محمد محمد دیدار علی

المفتی فی جامع اکبر آباد

مورخہ ۲۷ ربیع الثانی ۳۶ھ

﴿فتویٰ نمبر......342﴾

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی وفات کے بعد حسب ذیل ورثہ چھوڑے ایک بیوی دولڑکیاں۔ بعد انتقال زید کے چار ماہ بعد ایک لڑکا پیدا ہوا اور چار ماہ زندہ رہ کر فوت ہوگیا اور صرف ایک بیوہ دولڑکیاں باقی رہ گئیں۔ ترکۂ مورث ورثہ پر کس طرح تقسیم ہوگا؟

۲۹ جمادی الاولی ۳۶ھ

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اللھم رب زدنی علما

صورت مسئولہ میں بعد ماتقدم علی الارث اور انحصار ورثہ ء کے ورثۂ مذکورہ میں کل مال زید کے ایک سو ساٹھ حصہ کر کے ۳۴ حصہ مریم کو دیئے جائیں گے۔ اور ۶۳ حصہ زینب کو اور اتنے ہندہ کو۔ صورتہ ھکذا

زید مسئلہ ۸/۳۲/۱۶۰

میت

زوجہ	ابن	بنت	بنت
مریم	بکر	ھندہ	زینب
۱/۴/۲۰	۱۴	۷/۳۵	۷/۳۵

بکر مسئلہ

میت بیدہ (۱۴)

ام	اخت	اخت
مریم	ھندہ	زینب

۱/۱۴	۲/۲۸	۲/۲۸

الاحیاء

مریم	ھندہ	زینب
۳۴	۶۳	۶۳

المبلغ

۱۶۰

حررہ: العبدالراجی رحمۃ ربہ
ابومحمد محمد دیدار علی الحنفی المفتی فی جامع اکبرآباد

﴿فتویٰ نمبر...... 343﴾

سوال

عرضِ حال یہ ہے کہ یہاں پر ایک مولوی صاحب نے وعظ میں فرمایا کہ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی لاش مبارک شہادت کے بعد کئی روز تک نہایت ناگفتہ بہ حالت میں پڑی رہی اور آپ کی ایک ٹانگ (نعوذ باللہ) کتوں نے چبا ڈالی۔ مولوی صاحب اس واقعہ کو ایک تاریخی واقعہ بتلاتے ہیں۔ لہٰذا مفصل تحریر فرمایئے کہ یہ کہاں تک صحیح ہے۔ مولانا احمد رضا خان صاحب مدظلہ العالی سے جو دریافت کیا گیا تو وہ ایسا تحریر فرماتے ہیں۔ امام حافظ ابن حجر عسقلانی کتاب الاصابہ فی تمییز الصحابہ میں فرماتے ہیں۔

قال الزبير ابن بكار بويع يوم الاثنين لليلة بقيت من ذى الحجة سنة ثلاث و عشرين و قتل يوم الجمعة لثمان عشرة خلت من ذى الحجة بعد العصر ودفن ليلة السبت بين المغرب والعشاء[1] .

(ترجمہ: حضرت زبیر بن بکار نے فرمایا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی بیعت ۲۹ ذی الحجہ ۲۳ھ کو کی گئی۔ جمعہ کے دن اٹھارہ ذی الحجہ کو عصر کے بعد آپ کو شہید کیا گیا اور ہفتہ کے کی رات کو مغرب اور عشاء کے مابین آپ کو دفن کیا گیا)

شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ نے تحفہ اثنا عشریہ میں امیر المومنین ذوالنورین رضی اللہ عنہ دسویں طعن میں اول ملاعین سے نقل کیا کہ :

بعد از قتل اورا تاسه روز افتاده گذاشتند و بدفن اونپر داختند[2]

(ترجمہ: بعد مارے جانے کے تین روز اسی طرح پڑا رہنے دیا کسی نے دفن نہیں کیا[3])

---

[1] کتاب الاصابہ فی تمییز الصحابہ — جلد ۲ ، صفحہ ۳۶۴ — مطبوعہ مکتبہ المثنیٰ لبنان

[2] تحفہ اثنا عشریہ — صفحہ — مطبوعہ ترکی

[3] ترجمہ اردو تحفہ اثنا عشریہ — صفحہ ۶۷۶ — نور محمد اصح المطابع کراچی

کتوں کا لفظ اس طعن میں نہیں ہے۔ پھر جواب میں بہت سی روایت ذکر کر کے فرمایا:۔

ازیں روایات مشہورہ متعددہ ثابت شدہ تاسہ روز افتادہ ماندن لاشِ عثمان محض افترا و دروغ ست ودر جمیع تواریخ تکذیبِ آن موجود است زیرا کہ باجماعِ مورخین شہادتِ عثمان بعد از عصر روز جمعہ ہیژدہم ذی الحجہ واقع شدہ است و دفن اودر بقیع شب شبنہ وقوع یافت بلاشبہ[1] انتہی

(ترجمہ: اورانہیں چندروایات سے ثابت ہے[2] ہوا کہ تین روز لاشِ عثمان کا پڑا رہنا جو کہتے ہیں یہ بھی محض افتراء ودروغ ہے۔ سب تواریخ دانوں نے اس بات کو جھوٹا ٹھہرایا ہے۔ تکذیب اس کی تواریخ میں موجود ہے۔ اس واسطے کہ سب مورخ متفق ہیں کہ جمعہ کے دن اٹھارہویں ذی الحجہ کو بعد عصر عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا اور دو شنبہ کی شب بقیع میں دفن کیا بے شبہ[3])

ورایتنی کتبت فی بعض تعلیقاتی الحدیثیة وھذا ایضا تجاوز نعم لا تقبل المناکیر المنکرات فی مقابلة المشھورات المقبولات. واللہ تعالی اعلم فقط

(ترجمہ: مجھے اپنے بارے میں گمان ہے کہ میں نے بعض اپنی جدید تعلیقات میں لکھا ہے کہ یہ بھی (حق سے) تجاوز ہے۔ ہاں مقبول اور مشہور روایات کے مقابلہ میں مجہول اور منکر روایات کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے)

۲۵ ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ

عبدالوہاب مدرس مدرسہ بھرت پور معرفت مولوی سعادت اللہ

---

[1] تحفہ اثنا عشریہ

[2] ''اور یہ بھی انہی چندروایات سے ثابت ہوا'' درست ترجمہ نہیں ہے بلکہ صحیح ترجمہ یوں ہے۔ ان متعدد (کئی ایک) مشہور روایات سے ثابت ہوا) مرتب عفی عنہ

[3] اردو ترجمہ تحفہ اثنا عشریہ صفحہ ۶۸۲ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی

الجواب

هو الموفق للصواب .

بسم الله الرحمن الرحیم

استیعابِ ابن عبدالبر و تاریخ طبری کے دیکھنے سے جو اس وقت میرے سامنے موجود ہے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی تاریخ شہادت اور تاریخ دفن میں بہت کچھ اختلاف ہے علامہ طبری صفحہ ۱۴۵ جلد خامس اپنی تاریخ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

یعقوب بن زید اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ جمعہ کے دن اٹھارہ ذی الحجہ کو بعد عصر ۳۶ء میں شہید کئے گئے اور دوسرے راوی کہتے ہیں کہ ۳۵ میں شہید کئے گئے۔ عامر شعبی کہتے ہیں کہ وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ۲۵ سال بعد صبح کے وقت شہید کئے گئے بعض کہتے ہیں ضحیٰ یعنی چاشت کے قریب علی ہذا بعض کہتے ہیں کہ آپ کی لاش مبارک دو روز بے گور و کفن رہی اور بعض کہتے ہیں کوڑا ڈالنے کی جگہ تین دن بے گور و کفن رہی۔

☆ علی ہذا القیاس چونکہ یہ تاریخیں مدت بعد لکھی گئی ہیں کسی نے کچھ بیان کیا کسی نے کچھ کہا۔ ☆ بہر نہج چونکہ زیادہ معتبر قابلِ اعتبار یہی روایت ہے ☆ کہ بعد عصر اٹھارہ ذی الحجہ کو بروز جمعہ شہید کئے گئے اور ہفتہ کی شب کو بقیع کے حش الکوکب نامی ایک باغیچہ میں جس کو آپ نے خرید کر بقیع میں داخل کر دیا تھا اور بطریق کرامت یا غالباً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کے موافق ہمیشہ جب آپ وہاں تشریف لاتے فرماتے کہ یہاں ایک مردِ صالح دفن کیا جائے گا دفن کئے گئے۔

کما هو ظاهر من تصریحات التحفة والطبری والاستیعاب لابن عبدالبر .

☆ اور گورستانِ یہود میں جس کا نام دیرِ سلع تھا بعض بلوائیوں نے دفن کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر وہاں دفن نہ کر سکے اور چند صحابہ و تابعین نے ملائکہ کے آوازِ اطمینان دہ سن کر فرشتوں کے ساتھ نمازِ جنازہ پڑھ کر آپ کو

جہاں کی نسبت آپ فرمایا کرتے تھے کہ یہاں ایک مردِ صالح دفن ہوگا وہاں ہی حش الکوکب باغیچہ بقیع میں دفن کئے گئے اور روایت کتے کی تو روایت کتے ہی کی ہے علی ہذا روایت دفن کی گورستانِ یہود میں۔

☆☆ بہرنہج جو بھی کچھ ہوا موجب ترقیءِ مراتبِ شہادتِ حضرت عثمان تھا ☆ جیسے حضرت سید الشہداء جگر گوشہء رسول اللہ ﷺ کی لاش مبارک پر گھوڑوں کو دوڑایا جانا اور کئی روز لاش مبارک کا بے گوروکفن رہنا موجب ترقی مراتبِ حضرتِ سید الشہداء رضی اللہ عنہ تھا۔ ان واقعات کو بطریقِ تنقیص واہانت بیان کرنا موجبِ خوفِ زوالِ ایمان ہے۔ اللہ ہم کو اور تمام مسلمانوں کو تنقیصِ مراتبِ صحابہ کرام اور اہل بیتِ عظام علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام سے بچائے آمین

حررہ: العبد الراجی رحمۃ ربہ القوی

ابو محمد محمد دیدار علی مفتی جامع مسجد آگرہ

نوٹ: معرفت عمران گل طالب علم بمولوی سعادت اللہ صاحب فرستادہ شد

❁❁❁❁❁

﴿فتویٰ نمبر......344﴾

سوال

مولا عمر (رضی اللہ عنہ) نے بزغالہ منخقہ یعنی گردن مروڑا بہن کو کھلانا چاہا اور انہوں نے کھانے سے انکار کیا حالانکہ ممانعت منخقہ اس وقت نہ تھی پھر کیوں انکار کیا؟

جناب مولوی غلام محی الدین خان صاحب

امام جامع مسجد شاہجہاں پور۔

۱۷ دسمبر ۱۵ء

الجواب

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بزغالہ منخقہ کو پکانا کسی معتبر کتاب میں نہیں ہے۔ روضۃ الصفا میں ہے کہ

عمر بزغاله بدستِ خود ذبح ساخته بریاں کرده بنظر او در آورد. (۱)

(ترجمہ: حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بکری کا بچہ اپنے ہاتھ سے ذبح فرمایا اسے بھونا اور ان کے سامنے لائے)

پس انکار ذبیحہ کفار سے بحکم

لا تاكلوا مما لم يذكر اسم الله عليه (۲)

(ترجمہ: جس جانور پر وقت ذبح اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اسے مت کھاؤ)

تھا یا بہ تعظیم تعلیم رسولِ کریم ﷺ ہوگا۔

کتبہ المفتی السید محمد اعظم شاہ غفرلہ

❁❁❁❁❁

---

(۱) روضة الصفا. جلد صفحه مطبوعه

(۲) القرآن الحکیم : سوره الانعام: آیت ۱۲۱

۱۵ ستمبر ۳۳ء حافظ رحمت اللہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ شرع متین -

ایک مسجد میں عرصہ بیس یا پچیس سال سے ایک شخص مسمی ... لال رتی
میں امامت کرتا تھا چونکہ عرصہ ۱۲ سال سے اسکی حرکات ناشائستہ
مثل قمار بازی وغیرہ کے متواتر اسکی دیکھنے میں آئیں - لہذا اسکو چند
مرتبہ اس فعل قبیح سے متنبہ بھی کیا گیا لیکن باوجود فہمائش کامل
کے وہ حرکات ناشائستہ سے باز نہ آیا - اور چند شرعی
تقصیرات کی وجہ سے ایک دوسرے امام کو اول کر لیے عرصہ ایک سال سے
مسجد سے علیحدہ کر دیا - اس نے چند آدمیوں کو اپنا شریک بنا کر احاطہ مسجد
سے باہر لوگوں کو مسجد کے نماز پڑھانا شروع کر دیا جس وقت کہ مسجد
اندر جماعت ہوتی ہے اور نماز ہوتی ہے اسی وقت وہ دوسرا امام
بھی مسجد کے باہر یہی کام کرتا ہے اور مسجد کے دروازے پر باہر کی
آواز اندر مسجد آتی ہے اس صورت میں مسجد کے اندر اور باہر
نماز ہوتی یا نہیں - بینوا توجروا -

۱۹۱۵ء
۱۵۶ ۱۴
۱۶۸

الجواب بعون الملہم للحق والصواب

ایسا امام شرعاً لائق امامت نہیں - تمام کتب میں ہے -
تکرہ امامۃ الفاسق - اور جن لوگوں نے اسکی امامت
کی ہے اور ایک نئی جماعت مسجد سے علیحدہ قریب مسجد
قائم کی ہے وہ سب گنہگار ہیں اور سخت سزا کے لائق
ہیں - قرآن مجید میں ہے - والذین اتخذوا
مسجدا ضرارا وکفرا وتفریقا بین المؤمنین وارصادا لمن
حارب اللہ ورسولہ من قبل ولیحلفن ان اردنا
الا الحسنی واللہ یشہد انہم لکذبون -
یعنی جنہوں نے ایک نئی مسجد ضد اور کفر پر بنائی
اور مسلمانوں میں جدائی ڈالنے کیواسطے اور جو خدا اور
رسول سے لڑ رہا ہے یعنی تیار ہے اسکی تعاقب
بنے اور قسم کھائیں گے کہ یہ کام ہم نے اچھا سمجھ کر کیا تھا -
پس اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں -